
WWW.PAKSOCIETY.COM
سالگرہ نمبر
گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
اپریل 2015
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے ناولوں کی نئی اقساط
سالگرہ نمبر کے لیے مصنفات کی خصوصی تحریریں
معروف قلم کار عنیزہ سید سے خوب صورت ملاقات
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

سالگرہ مبارک

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

مکمل ناول

منی ناول

افسانے

پبلشر و پروپرائٹر: نیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن ۔ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



خصوصی مضامین

مستقل عنوانات

Office. 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone (021) 35895313. Fax: 35802551. E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

مجھے کچھ کہنا ہے......!

کتنی عجیب اور تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہم پیار و محبت اور دوستی کے مقابلے میں نفرتوں کی سرزمین پر رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہم سب سے اچھے ہیں اور دوسرے ہمارے مقابلے میں ہر لحاظ سے کم ہیں یہ رویہ ہمیں اپنے مقصد حیات سے بھی دور کرتا جا رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تنہائی، ذہنی انتشار اور رشتوں کے ٹوٹنے کے سبب لوگ بہت پریشان ہیں مگر ہمارے مسائل صرف بھوک، ڈر، خوف، امارت، غربت، بیماری، ظلم اور خود پسندی تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ انسان کی بقا اور عافیت کو بھی احاطے میں لیے ہوئے ہیں۔

وطن عزیز میں یک جہتی اور سلامتی کی کوشش سپاہ کے علاوہ اہل قلم پر قرض نہیں فرض ہے اور نفسا نفسی کے اس دور میں آج کے ادیب کی ذمے داریوں میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ ادب انسانی زندگی کا ترجمان اور اس میں وقوع پزیر ہونے والی تبدیلیوں کا مرقع ہوتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو آنے والے وقت کی نوید دیتا ہے اور انہیں ماضی کے تجربے سے اپنے حال اور مستقبل کو سنوارنے کی طرف رجوع کرتا ہے اور ادب ہی معاشرے کی بگاڑ کو سدھارنے کے لیے ہر دم کوشاں رہتا ہے۔ اس لیے اگر ادیبوں کو اپنے ملک کا بہترین سفیر بھی کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا...... کیونکہ وہ ایک ایسے معاشرے کی تکمیل کا خواب دیکھتے ہیں جہاں پاکیزگی کا راج ہو اور محبت کا بول بالا ہو اور جہاں کسی برائی کا سرے سے وجود تک نہیں ہو...... ہر سچا ادیب اپنے ملک کی بہتری کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ بشر کو بشریت کے مقام تک پہنچا دیا جائے۔ بفضل اللہ تعالیٰ ہماری تمام مصنفات، شاعرات اور اس کے ساتھ، ساتھ ہماری تبصرہ نگار بہنیں بھی اپنی تحریروں کے ذریعے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی پوری سعی کرتی ہیں...... جس کے لیے شکریے کا لفظ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اور آج پاکیزہ کی سالگرہ مناتے ہوئے ہمیں آپ سب سے یہی کہنا ہے کہ ہمیں ایسے ادب کی ضرورت ہے جو خوابیدہ قوم کو بیدار کر سکے اور ایسا معاشرہ تشکیل دے جو ہمیں زندہ قوموں کی صف میں لے آئے، آمین۔ ثم آمین۔

مدیرہ

انجم انصار

Happy Birthday

محترمہ عذرا رسول کا پیغام

سالگرہ مبارک

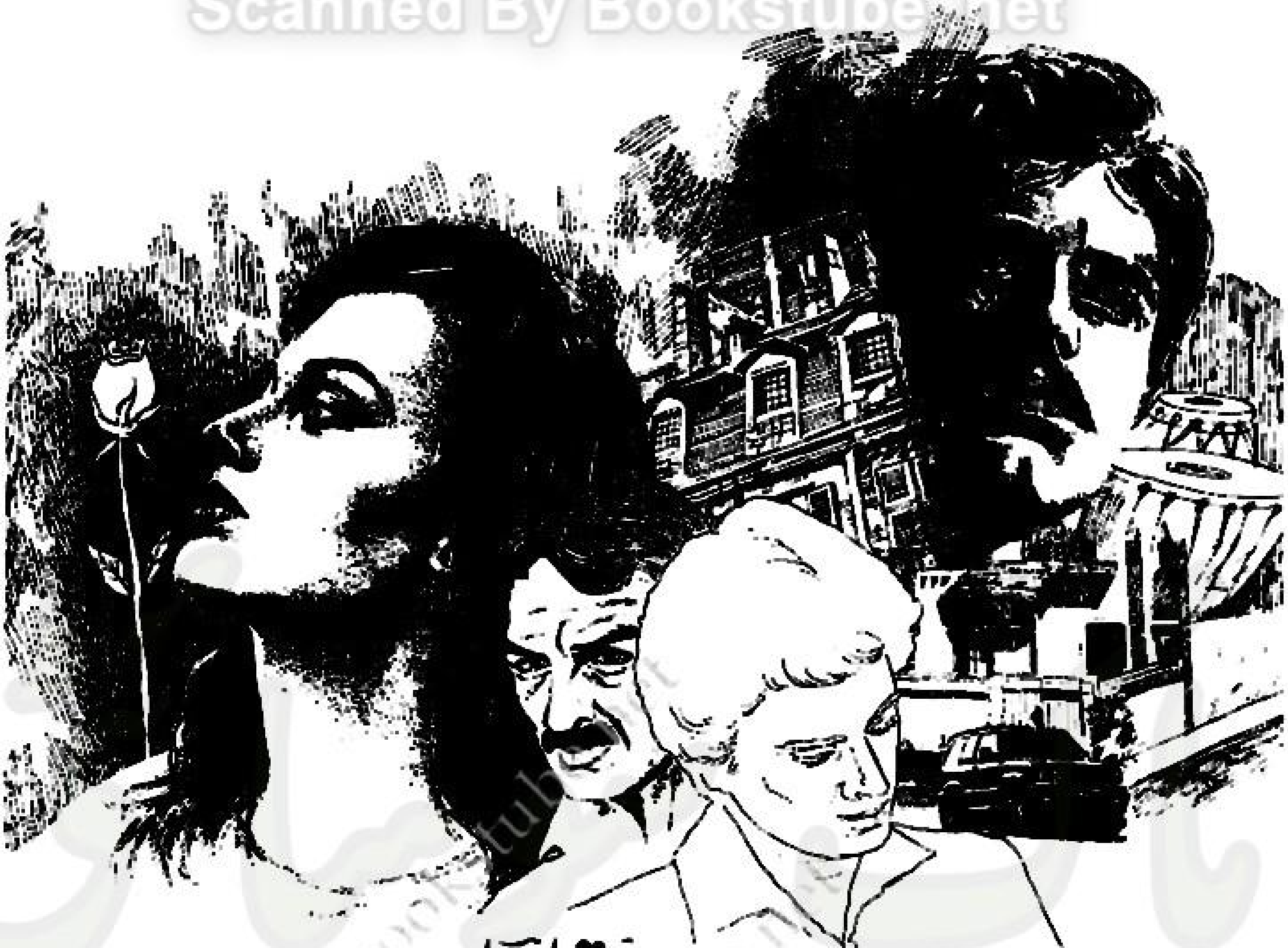
پاکیزہ بہنو! پروردگار عالم کے حضور آپ کے ایمان و صحت کی سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ آپ کو پاکیزہ کی سالگرہ کی مبارک باد دیتی ہوں اور دعا گو ہوں کہ آپ سب اسی طرح پاکیزہ سے تعاون کرتی رہیں جیسا کہ کرتی آئی ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے عورت کے بارے میں یہ تصور دیا کہ وہ دنیا کی بہترین متاع ہے اور وہ انسان کے (ہر رشتے کے حوالے سے) حسن سلوک کی سب سے زیادہ حق دار ہے۔ وہ معاشرے کے استحکام کی ضامن ہے۔ خاندان کی مرکز محبت ہے اور اس کی مضبوطی سے معاشرے ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ اپنے پیارے نبی ﷺ کے امتی ہونے کے ناتے ادارہ پاکیزہ کا مقصد حیات بھی یہی ہے کہ ہم ایسی تحریریں شائع کریں جو نہ صرف عورت کے مقام کو بلند کریں بلکہ اس کے توسط سے خاندان کی تعمیر و تشکیل بھی مثبت انداز میں ہو۔ الحمد للہ ہماری تمام مصنفات بڑی محنت، توجہ اور انتہائی محبت اور چاہت کے ساتھ پاکیزہ کے لیے لکھتی آ رہی ہیں۔ جب لوگ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ پاکیزہ کا انداز اور اس کی تحریریں دیگر رسائل سے قدرے مختلف ہوتی ہیں تو میں ان سے یہی کہتی ہوں کہ جناب معراج رسول نے اپنے ڈائجسٹ کا نام پاکیزہ اسی وجہ سے رکھا ہوگا ...... کہ اس سے پاکیزگی کو فروغ ملے تو ہم ایسی تحریریں کیونکر شائع کر سکتے ہیں جو جذبات برانگیختہ ہوں اور محض وقت گزاری کے لیے ہوں۔

ہمیشہ کی طرح میں اس سال بھی پاکیزہ کی مدیرہ انجم انصر کو خراج تحسین پیش کروں گی کہ وہ پاکیزہ کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتی ہیں اور دن رات کا خیال کیے بغیر اس کی بہتری کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں۔ مجھے یہ جان کر اب تو واقعی حیرت نہیں ہوتی کہ ہزاروں بہنیں اپنی انجم باجی کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہتی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

میں جانتی ہوں آپ سب بہنوں کو ذیشان اور فاطمہ کی شادی کے احوال کا شدت سے انتظار ہے۔ انشاءاللہ مئی کے سالگرہ نمبر دو میں آپ سب رنگین تصاویر کے ہمراہ شادی کا دلچسپ اور آنکھوں دیکھا حال پڑھیں گی اور وہ بھی عظمٰی آفاق کے قلم سے ...... جنہوں نے کسی مہمان کو نہیں چھوڑا ہے بلکہ خوب، خوب چھیڑا ہے۔

انشاءاللہ میں آئندہ ماہ آپ سے مزید باتیں بھی کروں گی ...... جی ہاں اپنے بیٹے کی شادی کے بارے میں مجھے تو آپ سے بہت کچھ شیئر کرنا ہے تو تھوڑا سا انتظار کریں ...... بس اگلے ماہ تک جب تک کے لیے اللہ حافظ ......!



اعتبارِ وفا

قسط 8

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سجھائی تک نہیں دیتی۔

ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اوّلیں قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں



''ثمر..... ثمر حیات نام ہے عظام کے پاپا کا۔ آپ کو بتایا تو تھا۔'' رواحہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
''اور میری ماما کا نام فرح تھا لیکن پاپا انہیں فرحی بلاتے تھے۔'' عظام ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔
''اوہ..... ہاں!'' انہوں نے ایک گہری طمانیت بھری سانس لے کر ان کی طرف دیکھا۔
''بعض اوقات دو بالکل اجنبیوں میں اتنی مشابہت ہوتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے، مجھے یاد ہے ایک بار میں اور بابا جان سوات گئے تھے تو وہاں ایک شخص ملا تھا جو بضد تھا کہ بابا جان چند سال پہلے منڈی بہاؤالدین میں اس کے پڑوسی تھے حالانکہ بابا جان زندگی میں کبھی منڈی بہاؤالدین نہیں گئے تھے۔''
وہ ہولے سے ہنسے اور قہوے کی پیالی اٹھاتے ہوئے پورا واقعہ تفصیل سے بتانے لگے۔ عظام اور رواحہ بہت دلچسپی سے سن رہے تھے۔

☆☆☆

ثمر حیات نے اپنے بریف کیس کا جائزہ لینے کے بعد بریف کیس بند کیا اور فرحی کی تصویر کو مخاطب کیا۔
''اللہ حافظ فرحی، لگتا ہے زندگی پھر بدلنے والی ہے۔ عظام کی محبتیں مجھے زنجیر کر رہی ہیں۔ میرا یہ بیٹا مجھے اس زندگی کی طرف واپس لا رہا ہے جو برسوں پہلے ہم سے بچھڑ گئی تھی اور اگر جو وہ ہوتا ہمارا دوسرا بیٹا تو شاید بہت پہلے میں یہ زندگی چھوڑ چکا ہوتا لیکن اب یہ عظام.....!'' اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے جھک کر بریف کیس اٹھایا اور لاؤنج میں آ گیا۔ ابھی فلائٹ میں دیر تھی۔ عظام چند دن پہلے ہی رواحہ کے گھر جا چکا تھا۔
اگرچہ عظام اسے ائرپورٹ پر جا کر سی آف کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے منع کر دیا تھا کیونکہ بگ با نے اسے دو تین دن وہاں ہی رکنے کو کہا تھا اور ظاہر ہے اسے کہیں نہیں جانا تھا بلکہ عظام کے جانے کے بعد وہ ڈی ون میں آ گیا تھا اور وہاں چند دن گزار کر آج ہی کچھ دیر پہلے وہ گھر آیا تھا اور آج ہی اس کی بنکاک کے لیے فلائٹ تھی۔ بگ با سے اس کی براہ راست تو بات نہیں ہوئی تھی۔ ڈی ون سے ہی اسے پتا چلا تھا کہ سیمو اور بالی بھی اس کے ساتھ جا رہے ہیں غالباً اسی لیے اس کی سیٹ کینسل کروائی گئی تھی۔
عظام کے ساتھ گزرا ہفتہ اس کے لیے بہت بیش قیمت تھا۔ اگر بگ با نے اس کی سیٹ کینسل کروا کر اسے ڈی ون میں پہنچنے کا پیغام نہ بھجوایا ہوتا تو وہ اس بار عظام کی ائرپورٹ تک جا کر سی آف کرنے کی خواہش بھی پوری کر دیتا۔
وہ کبھی عظام کو اپنے ساتھ ائرپورٹ لے کر نہیں گیا تھا جب وہ چھوٹا تھا تو پہلے اسے خود ہاسٹل چھوڑتا پھر ائرپورٹ آتا اور جب بڑا ہوا تو ڈرائیور کے ساتھ بھجوا دیتا تھا۔ اس نے اس سے پہلے کبھی ساتھ چلنے کے لیے کہا بھی نہیں تھا اور اگر کہتا تو بھی یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ اسے کسی دوسرے ملک ہی جانا ہو۔ اکثر تو وہ وہاں ہی رہتا تھا..... اسی گھر میں لیکن عظام کو ہاسٹل بھجوا دیتا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عظام اس کی زندگی کے اس رخ کے متعلق جان سکے۔ عظام کے جانے کے بعد اس کی زندگی یکسر بدل جاتی تھی۔ وہ ثمر حیات نہیں صرف باس رہ جاتا تھا۔ بگ با کے ترتیب دیے گئے اس نیٹ ورک کا باس..... خود بگ با (جلیل خان) پچھلے دس سالوں سے زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہتا تھا۔ سو اس کی عدم موجودگی میں سارا کام وہ ہی سنبھالتا تھا۔ جن دنوں جلیل خان پاکستان میں ہوتا تو اس کا زیادہ وقت ڈی ون اور ڈی ٹو میں ہی گزرتا تھا۔ دو مختلف علاقوں میں موجود یہ دونوں بنگلے بگ با کے تھے۔
وہ آج جو کچھ تھا اس نے ایسا بننے کے متعلق کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کے خواب بالکل معمولی سے تھے کہ وہ ایم ایس سی کے بعد کسی اچھی جگہ جاب کر لے گا اور اگر اپنے مطلب کی اچھی جگہ جاب نہ ملی تو ایجوکیشن میں ہی چلا جائے

گا اور قوم کے بچوں کو تعلیم دے گا۔ اس نے زیادہ دولت کے خواب دیکھے تھے نہ شہرت کے لیکن تقدیر کے اپنے فیصلے تھے۔ وہ آج تک نہیں جان سکا تھا کہ تقدیر نے اس جیسے سیدھے سادے ناک کی سیدھ میں چلنے والے شخص کے ساتھ یہ کھیل کیوں کھیلا۔ شاید اس کی اپنی کمزوری اور بزدلی تھی وہ اتنا بڑا اعتماد نہیں تھا کہ اچانک بدل جانے والے حالات میں اپنی زندگی کا خود فیصلہ کر سکتا۔ باپ اس دنیا میں نہیں تھا جو ہر گرم و سرد میں اس کی ڈھال بن جاتا۔ ماں کا کچھ پتا نہ تھا جو ڈھارس دیتی، آنسو پونچھتی۔ وہ اکیلا نہیں تھا، فرحی بھی تھی اس کے ساتھ۔ اسے ایک پناہ گاہ کی ضرورت تھی۔ وہ ساری زندگی فرحی کے ساتھ جلیل خان کے اس گھر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا اپنا گھر موجود تھا لیکن سب سے پہلے اسے اماں کو ڈھونڈنا تھا۔ وہ رات اس کی زندگی کی تاریک ترین رات تھی۔ ان راتوں سے بھی زیادہ تاریک جو اس نے جیل میں گزاری تھیں۔ وہ سارا دن یوں ہی کارپٹ پر بیٹھا رہا تھا۔ کبھی چیخیں مار، مار کر رونے لگتا کبھی خاموش ہو کر فرحی کو دیکھنے لگتا تھا۔ فرحی بھی کبھی روتی تھی کبھی چپ کر جاتی تھی۔ نہ فرحی کے پاس تسلی کے لیے لفظ تھے نہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا۔ کئی بار اس کے ذہن میں آیا کہ وہ ابھی اٹھ کر اپنے گھر کی طرف جائے کیا پتا اماں آس پڑوس میں کسی کے پاس ہوں یا پھر ہو سکتا ہے کہ ماموں کوئل گئی ہوں اُن کے گھر ہوں۔

''مجھے ماموں کی طرف جانا چاہیے۔'' لیکن اس کا جوڑ، جوڑ دکھ رہا تھا۔ پورے وجود سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ جلیل خان انہیں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ شاید وہ چاہتا کہ وہ جی بھر کر رو لیں اور دل کی بھڑاس نکال لیں۔ وہ بیٹھے، بیٹھے تھک گیا تو وہاں ہی کارپٹ پر لیٹ گیا۔ شاید دلدار نے جو دوادی تھی اس میں نیند کا اثر تھا کہ وہ لیٹے، لیٹے سو گیا۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئی تھیں۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو بس تھوڑی سی ہمت کر کے اٹھنا تھا لیکن وہ سو گیا تھا دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو فرحی اس کے پاس ہی کارپٹ پر بیٹھی تھی اور اس کی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ لحہ بھر اسے دیکھتا رہا پھر جیسے اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔

''فرحی.....'' وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا تھا۔ ''فرحی یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا، کیوں ہو گیا؟'' وہ ایک بار پھر رونے لگا تھا۔ فرحی بھی رونے لگی تھی۔ تب ہی جلیل خان لاؤنج میں آیا تھا۔ قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''مسائل تمہارے رونے سے حل نہیں ہوں گے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اٹھو اور منہ ہاتھ دھو کر ٹیبل پر آ جاؤ۔ گلا کھانا لگا رہا ہے۔ فرحی بٹی نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ چند نوالے لے لو۔ دلدار تمہارے لیے مزید دوائیاں لے آیا ہے۔ وہ کھا لو صبح تک تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو پھر تمہاری والدہ کی تلاش کا کام کرتے ہیں۔ کیا خبر وہ کسی عزیز رشتے دار کے گھر چلی گئی ہوں۔ تم جانتے تو ہو گے اپنے عزیزوں کو تو پھر صبح پتا کر لینا ادھر سے بھی۔ وہ اپنے گھر پلٹ کر نہیں آئیں اس کا تم یقین رکھو۔ میں نے ایک بندے کی ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے ادھر۔''

''ماموں...... کیا خبر ماموں انہیں لے گئے ہوں۔'' وہ بڑبڑایا تھا اور جلیل خان جو بات مکمل کر کے رکا نہیں تھا واپس جاتے، جاتے مڑا۔

''تمہارے پاس نمبر ہو تو تم فون کر کے اپنے ماموں سے پتا کر لو؟'' جلیل خان مشورہ دے کر چلا گیا تھا۔

''فون نمبر یاد ہے؟'' فرحی نے پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔ فرحی نے اٹھ کر فون اسٹینڈ سے فون سیٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا تو اس نے کانپتی انگلیوں سے نمبر ملایا۔ پہلے بڑے ماموں کا پھر چھوٹے ماموں کا۔ دونوں نے ہی جواب دیا کہ وہ ان کے گھر نہیں ہیں اور یہ کہ وہ آئندہ نہ تو انہیں فون کرے نہ ان کے گھر آئے وہ اس جیسے چور، ڈاکو، قاتل سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔ اس کا دل جیسے اب بیٹھنے لگا تھا۔

''پلیز ثمر دو تین نوالے ہی لے لو۔'' فرح نے بہ مشکل اسے اٹھایا حالانکہ اس کا کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

''نہیں فرحی، مجھے اپنے گھر جانا ہے اپنی اماں کو ڈھونڈنا ہے۔''

''ٹھیک ہے گھر بھی چلیں گے لیکن پہلے کچھ کھالو اور دوا لے لو۔ اتنی ڈھیر ساری دوائیاں دے گئے ہیں دلدار بھائی تمہارے لیے۔'' فرحی کے بے حد اصرار پر وہ اٹھ کر ٹیبل تک آیا تھا لیکن نوالہ اس کے حلق میں پھنس رہا تھا۔

اس کے ابا اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ وہ ابا جنہوں نے کبھی اس سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی تھی، وہ ان کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ آخری بار ان کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ قید میں بھی ان دس دنوں میں اس نے برائے نام ہی کھایا تھا لیکن اب بھی اس سے کچھ نہیں کھایا جا رہا تھا۔ پتا نہیں اماں کہاں تھیں پتا نہیں انہوں نے کچھ کھایا بھی ہوگا یا نہیں۔

یک دم اس نے اپنا سر ٹیبل پر رکھ دیا وہ ایک بار پھر رو رہا تھا۔ اونچا، اونچا...... دو عزیز ترین ہستیاں دیکھتے، دیکھتے بچھڑ گئی تھیں۔ اتنی جلدی صبر کیسے آتا۔ جلیل خان نے کچھ دیر اسے رونے دیا اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''حوصلہ کرو جوان ابھی آگے بہت کٹھنائیاں ہیں۔ تمہیں صبر نہیں آ رہا تو کھانا کھا کر ایک چکر لگا آتے ہیں تمہارے گھر کا۔''

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس نے آنسو پونچھ لیے تھے۔ اب اس کی نظریں سامنے بیٹھی فرحی پر تھیں۔ جس نے پلیٹ میں برائے نام چاول ڈالے ہوئے تھے اور انہیں ٹونگ رہی تھی۔ گاہے گاہے وہ نظر اٹھا کر اس کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ جلیل خان نے اطمینان سے اپنا کھانا ختم کیا اور اٹھ کھڑا ہوا اس نے پھر ثمر کو کھانے کے لیے نہیں کہا تھا۔ جانتا تھا یہ زخم اس طرح اتنی جلدی نہیں بھرنے والے۔

''آؤ۔'' اس نے ساکت بیٹھے ثمر کی طرف دیکھا۔

''میں بھی چلوں؟'' فرحی نے پوچھا تو جلیل خان نے نفی میں سر ہلایا۔

''اس وقت نہیں۔''

اس نے مڑ کر فرحی کو دیکھا تو اس نے جانے کا اشارہ کیا وہ جانتا تھا کہ فرحی یہاں محفوظ ہے۔ وہ خاموشی سے جلیل خان کے ساتھ باہر آ گیا۔ سارا راستہ وہ خاموش بیٹھا رہا تھا۔ جلیل خان نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ شیر خان نے اس کے گھر والی روڈ پر گاڑی روک دی تھی۔

''تم جاؤ، میں یہاں تمہارا انتظار کروں گا۔ محلے کے وہ گھر جدھر تمہاری والدہ کا آنا جانا تھا وہاں سے بھی پتا کر لینا۔'' وہ سر ہلا کر اپنے گھر والی گلی کی طرف بڑھ گیا۔

اسٹریٹ لائٹس جل رہی تھیں، نکڑ والا اسٹور بھی کھلا ہوا تھا۔ کچھ لڑکے اسٹور کے باہر کھڑے کچھ کھا پی رہے تھے۔ کچھ لوگ عشا کی نماز پڑھ کر مسجد سے آ رہے تھے۔ وہ سر جھکائے ہولے، ہولے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ گلی، آس پاس آتے جاتے لوگ سب اجنبی، اجنبی لگ رہے تھے جیسے وہ صدیوں بعد یہاں آیا ہو۔ اچانک وہ سامنے سے آتے وکیل صاحب کو دیکھ کر رک گیا۔ وہ غالباً دوسرے اسٹور سے انڈے اور ڈبل روٹی لے کر گھر کی طرف جا رہے تھے۔ وہ نہ صرف ان کے پڑوسی تھے بلکہ ابا کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ بے قرار سا ہو کر اس نے ایک قدم آگے بڑھا کر انہیں سلام کیا۔

''تمہیں جرأت کیسے ہوئی یہاں محلے میں قدم رکھنے کی۔'' وکیل صاحب اس کے سلام کا جواب دینے کے بجائے غصے سے بولے تھے۔

''وکیل صاحب میں اپنے گھر......''

''کون سا گھر میاں... تمہارے ماموں تالا لگا گئے ہیں یوں بھی تم جیسے چور، ڈاکو کو ہم محلے میں رہنے کی

اجازت نہیں دیں گے۔ میاں کہیں اور ٹھکانا کرلو۔ یہ شریفوں کا محلّہ ہے، غضب خدا کا لڑکی بھگائی، ڈاکا ڈالا، بندہ مار دیا۔ باپ صدمے سے مر گئے۔ ماں پاگل ہوگئی اور صاحبزادے کیسی دیدہ دلیری سے چلے آرہے ہیں گھر۔''

''وکیل صاحب میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ......'' اس نے بتانا چاہا تھا لیکن وکیل صاحب نے تمسخر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ارے جاؤ میاں، اب ہمیں پڑھاؤ گے تم۔'' اس اثنا میں کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ سب ہی اسے لعن طعن کر رہے تھے۔ کوئی باپ کا قاتل کہہ رہا تھا اور کوئی غنڈا بدمعاش اور کوئی ڈاکو چور۔

''آپ پلیز میری بات تو سنیں...... میں نے ایسا کچھ نہیں کیا میرے ساتھ تو خود ظلم ہوا ہے۔ میں ایسا نہیں ہوں۔'' لیکن کوئی اس کی بات نہیں سن رہا تھا سب کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت تھی، غصہ تھا۔ وہ گھبرا کر ان کا حلقہ توڑتا ہوا آگے نکل گیا تھا اور کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ اس کا... گھر تھا۔ یہاں وہ پیدا ہوا تھا، پلا بڑھا تھا۔ ماں باپ کی محبتیں سمیٹی تھیں۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

بہر حال یہ اس کا گھر تھا۔ بھاری قدموں سے چلتے ہوئے اس نے ساتھ والے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ یہ خالہ صفیہ کا گھر تھا۔ خالہ صفیہ سے اماں کی بہت دوستی تھی اور خود خالہ صفیہ بھی تو اس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ جو اچھی چیز ان کے گھر پکتی وہ اس کے لیے ضرور بھجواتیں۔ وہ ضرور اس کی بات سنیں گی بھی اور سمجھیں گی بھی اور کیا پتا خالہ کو پتا ہو کہ اماں کہاں ہیں لیکن خالہ صفیہ نے بھی اسے دروازے سے ہی لوٹا دیا تھا۔ پھر اس نے دو تین اور گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے تھے لیکن اماں کسی گھر میں نہیں تھیں۔ کسی نے ہمدردی کی، کسی نے نفرت سے دھتکار دیا تھا۔ تب وہ سر جھکائے دل شکستہ سا محلے سے نکلا تھا۔ جلیل خان گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سگریٹ نیچے پھینک کر جوتے سے مسلا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی خاموشی سے بیٹھ گیا تھا نہ اس نے کچھ پوچھا نہ اس نے بتایا۔

وہ پوری رات اس نے جاگتے اور روتے ہوئے گزار دی تھی۔ صبح چائے کا ایک کپ پی کر وہ جلیل خان کو بتا کر گھر سے نکل آیا تھا۔

''مجھے ماموں کی طرف جانا ہے۔''

رات ماموں سے فون پر بات ہو جانے کے بعد اسے ہمت نہیں ہوئی تھی ان کے گھر جانے کی لیکن اس وقت اسے ان کی طرف ہی جانا تھا۔ وہ ہی اس کے واحد اپنے تھے، ٹھیک ہے رات کو وہ غصے میں تھے فطری بات تھی لیکن اب جب وہ ان کے سامنے جا کر بات کرے گا تو وہ ضرور اس کی بات سنیں گے۔ جلیل خان نے اسے روکا نہیں تھا۔ وہ سیدھا چھوٹے ماموں کی دکان پر گیا تھا۔ ممانی غیر تھیں ماموں تو اپنے تھے، یہ وہ ماموں تھے جو اسے داماد بنانا چاہتے تھے جو برادری میں بیٹھ کر اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔

''نکل جاؤ میری دکان سے۔'' اسے دیکھتے ہی وہ دہاڑے تھے۔

''میرے بہنوئی اور بہن کے قاتل ہو تم...... لوفر......''

''تو کیا اماں بھی......؟'' دل جیسے درد سے پھٹنے لگا تھا۔

''نہیں...... ہمیں کچھ علم نہیں ہے۔ تمہاری اماں کا دماغ صدمے سے چل گیا تھا۔ وہ تمہیں ڈھونڈنے کے لیے گھر سے نکلی تھیں پھر لوٹ کر نہیں آئیں۔'' بالآخر ماموں نے بتایا تھا۔

''ہم نے ہر جگہ ڈھونڈ لیا۔ اسپتال، مردہ خانہ، شیلٹر ہوم...... اور سنو......'' انہوں نے اسے دکان سے باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"آئندہ یہاں قدم مت رکھنا۔"

"گھر کی اور دکان کی چابی دے دیں۔" وہ دل شکستہ سا ہو کر دکان سے اتر آیا تھا۔

"میرے پاس نہیں ہے، بھائی صاحب کے پاس ہو گی۔" اسے اپنے گھر جانا تھا لیکن اماں کے بغیر...... وہ دیوانوں کی طرح اگلے دس دن تک انہیں ڈھونڈتا رہا تھا۔ رات کو نڈھال ہو کر وہ جلیل خان کے لاؤنج میں پڑ جاتا..... کتنی راتیں جاگتے اور گریہ وزاری کرتے ہوئے اس نے گزار دیں۔ جلیل خان نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس فرحی ہی جو پاس آ کر بیٹھ جاتی تھی زبردستی کھانے کے لیے کہتی تو کچھ کھا لیتا...... وہ ابا کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔ جلیل خان نے اس سلسلے میں بھی اس کی مدد کی تھی۔

"شیر خان کو علم ہے تمہارے ابا کو کہاں دفن کیا گیا ہے۔ میں نے وہاں قرآن خوانی کروائی ہے دو بار ان کے ایصالِ ثواب کے لیے۔" اور ابا کی قبر سے لپٹ کر وہ اتنا بلک، بلک کر رو دیا کہ شیر خان کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

"بتاؤ میں کیا کروں فرحی، اماں کہیں نہیں ملیں۔ حتیٰ کہ پاگل خانے تک سے پتا کر آیا ہوں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا فرحی کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میں اندھا ہو گیا ہوں۔ چلو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں، ایک بار پھر کوشش کرتے ہیں، کیا خبر تمہارے ڈیڈی اور ممی کا دل پگھل جائے۔" گیارھویں دن وہ فرحی کے سامنے مایوس بیٹھا تھا۔

جلیل خان نے سنا لیکن روکا نہیں...... وہ کئی بار فرحی کو لے کر گھر گیا اور ہر بار اسے دروازے سے ہی لوٹا دیا گیا..... کئی بار وہ اپنے محلے میں بھی گیا۔ کسی نے دیکھ کر دروازہ بند کر لیا اور کسی نے روکھا سا جواب دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس کے ابا کی بہت عزت کرتے تھے اور اس سے بھی پیار کرتے تھے۔ تب نڈھال ہو کر تھک کر اور شاید مایوس ہو کر وہ کئی دن گھر میں ہی پڑا رہا۔ وہ ناشتے کے لیے ٹیبل پر آتا نہ کھانے کے لیے..... فرحی ٹرے میں رکھ کر لے جاتی تو چند لقمے کھا لیتا۔ جلیل خان بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"ثمر ایسے کیسے گزارہ ہو گا، کیا کریں گے ہم...... اس سے تو اچھا ہے کہ ہم دونوں مر جائیں۔ ہم جی کر کیا کریں گے۔" فرحی نے کہا تو وہ خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا جیسے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہو۔

"ثمر پلیز اپنے آپ کو سنبھالو، کوئی تو راستہ ہو گا اگر نہیں ہے تو پھر موت کا راستہ تو کھلا ہے، ہم کب تک اس شریف آدمی کے گھر بیٹھے رہیں گے؟"

"ہاں، ہم کب تک بیٹھے رہیں گے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "چلو اپنے گھر چلتے ہیں۔"

"سر آپ نے ہمارا بہت ساتھ دیا، آپ کا شکریہ مر کر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ اب اجازت دیجیے۔" وہ جلیل خان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"کہاں جاؤ گے؟" جلیل خان نے اسے دیکھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے ملگجے تھے اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"اپنے گھر......"

"ٹھیک ہے لیکن فرحی کا تمہارے ساتھ وہاں اکیلے گھر میں رہنا مناسب نہیں ہے، جب تمہاری والدہ مل جائیں گی تو لے جانا..... تم جانا چاہو تو میں تمہیں روکوں گا نہیں۔"

"لیکن......" اس نے سٹپٹا کر جلیل خان کی طرف دیکھا تھا۔

"یہاں بھی بھلا فرحی اکیلے کیسے رہ سکتی ہے، یہاں بھی تو بس صبح صبح ایک ماسی آ کر کام کر کے چلی جاتی تھی۔" اس نے سوچا۔

''لیکن کیا...... ؟'' جلیل خان اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''میں یہاں بھی فرحی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔'' اس نے تھوک نگلا تھا اور خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تو......؟'' جلیل خان کے ہونٹوں پر اس نے پہلی بار مسکراہٹ ابھرتے دیکھی۔

''تم نہا دھو کر کپڑے بدلو۔ شیو کرو، فریش ہو جاؤ، شیر خان تمہارے لیے نئے کپڑے لے آیا تھا۔ اس نے واش روم میں لٹکا دیے ہیں۔ شام کو تمہارا نکاح ہے فرحی کے ساتھ۔ شیر خان کے پاس، نکاح کے فارم ہیں، کچھ اس نے فل کر دیے ہیں جو کوائف رہ گئے ہیں وہ تم فل کروا دینا۔''

وہ حیرت زدہ سا جلیل خان کو دیکھنے لگا تھا۔ جلیل خان نے سب کچھ پہلے سے طے کر رکھا تھا۔

''ان حالات میں اس سے بہتر اور کوئی حل نہیں ہے، یہاں اس گھر میں کوئی عورت نہیں ہے، میں نے شادی نہیں کی۔ ماں، بہن کوئی ہے نہیں ورنہ انہیں لے آتا...... اور فرحی کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے ساتھ...... تم نے ہر کوشش کر دیکھی اس کے والدین اسے ساتھ رکھنے کو تیار نہیں۔''

جلیل خان صحیح کہہ رہا تھا۔ اسے فرحی کو سہارا دینا تھا۔ وہ ساری زندگی یہاں نہیں رہ سکتے تھے اور وہ بغیر کسی رشتے کے فرحی کے ساتھ اکیلا نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ جلیل خان سے بہت متاثر ہوا تھا اور احسان مند بھی...... ایک طرف سگے رشتے تھے جنہوں نے اس مشکل وقت میں منہ پھیر لیا تھا دوسری طرف یہ شخص تھا بالکل اجنبی اور انجان، وہ حادثاتی طور پر ان سے ملا تھا اور......

''فرحی...... آپ نے فرحی سے بات کی......'' اس نے ممنون نظروں سے جلیل خان کی طرف دیکھا۔

''اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''تھینک یو سر......'' اس کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

''اٹس او کے......'' جلیل خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دبایا تھا۔ ''جاؤ فریش ہو کر آؤ اور کچھ کھا پی لو، شام تک تمہاری حالت بہتر ہونی چاہیے۔''

جلیل خان چلا گیا لیکن جلیل خان کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک وہاں ہی بیٹھا رہا۔ اور اسی شام اس کا فرحی سے نکاح ہو گیا۔ جلیل خان نے چھوٹی سی دعوت کا اہتمام کیا تھا...... محلے کے چند معززین کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور اس کا تعارف اپنے یتیم بھانجے کی حیثیت سے کروایا تھا اور فرحی کو بھی قریبی عزیز بتایا تھا۔

نکاح کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ فرحی کے ساتھ اپنے گھر میں رہے گا اور جب تک کوئی اچھی جاب نہیں مل جاتی ابا کی دکان پر بیٹھے گا اور اماں کو بھی تلاش کرتا رہے گا، کیا خبر گھر کھلا دیکھ کر اماں خود ہی کسی روز آ جائیں۔ بہر حال زندگی کو کہیں نہ کہیں سے تو شروع کرنا ہی تھا کیونکہ وہ اکیلا نہیں تھا اب فرحی کی بھی ذمے داری تھی۔ جو زخم لگے تھے انہیں بھرنے میں وقت لگنا تھا...... لیکن اسے فرحی کی خاطر ہمت کرنا تھی۔ جلیل خان نے اس کی بات سن کر کہا تھا۔

''میں تمہیں منع نہیں کروں گا شہر لیکن مجھے صرف یہ خوف ہے کہ کہیں فرحی کے خاندان والے تمہارے لیے زندگی کو مشکل نہ بنا دیں۔ بڑے لوگ ہیں مروا بھی سکتے ہیں اسی شہر میں رہو گے تو کہیں نہ کہیں آمنا سامنا بھی ہو گا...... اور غیرت میں انسان کو کچھ نہیں سوجھتا۔''

''آپ کی بات صحیح ہے سر لیکن میرا گھر یہاں ہی ہے اور میں کہاں جا سکتا ہوں...... جو اللہ کو منظور ہوا ہونا تو وہی ہے۔ پہلے کون سا سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہوا ہے جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ آپ پر بھی

کب تک بوجھ بنیں گے ہم......ایک نہ ایک دن تو جانا ہی ہے ......''

''ٹھیک ہے، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں لیکن یہ یاد رکھنا کہ میں نے فرحی کو بیٹی کہا ہے، تم بوجھ نہیں ہو اگر کبھی زندگی میں میری ضرورت پڑے تو میرے گھر کے دروازے ہر لمحے تمہارے لیے کھلے ہیں۔''

''بہت شکریہ سر۔میں کل صبح ماموں سے گھر کی چابیاں لے آؤں گا تو پھر فرحی کو لے جاؤں گا۔ایک رات اور آپ کی چھت تلے رہنا چاہتا ہوں۔''

''جیسے تمہاری مرضی ثمر حیات......میری طرف سے چاہو تو ساری زندگی یہاں رہ سکتے ہو۔''

اس رات بھی وہ لاؤنج میں ہی سویا تھا اور فرحی گیسٹ روم میں تھی۔نکاح ہو چکا تھا۔یہ وقت کی ضرورت تھی لیکن ابھی وہ خود ذہنی طور پر اس رشتے کے لیے تیار نہیں تھا۔

صبح ناشتے پر وہ اور فرحی اکیلے تھے، فرحی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، یقیناً وہ رات بھر روتی رہی تھی۔شادی کے حوالے سے ہر لڑکی کے خواب ہوتے ہیں اور جن حالات میں اس کا نکاح ہوا تھا وہ یقیناً تکلیف دہ ہوگا اس کے لیے......اسے اپنی ماں یاد آئی ہوں گی۔باپ کا خیال آیا ہوگا اک ذرا سی جذباتی غلطی عمر بھر کا پچھتاوا بن گئی تھی۔گل نے بتایا تھا کہ جلیل خان کسی بہت ضروری کام سے صبح سویرے چلے گئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ آپ ان کے آنے کا انتظار کریں۔

ناشتے کے بعد وہ فرحی کو بتا کر گھر کی چابیاں لینے بڑے ماموں کے گھر چلا گیا تھا۔

''کیا کرنے آئے ہو یہاں؟'' ماموں نے اسے دیکھ کر نفرت سے پوچھا۔

''گھر کی چابیاں لینے آیا ہوں، چھوٹے ماموں نے کہا تھا آپ کے پاس ہیں۔''

''کس گھر کی......؟'' ماموں کی آنکھوں میں تمسخر تھا۔

''اپنے گھر کی......''

''اچھا......'' ان کا اچھا بہت لمبا تھا۔

''وہ گھر ہماری بہن کا تھا۔اسی کے نام ہے ناں......'' غیر ارادی طور پر اس کا سر اثبات میں ہلا تھا۔وہ جانتا تھا کہ گھر اماں کے نام ہی ہے۔

''تو......اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس گھر میں شرعاً اور قانوناً ہمارا حصہ بھی ہے، گھر فروخت کر کے جو تمہارا حصہ بنا تمہیں دے دیں گے۔''

''میری اماں ابھی زندہ ہیں، آپ کیسے حصے بخرے کر سکتے ہیں؟''

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ زندہ ہے؟'' ماموں گیٹ پر ہی کھڑے اس سے بات کر رہے تھے۔

''اور آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ نہیں ہیں؟'' اس نے کہا تو انہیں غصہ آ گیا تھا۔

''بکواس مت کرو......اور جاؤ یہاں سے......اور آئندہ یہاں قدم مت رکھنا۔ٹانگیں توڑ دوں گا تمہاری۔''

''ماموں پلیز......''

''اے ہے جوان بیٹیاں ہیں ہماری تم جیسے بدمعاشوں کی جگہ نہیں ہے ہمارے گھر میں۔'' ممانی بھی جانے کب گیٹ کے پاس آئی تھیں۔

''بند کریں جی دروازہ اور دفع کریں اسے۔''

''دکان کی چابی تو دے دیں۔''

''کس خیال میں ہو......دکان کرائے کی تھی مالک نے خالی کر والی ہے اور اب چلتے پھرتے نظر آؤ۔'' انہوں

نے گیٹ بند کر دیا۔ جب وہ واپس مڑ رہا تھا تو اس کا خون کھول رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ سب کچھ تباہ و برباد کر دے اور خود کو بھی ختم کر لے لیکن فرحی کا خیال تھا جو اسے کچھ بھی غلط کرنے سے روکتا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو جلیل خان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر اس کا انتظار کرنے کے بعد وہ نگل کو بتا کر فرحی کو لے کر گھر سے نکل آیا۔ یہ گھر اس کا تھا...... اسے کوئی اس گھر میں جانے سے نہیں روک سکتا تھا۔ کیا ہوا جو ماموں نے چابی نہیں دی تھی۔ وہ گھر کا تالا توڑ کر اندر چلا جائے گا۔ اور کون اسے روکے گا سب محلے والے جانتے تھے کہ وہ اس کا گھر ہے، اپنے گھر کے نزدیک ہی ایک چابی، تالے ٹھیک کرنے اور کھولنے والا بیٹھتا تھا اس نے اسے ساتھ لیا اور تالا کھلوا کر اندر داخل ہوا...... یہاں گھر میں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ برآمدے میں لکڑی کا تخت پڑا تھا ساتھ ہی دو کرسیاں پڑی تھیں۔ بس اماں، ابا نہیں تھے۔ ہر وقت چمکتا ہوا صاف ستھرا صحن اس وقت مٹی سے اٹا تھا۔ اس نے بہ مشکل اپنی چیخوں کو روکا تھا لیکن آنسو بہنے لگے تھے۔ تالا کھولنے والا واقف تھا اس نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

''صبر کرو بھائی......'' اور پھر دونوں کمروں کے تالے کھول کر اپنی مزدوری لے کر چلا گیا...... دروازہ بند کر کے وہ مڑا تو فرحی چادر لپیٹے تخت پر بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ سامنے کچن کا دروازہ ادھ کھلا تھا جیسے ابھی ابھی اماں کچن کا دروازہ کھول کر مسکراتی ہوئی باہر نکل آئیں گی۔ اس کا جی چاہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے عورتوں کی طرح بین کرے اماں اور ابا کو پکارے...... وہ ضبط کرتا ہوا فرحی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''فرحی......'' فرحی نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ہاتھ کی پشت سے پونچھتی جا رہی تھی۔

''فرحی......'' اس نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور ضبط کا بندھن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ بلک کر رونے لگا۔ بہت دیر تک وہ دونوں روتے اور ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے رہے۔

''فرحی......'' اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ''تم نے ایسی زندگی کے خواب نہیں دیکھے ہوں گے، تم اپنے گھر میں ہوتیں تو کیا اس طرح رخصت ہوتیں...... تم پارلر میں سجتیں، دلہن بنتیں، شہر کے معززین تمہاری شادی کی دعوت میں مدعو ہوتے...... بابل کی دعائیں تمہارے سنگ ہوتیں۔''

''پلیز......'' فرحی نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا لیکن وہ بولتا رہا۔

''اور یہاں اس گھر میں تمہارا شاندار استقبال ہوتا لیکن یہاں اس گھر میں تمہارا استقبال کرنے کے لیے میری ماں موجود نہیں ہے، وہ ہوتیں تو تم دیکھتیں، وہ کیسے تمہارے لاڈ اٹھاتیں اور ان سے زیادہ ابا تمہیں پیار کرتے...... اگر میں تمہیں کچھ کہتا تو وہ دونوں مجھ سے لڑتے...... دونوں کو ہی بیٹی کا بہت شوق تھا۔ تم جن حالات میں میری زندگی میں شامل ہوتیں وہ تمہیں بہت عزت دیتے، وہ ایسے ہی تھے۔'' وہ بہت دیر تک بولتا رہا تھا۔ فرحی ہاتھ گود میں دھرے خاموشی سے اسے سنتی رہی تھی۔ پھر وہ خود ہی چپ کر گیا تھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ وہ یک دم اٹھا تھا۔

''تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی فرحی میں کچھ لے کر آتا ہوں۔'' اس کے پاس ابھی کچھ پیسے تھے۔ جب وہ اماں کو تلاش کرنے کے لیے نکلا تھا تو جلیل خان نے اسے کچھ رقم دی تھی رکشے، ٹیکسی کے کرائے کے لیے۔ جس میں سے اتنے ضرور بچے ہوئے تھے کہ وہ کچھ کھانے کے لیے آتا۔

''نہیں پلیز، مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔'' فرحی نے بے اختیار اس کا بازو پکڑ کر اسے روکا تھا۔

''یہاں ڈر والی کوئی بات نہیں ہے، تم دروازہ بند کر لینا...... اور......'' لمحہ بھر اسے دیکھنے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب تمہیں اکیلے ہی رہنا ہو گا فرحی...... جب تک اماں مل نہیں جاتیں۔ میں کل صبح گھر سے نکلوں

گا۔ پہلے تو ماموں کی طرف دو معزز لوگوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ ابا کی دکان مال سے بھری ہوئی تھی اور مجھے نہیں لگتا کہ چند دنوں میں دکان کے مالک نے دکان خالی کرالی ہوگی۔ ابا نے دکان کی پگڑی دے رکھی تھی تین چار لاکھ سے کم تو نہیں ہوگی...... مجھے مالک دکان سے بھی ملنا ہوگا۔ ہم ایسے گھر میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر تو نہیں بیٹھ سکتے۔''

''ٹھیک ہے کل چلے جانا۔ لیکن پلیز ثمر اس وقت نہیں۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔'' فرحی نے التجا کی تھی۔

''او کے ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں فریج میں کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی۔ شاید انڈے پڑے ہوں...... آلو ہوں گے ابا دس پندرہ دنوں کی اکٹھی سبزی وغیرہ اور گوشت لاتے تھے۔ آٹا، چینی، چاول وغیرہ تو مہینے بھر کا اکٹھا ہی آتا تھا۔''

وہ کچن کی طرف گیا تو فرحی بھی اس کے ساتھ کچن میں گئی تھی۔ فریج میں تین انڈے تھے۔ اسے لگا تھا... جیسے اماں ابھی کچن میں داخل ہوں گی اور اسے وہاں سے ہٹا دیں گی۔

''چلو ہٹو باہر بیٹھو...... مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا مردوں کا کچن میں آنا۔'' ہر طرف ان کی خوشبو بکھری ہوئی تھی اور کانوں میں ان کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

''نماز کے لیے جا رہا ہوں، دروازہ بند کرلو۔'' کبھی ابا کی آواز آتی۔

''ناشتا بن گیا ہے ثمر بیٹا آجاؤ۔'' کبھی اماں کی آواز کانوں میں پڑتی۔ وہ گھبرا کر کچن سے باہر نکلا۔

''تم آملیٹ بنالو فرحی، میں روٹیاں باہر سے لے آتا ہوں۔ شاید کوئی تندور کھلا ہو ابھی...... یا پھر ڈبل روٹی لے آؤں گا۔ دودھ بھی لیتا آؤں گا۔ دس منٹ میں آرہا ہوں۔''

وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ ایک دو پڑوسیوں نے رک کر ہمدردی کا اظہار کیا...... باپ کی وفات پر افسوس کیا۔ کچھ دور کھڑے سرگوشیاں کرتے رہے۔ لیکن اس نے پروا نہیں کی تھی۔ اسٹور سے دودھ اور ڈبل روٹی لے کر اس نے تندور سے روٹیاں لیں اور گھر آگیا۔ فرحی نے آملیٹ بنالیا تھا۔ انہوں نے وہاں ہی برآمدے میں تخت پر بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ فرحی چائے بنانے کے لیے گئی تو وہ اٹھ کر ابا، اماں کے کمرے میں چلا گیا۔ اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ فرحی کے پاس ایک ہی فالتو سوٹ تھا جو شیر خان جلیل کے کہنے پر لایا تھا۔ اسے فرحی کے لیے کپڑے خریدنے تھے اور دوسری ضرورت کی چیزیں لانی تھیں۔ لیکن لوہے کی بڑی الماری جس کے لاکر میں رقم اور اماں کا زیور ہوتا تھا۔ وہ لاکر خالی تھا...... نہ رقم تھی نہ اماں کا زیور...... ساٹھ، ستر ہزار روپیہ تو ہر وقت گھر میں ہوتا ہی تھا۔ اور اماں اپنی بچت بھی یہاں ہی زیورات والے ڈبے میں رکھتی تھیں لیکن الماری خالی تھی حتیٰ کہ ابا کے دکان کے حساب والے رجسٹر بھی نہیں تھے جو نچلے خانے میں پڑے رہتے تھے۔ وہ حیران سا کھڑا رہ گیا تھا۔

''کیا ماموں اس حد تک گر سکتے ہیں؟'' اسے یقین نہیں آرہا تھا وہ گھوم پھر کر کمرے میں دیکھ رہا تھا۔ ایک دو خوب صورت ڈیکوریشن پیس بھی جو کارنس پر پڑے تھے اسے نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ دل شکستہ سا کمرے سے باہر آیا۔ فرحی چائے بنا چکی تھی وہ اپنے کمرے میں چلے آئے تھے۔ اس کے کمرے میں بھی چیزیں الٹ پلٹ ہوئی پڑی تھیں۔ پتا نہیں کیا تھا...... کیا نہیں...... اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ چائے کا کپ لے کر فرحی کے سامنے بیٹھ گیا۔

''فرحی آج رات بہت بھاری ہے، اس گھر میں اماں اور ابا کے بغیر رہنا ابھی بہت مشکل لگے گا مجھے...... وقت لگے گا لیکن پھر ہولے، ہولے سب سیٹ ہو جائے گا۔ ہم ایک شرعی رشتے میں ضرور بندھ گئے ہیں فرحی لیکن ابھی ہم اپنی شادی شدہ زندگی کا آغاز نہیں کریں گے۔ میں اس کے لیے ذہنی طور پر خود کو تیار نہیں پاتا۔ اور پھر شاید اماں آجائیں۔'' اسے امید تھی کہ اماں ضرور مل جائیں گی۔

''اماں آگئیں تو پھر اماں تمہارے سارے ارمان پورے کریں گی۔ اماں کو بہت شوق تھا کہ کب میں پڑھائی سے فارغ ہوں کب جاب کروں اور وہ دھوم دھام سے میری شادی کریں۔''

وہ پوری رات انہوں نے جاگتے اور باتیں کرتے گزاری تھی۔ اماں کی باتیں...... ابا کی باتیں اور اپنی باتیں، جب وہ پہلی بار ملے تھے...... جب پہلی بار انہوں نے اپنے دل میں ایک دوسرے کے لیے محبت کا جذبہ محسوس کیا تھا۔ یوں ہی باتیں کرتے ہوئے رات بیت گئی تھی۔ فرحی کچن میں چائے بنانے گئی تو وہ بھی کچن کے دروازے کے پاس کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

''ناشتا کر کے میں کچھ دیر کے لیے باہر جاؤں گا۔ تم دروازہ بند کر کے سو جانا۔ شام کو دونوں جلیل خان سے ملنے جائیں گے۔''

فرحی نے چولھے پر چائے کا پانی رکھتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا تب ہی کسی نے صحن کا دروازہ بجایا۔ دھڑا دھڑ کوئی بری طرح دروازہ پیٹ رہا تھا۔

''اتنے سویرے کون آ گیا۔ کیا پتا اماں ہوں......'' اس نے تقریباً بھاگ کر دروازہ کھولا...... دونوں ماموں دروازہ کھلتے ہی دندناتے ہوئے اندر آ گئے تھے۔

''تمہیں جرأت کیسے ہوئی گھر کا تالا توڑنے اور اندر داخل ہونے کی؟'' یہ بڑے ماموں تھے۔

''یہ میرا گھر تھا اور میں اپنے گھر آیا ہوں۔'' اس نے بے حد تحمل سے کہا تھا۔ ''اور اپنے گھر آنے سے بھلا مجھے کون روک سکتا ہے؟''

''ہم...... ہم روکیں گے۔'' چھوٹے ماموں آگے بڑھے تھے۔ ''تمہارا گھر تھا...... اب نہیں ہے، یہ گھر آپا کے نام تھا۔ ہم نے اس کا سودا کر دیا ہے، جو تمہارا حصہ بنے گا تمہیں مل جائے گا۔ اپنا پتا دے جانا بھجوا دیں گے۔''

''سودا کر دیا ہے، کیسے کر سکتے ہیں آپ اس کا سودا......؟'' وہ زور سے چیخا تھا۔ ''میری ماں ابھی زندہ ہے اور میرے بغیر آپ کیسے کر سکتے ہیں اس کا سودا...... میں اماں کا وارث ہوں...... ان کا بیٹا ہوں۔'' وہ ہکا بکا سا صحن کے بیچوں بیچ کھڑا دونوں ماموؤں کو دیکھ رہا تھا۔

''زیادہ سبق نہ پڑھاؤ ہمیں...... تم سے زیادہ قانون جانتے ہیں ہم...... اپنا سامان اٹھاؤ اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔'' فرحی جو شور سن کر کچن سے باہر نکلی تھی سہمی ہوئی سی دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ بڑے ماموں برآمدے کی طرف بڑھے تو ان کی نظر فرحی پر پڑی۔

''تو اس کے لیے تالا توڑا ہے تم نے۔ عیاشیاں کرنے کے لیے یہاں آئے ہو۔ اس آوارہ لڑکی کے ساتھ۔''

''بس ماموں جان...... اس سے آگے ایک لفظ بھی مت کہیے گا۔ میری بیوی ہے یہ۔''

''اوہ تو یہ ہے وہ......'' چھوٹے ماموں فرحی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''جسے لے کر گھر سے بھاگے تھے اور اپنے باپ کی جان لے لی.. چور، ڈاکو، بدمعاش......'' انہوں نے آواز بلند کر لی تھی کھلے دروازے سے ایک دو پڑوسی اندر آ گئے تھے۔

''کیا ہوا میاں صاحب؟'' کسی نے پوچھا۔

''ارے یہ شریفوں کا محلہ ہے، چوروں، ڈاکوؤں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔''

''چور...... میں نہیں آپ ہیں۔'' اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ ''آپ نے میرے گھر سے اپنی بہن کے گھر سے زیور، روپیہ، پیسہ سب چوری کر لیا۔ ڈاکو ہیں آپ۔''

''بکواس کرتا ہے۔'' ماموں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔

''بے حیا...... ماں باپ کے قاتل، آوارہ......'' بڑے ماموں کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور وہ اسے مار رہے تھے۔ لاتیں، ٹھڈے، مکے اور وہ پٹ رہا تھا۔ ناک پر لگنے والے مکے سے اس کی نکسیر پھوٹ پڑی تھی لیکن اس

نے ماموں کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ شور وغل سن کر اور لوگ بھی صحن میں آ گئے تھے...... کوئی افسوس کر رہا تھا۔ کوئی ان کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ فرحی کچن کے دروازے سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''بس کیجیے میاں صاحب......'' کسی نے کہا تو بڑے ماموں نے انہیں مخاطب کیا۔

''بھائیو! کیا تم چاہتے ہو کہ محلے میں گندگی پھیلے......؟ وہ دیکھو!'' انہوں نے فرحی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ہے گندگی کی پوٹ......''

''نہیں، نہیں میاں صاحب......'' ہجوم سے مشترکہ آوازیں آئی تھیں۔

''نکال باہر کریں اسے۔''

''سن لیا تم نے نابنجار، خاندان کے منہ پر کالک مل دی...... سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہمیں...... بھائی صاحب زندہ ہوتے تو وہ بھی تمہیں گھر میں گھسنے نہیں دیتے۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور اس بے حیا لڑکی کے ساتھ دفعان ہو جاؤ۔'' انہوں نے اسے دھکا دیا تو وہ گر پڑا۔ چھوٹے ماموں نے اسے پاؤں سے ٹھوکر ماری۔ ناک سے پھر خون بہنے لگا تھا۔ فرحی کی قوتِ برداشت ختم ہو گئی تھی۔

''خدا کے لیے مت ماریں چھوڑ دیں۔'' وہ روتی ہوئی صحن میں آ گئی تھی اور گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

''ہم چلے جاتے ہیں، خدا کے لیے مت ماریں۔'' وہ ہاتھ جوڑنے لگی تھی۔

''ہم کہیں نہیں جائیں گے فرحی، یہ ہمارا اپنا گھر ہے۔'' اس نے دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا......'' تمسخر سے اسے دیکھتے ہوئے اب بڑے ماموں نے اسے ایک اور ٹھڈا مارا تھا۔

تب ہی فون کی آواز پر وہ چونکا اور پاکٹ سے اپنا سیل فون نکالا۔ اس کے رخسار گیلے ہو رہے تھے۔ آنکھیں نم تھیں ماضی کی یادیں ہمیشہ ہی اذیت دیتی تھیں اسے......اور آج تو وہ اس طرح کھو گیا تھا کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی کہ کب آنسو آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ بائیں ہاتھ کی پشت سے رخسار پونچھتے ہوئے دائیں ہاتھ سے اس نے سیل آن کیا۔

''یس بگ بابا......''

''کیسے ہو ثمر حیات......طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......آواز بھاری لگ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہوں سر، آپ کیسے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں تو ٹھیک ہوں مگر تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے، میرا تو خیال تھا عظام کے ساتھ تم نے خوب انجوائے کیا ہوگا۔''

''جی بہت انجوائے کیا......'' عظام بھی بہت خوش تھا۔

''پھر کیا پریشانی ہے؟'' اتنی دور سے بھی بگ بابا اسے محسوس کر رہے تھے۔

''نہیں بگ بابا...... یونہی سیمو وغیرہ کا انتظار کرتے ہوئے ماضی میں کھو گیا تھا۔''

''ہوں...... ایسے اذیت ناک ماضی کو بھول کیوں نہیں جاتے۔'' بگ بابا نے ہمیشہ کی طرح نصیحت کی۔

''کیسے بھولوں بگ بابا...... آپ بتائیں، سب خیریت تھی ناں...... آپ نے میری سیٹ کینسل کروادی تھی؟''

''ہاں بس اچانک ہی پروگرام تبدیل ہو گیا تھا۔ ویسے تمہارے بخیریت پہنچنے کا میسج کر دیا تھا عظام کو اور ایک بار وحید نے بھی فون پر بات کر لی تھی مختصری۔'' بگ بابا نے تفصیل بتائی۔

وحید کی آواز حیرت انگیز حد تک اس سے مشابہ تھی۔ وحید بھی بگ با کا ہی بندہ تھا۔ کالج میں آنے کے بعد جب پہلی بار عظام نے کہا تھا کہ پاپا آپ وہاں پہنچ کر کم از کم خیریت کا ایک فون ہی کر دیا کریں تو ہمیشہ کی طرح بگ با نے اس کا یہ مسئلہ حل کر دیا تھا۔ وحید بنکاک میں رہتا تھا اور ایک دو جملے ہی کہتا تھا کہ شک نہ ہو، ان دنوں وہ بگ با کے ساتھ ڈی ون میں رہ رہا تھا۔

''او کے پھر ملاقات پر باقی باتیں......'' بگ با نے فون بند کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ ممتاز خان۔'' اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔

''باس وہ سیمو اور بالی آ گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اٹھا تو ممتاز خان نے اس کا بریف کیس اٹھا لیا۔

''ممتاز خان، مجھے تمہیں کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے، سب سمجھتے ہو تم۔'' اس نے ممتاز خان کی طرف دیکھا۔

''جی باس......''

''میری واپسی ایک ہفتے تک ہو جائے گی۔ لیکن اس بار میں ڈی ون میں ہی قیام کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ عظام کو پتا چلے میں پاکستان میں ہی ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کبھی کسی کام سے گھر کا چکر لگائے تو دھیان رکھنا۔'' وہ ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے اسے سمجھا رہے تھے۔ ''اور ہاں وہ شخص...... وہی مقبول بٹ ہماری عدم موجودگی میں پھر تو نہیں آیا تھا؟''

ممتاز خان نے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر اگر کبھی وہ آئے تو اس کا فون نمبر لے لینا۔''

''مجھے یاد ہے باس، آپ نے پہلے بھی کہا تھا۔'' اس نے گیٹ کھولا۔ گیٹ کے باہر گاڑی کھڑی تھی...... بالی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ ممتاز خان کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ایمل وارڈ روب کھولے کھڑی تھی۔ پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے دو تین جوڑے نکالے اور سوچا پتا نہیں اب کتنے دن ٹھہرنا پڑے گا۔ ممی کہہ تو رہی تھیں کہ ہفتہ بھر تو رکنا ہی پڑے گا اور ہمدانی صاحب بھی تو کہہ رہے تھے کہ زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں تو میرا خیال ہے یہ جوڑے بھی رکھ ہی لوں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے بیگ میں رکھے بیگ کی زپ بند کی اور لاؤنج میں آ گئی۔ لاؤنج میں ارتفاع اور افنان دونوں ہی موجود تھے۔ افنان کے ہاتھوں میں اخبار تھا جبکہ ارتفاع ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

''ارفی بیٹا تم نے پیکنگ کر لی؟'' افنان کے پاس بیٹھتے ہوئے ایمل نے پوچھا۔

''میرا جانا کیا ضروری ہے؟'' اس نے ایمل کی طرف دیکھا۔

''کیوں، تم نہیں جانا چاہتیں کیا؟'' ایمل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''جی، میں نہیں جانا چاہتی۔ میری پڑھائی کا پہلے ہی کافی حرج ہو چکا ہے۔ ابھی تک کور نہیں کر پائی۔''

''لیکن آج شام کو ہم جائیں گے کل سنڈے ہے اور پرسوں تم افی اور پاپا کے ساتھ واپس آ جانا۔'' مجھے اگر کچھ رکنا پڑا تو میں رک جاؤں گی۔ بلکہ مجھے تو بہرحال رکنا ہی پڑے گا ممی کہہ رہی تھیں کہ کچھ دن لگ جائیں گے۔''

''لیکن میں وہاں جا کر کیا کروں گی یہ چالیسواں وغیرہ کوئی ضروری تو نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک ہے لیکن تم یہاں اکیلی رہ کر کیا کرو گی۔ تمہارے پاپا، میں، افنان سب ہی تو جا رہے ہیں۔''

''میں اکیلی کہاں ہوں گی نازو ہے، گیٹ پر چوکیدار ہے...... مجھے کیا ڈر ہو سکتا ہے؟'' افنان جو ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا اس نے اخبار ایک طرف رکھا اور بہن سے پوچھا۔

''تمہیں آخر مسئلہ کیا ہے ارفی؟''

''مجھے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

''کچھ تو ہے، بہرحال اپنی پیکنگ کر لو جا کر، ہم یہاں تمہیں اکیلے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔'' افنان کا لہجہ حتمی تھا۔

''کوئی زبردستی ہے کیا؟'' اس نے ایک غصیلی نظر افنان پر ڈالی۔ ہاتھ میں پکڑا ریموٹ صوفے پر پھینکا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

''افی یہ......'' ایمل نے پریشان سا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''ماما پلیز اس کا دماغ خراب ہو چکا ہے، آپ پریشان مت ہوں۔ پاپا نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے اسے۔'' اسے ارتفاع پر بہت غصہ تھا۔ اس روز وہ گھر آیا تو ارتفاع صوفے پر دونوں پاؤں رکھے لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی۔

''تم آج جلدی آ گئیں؟''

''ہاں میرا موڈ نہیں تھا پڑھنے کا پھر عالیہ بھی نہیں آئی تھی تو میں بھی آ گئی۔'' اس نے افنان کو بتایا۔

''عالیہ نہیں آئی تھی تو تم مجھے فون کر دیتیں تو میں پک کر لیتا تمہیں کیسے آئی ہو تم؟''

''میرے کلاس فیلوز عظام اور رواحہ وہ بھی آ رہے تھے ان کے ساتھ آ گئی۔''

''ارفی اس طرح اجنبی لوگوں سے لفٹ نہیں لیتے۔'' افنان کا انداز سمجھانے کا سا تھا۔

''وہ اجنبی نہیں تھے، میرے کلاس فیلو تھے۔'' ارتفاع کو افنان کی اس طرح نصیحت کرنا برا لگتا تھا۔

وہ ایک گہری سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بیک وقت اس کی نظر صوفے پر

پڑے لائٹر اور سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھرے ایش ٹرے پر پڑی تھی۔

''کیا وہ لوگ اندر آئے تھے؟'' اس نے لائٹر اٹھا لیا تھا۔

''نہیں......'' ارتفاع نے نفی میں سر ہلایا۔

''اور یہ لائٹر......؟'' اس نے ارتفاع کو لائٹر دکھایا۔

''ارے...... یہ تو ظفری کا ہے۔'' ارتفاع نے لائٹر لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''ظفری کا......لیکن یہ یہاں کیسے آگیا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔''کیا وہ یہاں آیا تھا؟''

ارتفاع نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا ارفی کہ وہ اچھا لڑکا نہیں ہے اور تم اسے گھر تک لے آئی ہو؟'' افنان کو افسوس ہوا تھا۔

''میں اسے گھر تک نہیں لائی۔'' ارتفاع نے ناگواری سے اسے دیکھا۔''وہ خود آیا تھا نانا کا افسوس کرنے، عالیہ نے اسے بتایا تھا کہ میں آگئی ہوں اور جب میں اسے یونیورسٹی میں نہ ملی تو گھر چلا آیا افسوس کرنے، اب اس بیچارے کو کیا پتا تھا کہ وہ میرے نانا نہیں تھے، تمہارے نانا تھے۔''

''تمہارے ذہن سے یہ خناس نہیں نکلا...... یوں کرو اپنا ڈی این اے کروالو پتا چل جائے گا۔'' افنان نے چڑ کر کہا تو ارتفاع کے لبوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور اس نے اس کی بات کو ذرا اہمیت نہیں دی تھی۔

''تصدیق تو وہاں کی جاتی ہے افنان بابر جہاں شک ہو...... اور یہاں تو شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔'' افنان نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا تھا۔ اس سے کچھ کہنا فضول تھا...... جو بات اس کے ذہن میں بیٹھ جاتی تھی وہ مشکل سے ہی نکلتی تھی...... اور یہ بات صرف پاپا ہی اسے سمجھا سکتے تھے۔ لیکن ظفری...... اس نے ایک بار پھر اسے ظفری سے دور رہنے کی تاکید کی تھی لیکن ارتفاع نے ذرا پروا نہیں کی تھی۔ تین دن پہلے ہی اس نے ارتفاع، عالیہ اور ظفری کو کیفے اروما سے نکلتے دیکھا تھا اور اس کے پوچھنے پر اس نے بہت رُوڈلی جواب دیا تھا۔

''عالیہ میری فرینڈ ہے، اس نے مجھے ٹریٹ دی تھی اب میں اسے منع تو نہیں کر سکتی تھی کہ فلاں بندے کو مت بلانا...... فار گاڈ سیک انی میری فکر کرنا چھوڑ دو، جس طرح میں تمہارے معاملات میں انٹر فیئر نہیں کرتی تم بھی مت کیا کرو۔'' تین دن سے وہ ارتفاع سے بات نہیں کر رہا تھا۔ اور آج......

''انی......'' ایمل نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''بیٹا اگر وہ نہیں جانا چاہتی تو تم بھی رک جاؤ۔ میں اور تمہارے پاپا چلے جاتے ہیں۔''

''مما پلیز ٹینشن مت لیں، وہ ہمارے ساتھ ہی جائے گی اور اس بار ہم نانو کو ساتھ ہی کیوں نہ لے آئیں۔ نانا جان کے بعد تو وہ وہاں بہت اکیلی اور تنہا ہوگئی ہوں گی۔'' افنان نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا تو ایمل نے اسے بتایا۔

''وہ عدت وہاں ہی گزارنا چاہتی ہیں اور ویسے بھی وہاں ابھی بزنس وغیرہ کے کافی مسائل ہیں، ہمدانی صاحب کی بھی رائے تھی کہ ان کا یہاں رہنا ضروری ہے یوں بھی تمہارے پاپا نے اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہاں سے بزنس وائنڈ اپ کر کے لاہور ہی شفٹ ہو جائیں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' افنان خوش ہوا۔

''لیکن اس میں بہرحال کچھ وقت لگے گا، تب تک ارفی کی تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی۔ تم مائیگریشن کروا لینا یا پھر اگر یہاں ہی سے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہو تو ہاسٹل میں بھی رہ سکتے ہو۔'' تب ہی بابر لاؤنج میں داخل ہوا۔ ہاتھ میں پکڑا بریف کیس اس نے صوفے پر رکھا اور ایمل کی طرف دیکھا۔

''سیٹس بک کروادی ہیں سات بجے کی فلائٹ سے نکلیں گے۔''

''لیکن آپ کی لاڈلی نے جانے سے انکار کردیا ہے۔'' افنان نے پھر اخبار اٹھالیا تھا۔

''یار تم بھی میرے لاڈلے ہو، میرے اصل وارث اور جانشین تو تم ہی ہو۔'' بابر ہنسا۔ ''بہنوں سے جیلس نہیں ہوتے جانو...... یہ تو چار دن کی مہمان ہوتی ہیں۔ آنگن کی چڑیاں، کوئی پل میں آنگن خالی کر جاتی ہیں۔''

ایمل کی آنکھیں نم ہوئیں اسے بابر پر فخر محسوس ہوا وہ یقیناً ایک اچھا اور محبت کرنے والا باپ تھا۔ شادی سے لے کر اب تک وہ کبھی بابر سے بدگمان نہیں ہوئی تھی۔ پہلی بار وہ ہمدانی صاحب اور ممی کی باتوں پر الجھی تھی۔ ممی نے کچھ نہیں بتایا تھا نہ ہی ہمدانی صاحب نے کھل کر کوئی بات کی تھی لیکن ہمدانی صاحب نے اسے بار، بار تاکید کی تھی کہ بزنس اور پراپرٹی کے سلسلے میں جو گفتگو بھی ان تینوں کے درمیان ہو رہی ہے اس کا ذکر وہ بابر سے نہیں کرے گی۔ ان کی باتوں سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ ڈیڈی کو بابر سے یقیناً کچھ شکایات تھیں اور وہ اس سے ناراض تھے تب ہی بابر بھی جب لاہور جاتا تھا تو اُدھر کم ہی جاتا تھا۔ یقیناً ڈیڈی کو کوئی غلط فہمی تھی...... بابر ایک اچھا شوہر اور اچھا باپ تھا۔ اس بار وہ ممی سے ضرور کھل کر بات کرے گی۔.... کیونکہ بابر سے معاملات چھپانے پر وہ اندر سے گلٹی ہو رہی تھی۔

''کھانا لگواؤں؟'' اپنی سوچوں کو جھٹک کر اس نے بابر سے پوچھا۔

''نہیں، کھانا تو میں نے آفس میں کھالیا تھا، تم چائے بنواؤ میں چینج کر کے آتا ہوں۔ اور ہاں ممی کو بھی فون کر دینا آنے کا وہ ائرپورٹ پر گاڑی بھجوادیں گی۔'' اس نے جھک کر بریف کیس اٹھایا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ اس کے سیل فون کی بیل ہوئی، بریف کیس بیڈ پر رکھ کر اس نے فون نکالا۔ اسکرین پر عنبرین کا نام چمک رہا تھا۔

''کہاں ہو بابر......؟ تم نے آج آنے کو کہا تھا۔ انتظار کر رہی ہوں۔'' عنبرین نے اس کا ہیلو سنتے ہی بے تابی و بے قراری سے کہا۔

''ابھی کراچی میں ہی ہوں۔ وہاں آکر خود ہی رابطہ کرلوں گا۔ فون مت کرنا اب....'' اس نے فون آف کر کے بیڈ پر پھینکا۔ ''یہ عنبرین بھی اب دردِسر ہی بنتی جا رہی ہے۔'' اس نے دانت پیسے۔

اس نے کبھی عنبرین سے شادی کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ وہ تو بس اس کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔ ایم بی اے کے بعد اس نے ناصر نوید کے مشورے پر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرلی تھی۔ حالانکہ کرنل حامد کی خواہش تھی کہ وہ ان کے ساتھ ان کا بزنس سنبھالنے میں ان کی مدد کرے۔ لیکن اسے کرنل حامد کے سامنے یہ تاثر دینا تھا کہ اسے ان کے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ کوئی لالچ ہے۔ اس وقت مصلحت کا یہی تقاضا تھا۔ بعد میں ایمل سے شادی کے بعد تو سب کچھ اسی کا تھا۔ عنبرین کو ان کے آفس میں جاب کرتے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے لیکن دونوں میں اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ کئی بار اکٹھے لنچ کرنے بھی جاچکے تھے اور اس روز بھی وہ عنبرین کے ساتھ لنچ کے لیے نکلا تھا اور راستے میں عنبرین پہلے آئس کریم کھانے کے لیے مچلی تھی...... وہ کھانے پینے کی خاصی شوقین تھی اور آئس کریم پر تو مرتی تھی۔ آئس کریم کھا کر وہ باہر نکلے تو عنبرین کو اپنی کوئی واقف کار خاتون مل گئی، وہ اس سے سلام دعا کرنے لگی۔ تو وہ پارکنگ میں اپنی کار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا جب اس نے ایمل کو بائیک سے اتر کر پارلر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اس کے ہونٹ سکڑے تھے اور پیشانی پر لکیریں سی پڑ گئی تھیں۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔ وہ اسے آواز دینا چاہتا تھا لیکن پھر رک گیا۔ وہ دونوں گلاس ڈور کھول کر اندر چلے گئے تھے۔

''یہ ایمل کے ساتھ کون تھا۔شاید اس کا کوئی کلاس فیلو......لیکن جس طرح ایمل نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا وہ کلاس فیلو سے زیادہ ہی کچھ لگ رہا تھا...... پرسنیلٹی بھی زبردست تھی۔ وہ ہونٹ بھینچے سوچ میں ڈوبا کھڑا تھا جب عنبرین نے آکر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''کیا سوچ رہے ہو بابی؟''

''یار کیا سوچنا بس تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ ویسے یہ محترمہ کون تھیں؟''

''کالج میں میری کلاس فیلو تھی۔ کافی عرصے بعد ملی ہے، بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آئی ہوں، چلیں اب......''

''ہاں چلو......''

بابر سوچ میں ڈوبا تھا۔ ابھی تک اس کا ذہن ایمل اور اس کے ساتھ جوڑ کا تھا اس میں الجھا ہوا تھا۔

''تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے عنبرین سے پوچھا تو عنبرین نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''تم نے لنچ کا وعدہ کیا تھا اور اب آئس کریم پر ہی ٹرخا دیا ہے۔''

''یار لنچ پھر کبھی سہی، آج مجھے ابو کی طرف جانا تھا۔ دوبار ان کی کال آچکی ہے۔'' اس نے گاڑی پارکنگ سے باہر نکالی۔

''خیریت تھی؟'' عنبرین نے پوچھا تھا۔

''ہاں خیریت ہی ہے...... بس کچھ کاروباری معاملات ڈسکس کرنے ہیں۔''

کب واپس آؤ گے؟'' عنبرین کو پتا تھا کہ اس کے ابو گوجرانوالہ میں ہوتے ہیں۔

''رات کو آجاؤں گا۔ تم بتاؤ تمہیں کہاں ڈراپ کروں۔ گھر جاؤ گی یا آفس چھوڑ دوں؟''

''گھر ہی جاؤں گی، ہاف ڈے کی لیولی تھی میں نے...... مجھے میرے اسٹاپ پر اتار دینا۔'' اسے پتا تھا کہ عنبرین کا موڈ آف ہے لیکن اسے اس وقت عنبرین کے موڈ کی پروا نہیں تھی۔ اس کا ذہن ایمل میں الجھا ہوا تھا اور وہ ہونٹ بھینچے خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ عنبرین کو اس کے گھر سے نزدیک ترین اسٹاپ پر اتار کر اس نے گوجرانوالہ کا رخ کیا تھا اور دو گھنٹے بعد ناصر نوید کے آفس میں تھا۔ کچھ دن پہلے ہی انہوں نے پراپرٹی کا کام شروع کیا تھا۔ آفس وغیرہ سیٹ کرنے میں بابر نے ہی ان کی مدد کی تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں کافی رقم تھی۔ ممی کے علاوہ کرنل حامد بھی اسے کھلے ہاتھ سے دیتے تھے۔ یہ نئی گاڑی بھی کچھ دن پہلے ہی کرنل حامد نے اسے گفٹ کی تھی۔

''خیریت ہے اس وقت یہاں کیسے آئے ہو؟'' ناصر نوید اسے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔

''مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے ابو......''

''کیا بات ہے یار...... بیٹھ جاؤ اور اطمینان سے بتاؤ۔''

''مجھے آپ یہ بتائیں کہ آپ کی اور مما کی کوئی بات ہوئی ہے انکل حامد سے میرے اور ایمل کے رشتے سے متعلق؟'' اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ وہ فرحانہ کو ممی کہتا تھا لیکن کرنل صاحب کو اکثر انکل کہہ دیتا تھا۔

''نہیں ابھی تو باضابطہ طور پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ ایمل کی پڑھائی ختم ہونے کا انتظار ہے تمہاری مما کو...... ویسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دونوں بہنوں نے آپس میں طے کر رکھا ہے۔'' ناصر نوید نے اطمینان سے کہا۔

''آپس میں بات کرنے سے کیا ہوتا ہے ابو، آپ اور مما جا کر باضابطہ طور پر رشتے کی بات کریں۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

''کیوں کوئی خاص بات ہے کیا؟'' ناصر نوید نے بغور اسے دیکھا تھا۔

''ابو میرا خیال ہے ایمل کسی اور کو پسند کرتی ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''اگر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے تو ظاہر ہے آپ جو چاہ رہے ہیں وہ نہیں ہو سکتا۔''

''اگر وہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے تو مجھے افسوس ہے تم پر...... ایک گھر میں رہ کر بھی تم اسے متاثر نہیں کر سکے۔ یوں تو ہر وقت لڑکیوں کو لیے گھومتے پھرتے ہو۔'' ناصر نوید اس سے اتنے بھی بے خبر نہیں تھے۔ لیکن بابر کو ان کی بات پسند نہیں آئی تھی۔ تاہم وہ خاموش رہا تھا۔

''دیکھو بابر۔'' اسے خاموش دیکھ کر ناصر نے سمجھایا تھا۔ ''تم شرعاً یا قانوناً کرنل صاحب کی جائداد میں ایک دھیلے کے بھی حقدار نہیں ہو، ہو سکتا ہے وہ تمہیں لے پالک بیٹا ہونے کی وجہ سے کچھ تھوڑا بہت دے دیں۔ ایمل اکلوتی بیٹی ہے ان کی۔ نہ کوئی بہن، بھائی ہے کرنل صاحب کا، نہ کوئی بھتیجا، بھانجا...... اربوں کی جائداد کی وارث ہے ایمل اور تم صرف اسی صورت میں اس جائداد کے مالک بن سکتے ہو جب تمہاری شادی ایمل سے ہو۔''

''تو آپ پھر باضابطہ طور پر انکل حامد سے رشتے کی بات کریں۔'' بابر تھوڑا سا بے چین ہوا تھا۔ سات سال کی عمر سے وہ جس لگژری زندگی کا عادی ہو چکا تھا ایمل سے شادی نہ ہونے کی صورت میں یہ چھن بھی سکتی تھی۔ ایمل اسے بچپن سے ہی پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ بات وہ جانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ فرحانہ کی توجہ بٹ جانے کی وجہ سے یہ نیچرل تھا لیکن وہ اب بھی اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھی۔ اس کی وجہ غالباً وہی لڑکا ہوگا۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے؟'' ناصر نوید نے یقین دہانی چاہی تھی۔

''یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج پہلی بار ہی میں نے اسے اس لڑکے کے ساتھ دیکھا ہے لیکن جس طرح ایمل نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما تو......''

''او کے، کل کسی وقت میں اور تمہاری ماما آئیں گے۔ کرنل صاحب سے بات کرنے اور مجھے یقین ہے کہ فرحانہ اور کرنل صاحب جس طرح تم سے محبت کرتے ہیں اور تمہاری تعریف کرتے ہیں وہ انکار نہیں کریں گے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن انکل، ایمل کی کوئی بات نہیں ٹالتے اگر ایمل نے انکار کر دیا اور انکل سے اس لڑکے کی بات کی تو انکل کبھی اس کی بات نہیں ٹالیں گے۔'' وہ اب بھی پریشان تھا۔

''دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے، تمہارا باپ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلتا...... میرا خیال ہے تم نے لنچ بھی نہیں کیا ہوگا۔ میں نے بھی نہیں کیا ابھی تک چلو باہر چل کر کچھ کھاتے پیتے ہیں۔'' ناصر نوید اٹھے تو وہ بھی ان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

ایمل کی طرف اسے ناصر نوید نے متوجہ کیا تھا...... اور وہ دل ہی دل میں ایمل کو اپنا سمجھنے لگا تھا۔ لیکن اب...... اسے لگا تھا جیسے ایمل کے لیے اس کے دل میں کوئی جذبہ نہیں رہا۔ وہ ایسی لڑکی کو کیسے اپنے دل میں جگہ دے سکتا تھا جو کسی اور کے ساتھ انوالو ہو...... لیکن وہ اربوں کی جائداد سے دستبردار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ شادی اسے بہر حال ایمل سے ہی کرنا تھی اور وہ اس میں کامیاب رہتا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر وہ واش روم کی طرف بڑھا اور پھر کچھ سوچ کر کمرے سے باہر نکلا۔

''پہلے ارتی سے بات کرلوں۔'' اس کا جانا ضروری تھا اس نے ذہن میں جو پلاننگ کر رکھی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ ارتفاع ان کے ساتھ ہی لاہور جائے۔ ارتفاع کے کمرے کے پاس پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔

ارتقاع فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

''او کے ظفری پھر بات ہوگی۔'' ارتقاع نے فون بند کر کے دروازے کی طرف دیکھا'' آجائیں۔'' اور اندر داخل ہونے سے پہلے بابر نے ظفری کا نام سنا تو اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کیسی ہو میری گڑیا؟''

''ٹھیک ہوں پاپا۔'' وہ مسکرائی۔

''اور کیا ہو رہا تھا؟''

''کچھ نہیں فون پر بات کر رہی تھی۔''

''میں نے سنا ہے تم لاہور نہیں جا رہی ہو۔'' وہ اصل بات کی طرف آیا۔

''جی پاپا، میرا موڈ نہیں ہے اور میں کیا کروں گی وہاں جا کر۔''

''تمہارے نانا ابو کا چالیسواں ہے، تمہیں بھی اپنی نانو کے پاس جانا چاہیے۔''

''آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میں جان چکی ہوں پاپا کہ وہ میرے نانا ابو نہیں تھے اور نہ ہی وہ میری نانو ہیں اور مجھے ان کی موت کا کوئی دکھ بھی نہیں ہے۔'' بابر کی مسکراہٹ گہری ہوئی لیکن اس نے اسے ڈپٹا۔

''فضول باتیں مت کرو ارفی، تمہاری نانو کیا سوچیں گی؟''

''انہوں نے بھلا کیا سوچنا ہے پاپا پھر اُن سے کیا رشتہ ہے؟ مجھے نہیں جانا۔'' وہ ضدی تھی تو بابر نوید بھی اس کا باپ تھا...... اسے کیسے ہینڈل کرنا ہے جانتا تھا۔

''اپنے پاپا کی بات بھی نہیں مانو گی ارفی؟''

''میں صرف آپ کی بات مان رہی ہوں پاپا ورنہ میں حقیقت جانتی ہوں۔''

بابر نوید کی کسی بات سے وہ انکار کر ہی نہیں سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے پھر تم جلدی سے اپنی پیکنگ کرلو۔'' اس نے اس کا سر تھپتھپایا۔

''آپ افنان کو سمجھائیں پاپا، خواہ مخواہ رعب ڈالتا ہے مجھ پر۔'' اسے بھی افنان کی شکایت کا موقع ملا تھا۔ وہ پاپا کی ایک بات مان کر دس اپنی بھی منوالیتی تھی۔

''ارے بھئی کیا رعب ڈال دیا اس نے میری بیٹی پر......'' اس نے مسکرا کر ارفی کی طرف دیکھا۔

''بس یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، اس سے نہ ملو۔ فلاں جگہ نہ جاؤ، ہر وقت بڑا بننے کا شوق ہے اسے۔ میرے دوستوں پر اعتراض کرتا ہے، ظفری اچھا لڑکا نہیں ہے، عالیہ، بہت ماڈ ہے......'' وہ روانی میں کہہ گئی تھی۔

''ظفری......؟'' بابر نوید نے بغور اسے دیکھا۔'' وہی لڑکا نا، جس نے اپنے فارم پر کوئی پارٹی رکھی تھی۔''

''جی پاپا، اچھا شریف لڑکا ہے، عزت کرتا ہے افی کو تو خواہ مخواہ ہی اس سے چڑ ہے۔''

''ہوں......'' بابر لمحہ بھر اسے دیکھتا رہا۔ ''تم پسند کرتی ہو اسے۔ تو بے فکر رہو۔ تمہاری زندگی کا کوئی بھی فیصلہ تمہاری مرضی کے بغیر نہیں ہوگا۔ لاہور سے واپس آکر ملوانا ظفری سے۔''

''نہیں......'' وہ سٹپٹائی تھی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں...... ہم صرف دوست ہیں۔'' یک دم ہی تصور میں رواحہ آیا تھا۔ گہری نظروں سے اسے تکتا...... اس نے سر جھٹکا اور مسکرائی۔

''پاپا تو ویک اینڈ پر ظفری نے اپنے فارم پر پھر پارٹی رکھی ہے، سب جائیں گے پلیز پاپا مجھے بھی جانا ہے۔''

''او کے...... چلی جانا۔''

''اور وہ جو آپ کے صاحبزادے ٹانگ اڑائیں گے۔'' اس نے منہ بنایا۔

''نہیں اڑانے دوں گا ٹانگ۔'' وہ ہنسا۔

''ہم باپ بیٹی کچھ نہ کچھ پلان کریں گے، چلو تم تیاری کرو مجھے بھی چینج کرنا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور بابر نوید مطمئن سا ہو کر باہر نکلا کہ ارتقاع کو ساتھ لے جانا ضروری تھا۔ کرنل حامد نے اپنی زندگی میں کچھ فیصلے کیے تھے یہ بات اس کے علم میں تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا فیصلے کیے ہیں۔ کچھ عرصے سے وہ نہ جانے کس بات پر اس سے خفا تھے۔ وہ جب بھی جاتا تھا بہت رکھائی سے بات کرتے تھے حالانکہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ اسے جب بھی جتنی رقم کی ضرورت پڑی تھی اپنے بزنس کے لیے انہوں نے فراخ دلی سے دی تھی۔ ابھی وہ سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ کیا بات ہے کہ وہ دنیا سے ہی رخصت ہو گئے تھے۔ اس روز ممی کے کہنے پر وہ ہمدانی صاحب سے ملنے گیا تھا لیکن ہمدانی صاحب کا رویہ بھی بڑا روکھا تھا، وہ گھنٹا بھر ان کے پاس بیٹھا رہا تھا لیکن انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے وہ کچھ اندازہ کر پاتا۔ تھوڑی سن گن اسے ملی تھی کہ کرنل حامد نے تین ماہ پیشتر وکیل کو بلا کر اپنی جائداد کے سلسلے میں کوئی وصیت تیار کروائی تھی لیکن کیا وصیت تھی، وہ نہیں جانتا تھا اور ہمدانی صاحب بھی اجنبی سے بنے بیٹھے تھے حالانکہ اس نے کہا بھی تھا کہ ممی نے اسے بھیجا ہے کہ جو کچھ بھی ڈسکشن کرنی ہے اس سے کرلیں لیکن ہمدانی صاحب نے جواب دیا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹا جو تم سے ڈسکس کی جائے۔ ان سے جو بات کرنی ہے وہ کسی تیسرے فرد سے نہیں کی جا سکتی۔''

''میں تیسرا فرد نہیں ہوں ہمدانی صاحب، ان کا داماد ہی نہیں بیٹا بھی ہوں۔''

''سوری بیٹا اگر آپ کو برا لگا ہو لیکن مجبوری ہے میری بھی۔'' اور وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا ان کے آفس سے آ گیا تھا۔

''آپ سے بھی سمجھ لوں گا ہمدانی صاحب ایک دفعہ سب کچھ سنبھال لوں میں پھر سب سے پہلے آپ کا ہی پتا صاف کروں گا۔'' زیر لب کہتے ہوئے اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو سیل فون کی بیل ہو رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر فون اٹھایا لیکن بیل بند ہو گئی تھی۔ اس نے دیکھا وسیم کا نمبر تھا۔ دو تین مس کالز بھی تھیں اس کی۔

''اوہ۔'' اس نے فوراً ہی کال بیک کی۔

''کیا بات ہے وسو؟'' وسیم جس ایریے میں رہتا تھا وہاں سب اسے وسو ہی کہہ کر بلاتے تھے۔ بابر اپنے سارے غیر قانونی کام اسی سے کرواتا تھا۔

''کچھ نہیں صاحب، میں گیا تھا اُدھر اس کا چبارہ تو خالی پڑا ہے۔ باہر یہ موٹا تالا لٹک رہا تھا۔''

''کہاں گئی ہے پتا کرو؟''

''کوشش کر رہا ہوں صاحب، چل جائے گا پتا۔''

''کوشش نہیں وسو مجھے اس کا پتا چاہیے ہر صورت میں۔''

''کہاں جانا ہے اس نے...... کہیں نکلی ہو گی کسی چکر میں مڑ کر تو ادھر ہی آنا ہے۔'' وسیم کا انداز بے پروائی لیے ہوئے تھا۔

''میں اس کے مڑنے کا انتظار نہیں کر سکتا وسو، مجھے جلد از جلد اس کا ٹھکانا معلوم کر کے بتاؤ۔ آخر اپنا جما جمایا کاروبار چھوڑ کر کہاں جا سکتی ہے؟''

''صاحب وہ بھی معلوم ہو جائے گا لیکن آپ کو کیا کام پڑ گیا اس سے؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک امانت تھی اس کی میرے پاس وہی لوٹانی ہے۔'' بابر کے لبوں پر معنی خیز سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔



مجھ سے ملیے

میں ہوں نرگس نسیم جو پہلے صابہ موہڑہ گاؤں کے اضافے کے ساتھ لکھا کرتی تھی۔ مگر اب چکوال شہر میں رہائش ہے۔ میرا تعلق غازیوں اور شہیدوں کی سرزمین ضلع چکوال کے ایک گاؤں صابہ موہڑہ سے ہے۔ ماشاءاللہ سے شادی شدہ اور چھ پیارے سے خوب صورت سے بچوں کی مما جان ہوں۔ مابدولت نے 11,12,78 کو اس دنیا میں دسمبر کی سخت سردی میں آکر اپنے ماں، باپ کو بھی ٹھنڈی آہیں بھرنے پر مجبور کردیا کہ پاپا جی نے بیٹا نہ ہونے کی بنا پر اور مجھے دیکھے بنا فوراً دوسری شادی رچالی۔ میں بیک وقت نرم مزاج بھی ہوں اور پتھر دل بھی...... جس کو چاہتی ہوں اس پر جان بھی دینے کو تیار اور جو ایک بار دل سے اتر جائے تو اس کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں۔ جھوٹ سے سخت نفرت، پسندیدہ رسالے اخبارات، پاکیزہ، جاسوسی، سرگزشت، اخبار، چکوال نامہ، دھن کون مائز، پسندیدہ رائٹر، انجم آپی، عمیرہ احمد، رخسانہ نگار، ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، اقبال بانو، نگہت سیما اور اتنی پسند ہیں کہ بس...... پسندیدہ کھانا۔ چاول، پسندیدہ کلر۔ پنک۔ پسندیدہ پھول اور پھل۔ سرخ گلاب اور آم۔ پسندیدہ شخصیت۔ حضرت محمدؐ۔ پسندیدہ کتاب۔ دینی کتب کے بعد جلترنگ۔ پسندیدہ شاعر۔ پروین شاکر، محسن نقوی، عنبرین حسیب، شگفتہ شفیق۔ یہ تھا میرا مختصر ادھورا سا تعارف...... ان نئی بہنوں کے لیے جو میرے بعد پاکیزہ میں آئیں اور چھا گئیں انہیں سلام اللہ ایسے ہی ہمارے پیارے پاکیزہ اور تمام اسٹاف کو ترقی کے راستے پر گامزن رکھے، آمین۔

تحریر: نرگس نسیم، چکوال

''کیسی امانت صاحب؟'' وسیم نے فری ہونے کی کوشش کی۔

''اپنے کام سے کام رکھا کرو وسیم، ہزار بار تمہیں کہا ہے جو کہا جائے وہ کرو۔ زیادہ کرید کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔'' بابر نے اسے ڈپٹا۔

''جی صاحب!''

''اب تب ہی فون کرنا جب اس کا پتا معلوم ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے صاحب لیکن وہ کچھ رقم کی ضرورت تھی، بیوی بیمار ہے۔''

''کون سی بیوی، وہ جو پچھلے مہینے مرگئی تھی؟'' بابر ہنسا۔

''نہیں صاحب...... یہ...... یہ دوسری ہے۔''

''ٹھیک ہے، کل لاہور آرہا ہوں دفتر آجانا۔'' بابر نے فون آف کرکے پھر اسے بیڈ پر پھینکا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

وہ کئی دنوں سے مونا کو تلاش کررہے تھے لیکن اتنے بڑے شہر کراچی میں کسی کو تلاش کرنا کوئی آسان نہ تھا اور وہ بھی ایک ایسی شخصیت کو تلاش کرنا جو سگنل پر چند لمحوں کے لیے نظر آئی ہو۔ کاش کچھ دیر پہلے اُن کی نظر اس پر پڑ جاتی۔ وہ اسے بلا لیتے لیکن وہ تو پلک جھپکتے میں غائب ہوگئی تھی اور اب وہ اسے تلاشتے پھر رہے تھے۔ ضروری تو نہیں تھا کہ وہ دوبارہ نظر آجاتی۔ ہوسکتا ہے وہ چند دنوں کے لیے کراچی آئی ہو اور اب تک واپس بھی چلی گئی ہو۔ چند سال پہلے جب وہ لاہور گئے تھے تو انہیں پتا چلا تھا کہ وہ لوگ گھر فروخت کرکے امریکا شفٹ ہوگئے ہیں۔ اس گھر میں کوئی اور لوگ رہ رہے تھے۔ اس گھر سے کتنی یادیں وابستہ تھیں۔ اس گھر میں بابا جان کے ساتھ انہوں نے اپنی زندگی کا

خوب صورت ترین وقت گزارا تھا۔ اسی گھر میں چندا سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہاں ہی اسی گھر میں چندا دلہن بن کر آئی تھی اور پھر اسی گھر میں...... بابا جان کا جنازہ بھی اسی گھر سے اٹھا تھا اور وہ جو اتنے سالوں بعد صرف مونا اور اس کی فیملی سے ملنے گئے تھے دل شکستہ سے لوٹ آئے تھے۔ مونا اور اس کی فیملی نے دکھ کے لمحوں میں ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ ماضی سے ان کے رابطے کا وہ واحد ذریعہ تھے اور اب مونا نظر بھی آئی تھی تو... کتنے دنوں سے وہ بے مقصد ہی کراچی کی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے پھر رہے تھے اس وقت بھی شاہراہ فیصل پر ادھر اُدھر دیکھتے گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ آخر وہ کیوں اسے تلاش کر رہے تھے کیا جاننا چاہتے تھے، کیا معلوم کرنا تھا انہیں وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔

مونا جو اُن کی محبتوں کی امین تھی، رازداں تھی۔ شاید وہ اس کے پاس بیٹھ کر رونا چاہتے تھے۔ وہ آنسو جو ان بیتے سالوں میں اندر ہی منجمد ہوگئے تھے پگھل جانے کو بے تاب تھے۔ شاید وہ کھل کر رونا چاہتے تھے۔ رواحہ کی خاطر جن آنسوؤں پر بند باندھ رکھا تھا انہیں لگا تھا جیسے وہ بند مونا کی ایک جھلک دیکھ کر ہی ٹوٹنا چاہتا ہو۔ شاید وہ مونا کو بتانا چاہتے تھے کہ چندا کے بعد ان بیتے سالوں میں انہوں نے زندگی کو کیسے بتایا۔ اگر جو رواحہ نہ ہوتا تو...... انہوں نے ایک گہری سانس لے کر ونڈ اسکرین کی طرف دیکھا تو جیسے ونڈ اسکرین پر وہ منظر ابھر آیا۔ وہ چندا سے وعدہ کر کے گھر آئے تھے کہ آج وہ بابا جان سے ضرور بات کریں گے اور بہت جلد بابا جان کو ان کے گھر بھیجیں گے اور ونڈ اسکرین پر جیسے وہ منظر زندہ ہوگیا تھا۔ بابا جان اپنے بیڈ پر نیم دراز کچھ پڑھ رہے تھے۔

''بابا جان!'' ان کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھتے ہوئے۔ انہوں نے آہستگی سے بلایا۔

''ہوں، کیا بات ہے؟'' انہوں نے کتاب سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔

''بابا جان، وہ میں چندا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''چندا اچھی بچی ہے لیکن تمہیں ایسی جلدی کیا ہے؟'' وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ''پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو ابھی تم اس قابل نہیں ہوئے بیٹا کہ شادی کی ذمے داریاں سنبھال سکو۔ بیٹی کا رشتہ دیکھتے ہوئے بہت ساری باتیں دیکھی جاتی ہیں۔ کم از کم اپنی تعلیم مکمل کر کے پہلے کوئی ڈھنگ کی جاب تو کرلو۔'' وہ سنجیدہ تھے۔

''جلدی مجھے نہیں ہے بابا جان، چندا کو ہے۔'' وہ بابا جان سے کوئی بھی بات نہیں چھپا سکتے تھے۔ ''وہ چاہتی ہے کہ ابھی صرف رشتے کی بات ہوجائے۔ شادی ظاہر ہے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہی ہوگی۔''

''چندا کو کیوں اتنی جلدی ہے؟'' انہوں نے عینک کو نیچے کرتے ہوئے شیشوں کے اوپر سے اسے دیکھا۔

''وہ...... دراصل گھر میں اس کے رشتے کی بات چل رہی ہے اور وہ چاہتی ہے اس سے پہلے کہ اس کے ڈیڈی ہاں کردیں آپ......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''کس سے بات چل رہی ہے، کیا کرتا ہے وہ لڑکا؟''

''اس کا کوئی کزن ہے باقی تفصیل میں نے نہیں پوچھی۔''

''تو......'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ ''اس صورتِ حال میں جبکہ وہ اس کا کزن ہے تو یقیناً ان کا اسٹینس بھی ایک ہوگا۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارا پرپوزل قبول کرلیا جائے گا؟''

''نہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''لیکن چندا مجھے...... میرا مطلب ہے چندا بات کرلے گی اپنے ممی، ڈیڈی سے۔''

''تو ٹھیک ہے پھر چندا سے کہو کہ وہ بات کرلے اور ہمیں بتادے کہ کب جانا ہے۔ میں تمہاری پھپھو کو گاؤں سے بلوالوں گا تو چلے جائیں گے۔'' انہوں نے عینک ناک پر درست کرتے ہوئے پھر کتاب اٹھالی تھی۔

''تھینک یو بابا جان۔''

''تھینک یو کی ضرورت نہیں ہے میری جان چندا مجھے بھی بہت پسند ہے۔ بہت پیاری بچی ہے لیکن جیسا کہ تم نے بتایا کہ وہ بہت بڑے لوگ ہیں، کیا وہ ہمارے چھوٹے سے گھر میں ایڈجسٹ کرلے گی؟'' بابا جان نے اس کا بازو تھپتھپایا۔

''میں نے یہ بات پوچھی تھی چندا سے لیکن اسے اس سے فرق نہیں پڑتا، وہ کہتی ہے وہ ہر حال میں خوش رہے گی۔'' وہ بات کرتے ہوئے جھجکے تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''انسان محبت میں ایسے ہی وعدے کرتا ہے بیٹا جی۔'' دونوں میں بے تکلفی ہونے کے باوجود وہ جھجک گئے تھے۔

''آپ کو ڈسٹرب کیا بابا جان، پلیز آپ پڑھیں۔ میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔''

''ڈسٹرب تو آپ کر چکے صاحب زادے۔'' وہ واقعی ڈسٹرب ہوگئے تھے بہت بعد میں ایک دن انہوں نے بتایا تھا کہ اپنے تجربے کی بنا پر وہ جانتے تھے کہ چندا اور ان کا ساتھ مشکل ہے۔ چندا کے والدین کو اس کا رشتہ قبول نہیں ہوگا۔ اس صورت میں جب ان کے پاس متبادل بھی ہو لیکن وہ انہیں مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بہرحال ایک بار کوشش کر لینے میں کیا حرج تھا لیکن انکار کی صورت میں اس پر کیا گزرے گی یہ بات انہیں پریشان کررہی تھی۔ چندا جب ان کے گھر آئی تھی تو اس کی فیملی کے متعلق کافی کچھ جان گئے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور یہ صرف پسندیدگی نہیں محبت ہے۔ یک دم انہیں لگا جیسے ونڈ اسکرین دھندلا گئی ہو۔ انہوں نے وائپر چلایا لیکن اسکرین تو بالکل شفاف تھی ان کی اپنی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ یک دم انہوں نے بریک لگا کر اپنی آنکھوں کو رگڑا...... ان کی نظر اپنے گھر کے گیٹ پر پڑی۔ سوچوں میں گم انہیں احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ گھر پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے ہارن دیا تو تھوڑی دیر بعد گیٹ کھل گیا، وہ گاڑی اندر لے گئے۔ عظام کی گاڑی نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا ابھی وہ لوگ یونیورسٹی سے نہیں آئے تھے۔ وہ خدا بخش سے باتیں کرتے ہوئے اندرونی دروازہ کھول کر اندر آئے تو لاؤنج میں رواحہ کو صوفے پر لیٹے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''تم اکیلے آئے ہو یونیورسٹی سے؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے رواحہ کی طرف دیکھا۔ ''عظام کہاں ہے؟''

''عظام ہاسٹل چلا گیا تھا جواد کے ساتھ اس کی کچھ بکس وغیرہ ابھی وہاں ہی تھیں وہ لینی تھیں اس نے۔''

''یار اس بچے کے سو دشمن ہے۔ اکیلے مت جانے دیا کرو کہیں خدانخواستہ کچھ ہوگیا تو کل ہم اس کے باپ کو کیا جواب دیں گے؟'' وہ پریشان سے ہوگئے تھے۔ ان کے ذہن میں اس روز والے عجیب حلیے کے لوگ آگئے تھے۔ انہیں خیال آیا جیسے کچھ دن پہلے انہوں نے انہیں پھر دیکھا تھا لیکن دھیان نہیں دیا تھا اور انہیں یہ بھی یاد نہیں آرہا تھا کہ کہاں دیکھا تھا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں بابا۔ اتنے برس گزر گئے۔ عظام کے پاپا نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا یہاں کبھی کوئی دشمن تو نظر نہیں آئے عظام کے جو تھے مر کھپ گئے ہوں گے۔''

''پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے۔'' کہہ کر وہ خدا بخش کی طرف مڑے۔ ''کھانا کھالیا رواحہ نے؟''

''نہیں۔'' خدا بخش نے نفی میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ''لگا دوں؟''

''مجھے تو بھوک نہیں ہے تم اور رواحہ کھالو۔''

''آپ نے کیا کالج میں ہی کچھ کھالیا تھا؟'' انہیں رواحہ کا لہجہ ہمیشہ سے کچھ مختلف لگا۔

''نہیں...... لیکن بھوک نہیں ہے مجھے۔ عظام کب تک آجائے گا تم ویٹ کروگے اس کا؟''

''پتا نہیں..... ہو سکتا ہے وہ جواد کے ساتھ ہی کھالے۔'' پتا نہیں رواحہ کی نظریں ان کے چہرے پر کیا کھوج رہی تھیں وہ تھوڑا سا اپ سیٹ ہو کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔

''بابا!'' رواحہ نے پیچھے سے آواز دی۔ ''آپ کو جو بھی پریشانی ہے وہ مجھ سے شیئر کیوں نہیں کرتے؟''

''مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے میری جان۔'' انہوں نے اس کی طرف مڑے بغیر کہا۔

''بابا اِدھر میری طرف دیکھیں۔'' رواحہ اٹھ کر ان کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔

''یار کیا بات ہے؟'' وہ اس کی طرف مڑتے ہوئے زبردستی مسکرائے۔ ''خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہو، بڈھا آدمی ہوں تھک جاتا ہوں' پڑھانا آسان کام نہیں ہوتا۔ پڑھنے والے کو نہیں معلوم ہوتا یہ پڑھانے والا ہی جانتا ہے۔''

''لیکن بابا آپ ایک ہفتے سے کالج نہیں جا رہے ہیں۔'' بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔ ''بیگ صاحب نے گھر کے نمبر پر فون کر کے آپ کی خیریت معلوم کی کیونکہ آپ کا سیل آف تھا۔'' وہ پہلے تو حیران ہوئے پھر بے ساختہ ہنس دیے۔

''یار تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے میں کوئی اسکول، کالج سے بھاگنے والا اسٹوڈنٹ ہوں۔''

''بابا پلیز مذاق میں مت ٹالیں کوئی تو پرابلم ہے آپ کے ساتھ۔'' وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔ ''اگر آپ کالج نہیں جا رہے تو پھر کہاں جا رہے ہیں..... گھر پر بھی نہیں ہوتے آپ..... اگر مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتے تو خدا بخش چاچا سے کرلیں۔'' وہ روٹھا روٹھا سا واپس آکر صوفے پر بیٹھ گیا اور ریموٹ اٹھا لیا۔

''کوئی بھی پرابلم نہیں ہے، تھک گیا تھا ریسٹ کرنا چاہتا تھا اتنی چھٹیاں بقایا تھیں میری سو کرلیں۔''

''لیکن ریسٹ تو گھر پر کیا جاتا ہے بابا۔'' وہ پھر بے اختیار ہنس دیے اور اس کے قریب آکر اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اس کے بال بکھیر دیے۔

''تم تو کسی پولیس والے سے بھی بڑھ کر میری انویسٹیگیشن کر رہے ہو۔''

''سوری بابا لیکن میں آپ کے لیے پریشان تھا۔''

''چھٹی میں نے ریسٹ کرنے کے لیے ہی لی تھی لیکن پچھلے دنوں اتفاق سے ایک یونیورسٹی فیلو مل گیا تو بس دونوں بیٹھ کر یونیورسٹی کی یادیں تازہ کرتے رہتے ہیں چند دنوں کے لیے وہ آیا تھا یہاں۔''

''یہی بات ہے ناں بابا؟'' اس نے کچھ شک سے انہیں دیکھا۔

''ہنڈرڈ پرسنٹ۔'' وہ مسکرائے اور اس کا بازو تھپتھپایا۔

''آپ کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ کہاں جاؤں گا؟ آپ جانتے ہیں ناں بابا میرا آپ کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''میری جان میرا بھی تو تمہارے..... '' اور انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا انہیں لگا تھا جیسے ان کا دل بند ہو جائے گا۔ ان کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں۔ اس کا سر چوم کر وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔

''تم میری زندگی ہو رواحہ..... تمہاری پریشانی میری جان نکال دیتی ہے۔ تمہاری آنکھوں میں افسردگی کے رنگ دیکھیں تو میرا دل اپنی دھڑکنیں کھونے لگتا ہے۔ تم نہیں جانتے میری زندگی..... چندا کے بعد میں کتنے گہرے اندھیروں میں ڈوب گیا تھا اور یہ تم تھے رواحہ جو ان گہرے اندھیروں میں چاند کی طرح طلوع ہوئے..... میرے ان اندھیرے آسمانوں کے چاند، سورج، ستارے سب تم ہی ہو۔ تم مجھے ہر رشتے، ہر تعلق سے زیادہ پیارے زیادہ اہم ہو۔ کوئی بھی دوسرا میری زندگی میں تم سے زیادہ اہم اور پیارا نہیں ہے میری جان..... میری زندگی.....''

''تو کیا کوئی دوسرا آ گیا ہے آپ کی زندگی میں؟'' رواحہ کی آنکھوں میں شرارت بھری چمک لپکی۔

''کیا وہ...... نام بھول گیا ہے ان مس کی کوششیں رنگ لائی ہیں یا پھر وہ سر بیگ کی سسٹر؟''

''بکومت۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ ''اپنا بتاؤ تمہاری کوششیں رنگ لائیں یا نہیں؟''

''کیسی کوششیں بابا؟'' اس نے انجان بنتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

''بنومت میری جان صاف، صاف بتاؤ معاملہ کچھ آگے بڑھا۔''

''معاملہ تو شروع ہی نہیں ہوا بابا تو آگے کیسے بڑھتا۔'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ وہ موضوع بدلنے میں تو کامیاب ہو گیا تھا کہ بابا کی اداسی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی لیکن خود اس کی خوب صورت آنکھوں میں اداسی کا غبار سا پھیل گیا تھا۔

''کیوں؟'' انہوں نے اس کی آنکھوں میں اترتی اداسی کو محسوس کیا۔ ''معاملہ آگے بڑھاؤ یار میں اور خدا بخش تو تیار بیٹھے ہیں تمہیں زنجیریں ڈالنے کے لیے۔''

''کیوں، میری آزادی بری لگتی ہے کیا آپ کو؟'' اس نے لہجے میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی طرف موڑا۔

''ادھر دیکھو رواحہ...... میرے شہزادے کو بھلا کوئی لڑکی اگنور کر سکتی ہے؟''

''آپ کو کیا پتا بابا آپ کے شہزادے کو اور کسی نے نہیں ارتفاع نے اگنور کیا ہے۔ اس کا دل ایک ایسی لڑکی کی چاہ کر بیٹھا تھا جو شاید کسی اور کو چاہتی تھی اور یہ جاننے کے باوجود بھی اس کا دل ہمک، ہمک کر اس کی اور لپکتا تھا اور اس کا خوش فہم دل اسے نہ جانے کیسے، کیسے خواب دکھاتا تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔'' پچھلے کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ ارتفاع جان بوجھ کر اسے اگنور کرتی ہے حالانکہ اس روز کے بعد جب انہوں نے اسے گھر چھوڑا تھا ان کے درمیان اکثر بات چیت ہو جاتی تھی بلکہ رواحہ نے اسے اپنے ان لیکچرز کے نوٹس بھی دیے تھے جو اس کے مس ہو گئے تھے لیکن آج کل وہ اور عالیہ اکثر ظفری کے ساتھ نظر آتی تھیں۔ کینٹین میں، لائبریری میں، لان میں اکثر ظفری ان کے پاس کھڑا نظر آتا تھا اور کل تو اس کا ظفری سے چھوٹا سا جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔ ظفری اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے باتیں کر رہا تھا وہ اور عظام اس کے پیچھے ہی تھے۔ جب اس نے ظفری کو ارتفاع کا نام لیتے سنا تھا۔

''یار کیا لڑکی ہے یہ ارفی بھی۔ سیدھی دل پر اٹیک کرتی ہے۔'' ظفری کے دوست کا انداز بہت گھٹیا اور عامیانہ تھا۔ اس کا خون کھولنے لگا تھا۔

''خبردار۔'' ظفری نے دوست کے بازو پر ہاتھ مارا تھا۔ ''وہ ظفری کی محبوبہ ہے اس پر بری نظر مت ڈالنا۔''

''کیا واقعی؟'' ظفری کے دوست نے قہقہہ لگایا تھا۔

''ابھی تو صرف تُو ہی اسے محبوبہ بنانے پر تلا ہے اس نے تو تجھے محبوب کے درجے پر فائز نہیں کیا ناں۔''

''کر لے گی میرے یار کر لے گی ایک دن دیکھنا۔'' اور وہ بے اختیار ہی آگے بڑھا تھا۔

''شرم نہیں آتی تم لوگوں کو ایک کلاس فیلو لڑکی کے متعلق ایسی بے ہودہ باتیں کرتے ہوئے؟''

''تم اس کے مامے لگتے ہو؟'' ظفری مڑا تھا۔

''تم لوگوں کو اخلاقیات چھو کر نہیں گزری ہیں۔'' اسے بے حد غصہ آ رہا تھا۔

''آئندہ ظفری کے منہ مت لگنا مسٹر رواحہ اور پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ تم ظفری کو اچھی طرح جانتے نہیں ہو۔'' ظفری نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

''تم چاہو تو تم بھی اپنی کسی فیورٹ کے متعلق ایسی گفتگو کر سکتے ہو، ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔'' ظفری کے دوست نے اس کے بازو پر ہاتھ مارا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ دونوں کا منہ توڑ دے تاکہ پھر وہ اس طرح کی بکواس نہ کر سکیں لیکن عظام نے اسے روک لیا تھا۔

''لیو اٹ یار۔'' اور اسے کھینچتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف لے گیا تھا۔ ظفری وہاں ہی کھڑا اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''یاد رکھنا رواحہ، آئندہ ہمارے رستے میں نہ آنا ورنہ.....''

''ورنہ کیا کر لو گے تم؟'' رواحہ نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

''یہ تمہیں جلد پتا چل جائے گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''کیا سوچ رہے ہو یار؟'' انہوں نے پوچھا تو وہ چونکا۔

''کچھ نہیں بابا، سوچ رہا تھا کسی روز خدا بخش چاچا کی چوائس بھی دیکھ لی جائے یعنی شیخ صاحب کی لڑکیاں۔'' وہ ہنسا۔

''رواحہ..... کیا تم سیریس تھے اس لڑکی کے لیے؟'' انہوں نے رواحہ کی ہنسی میں عجیب سا درد محسوس کیا تھا۔

''ارے نہیں بابا..... ویسے ہی ایک لڑکی تھی اچھی لگی تھی اور بس۔ یوں بھی عظام کہتا ہے یکطرفہ محبتیں بہت اذیت ناک ہوتی ہیں زندگی کا سفر طے کرنے کے لیے ہاتھ میں کوئی جگنو بھی نہیں ہوتا جو راستوں کو آسان اور سفر کو سہل کر دے۔''

''محبت کرنے لگے تھے اس سے؟'' وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے دوست جیسے بابا کو سب کچھ بتا دے اپنے دل کی ہر بات لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکرایا۔

''ارے نہیں بابا! ایسی کوئی بات نہیں تھی بس یوں ہی دل نے کہا تھا اچھی لڑکی ہے۔ اچھی ہم سفر ہوگی لیکن..... دنیا میں تو اور بھی اچھی لڑکیاں ہوں گی ناں تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔'' وہ ہنس رہا تھا اور دل مسلسل اس کی بات کی نفی کر رہا تھا۔ ہنستے، ہنستے اس نے دائیں طرف صوفے پر پڑا اپنا سیل فون اٹھایا جس کی بیل ہو رہی تھی۔

''عظام کا ہوگا۔'' اس نے سوچا لیکن اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔

''ہیلو السلام علیکم!'' اس نے فون آن کیا۔

''رواحہ بات کر رہے ہو؟''

''ہاں، آپ کون؟''

''ظفری بول رہا ہوں۔''

''جی.....!'' وہ حیرت زدہ سا رہ گیا۔

''عظام، تمہارا بھائی یا کزن جو بھی ہے اس وقت میرے قبضے میں ہے۔''

''کیا.....؟'' وہ چیخا۔

''تم نے ظفری کو چیلنج کیا تھا ناں۔ اس کی زندگی چاہتے ہو تو کچھ دیر میں میرے ڈیرے پر آ جاؤ۔ کچھ معاملات طے ہو جائیں تو اپنے برادر کو لے جانا۔'' اس نے فون آف کر دیا تھا لیکن وہ ہیلو، ہیلو کرتا رہ گیا۔

''کیا ہوا رواحہ؟'' انہوں نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا تو وہ متوحش نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

جاری ہے

میں شانزے ہوں

رفعت سراج



"لو بھئی پہنچ گئے منزل پر... مارا اسٹیشن پر ٹرینیں لیٹ ہونے کی وجہ سے ایک قیامتِ صغریٰ کا منظر ہے۔" ثمینہ آپا نے بڑی سی چادر جیسے نوچ کر ایک طرف دے ماری اور پیڈسٹل فین کے سامنے قمیص کے گلے کو انگلیوں کی پوروں سے پکڑ کر پوری کوشش میں لگ گئیں کہ ہوا گریبان کے ذریعے روئیں، روئیں میں اتر جائے۔ شانزے ان کی چوتھی بیٹی ان کے ہمراہ آئی تھی اور زمانوں

کے بعد اپنی خالہ کے گھر خالہ زاد بھائی کی شادی میں شرکت کرنے آئی تھی۔ گھر میں شادی کے گھر والی رونق اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ قریبی رشتے دار لڑکیاں مایوں کے دن پہننے جانے والے پیلے زرد جوڑوں کو فائنل ٹچ دینے میں مصروف تھیں۔ مہمانوں کا سامان اِدھر اُدھر دیواروں کے ساتھ لگا نظر آرہا تھا۔ بیچ میں ایک ڈھولکی بھی پڑی لڑھک رہی تھی جس کی رات کو بہت عزت افزائی ہوتی تھی، دن میں بچے ڈھولکی کو نوبت کی طرح بجاتے تھے تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کوئی ماں بے مہار شور سے عاجز آکر اپنے بچے کو دھموکڑے جڑنے آگے بڑھتی تو وقتی طور پر سب بچے بھاگ کھڑے ہوتے تھے مگر تھوڑی دیر بعد پھر نوبت بجتی جیسے کوئی مراثی اعلان کرنے آگھسا ہو۔ اس وقت چونکہ دوپہر کا کھانا چل رہا تھا اس لیے قدرے سکون تھا۔ سب مائیں بچوں کو دسترخوان کے اردگرد سمیٹے بیٹھی تھیں۔

''مہمان کے آنے سے تو بہت خوشی ہوتی ہے مگر آپ نے آکر حیران بھی بہت کیا ہے۔ خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔'' دولہا شادان کی اماں اور ثمینہ آپا کی چھوٹی بہن شاہینہ نے خوشی سے وفورِ جذبات کا بے ساختہ اظہار کیا۔

''ماشاء اللہ...... شانزے نے تو بہت اچھا قد نکالا ہے۔ ایک دم سے بڑی ہوگئی۔''

''ایک دم سے کہاں...... ارے دس سال بعد دیکھو گی تو یہی حال ہوگا۔ یاد ہے کب آئی تھیں تم وزیرآباد؟'' ثمینہ آپا نے اپنی مخصوص ٹون میں یوں کہا گویا جھاڑ پلا رہی ہوں۔

''آپا آپ کو تو پتا ہے ناں میرا تو لڑکوں کا گھر ہے۔ کوئی بیٹی نہیں جو ذرا گھر کے کاموں میں ہاتھ ہی بٹادے۔ جب نکلنے کا سوچا کسی کے ایگزام شروع ہوگئے۔ کسی کو باہر جانے کی پڑگئی۔''

''ہاں بھئی سب کی اپنی، اپنی مجبوریاں...... ہم نہیں نکل سکے تو تمہیں کیا کہیں۔'' ثمینہ آپا نے چھوٹی بہن کی معذرت خواہانہ تفصیل کو گرمی کی شدت میں جھونک کر اُن کی جان خلاصی کی۔

اس دوران شانزے خاموشی کی تصویر بنی نظریں گھما، گھما کر مہمانوں کی آ ہر جا بہ دیکھتی رہی۔ کوئی نظم و ترتیب نہیں دکھائی دیتی تھی۔ دیگ کا منہ کھلا ہوا تھا۔ کوئی نہ کوئی پلیٹ ہاتھ میں لیے اِدھر اُدھر آتی جاتی نظر آرہی تھی۔ صرف بچوں والیاں دسترخوان پر بچوں کو سکون سے لیے بیٹھی تھیں۔ ایک دو اپنے ہاتھوں سے بچوں کے منہ میں نوالے دے رہی تھیں۔

''آپ نہا دھو کر فریش ہوجائیں پھر آپ کے لیے کھانا لگواتی ہوں۔ کھانا کھا کر آرام کریں پھر شام کے فنکشن کی تیاری۔'' شاہینہ اٹھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''مارا بھی تو چکر آرہے ہیں، لیموں نمک کا پانی پلادو پہلے ذرا سستالوں۔'' شاہینہ کی ہدایات کو درخورِ اعتنا بھی نہ جانا انہوں نے۔ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر اسی صوفے پر ڈھے گئیں جس پر کچھ دیر قبل بڑے تکلف سے فروکش ہوئی تھیں۔ شانزے نے آدابِ محفل کی صریح خلاف ورزی پر قدرے گھبرا کر چاروں طرف نئے سرے سے نظر دوڑائی تھی۔

''چلیں اٹھیں آپ میرے کمرے میں جاکر آرام کرلیں۔ یہاں تو بچے دھاچوکڑی کریں گے۔ آئیں۔'' شاہینہ نے دور دراز کے سفر سے آئی تھکی ہاری ماں جائی کو اپنے نازک ہاتھ کا سہارا دینا چاہا اس اعتماد سے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔

''بس یہیں ٹھیک ہوں۔ بستر پر جالیٹی تو گہری نیند آجائے گی۔'' ثمینہ آپا نے حتمی انداز میں بہن کو

مزید اخلاقیات سے باز رکھا۔

''چلو بیٹا شانزے، آپ تو شاور لے کر چینج کرلو اور ہاں دیکھو یہ تمہاری خالہ کا گھر ہے کوئی تکلف کرنے کی ضرورت نہیں اگر بھوک لگ رہی ہے تو پہلے کھانا کھالو۔'' شاہینہ نے پیار سے بھانجی کا گال چھو کر بڑی محبت بھری نظروں سے اس کا ناقدانہ جائزہ بھی لیا تھا۔ سیدھی سادی، بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی گھبرائی، گھبرائی، شرمائی شرمائی۔

''بھابی آپ پہلے اسے کھانا کھلا دیں۔ ٹرین کا تھکا دینے والا سفر پتا نہیں بچی نے کب کچھ منہ میں ڈالا ہوگا۔'' شاہینہ کی نند اپنے بچے کو کھلا پلا کر فارغ ہوئی تھیں' اب اپنی موجودگی کا احساس دلانے کا خیال آیا تھا۔ ساتھ ساتھ ادھر اُدھر گرے ہوئے چاول کے دانے بھی چن رہی تھیں۔

''نہیں، نہیں خالہ... یں امی کے ساتھ ہی کھالوں گی۔ پہلے شاور لے کر چینج کر لیتی ہوں۔'' شانزے نے اسی طرح کم اعتمادی اور گھبراہٹ کے انداز میں جواب دیا۔

''جیسے تمہاری مرضی، آؤ میں تمہیں شاوان کے کمرے میں چھوڑ دوں وہاں کوئی آتا جاتا نہیں ہے۔ کمرا ڈیکوریٹ کرنے والے بھی پرسوں ہی آئیں گے کیونکہ کمرا تازہ پھولوں سے سجانا ہے۔''

''شاہینہ کیا ہوگیا ہے تمہیں..... تازہ پھولوں سے سجانا ہے تو بارات والے دن شام میں سجوانا۔'' شاہینہ کی پھوپھی ساس جو اسی وقت ہی لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں کڑے تیور سے بہو کو دیکھ کر یوں بولی تھیں جیسے کسی مجرم کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

''اچھا......اچھا ٹھیک ہے آپا جیسے آپ بولیں۔'' شاہینہ نے جلدی سے یوں جواب دیا جیسے قصاص ادا کر کے اپنی گردن چھڑائی ہو اور شانزے کا ہاتھ پکڑ کر سرعت سے لاؤنج سے نکل گئیں۔ مبادا مرحومہ ساس کے حصے کی جھاڑ جھپاڑ بھی پھوپھیا ساس اپنی ذمے داری سمجھ لیں۔

شاہینہ کی اپنی سگی ساس تو برسوں پہلے جنت مکانی ہو چکی تھیں مگر اپنی بے شمار فوٹو کاپیاں شاہینہ کے حوالے کر گئی تھیں۔ پھوپھیا ساس، خلیا ساس، ممیا ساس جن کی تعداد آج بھی شاہینہ کو ازبر نہیں تھی۔

☆☆☆

دولھا شاوان کے کمرے میں نئے فرنیچر کی ایک مخصوص مہک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہینہ نے اسے واش روم کا دروازہ دکھا کر ہاتھ میں لیا ایک دھلا ہوا ٹاول اسے پکڑا کر کہا۔

''تمہارا بیگ میں حمیدہ (نوکرانی) کے ہاتھ بھجواتی ہوں۔ اگر کپڑے پریس کروانا ہوں تو حمیدہ ہی کو کہہ دینا، پانچ منٹ میں استری کر کے لے آئے گی۔''

''جی خالہ پریس تو میں خود بھی کر سکتی ہوں، آپ بتا دیں کہ پریس کدھر کرتے ہیں۔''

''ارے ہٹاؤ...... تم تو خود تھکی ہاری ہو۔ ارے، یہ نوکرانیاں شادی کے کام کے الگ پیسے چارج کرتی ہیں بس تم حمیدہ ہی کو دے دینا سارے مہمانوں کے کپڑے پریس کرنا اسی کی ڈیوٹی ہے۔ سمجھیں؟'' شاہینہ کو ایک ساتھ کئی کام سوجھے ہوئے تھے اس لیے انداز میں عجلت تھی۔ وہ اتنی تیزی سے باہر نکل گئیں کہ شانزے کا اقرار میں ہلتا سر ہلتا ہی رہ گیا۔

☆☆☆

شاوان کے بے حد خوب صورت اور آرام دہ پُرسہولت بڑے سے واش روم میں بہت اچھی طرح غسل فرما کر جب وہ ٹاول میں اپنے گھنے دراز بال لپیٹے باہر آئی تو ذہنی حالت میں انقلاب آچکا تھا۔ اب اس نے دولھا کے کمرے کا بہت دلچسپی سے اور نئے سرے سے جائزہ لیا تھا۔

وارڈ روب تو دیوار گیر تھی اور بہت خوب

صورت بنی ہوئی تھی البتہ وائٹ اور گولڈن کے امتزاج سے بنا ہوا جہازی سائز بیڈ اور سائڈ ٹیبلز اور ٹیبلز پر رکھے ہوئے گولڈن شیڈز کے لیمپس بیڈ سے آٹھ فٹ کے فاصلے پر رکھی ہوئی بیڈ سے ہم آہنگ کشن سیٹس، دونوں سیٹس کے درمیان شیشے کی ٹیبل، ٹیبل پر تازہ پھولوں کا گلدستہ۔

کمرے میں آئینہ نہیں تھا ڈریسنگ کی دو سائڈز پر فرش سے چھت تک آئینے نصب تھے۔ ڈریسنگ میں ایک چھوٹا سا گولڈن اور وائٹ کے امتزاج سے بنا ہوا اسٹول بھی تھا۔'' ظاہر ہے دلہن کو بیٹھ کر میک اپ بھی کرنا ہوتا ہے۔'' اس نے سوچا تھا۔

وسیع بیڈروم میں بہت کم سامان تھا اور جو تھا وہ بھی بہت قرینے سے سجا ہوا تھا۔ اس نے درحقیقت اتنا خوب صورت اور تصوراتی سا بیڈروم زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے آنے والی دلہن کی قسمت پر ٹوٹ کر رشک آیا اور کھڑے، کھڑے دلہن کو بہت خوش قسمت ہونے کی سند دے ڈالی۔ اس نے پھر نئے سرے سے جائزہ لیا۔ سنہری زنجیر سے لٹکتا فانوس دیکھ کر اس نے سوچا پنکھے کی جگہ تو فانوس لٹکا دیا ہے۔ شاید کمرے میں پیڈسٹل چلائیں گے؟ مگر فوراً ہی اس کی نظر ڈیڑھ ٹن کے اسپلٹ پر پڑ گئی تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔

''دلہن تو جنت میں آ رہی ہے۔ امی تو کہتی ہیں خالہ بہت امیر ہیں، ان کے تین بیٹے دبئی میں سوفٹ ویئر کا بزنس کرتے ہیں۔ میری امی اور شاہینہ خالہ دونوں سگی بہنیں ہیں اور دونوں کی قسمت کتنی الگ، الگ ہے۔ امی کہتی ہیں میں تو جوڑ جمع کرتی ہوں بیٹی کو دے دیتی ہوں پھر بھی ہر بیٹی کی شادی پر قرضہ چڑھ جاتا ہے۔ تین بیٹیوں کی شادی کے بعد تو ابو بہت بوڑھے دکھنے لگے ہیں اسی لیے تو میں سوچتی ہوں کہ زندگی بھر شادی ہی نہ کروں۔ فضول میں اپنے ماں باپ کو پریشان کرنا۔'' اسی وقت حمیدہ کھانے کی ٹرے لے کر اندر آ گئی اور شانزے کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

''باجی نے بولا آپ کو اِدھر ہی کھانا دے دوں۔ باقی سب نے تو کھالیا ہے ناں۔'' حمیدہ ٹرے رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''مگر میری امی نے تو نہیں کھایا، میں ان کے ساتھ ہی کھالوں گی اور یہ تو دلہن کا فرنیچر ہے کہیں خراب نہ ہو جائے۔'' شانزے نے بہت محتاط انداز میں بات کی۔ حمیدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ابھی کون سا نکاح ہوا ہے ابھی تو یہ فرنیچر باجی کا ہے۔''

''لیکن بھجوا تو دیا ہے ناں لڑکی والوں نے۔'' شانزے نے تاول سے بال آزاد کرتے ہوئے عام سے انداز میں کہا تھا۔

''باجی نے کوئی جہیز وہیز نہیں لیا دلہن والوں سے، یہ تو شادان صاحب نے خود بنوایا ہے۔'' شانزے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''کیا لڑکی والے بہت غریب ہیں؟'' حمیدہ، شانزے کی حیرانی اور بھولپن پر ہنس، ہنس کر لوٹ گئی۔

''بہت امیر ہیں کارخانے، فیکٹریوں والے۔'' ہنسی کے بیچ یہ مشکل گویا ہوئی۔ ''جہیز تو غریب لوگ دیتے ہیں جو بہت امیر لوگ ہوتے ہیں ناں وہ اپنی لڑکی کو جائداد نکت (نقد) روپے اور دولہا کو سلامی میں یہ بڑی سی کار دیتے ہیں۔'' حمیدہ نے مقدور بھر ہاتھ لمبا کیا۔ ''اور پانچ لاکھ والی روٹو (راڈو) گھڑی بناتے (پہناتے) ہیں۔''

''پانچ لاکھ کی گھڑی..... صرف ایک گھڑی.....'' یہ تو اسے علم تھا کہ راڈو بہت قیمتی گھڑی ہوتی ہے مگر قیمت حمیدہ نے بتائی تھی۔ قوتِ خرید کے حساب سے ہی بندہ چیزوں میں دلچسپی لیتا ہے۔

''تو یہ فرنیچر دلہن والوں نے نہیں بھجوایا؟''

"ایک لوٹا نہیں آئے گا جہیز میں...... سب کچھ بینک میں آئے گا۔ دس سال سے باجی کے پاس کام کر رہی ہوں سب پتا ہے میرے کو۔ آپ کھانا کھاؤ، باجی نے بولا تھا فوراً آ جانا دیر نہ کرنا اور میں باتوں میں لگ گئی۔ آپ کی امی نے نیچے کھانا کھالیا ہے۔" حمیدہ کو کچھ یاد آیا تو سراسیمہ سی ہو کر باہر بھاگی۔

شانزے نے ٹرے کی طرف دیکھا۔ کڑھی، چاول، بریانی، سلاد، پانی کا جگ۔ اس نے ٹاول رکھنے کے لیے جگہ تلاش کی مگر کوئی مناسب جگہ سمجھ نہ آئی چند لمحے سوچا پھر ٹاول واش روم میں اسٹینڈ پر پھیلا کر کمرے میں آئی اور پلیٹ اٹھا کر بیٹھنے کی نیت سے سیٹ کی طرف بڑھی۔ اتنے حسین تصوراتی سے بیڈ روم میں کھانا تناول کرنا بھی ایک اعزاز لگ رہا تھا۔

ابھی اس نے دو چار نوالے ہی کھائے ہوں گے کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور شاداں عجلت بھرے انداز میں داخل ہو کر سیدھا وارڈ روب کی طرف بڑھا مگر ایمرجنسی بریک لگے تھے۔ گیلے بالوں والی سرو قامت دوشیزہ بغیر دوپٹے کڑھی چاول کھاتی ہوئی۔ اس نے سر کو یوں جھٹکا جیسے خود کو یقین دلانا چاہ رہا ہو کہ وہ جاگ رہا ہے۔

شانزے کی تو حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ ساری بہنیں شروع ہی سے بڑی چادریں اوڑھ کر گھر سے نکلتی تھیں کسی نامحرم نے آج تک ان میں سے کسی کو بغیر دوپٹے کے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بید کی طرح لرزتی پلیٹ اٹھائے سرو قد کھڑی ہو چکی تھی۔ شاداں دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور بسم اللہ کے ساتھ آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی۔

"میں شانزے ہوں۔" وہ روہانسی ہونے لگی۔ شاداں مزید دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی نظریں شانزے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اسی

وقت دھڑ سے دروازہ کھلا حمیدہ بوکھلائی، بوکھلائی اندر آئی اور تیر کی طرح ٹرے کی طرف بڑھی۔

''وہ......شادان صاحب آگئے ہیں باجی بولتی ہیں آپ ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر آرام سے کھانا کھائیں۔ اُدھر فردوس باجی سو رہی ہیں پر خیر ہے آپ....'' حمیدہ ٹرے لے کر پلٹی تو باقی کے الفاظ منہ ہی میں رہ گئے۔ شادان کو دیکھ کر ٹپٹا گئی۔

''آپ اوپر بھی آگئے...... پتا بھی نہیں چلا...... باجی نے بولا شادان کی گاڑی کھڑی ہے لگتا ہے وہ آگیا ہے۔ آپ نے تو پچھان (پہچان) لیا ہوگا......آپ کی خالہ کی بیٹی ہے پنجاب سے آئے ہیں یہ لوگ۔ باجی...... آپ آؤ میرے ساتھ سارا کھانا ٹھنڈا ہوگیا۔'' حمیدہ کے پاس دو بندوں سے براہِ راست مخاطب ہونے کا خصوصی آرٹ بھی ہے۔ شادان کے لیے یہ نیا انکشاف تھا۔ یہ جوہر تو آج کھلا تھا۔ وہ ٹرے لے کر نکل گئی۔ شانزے نے شرمائے، گھبرائے انداز میں بیڈ پر پڑا اپنا دوپٹا اٹھایا کندھے پر ڈالا کیونکہ ایک ہاتھ میں کڑھی چاول کی پلیٹ تھی بس عجلت میں اتنا ہی کر پائی اور اس انداز میں بھاگی کہ بلی کا نوزائیدہ بلونگڑا تصور میں آگیا جو ماں کی غیر موجودگی میں حواس باختہ سا بھاگا پھرتا ہے۔

شادان دھپ سے بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ اسے تو یاد ہی نہ رہا کہ وہ گاڑی دوڑاتا ہوا اشتم پشتم گھر کیوں آیا تھا۔

''میں شانزے ہوں۔''

''نہ سلام نہ دعا...... یہ کیا بات ہوئی؟ میں شانزے ہوں۔ آیت الکرسی نہ پڑھتا تو کیا کرتا۔ کوئی بتائے پھر مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟'' معاً اسے اپنا ضروری کام یاد آیا۔ آج کی تاریخ کا اہم ترین کام۔

''مائی گاڈ......سومی (منگیتر) بوتیک میں میرا ویٹ کر رہی ہوگی۔'' بڑبڑا کر اٹھا اور دراز کھول کر ویزا کارڈ نکال کر والٹ میں ٹھونسنے لگا۔

''میں شانزے ہوں......لاحول و لاقوۃ۔''

☆☆☆

عصر کی نماز کے بعد ہی مایوں کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ تقریب ایک مقامی فائیو اسٹار ہوٹل میں تھی۔ اس تقریب کا اہتمام، انتظام، انصرام سب لڑکی والوں کی طرف سے تھا کہ مایوں کی تقریب تو اصل میں لڑکی کی ہی ہوتی ہے۔ لڑکے والوں کو دو سو مہمان لانے کی اجازت تھی جبکہ شاہینہ نے صرف سو مہمان ساتھ لانے کی حامی بھری تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اپنی جانب سے وہ لڑکی والوں پر کوئی اضافی بار ڈالنا نہیں چاہتی تھیں۔ شانزے سب کی تیاریاں، بھاگ دوڑ بہ نظرِ غائر...دیکھ رہی تھی۔ وہ بری طرح الجھ گئی تھی وہ شادی اور ولیمے کے لیے جو ڈریسز لائی تھی اس سے لاکھ درجے بہتر اور قیمتی تو یہاں لڑکیاں مایوں میں پہن رہی تھیں۔ کتنے شوق اور جذبے سے وہ اتنی دور اپنے خالہ زاد کی شادی میں شرکت کرنے آئی تھی۔

گھر کا ماحول بہت پابند اور لگا بندھا تھا۔ والد محترم کیبل کے سخت خلاف تھے، پی ٹی وی کے پروگرام بھی منتخب شدہ دیکھے جاتے تھے۔ سہیلیاں بنانا لڑکیوں کو خراب کرنے کا مطلب سمجھا جاتا تھا اور ان ہی ذرائع سے لڑکیاں اپ ٹو ڈیٹ رہتی ہیں جن سے وہ چاروں بہنیں محروم رہی تھیں۔

ثمینہ کے شوہر ایکسائز میں تھے اور صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس محکمے میں سب رشوت خور نہیں ہوتے متقی، پرہیزگار بھی ہوتے ہیں انہوں نے سارا زور صرف کر دیا تھا۔ داماد بھی چن، چن کر ایسے ڈھونڈے تھے جو ساری زندگی ایکسائز کے ایماندار افسر سے متاثر ہوں اور راہِ حیات میں انہیں اپنا رہنما

گردانیں۔

میٹرک کے بعد چاروں بہنوں نے پرائیویٹ گریجویشن کیا تھا کیونکہ مجبوری تھی اور وہ تسلیم کرتے تھے کہ آج کے دور میں میٹرک پاس لڑکی کا کوئی اسٹینڈنس نہیں ہوتا۔

ثمینہ کے شوہر حیات خان بہت خاموش طبع انسان تھے اور خاموش انسان کی ہیبت بہت ہوتی ہے اور ذاتی عیب بھی پوشیدہ رہتے ہیں مسکراتے بھی بہت کم تھے مبادا ایکسائز والے آکر ٹیکس لگادیں۔

اب ایسے ماحول کی پروردہ دوشیزہ کو تو خالہ کے گھر اور کراچی شہر آکر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھاگی گیٹ سے نکل کر نان اسٹاپ فلائٹ کے ذریعے پیرس پہنچ گئی ہو۔

کتنی دیر وہ بیگ کھولے اپنے ساتھ لائے ہوئے گنتی کے چند جوڑوں کو گھورتی رہی جب کچھ نہ سوجھا تو حالِ دل کہنے ماں کے پاس چلی آئی اور اس کی کیفیات جان کر ثمینہ نے اپنے ازلی پُراعتماد اور قدرے جلے بھنے انداز میں جواب دیا تھا۔

''شادی تمہاری نہیں، شادان کی ہورہی ہے۔ لوگ اس کو اور اس کی دلہن کو دیکھیں گے، تمہارے اونٹ جیسے قد کی وجہ سے کسی کی نظر پڑ گئی تو پڑ گئی۔ یہاں تو لوگوں کو اپنا آپ دیکھنے سے فرصت نہیں..... اپنے چہروں پر اپنی شکلوں پر خود ہی فدا ہوئے جا رہے ہیں۔ جو ہے اسی پر گزارہ کرو میری ہمت نہیں کہ تمہیں لے کر بازاروں میں ماری، ماری پھروں۔ کوئی کہہ بیٹھے کہ تمہارے کپڑے اچھے نہیں تو کہنا نہ دیکھے تمہیں، آنکھیں بند کرلے۔'' ماں کے بیزار کن ٹکڑا توڑ جواب پر حوصلہ ضرور پست ہوا مگر ماں ہی کے اعتماد نے سہارا بھی بہت دیا تھا۔

آخر کار اس نے اس سال عید پر بنایا ہوا جوڑا آج کے دن کے لیے چن لیا جب وہ تیار ہو کر ثمینہ کے سامنے آئی تو انہوں نے اس کی طرف سے نظر چرا کر دل ہی دل میں کہا تھا۔

''ماشاء اللہ ان سب فیشن ماریوں کے بیچ میری بیٹی پھر بھی سب سے الگ ہے۔ اسی لیے تو میں اپنی بیٹیوں کو آئینہ دیکھنے سے منع کرتی تھی اپنی بھی نظر لگ جاتی ہے۔'' ماں کے بے مروت و سخت انداز سے قدرے دل برداشتہ شانزے کو کیا خبر تھی کہ اندر سے ساری مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔

☆☆☆

ہوٹل سے وہ بہت مبہوت کیفیت میں گھر واپس آئی تھی۔ کیا، کیا نظارے دیکھے کہ عقل دنگ تھی۔ اتنی کرنسی لٹائی گئی کہ کارپٹ نوٹوں سے چھپ گیا۔ اس نے سب کی نظر بچا کر ایک نوٹ اٹھا کر غور سے صرف اس لیے دیکھا تھا کہ اسے شک تھا کہ کیا یہ نوٹ اصلی ہیں مگر تازہ کڑک نوٹ کی خوشبو اور لمس بتا رہا تھا کہ بالکل اصلی ہے پھر گھر میں ابو نے بھی حفظ ماتقدم کے تحت بتایا تھا کہ اصلی نوٹ پر قائداعظم کی تصویر پر انگلی پھیرو تو کھردرا پن محسوس ہوتا ہے جبکہ جعلی نوٹ کا یہ حصہ بالکل بٹر پیپر کی طرح چکنا ہوتا ہے۔ یہ یقین کر لینے کے بعد کہ نوٹ واقعی اصلی ہیں اس کے ہوش اڑ گئے تھے اور ہوش تو شادان کو دیکھ کر بھی بہت اڑے تھے۔ کیا غضب کی تیاری تھی۔ بالکل شہزادہ لگ رہا تھا اور اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی اس کی دھان پان سی دودھ سے دھلی ہوئی منگیتر تو اسے ایک آنکھ نہ بھائی۔

''ہائے اللہ، یہ تو بالکل ہڈیوں کا پنجر ہے۔'' اسے خواہ مخواہ شادان پر ترس آنے لگا۔ لاشعوری طور پر اس نے شادان کی منگیتر سومیہ سے اپنا موازنہ نہ کیا۔ ''خالہ کو کرنسی نوٹوں کا کارپٹ چاہیے تھا حالانکہ خود اتنی امیر ہیں۔'' دل اور خیال پر کس کا اختیار؟ اسے اپنے خیالات سے خوف سا آنے لگا دل کی ایک نادیدہ زبان ہوتی ہے اسی وجہ سے دل بہت زبان دراز ہوتا ہے مگر وہ اس زبان کو گدی سے پکڑ کر

نہیں کھینچ سکتی تھی۔

کیفیتیں موسموں کی طرح دبے پاؤں آتی ہیں اور چھا جاتی ہیں۔ کروٹیں بدلتے، بدلتے پو پھٹنے لگی نیند سے بوجھل آنکھیں بند کرتے ہوئے یونہی خیال آیا۔ شاوان تو اپنے سپر لگژری بیڈروم میں اپنی دلہن کے سپنے دیکھ رہا ہوگا نیند کی پریاں سُریلے ساز چھیڑ رہی ہوں گی۔

☆☆☆

''اچھا، اچھا...... بڑی کا مدحت پھر عفت اس سے چھوٹی ندرت اور ندرت کے بعد شانزے...... اس کا نام تینوں سے نہیں ملایا؟ نام تو خیر اچھا ہے۔'' مایوں کے فنکشن سے تھکے ہارے مہمان گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے جبکہ بڑی عمر کی خواتین اپنی فجر کی نماز کی حفاظت کرتی اٹھ بیٹھی تھیں۔ نوکرنے گرما گرم چائے بھی بنا کر پیش کردی تھی اب نماز تسبیح سے فارغ ہوکر لگیں ادھر اُدھر کی سنانے۔ شاہینہ کی خلیہ ساس آپا بتول نے ثمینہ کے ساتھ بیٹھک جمائی۔ بال بچوں کی تفصیلات سے آغازِ گفتگو ہو رہا تھا۔

''جب شانزے پیدا ہوئی تو پڑوس میں انہی دنوں ایک پٹھان خاندان آبسا تھا بہت اچھی پڑوسن تھی وہ۔ بہت ہمدرد اور ملنسار اس نے شانزے کا نام رکھتے ہوئے کہا تھا باجی بس اب قافیہ ملانے کی ضرورت نہیں جو قافیہ ملا کر نام رکھتے ہیں بس پھر قافیہ ہی ملاتے رہتے ہیں۔ تم دیکھنا انشاء اللہ شانزے کے بعد اللہ تمہیں بیٹا دے گا۔''

''مگر بیٹا پھر بھی نہ ہوا...... ارے ناموں میں کیا دھرا ہے بس جو اللہ کا حکم۔'' آپا بتول نے لقمہ دیا۔

''ہوا تھا شانزے کے بعد بیٹا آیا۔'' ثمینہ کے چہرے پر افسردگی نظر آئی۔

''اچھا......؟'' آپا بتول کو بیٹے سے زیادہ اپنا اندازہ غلط ہونے پر حیرانی ہوئی پلکیں جھپکانا بھول گئیں۔ اس عمر میں ایک نیا ٹوٹکا ہاتھ لگ رہا تھا۔

''تین مہینے کا تھا دودھ پیتے پھندا لگا اور ......گود خالی ہوگئی۔''

''اے ہئے بس قدرت کے کام قدرت ہی جانے۔ یوں سمجھو مقدر میں بیٹے کا سکھ ہی نہیں تھا۔''

''ٹھیک بولیں آپ......بس یوں سمجھیں اللہ نے ان بدخواہوں کی زبانیں بند کرنے کو یہ دو دن کی خوشی دکھلائی تھی جو کہتے تھے میری کوکھ سے بیٹا پیدا نہیں ہوسکتا...... خیر گیا وہ وقت...... اللہ نے صبر دے دیا۔'' ثمینہ نے بات کے اختتام پر ٹھنڈی آہ بھری۔

''ہاں...... صبر تو اللہ ہی دیتا ہے۔ بیٹے تو دنیا کی زینت اور گھر کا چاند ہوتے ہیں۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے میرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور''

شعر کے اختتام پر ایک سرد آہ ان کے سینے کی قید سے بھی آزاد ہوئی۔ آپا بتول اپنے زمانے کی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ ادیب فاضل پڑھی ہوئی تھیں غالب کے پرستاروں میں نام لکھاتی تھیں۔ جواب میں اب ثمینہ خاموش تھیں یا یہ سوچ رہی تھیں کہ خالہ کو اس عمر میں اتنا مشکل شعر کیسے یاد رہا، وہ تو اپنے ہاتھ سے رکھی قینچی ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔

''ماشاء اللہ...... خیر تمہاری تو بیٹی بھی چاند جیسی ہے۔ اس سے بڑی بھی اس سے ملتی جلتی ہی ہوں گی...... بھئی میری تو ساری عمر ابوظہبی میں گزر گئی۔ بچیاں خالہ کے پاس آئی بھی ہوں گی تو میں کا ہے دیکھتی۔''

''ہاں بس...... جب تک اسکول داخل نہیں

ہوئی تھیں تو میرے ساتھ آتی جاتی تھیں جب اسکول پڑھنے لگیں تو کون آنے لگا اتنی دور...... شاہینہ کو جب موقع ملتا تو بیچاری خود ہی آ کر شکل دکھا دیتی تھی۔ اللہ بھلا کرے اور پھر پیسے کے کھیل، جہاز میں بیٹھی لاہور آ گئی وہاں سے ٹیکسی کر کے وزیر آباد پہنچ گئی۔ شکر ہے اسے دولت کا نشہ نہیں چڑھا۔ خون کے رشتوں کو نہیں بھولی، میں تو اب بھی نہ آتی بہت ضد کی کہ آپا میرے پہلے، پہلے بیٹے کی شادی ہے آپ کو ضرور آنا ہے۔ مجھے بھی بہن کا مان رکھنا پڑا۔ ایک ہی بھائی ہے وہ بھی پرائے دیس روزی کماتا ہے بس یہی کچھ سوچا اور چلی آئی۔'' ثمینہ نے اپنی دانست میں نشست تمام کی اور ہاتھ میں پکڑا چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھ کر سیاہ دانوں کی چمکدار تسبیح اٹھا لی۔ آپا بتول اب گہری سوچ میں تھیں۔

''ماشاء اللہ بچی بہت پیاری ہے۔ اچھا کیا سنگ لے آئیں۔ ایسے موقعوں پر ہی بعض اوقات بہت اچھے رشتے مل جاتے ہیں۔ لڑکیاں بالیاں نظروں میں آ جاتی ہیں۔ اللہ نیک نصیب کرے۔'' آپا بتول کی دعا پر ثمینہ نے آمین کی مہر لگائی اور درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

''اندر سے تقریباً ہر مرد حیات خالو جان سے ملتا جلتا ہی ہوتا ہے۔'' شادان، شانزے کے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں پانچ ڈائمنڈ جڑی بیش قیمت انگوٹھی پہناتے ہوئے بظاہر مسکرا کر درحقیقت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''تو کیا آپ کو پہلے سے پتا نہیں تھا کہ وہ الٹرا ماڈرن ہیں اور ان کے بوائے فرینڈز بھی ہیں؟'' دلہن بنی شانزے حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''سب پتا تھا لیکن اس نے منگنی سے پہلے کمٹمنٹ کی تھی کہ وہ اب اپنے بوائے فرینڈز کو چھوڑ دے گی۔ وہ ہائی سوسائٹی موو کرتی ہے وہاں بوائے فرینڈز بنانا روٹین کی بات ہوتی ہے۔ شروع ہی سے وہ کو ایجوکیشن میں پڑھی پھر ایک بڑے ادارے سے ایم بی اے کیا۔ اتنی ہائی کوالیفائڈ لڑکی کے بارے میں کون الٹا سیدھا سوچتا ہے۔ مہندی والے دن کیا ہوا، وہ تو پتا ہی ہوگا تمہیں؟'' یہ کہہ کر شادان اپنی شیروانی اتارنے لگا۔

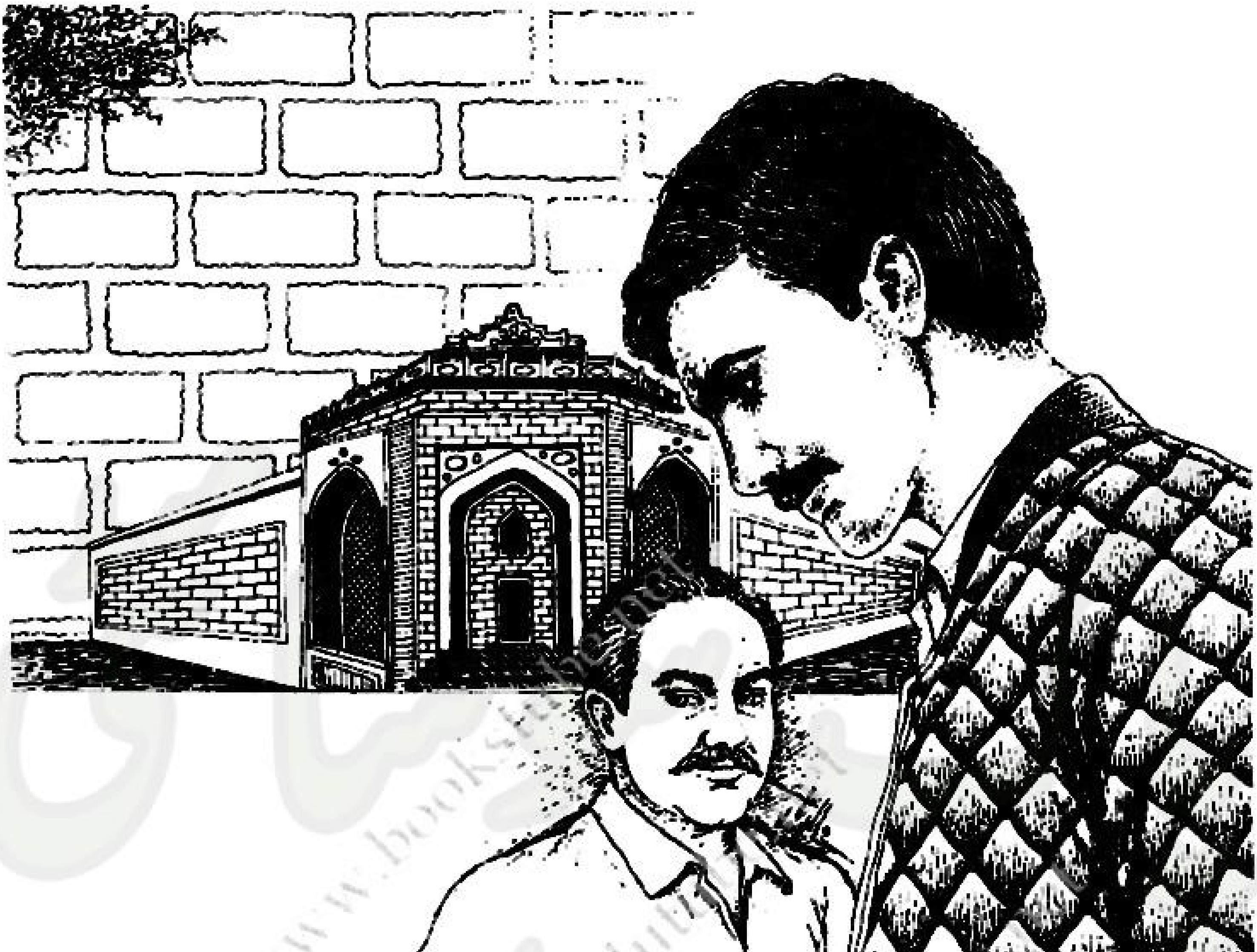
''جی...... مجھے تو بس یہ پتا ہے کہ سومی اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ فوٹو بنوانا چاہ رہی تھی اس نے آپ کو بھی صوفے سے اٹھنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ آپ کو اس بات پر غصہ آیا ہوگا؟'' شانزے نے بہ مشکل اپنی حیا آلود نظریں اٹھائیں۔

''Obviously'' شادان نے اعتراف کرنے میں دیر نہ لگائی۔ ''میں ممی کی پسند سے شادی کر رہا تھا لو افیئر چلا کر شادی کرتا تو شاید کچھ دیر سوچتا۔ اس نے کہا کہ تمہیں تو کسی ایک گز کی چوٹی والی مڈل پاس لڑکی سے شادی کرنی چاہیے۔ نیرو مائنڈڈ، کنزرویٹو ہونے کے جو طعنے دیے وہ الگ۔'' وہ حیرت زدہ سی اسے بولتا سن رہی تھی۔

''اس رات گھر واپس آ کر شاید ہی کوئی سویا ہوگا۔ سب حیران تھے کہ کیا ہو گیا۔ میں بھی ساری رات جاگ کر حیران پریشان سوچتا رہا، اپنے آپ سے الجھتا رہا...... کمال بات ہے کہ کمرے میں چاروں طرف تم کھڑی ہوئی تھیں۔''

''میں......؟'' شانزے نے بدحواس ہو کر شادان کی طرف دیکھا۔

''ہوں۔'' شادان بیٹھ گیا۔ ہونٹوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ تھی۔ ''ذرا ایک بار پھر کہو میں شانزے ہوں۔'' شادان نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر شانزے نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے۔



ناولٹ

متاعِ دل

نبیلہ ابر راجا

دوسرا حصہ

باہر اسٹڈی کے دروازے کے ساتھ مائرہ چپکی کھڑی تھی۔ وہ شاہ زیب کے پیچھے آئی تھی۔ وہ خود اپنے کانوں سے سب کچھ سننا چاہتی تھی۔ شاہ زیب نے اپنی بات کر دی تھی اب اندر خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔

''تمہارے ذہن میں یہ بات کیسے آئی...... ابھی تو تمہاری عمر یہ باتیں کرنے کی نہیں ہے؟'' عمر زیب بڑے تلخ انداز میں گویا ہوئے۔ باہر کھڑی مائرہ سر تا پا سلگ اٹھی۔



''عشق عاشقی کے چکر سے نکل آؤ اور اپنی تعلیم پر توجہ دو چلو جاؤ اپنے کمرے میں۔'' عمر قطعی بے لچک اور ٹھوس انداز میں بولے۔ شاہ زیب کے کندھے جھک سے گئے وہ تھکے، تھکے قدموں سے باہر نکلا۔ مائرہ تیزی سے دروازے کی اوٹ میں ہوگئی۔ شاہ زیب اس کی وہاں موجودگی سے بے خبر آگے بڑھ گیا۔ جب وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تب وہ دروازے کی اوٹ سے باہر نکلی۔ اس کے تو پورے وجود میں آگ لگ گئی تھی۔ عمر چچا نے شاہ زیب کی اچھی خاصی انسلٹ کردی تھی اور اس کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلا تھا۔

''بزدل کہیں کا۔'' اس نے بڑے تنفر سے یہ لفظ ادا کیے۔ وہ ابھی اور اسی وقت شاہ زیب سے اس بزدلی کی بابت بات کر کے شرم دلانا چاہتی تھی مگر رات کافی ہوگئی تھی اور اسے غصہ بھی بہت زیادہ آیا ہوا تھا۔ وہ بات کرتی تو لازماً اس کی آواز اونچی ہو جاتی اور پھر کوئی نہ کوئی جاگ جاتا پھر نہ جانے کیا ہوتا۔

اب گھر میں شاہ زیب سے بات نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ دُرِ یکتا اور پھر عمر زیب موجود ہوتے۔ اس بات کو کرنے کے لیے سکون، فراغت اور تنہائی درکار تھی۔ سو اس کے لیے باہر ہی کوئی جگہ مناسب تھی۔ جہاں کسی کے مخل ہونے کا امکان نہیں ہوتا۔ وہ آنکھیں موند کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

دوسری طرف عمر زیب اور شاہ زیب بھی جاگ رہے تھے۔ عمر کی پریشانی اپنی جگہ تھی۔ شاہ زیب نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر محبت اور شادی کی بات کی تھی۔ شاہ زیب کی پریشانی اپنی نوعیت کی تھی کہ پپا نے اس کی بات ہی نہیں سنی الٹا انسلٹ کردی ہے۔ تینوں نفوس اپنی، اپنی جگہ خود کو حق بجانب تصور کر رہے تھے۔

☆☆☆

مائرہ اور شاہ زیب کالج جانے کے بجائے ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ یہاں فیملی کیبن بھی تھے۔ وہ دونوں بھی ایسے ہی ایک کیبن میں موجود تھے۔ دُرِ یکتا کو ڈراپ کر کے دونوں نے یہاں بیٹھ کر بات کرنے کا پروگرام بنایا۔

مائرہ بہت پریشان، پریشان سی لگ رہی تھی۔ شاہ زیب کی اپنی حالت اس سے مختلف نہیں تھی۔ رات بھر اسے نیند نہیں آئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار، مار کر روئے۔ مائرہ نے اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ رات عمر چچا اور اس کے مابین ہونے والی گفتگو وہ سن چکی ہے۔

''آپ نے چچا سے بات کی رات کو؟'' شاہ زیب نے سر جھکا لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مائرہ اس کے چہرے کے تاثرات میں موجود شکست کی کوئی تحریر پڑھ سکے۔

''ہاں کی تھی۔'' خاصی دیر بعد وہ گویا ہوا۔

''پھر چچا نے کیا جواب دیا؟'' وہ ایک بار پھر نگاہیں چرانے لگا۔

''میں نے بات کی پپا سے..... وہ کہتے ہیں ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے ہو پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بہت شرمندہ نظر آرہا تھا۔ مائرہ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگنے لگی۔

''شاہ زیب میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ عمر چچا کبھی نہیں مانیں گے۔ مجھے ان کے انداز میں اپنی ساری فیملی کے لیے ایک عجیب اور بے نام سی نفرت نظر آتی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ کبھی مانیں گے۔ ٹھیک ہے امی، ابو باسط کے لیے ہاں کردیں گے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ نے تو اپنی طرف سے کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ آپ شاید میری قسمت میں نہیں ہیں۔ اس لیے ابتدائی مرحلے میں ہی انکار ہوگیا ہے۔ ویسے بھی بینا خالہ، امی کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں کہ جلدی سے ہاں کردیں۔'' مائرہ نے مصنوعی کمالِ معصومیت سے شاہ زیب کے جذبات بھڑکانے کی کوشش کی۔ شاہ زیب کے دل پر باسط کے نام سے چھریاں سی پھر گئیں وہ جیسے تڑپ ہی تو اٹھا۔

''پپا کو ماننا ہوگا۔ تم میری محبت ہو، تمہارے لیے مجھے اگر پپا کو چھوڑنا پڑا تو یہ بھی کرلوں گا۔''

''اتنا حوصلہ اور ہمت ہے آپ میں؟'' مائرہ

اسے آزما رہی تھی۔

''حوصلہ اور ہمت بہت ہے، وقت آنے پر تم بھی دیکھ لوگی۔'' اس کے لہجے میں پختہ چٹانوں کا سا عزم تھا۔

''اور کون سا وقت آئے گا' بیٹا خالہ فون پر فون کیے جا رہی ہیں اور ادھر عمر چچا مان ہی نہیں رہے ہیں۔'' وہ جھنجلا اٹھی۔

''کہا ناں پریشان نہ ہو...... بہت جلد تم میری ہوگی۔ پپا کو ماننا ہوگا آخر کو عاقل و بالغ ہوں وہ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔ میں ان سے ان کی نفرت کا سبب بھی پوچھوں گا۔'' اس سے وہ بہت خود غرض اور سنگ دل سا نظر آ رہا تھا۔ سرشاری مائرہ کی رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ منزل دور نہیں تھی۔ شاہ زیب چٹانی عزائم رکھتا تھا۔ اس نے اپنی منوا کے چھوڑنی تھی۔ مائرہ کو یقین ہو چلا تھا۔

☆☆☆

دُرِ یکتا بے چینی سے بھائی کا انتظار کر رہی تھی وہ اسے ابھی تک لینے نہیں آیا تھا۔ چھٹی ہوئے بھی آدھا گھنٹہ ہو رہا تھا۔ اس نے چوتھی بار رسٹ واچ پر وقت کا اندازہ لگایا تھا۔ اِدھر شاہ زیب ابھی تک مائرہ کے ساتھ تھا۔ اسے تیزی سے بھاگتے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا کہ دریکتا اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ مائرہ نے ہی کہا کہ دُرِ یکتا کی چھٹی ہو چکی ہوگی تب ہی اسے ہوش آیا اور وہ تیزی سے کی چین اٹھا کر گاڑی کی سمت لپکا۔

وہ سراپا انتظار تھی اس کے تاخیر سے آنے کا سبب اس نے نہیں پوچھا بلکہ خاموشی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ مائرہ خلافِ توقع آج اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی ورنہ وہ بھی اس کے ساتھ پیچھے ہی بیٹھتی تھی۔ واپسی کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ تینوں میں سے کسی نے بات میں پہل نہ کی۔

شاہ زیب گاڑی میں چابی یونہی لگی چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ مائرہ بھی بیگ اٹھا کر فوراً اتر گئی۔ ان دونوں کا رویہ دریکتا کو بہت عجیب اور پُراسرار سا لگ رہا تھا۔ وہ کوئی بات بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ رات جو کچھ ہوا دُرِ یکتا اس سے لاعلم تھی۔ ورنہ شاید اس خاموشی کا سبب کسی نہ کسی حد تک وہ جان ہی لیتی۔

☆☆☆

شاہ زیب کے زور، زور سے بولنے کی آواز پر دُرِ یکتا نے بہت تیزی سے سلام پھیرا۔ اس کا دل دہل سا گیا پھر اس سے دعا ہی نہیں مانگی گئی۔ اس نے مصلیٰ یونہی چھوڑا اور تیزی سے باہر دوڑ لگائی۔ شاہ زیب آج سے پہلے کبھی اس طرح اونچی آواز میں نہیں بولا تھا۔ ٹی وی لاؤنج کا منظر اس کے لیے خاصا پریشان کن تھا۔ شاہ زیب، پپا کے سامنے اکڑ کر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرکشی اور ہٹ دھرمی واضح تھی۔ وہ دور ہی کھڑی ہوگئی۔

''میں عاقل و بالغ ہوں، مجھے اپنی پسند منتخب کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔ مجھے میرے دین نے بھی پسند کی شادی کا پورا حق دیا ہے۔'' وہ گویا ایک، ایک لفظ چبا کر بول رہا تھا۔

''گیٹ لاسٹ شاہ زیب۔'' عمر زیب پوری قوت سے دہاڑے مگر وہ اُدھر ہی جما رہا۔

''میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں شادی کروں گا تو صرف مائرہ سے۔ میں جا رہا ہوں فی الحال لیکن پپا یہ مت سمجھیے گا کہ میں نے ہار مان لی ہے۔ آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ لیں پھر مجھے جواب دیں۔ میں انتظار کرلوں گا ایسی بھی بے صبری نہیں مجھے۔'' اس وقت دُرِ یکتا کو شاہ زیب بہت خود غرض نظر آ رہا تھا۔ پپا کے سامنے کس طرح بدتمیزی سے اکڑ کر کھڑا تھا۔ مائرہ کے نام لیے جانے پر اس پر ساری حقیقت کھل گئی کہ سارا جھگڑا اور اصل کس بات پر ہے۔

شاہ زیب دھم دھم کرتا دریکتا کو ہاتھ سے پرے کرتا نکل گیا۔ وہ بھاگ کر پپا کے پاس آئی جو کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئے تھے۔

''پپا آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟'' وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے جو بے حد سرد محسوس ہو رہے تھے۔

''جاؤ، میں ٹھیک ہوں۔'' ان کے لہجے میں

آنسوؤں کی آمیزش صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ دُرِ یکتا کے دل کو کچھ ہوا۔

''پپا کیا ہوا ہے آپ کو..... اور بھائی اس طرح کیوں چیخ رہا تھا۔ مجھے بھی تو بتائیں ناں؟'' وہ سخت متوحش تھی۔

''بیٹھو اِدھر میرے پاس۔'' عمر زیب نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ان کی پیشانی کی ایک رگ بار، بار پھڑک رہی تھی اور یہ اسی وقت ہوتا تھا جب وہ بہت پریشان ہوتے اور کسی سے کچھ کہہ نہ پاتے۔ آج ایسا لگ رہا تھا اگر انہوں نے دل پر پڑا بوجھ نہ اتارا تو ان کا دماغ و دل، وجود سب ریزہ، ریزہ ہوکر فضا میں بکھر جائے گا۔ وہ باپ کے دونوں ہاتھ تھامے سخت پریشانی کے عالم میں انہیں دیکھ رہی تھی۔ عمر نے مسکرانے کی کوشش کی پر اس کوشش میں وہ دریکتا کو پہلے سے بڑھ کر قابلِ رحم لگے۔ اس کا دل کٹنے لگا اور آنکھوں میں نمی در آئی۔

''وہ کہتا ہے کہ مائرہ کے لیے میرا پروپوزل لے کر جائیں فوراً ورنہ اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر اس کی بات نہ مانی گئی تو وہ کورٹ میرج کرلے گا۔ کچھ اللہ سیدھا کرلے گا اپنے ساتھ۔'' وہ یک دم برسوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے۔ دریکتا باپ سے بڑھ کر پریشان تھی۔ یکا یک شاہ زیب کو کیا ہوگیا تھا کیسی باتیں کررہا تھا وہ۔ پپا کے سامنے اس نے آنکھیں اٹھا کر بات نہ کی تھی اور آج خود اس نے شاہ زیب کو کتنی بدتمیزی سے بات کرتے سنا اور دیکھا۔

مائرہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ سارا دن اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ شاہ زیب دل کی بھڑاس نکال کر جاچکا تھا۔ دریکتا اور عمر زیب بالکل خاموش تھے۔ ایک طوفان نے ان کے آشیانے کا رخ کرلیا تھا۔ یہ طوفان اپنے ساتھ سب کچھ بہا لینے کے درپے تھا۔

''پپا پریشان مت ہوں سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' دریکتا نے بھیگی آنکھوں سمیت مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے تسلی دی تو وہ فقط سر ہلا کر رہ گئے۔

عمر زیب نے آنے والے وقت کی آہٹوں کو پہچان لیا تھا۔ شاہ زیب کے تیور ہار ماننے والے نہیں لگ رہے تھے انہیں ہی جھکنا تھا۔ ساری عمر خود کو خاندانی سازشوں کے تانے بانوں سے دور رکھا تھا پر اتنی احتیاط کے باوجود ہونی ہوکر رہی تھی۔ اس بار جب وہ گاؤں گئے تو تینوں بھائیوں نے جس طرح رشتوں کی بات کی تھی تب سے وہ اندر ہی اندر کھٹک گئے تھے مگر انہیں کچھ خوش فہمیاں بھی لاحق تھیں جو شاہ زیب کی سرکشی نے دور کردی تھیں۔ مائرہ، بھائی کی بیٹی تھی اپنا خون تھا۔ اگر یہ شادی ہوجاتی تو اس میں مضائقہ بھی تو نہیں تھا پر شیریں بھابی نے مائرہ کو مہرہ بنا کر آگے بڑھایا تھا وہ اچھی طرح جان گئے تھے۔

☆☆☆

برآمدے اور بیرونی گیٹ کے علاوہ سارے گھر کی لائٹیں آف تھیں۔ شاہ زیب نے گاڑی ڈرائیو وے پر کھڑی کرکے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ سارا گھر خاموشی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پپا کے بیڈروم کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک ثانیے کے لیے اس کے قدم رکے پھر فوراً ہی آگے بڑھ گئے۔ مائرہ اسی کا انتظار کررہی تھی۔ وہ تو جیسے شاہ زیب کی آمد کے انتظار میں دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اس کے قدموں کی مخصوص چاپ کو پہچان کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ ملگجی سی روشنی میں اس کا سراپا واضح تھا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے شاہ زیب کو خاموشی کا اشارہ کیا۔ دونوں اندر آکر بیٹھ گئے۔

مائرہ کے رتجگے کی گواہ آنکھیں سرخ، سرخ سی نظر آرہی تھیں۔ جیسے بہت دیر تک روتی رہی ہو۔ شاہ زیب کو پپا کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے جو ملال ہوا تھا، مائرہ کی آنکھیں دیکھ کر پل بھر میں مٹ گیا۔

''تم نے کھانا کھایا؟''

''نہیں۔'' مائرہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں نہیں کھایا؟'' وہ فکرمندی سے بولا۔

''بس جی نہیں چاہ رہا تھا عمر چاچا آپ سیٹ رہے

ہیں۔ آپ نے اس طرح بول کر اچھا نہیں کیا ہے۔ بات منوانے کے، ضد کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ اب وہ سوچ رہے ہوں گے اس کے پیچھے میری امی کا اور میرا ہاتھ ہے، جس کی وجہ سے آپ ان سے یوں بولے۔ میں اپنی فیملی اور اپنی عزت کے معاملے میں بہت حساس ہوں آپ کو پتا ہونا چاہیے۔'' مائرہ کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

''تمہاری عزت میری عزت ہے، پیا کچھ کہہ کے تو دیکھیں۔ میں ان سے ابھی جواب مانگ لیتا پر وہ سو رہے ہیں کل دیکھوں گا اور تم فکر مت کرو۔ وہ نارمل ہو جائیں گے۔'' شاہ زیب نے اسے دائیں بازو کے گھیرے میں سمیٹ لیا۔ کچھ پل اسی کیفیت میں گزر گئے مگر پھر بہت جلد مائرہ اس سے دور ہوئی۔

''آپ جائیں آرام کریں، رات کافی ہو گئی ہے۔ اس طرح یہاں بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں بہت جلد تم میرے پاس ہو گی پھر دیکھوں گا کہاں بھاگ کے جاؤ گی مجھ سے۔'' شاہ زیب ٹھنڈی سانس بھرتا پلٹ گیا۔ اگر وہ ایک بار پیچھے مڑ کے دیکھ لیتا تو اسے مائرہ کی آنکھوں میں انجانی سی خوشی اور کامیابی کی چمک صاف نظر آ جاتی۔

اسے مائرہ کی آنکھوں کی سرخی نظر آ گئی تھی پر عمر زیب کے دل کا خون جس کا عکس ان کے چہرے پر تھا اسے بالکل نظر نہیں آیا تھا۔ اس کی سرکشی کا گھاؤ بھرنے والا نہیں تھا۔ اپنی دلی خواہشات کے سامنے ان کی تکمیل کے سامنے اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ محبت کی کالی پٹی جوان آنکھوں پر بندھ جائے تو پھر اپنی بھلائی بھی نظر نہیں آتی۔

☆☆☆

عمر شکست خوردہ نظر آ رہے تھے۔ شاہ زیب آج بھی ان کے سامنے کھڑا تھا۔ پر آج اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ عمر نے ہار مان لی تھی اور مائرہ کے گھر رشتہ جلد لے جانے کا کہہ دیا تھا۔

''تم فکر مت کرو، میں بہت جلد اورنگزیب بھائی سے بات کروں گا۔ اب مائرہ کا اس طرح ہمارے گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ جس لڑکی نے کل بہو بن کر ہمارے گھر آنا ہے اسے اپنے ماں باپ کے پاس موجود ہونا چاہیے۔'' شاہ زیب بہت شرمندہ تھا پر عمر نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔ ''بس ٹھیک ہے میں غلطی پر تھا۔ کچھ بھی سہی مائرہ میرے بھائی کی بیٹی ہے ایک طرح سے میرا اپنا خون ہے۔ وہ میری بہو بن جائے تو اچھی بات ہے۔ اپنے خاندان کے ساتھ میرا رشتہ اور مضبوط ہو جائے گا۔ اچھا ہے میرے پاس اپنی برسوں پرانی غلطی کی تلافی کا سنہری موقع ہے۔'' آخری جملہ انہوں نے بہت ہی آہستہ آواز میں کہا۔ جو کوشش کے باوجود شاہ زیب نہ سن سکا۔ اسے تو آج اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی تھی۔ دلی مراد اتنی آسانی سے پوری ہونے جا رہی تھی۔ اس کے پاس مزید کچھ سوچنے کا ٹائم ہی نہیں تھا۔ ہنستا مسکراتا وہ مائرہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لیے ڈھونڈنے لگا۔

☆☆☆

عمر زیب نے طاہر لغاری کو بھی گاؤں ساتھ جانے کے لیے کہا تھا۔ ہاں ردیکا اور شاہ زیب اس بار ساتھ نہیں جا رہے تھے۔ صرف عمر زیب اور طاہر لغاری ہی جا رہے تھے۔ شاہ زیب کے لیے مائرہ کا رشتہ طلب کرنا تھا۔ رسم و رواج کو بھی تو دیکھنا تھا ورنہ شاہ زیب کا بس چلتا تو مائرہ کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس لے آتا ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے۔

☆☆☆

ان دونوں کے ساتھ مائرہ بھی آئی تھی۔ وہ اپنی ساری چیزیں بھی سمیٹ کے لے آئی تھی۔ ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ گھر میں ہونے والی سرگرمیوں سے بے خبر رہتی پھر شاہ زیب اسے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بتاتا تھا۔ اس لیے وہ گاؤں واپسی پر بہت خوش تھی۔

عمر زیب کے ساتھ طاہر لغاری اور مائرہ کو دیکھ کر شیریں ٹھٹک سی گئیں۔ مائرہ نے اشاروں میں ان کی آمد کا مقصد بتا دیا تھا۔ ان کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہارون اور نوید تک بھی خبر پہنچ گئی اور یہ کیسے ہو سکتا

تھا کہ دونوں کی بیویوں کو پتا نہ چلتا۔ ذرا سی دیر میں سب ان کے ہاں جمع ہو گئے۔ عمر نے اپنی آمد کی غرض و غایت بیان کر دی اور نگزیب بھائی بہت خوش ہوئے۔ اٹھ کر بھائی کو گلے لگایا۔

''مائرہ تمہاری بیٹی ہے، اب یہ ہماری نہیں ہے نہ اس پر ہمارا کوئی حق ہے۔'' اورنگزیب کے لہجے سے ہی ان کی خوشی محسوس کی جا رہی تھی۔

فرح اور فوزیہ قدرے الگ بیٹھی شیریں کو دیکھ رہی تھیں۔ سب کو مٹھائی کھلاتے ہوئے وہ کتنی خوش نظر آ رہی تھیں جیسے میدان مار لیا ہو۔ شاہ زیب اور مائرہ کی بات پکی ہو گئی تھی۔ اب مائرہ اپنے گاؤں سے ہی کالج آتی جاتی جو ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔

☆☆☆

''میں کہتی ہوں اب آپ بھی بات کریں عمر بھائی سے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور یہ تیزی دکھا جائے آپ اپنے طور پر کہہ دیں عمر بھائی سے تاکہ سب کو پتا چل جائے۔'' فوزیہ اور نوید میں بحث چل رہی تھی۔

''ارے میں کیسے بات کروں پچھلی بار اس موضوع پر بات ہوئی تھی تو عمر نے کہا تھا کہ ابھی دریکتا پڑھ رہی ہے، چھوٹی ہے اس کے بعد دیکھا جائے گا۔'' نوید نے پرانی بات الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ پھر سے اپنی شریکِ سفر کے سامنے دہرائی تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گئی۔

''ابھی آپ عمر بھائی کے پاس تو نہیں گئے ہیں ناں۔ جب ہم ان کے گھر جا کر اسجد کے رشتے کی بات کریں گے تو پھر وہ یہ بات نہیں کہیں گے کہ ہماری بیٹی چھوٹی ہے۔ یہ تو ہر باپ کہتا ہے مگر ایک نہ ایک دن بیٹی ذات کو پرائے گھر رخصت تو کرنا ہوتا ہے۔ عمر خوش ہوگا، ہمارا اسجد لائق فائق ہے، اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ عمر کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے بیٹی دینے میں۔ آخر کو اورنگزیب بھائی کی طرح آپ بھی اس کے بھائی ہیں۔ شیریں بھابی نے تو ایک بار بھی نہیں کہا کہ ہماری مائرہ چھوٹی ہے۔ انہوں نے تو جیسے شکر ادا کیا شاہ زیب کے رشتے پر۔ آخر کو اتنی بڑی جائداد کا وارث ہے۔ راج کرے گی مائرہ۔'' فوزیہ کے لہجے سے رشک و حسد صاف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی اور نوید خاموشی سے سن رہے تھے۔ دل میں بیگم کی باتوں سے وہ بھی متفق تھے۔

☆☆☆

کچھ اسی طرح کی باتیں حویلی کے دوسرے حصے میں موجود فرح اور ہارون میں بھی ہو رہی تھیں۔ فرح تو باقاعدہ شوہر سے لڑ رہی تھیں۔

''آپ منہ دیکھتے رہ جائیں گے اور فوزیہ، نوید بھائی کے ساتھ رشتے کے لیے چلی جائے گی۔ آپ بھی عمر کے بھائی ہیں اس کی بیٹی پر ہمارا بھی حق ہے۔''

''میں دو تین دن تک جاؤں گا عمر کی طرف۔'' بالآخر ہارون زیب نے فیصلہ کر ہی لیا۔ فرح کی باچھیں خوشی سی چر گئیں۔

''میں بھی تو جاؤں گی ناں۔ آخر کو قاسم کی ماں ہوں صاف کہہ دوں گی عمر بھائی سے کہ دُریکتا ہماری امانت ہے۔'' وہ ہاتھ نچا کے بولی۔ ہارون دل میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ عمر نے تو کہہ دیا تھا کہ جب تک دریکتا تعلیم سے فارغ نہیں ہو جاتی اس وقت تک وہ اس کا رشتہ طے کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور فرح نے ناک میں دم کیا ہوا تھا کہ جاؤ اور جا کے عمر بھائی سے بات کرو۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں فوزیہ اور نوید ان سے پہل کرنے میں بازی نہ لے جائیں۔ شیریں بھابی کی تیزی و عقل مندی سے دونوں ہی خائف تھیں۔

☆☆☆

ایک بوجھ عمر کے سر سے اتر گیا تھا۔ شاہ زیب کی ضد پوری ہو گئی تھی۔ اب بہن ہونے کی حیثیت سے دریکتا کے اپنے ارمان تھے۔ وہ چاہ رہی تھی کہ دھوم دھام سے بھائی کی منگنی ہو۔ عمر زیب اس کی خواہش ٹال نہیں سکتے تھے چنانچہ منگنی کے دعوت نامے چھپوائے گئے۔ دوست احباب میں تقسیم ہوئے۔ مائرہ کے لیے بوتیک سے زرق برق منگنی کا جوڑا لیا گیا ساتھ جیولری بھی

بہت دھوم دھام سے منگنی ہوئی۔ اب باضابطہ طور پر مائرہ، شاہ زیب کی منگیتر بن گئی تھی۔ وہ روز گاؤں پہنچا ہوتا یا پھر مائرہ کے کالج۔ اپنے مستقبل اور پڑھائی کی طرف سے وہ بالکل بے پروا ہو گیا تھا۔ دل و دماغ میں مائرہ سے ملنے کی دُھن سمائی رہتی۔ باقی دنیا کی کسی چیز کا اسے ہوش نہیں تھا۔ اس کی دنیا مائرہ سے شروع ہو کر مائرہ پر ہی ختم ہوتی تھی۔ پتا نہیں اس نے شاہ زیب پر ایسا کیا جادو کیا تھا جو اسے اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

☆☆☆

عمر زیب کی طبیعت گزشتہ ہفتے سے خراب تھی۔ تھوڑا سا گلا خراب ہوا اس کے بعد زکام شروع ہوا پھر پورے جسم کو بخار نے جکڑ لیا۔ وہ کہیں آنے جانے کے قابل ہی نہیں رہے تھے گھر پر بستر کے ہی ہو کے رہ گئے۔ طاہر لغاری دو دن پہلے آ کے دیکھ گئے تھے پھر اس کے بعد وہ بھی نہیں آئے۔ ان کا بیٹا انگلینڈ سے آیا ہوا تھا وہ دوستوں اور رشتے داروں سے ملنے ملانے میں لگے ہوئے تھے۔ اشعر انگلینڈ میں ہی مقیم تھا، آج کل چھٹیوں میں پاکستان آیا ہوا تھا۔ طاہر بہت خوش تھے اشعر کے آنے سے پہلے وہ روز عمر زیب کے پاس آتے کافی دیر بیٹھتے، گپ شپ لگاتے وہ نہیں آ رہے تھے تو عمر بھی اداس، اداس تھے۔ طاہر سے بات کر کے وہ اپنے مسئلے، مسائل دکھ درد بھول جاتے۔

نویں دسویں دن ان کی حالت میں کچھ بہتری ہوئی تو وہ خود گاڑی ڈرائیو کر کے طاہر کی طرف چلے گئے۔ وہاں خوشیوں کے سارے رنگ اترے ہوئے تھے۔ طاہر لغاری کے اکثر رشتے دار اشعر کی آمد کا سن کر آئے ہوئے تھے۔ جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔

طاہر لغاری سے حقیقی معنوں میں دوستی راحیلہ کی شادی کے بعد شروع ہوئی تھی۔ طاہر اس وقت انگلینڈ سے آئے تھے ان کے بیوی بچے وہیں تھے۔ طاہر کا اپنا بزنس تھا اور اس میں وہ خاصے کامیاب تھے۔ راحیلہ کے ساتھ شادی پر آمادہ وہ طاہر ہی کی وجہ سے ہوئے تھے۔ بعد میں طاہر پھر انگلینڈ واپس لوٹ گئے۔

دو بیٹیاں اور ایک بیٹا وہیں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کی بیگم ایک اتفاقی حادثے میں اللہ کو پیاری ہو گئی تو انہوں نے دیکھ بھال کر دونوں بیٹیوں کی شادیاں اُدھر ہی انگلینڈ میں ہی کر دیں اشعر دونوں بہنوں سے چھوٹا تھا۔ چار سال پہلے طاہر لغاری مستقل طور پر پاکستان لوٹ آئے تھے۔ یہیں گھر بنایا ان کے اکثر رشتے دار بھی اِدھر ہی تھے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اشعر نے بھی ان کے پاس لوٹ آنا تھا۔ بیٹیاں بھی اکثر و بیشتر پاکستان ان کے پاس چکر لگا جاتیں۔ وہ خوش تھے اور بے فکر زندگی گزار رہے تھے۔ فکرِ معاش سے آزاد تھے اس لیے بڑھاپے میں بھی عمر چور تھے۔ چہرے پر تازگی اور مسکراہٹ رہتی۔ وہ ہنسنے ہنسانے والے انسان تھے اسی بنا پر عمر زیب کی ان کے ساتھ بہت بنتی تھی۔

عمر زیب کو دیکھ کر طاہر گرم جوشی سے ان سے بغل گیر ہو گئے۔ اشعر بھی ان کی تقلید میں اٹھ کھڑا ہوا اور عمر سے ملا۔ وہ چند ثانیے کے لیے اسے دیکھتے رہ گئے۔ بہت شاندار شخصیت تھی اشعر کی۔ لمبا چوڑا، کڑیل جوان، اس کی گرفت میں مضبوطی اور سختی تھی۔

''اللہ نظرِ بد سے بچائے۔'' انہوں نے دل ہی دل میں دعا دی۔ وہ ان سے حال احوال پوچھ رہا تھا۔ بہت صاف اور رواں اردو میں لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ انگلینڈ میں پلا بڑھا ہے۔ طاہر نے اپنی اولاد کو اپنی روایات اور ماحول سے الگ نہیں کیا تھا۔ وہ انگلینڈ میں رہ کر بھی پاکستانی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ویسے بھی اشعر پاکستان آتا جاتا رہتا تھا۔ یہاں کا کلچر، رہن سہن، زبان کچھ بھی اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

عمر زیب کافی دیر اس سے باتیں کرتے رہے۔ اشعر کچھ کام مکمل کرنے کے بعد پاکستان میں ہی رہنے کا خواہش مند تھا۔ آئندہ دو ایک سالوں میں اس نے لوٹ آنا تھا۔ وہ بہت باشعور اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ اس لیے عمر کو اچھا بھی لگا اُدھر ان کا اپنا لاڈلا بیٹا تھا جسے آج کل کسی چیز کا ہوش ہی نہیں تھا۔ اسے بس گاؤں اور مائرہ کے کالج کے چکر لگانے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ رات کا

کھانا کھائے بغیر طاہر اور اشعر نے انہیں اٹھنے نہیں دیا۔

☆☆☆

کالج کے باہر گاڑی لیے شاہ زیب، مائرہ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں گیٹ سے باہر نکلی تو پہلی نگاہ شاہ زیب پر ہی پڑی۔ اس کی ساتھی لڑکیوں نے بھی کھی کھی کرکے ہنسنا شروع کر دیا۔

''کیوں ہنس رہی ہو تم لوگ؟'' مائرہ شرمندہ ہو کر انہیں ڈانٹنے لگی۔

''تمہارا دیوانہ آج پھر آیا ہوا ہے۔'' سمرن اس کی گہری دوست چہک کر بولی۔

''ہاں، میں بھی میں دیکھ رہی ہوں۔'' وہ کچھ تنک کر بولی تو سمرن حیرت سے اسے تکنے لگ گئی۔ شاہ زیب دولت مند اور خوب صورت ہونے کے ساتھ، ساتھ مائرہ کو بے پناہ چاہتا تھا۔ مائرہ بڑے فخر سے بتاتی تھی کہ شاہ زیب نے اس کی خاطر اپنے چچا سے ٹکر لی اور لڑ جھگڑ کر اسے اپنایا ہے۔ اس چویشن میں کبھی، کبھی سمرن کو اس کی بیزاری سمجھ نہیں آتی تھی حالانکہ مائرہ، شاہ زیب کے مقابلے میں اتنی حسین بھی نہیں تھی۔ وہ سب فرینڈز شاہ زیب کی پرسنالٹی اور اس کی نت نئی مہنگی گاڑیوں سے خاصی متاثر تھیں پر مائرہ کی تیوریاں چڑھی ہی رہتیں۔

شاہ زیب نے گاڑی کا اگلا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ خود مائرہ کا ڈرائیور کالج گیٹ سے کچھ ہٹ کر مالکن کے انتظار میں تھا۔ شاہ زیب نے پیسے دے کر اس کا منہ بند کیا ہوا تھا۔ مائرہ کے ساتھ کچھ وقت گزار کر وہ اسے گیٹ کے پاس چھوڑ دیتا جہاں سے وہ اپنی گاڑی میں گھر چلی جاتی۔ کچھ دن گزرتے ہی وہ گاؤں پہنچ جاتا۔ رات گزار کر اگلے دن پھر گھر لوٹتا۔ اس کی بے قراری و وارفتگی کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ کل سے بینا خالہ اپنے بیٹے باسط کے ساتھ حویلی آئی ہوئی تھیں۔ اس وجہ سے مائرہ جلدی گھر لوٹنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ جھنجلائی ہوئی روٹھی، روٹھی سی لگ رہی تھی۔ اس کا دھیان بھی شاہ زیب میں نہیں تھا۔ اس نے بہت جلدی اس کی یہ ذہنی غیر حاضری پکڑ لی۔

''کیا بات ہے کن خیالوں میں گم ہو؟'' شاہ زیب گاڑی موڑ کر مین روڈ سے اتر آیا تھا۔ پاس ہی تھوڑی سی آبادی تھی۔ اس نے گاڑی ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑی کر دی۔ اب مائرہ مکمل طور پر اس کے سامنے تھی۔

''شاہ زیب روز، روز اس طرح ملنا ٹھیک نہیں ہے۔ امی ابو کو آپ کا آئے روز گاؤں چلے آنا بھی پسند نہیں۔ آپ اپنی ہی روایات کو بھول رہے ہیں۔ اس سے میری عزت پر حرف آتا ہے۔'' مائرہ غصے میں تھی۔ شاہ زیب بھی غصے میں آگیا۔ چابی اگنیشن میں گھما کر گاڑی اسٹارٹ کی اور واپس ہولیا۔ مائرہ کو کالج کے پاس کھڑی اس کی گاڑی کے پاس ڈراپ کرکے وہ زن سے نکل گیا۔ اس دوران نہ تو مائرہ نے اس سے بات کی نہ اسے روکنے کی کوشش کی۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

''ارے آگئی ہو واپس؟'' باسط نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ وہ اس سے ڈھائی تین سال بڑا تھا پر قد کاٹھ ڈیل ڈول ایسا تھا کہ مائرہ سے کم سے کم چار پانچ سال بڑا نظر آتا۔ عمر کے مقابلے میں اس کے چہرے پر پختگی تھی۔ مائرہ آپ جناب کا تکلف کیے بغیر دھڑلے سے تم کہہ کر مخاطب کرتی۔

''ہاں، تم سناؤ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ بیگ رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ہونا کیا تھا، تمہارا انتظار کر رہا تھا، تم آؤ تو گپ شپ لگاؤں تم سے۔ پتا ہے یہاں میری دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ کیا ہے؟''

''نہیں، مجھے نہیں پتا۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''یہاں میری دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ تم ہو، صرف تم۔'' مائرہ کا دل دھڑک اٹھا۔ اصولی طور پر باسط کے منہ سے یہ بات سن کر اسے خفا ہونا چاہیے تھا اسے روکنا چاہیے تھا مگر اسے حیرت انگیز طور پر جانے کیوں یہ بات بالکل بری نہیں لگی۔

''خالہ کو بہت جلدی تھی ناں تمہاری منگنی کی۔

آخر کو تمہارے چچا کا بیٹا بہت امیر ہے۔ جائیداد کا مالک ہے اس کے سامنے ہم غریبوں کی دال کہاں گلنی تھی۔ پیسے والے جیت گئے اور ہم غریب دل والے منہ دیکھتے رہ گئے۔'' اس نے بہت طنزیہ انداز میں کہا۔ مائرہ خاموشی سے دیکھتی رہی۔ ایک بار بھی اس نے نہیں ٹوکا کہا بھی تو اتنا......

''میں یونیفارم تبدیل کرلوں پھر خالہ سے اور تم سے بات ہوتی ہے۔'' اسے وہیں کچھ سوچتا چھوڑ کر مائرہ اندر غائب ہوگئی۔

☆☆☆

شاہ زیب بہت ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے گھر پہنچا۔ ادھر اُدھر دیکھے بغیر اپنے بیڈروم میں آکر بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ دل میں مائرہ کی بے رخی نے آگ لگادی تھی۔ اوپر سے رہ رہ کر اس کی باتیں ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔

''شاہ زیب روز روز اس طرح ملنا ٹھیک نہیں...... امی، ابو کو آئے روز آپ کا گاؤں چلے آنا بھی پسند نہیں۔ آپ اپنی ہی روایات کو بھول رہے ہیں۔ اس سے میری عزت پر حرف آتا ہے۔'' شاہ زیب نے غصے میں بیڈ پر پڑے تمام تکیے اور کشن کارپٹ پر دے مارے۔ غصہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کتنا فاصلہ طے کرکے موسم کی شدت کی پروا کیے بغیر اسے دیکھنے اور ملنے کے شوق میں آئے روز آجاتا اور اسے پروا ہی نہیں تھی۔ گویا شاہ زیب اس کی انسلٹ کررہا تھا۔ آج تو اس نے بیگانگی کی حد کردی تھی۔ ایک بار... بھی اسے روکا نہ منایا۔ بس غصے میں بیٹھی سامنے دیکھتی رہی۔

مغرب کا وقت ہورہا تھا اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ذریکتا پریشان سی ہوگئی کہ جانے کیا بات ہے جو شاہ زیب اس طرح کمرا بند کیے پڑا ہے۔ اس نے دروازے پر زوردار انداز میں دستک دی۔ چند سیکنڈز کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ عجیب بکھرا، بکھرا سا حلیہ تھا اس کا۔ آنکھیں سرخ، چہرے پر یاسیت جیسے برسوں کا مریض ہو۔

''بھائی کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے جو شام سے اس طرح لیٹے ہوئے ہیں؟'' اس کی محبت نے جوش مارا۔

''نہیں...... کسی نے کیا کہنا ہے بس ایسے ہی دل چاہ رہا تھا اکیلے رہنے کو۔ خیر تم چائے بنواؤ ایک کپ، میں اِدھر ٹی وی لاؤنج میں ہی آرہا ہوں پپا اور تمہارے پاس۔'' وہ سر ہلاتی کچن کی طرف آگئی۔ چائے لے کر جب وہ ٹی وی لاؤنج میں آئی تو شاہ زیب، پپا کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ بڑے دن بعد آج وہ اس طرح پپا کے پاس بیٹھا نظر آیا تھا۔ اسے بہت اچھا لگا۔ بڑا بھرپور منظر تھا مکمل گھریلو منظر۔ بھائی، بہن اور پاپا ہلکی پھلکی گپ شپ ہورہی تھی جب باتوں کے درمیان شاہ زیب اچانک خاموش ہوگیا۔ اس کی خاموشی بڑی معنی خیز تھی جانے اس کے پس منظر میں کیا راز تھا بالآخر راز کھل ہی گیا۔

''پپا میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' عمر کے ساتھ، ساتھ ذریکتا بھی حیران ہوئی۔

''وقت آنے پر شادی بھی ہوجائے گی۔'' عمر خاصے تحمل سے کام لے رہے تھے۔

''لیکن پپا میں بہت جلد شادی کرنا چاہتا ہوں ایک دو ماہ کے اندر اور میں نے پلان بھی کرلیا ہے۔'' اس کا انداز حتمی تھا۔

''ابھی تمہاری تعلیم مکمل نہیں ہوئی ہے کم سے کم چار پانچ سال لگیں گے اس کے بعد شادی کا سوچا جائے گا۔''

''پپا میں نے شادی کرنی ہے بس۔ مزید تعلیم میں نے حاصل نہیں کرنی آپ کے ساتھ بزنس میں ہیلپ کرنی ہے، آفس میں بیٹھنا ہے۔'' وہ پھر روایتی ضد پر اتر آیا تھا۔ عمر نے اسے سمجھانے کی ایک آخری کوشش کی۔

''تمہاری عمر ابھی اتنی زیادہ نہیں ہے کہ تم شادی کے بارے میں سوچ سکو، بیس بائیس سال کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔''

''پپا میں سمجھدار ہوں، شادی کی ذمے داری اٹھا

سکتا ہوں۔ بس جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ کل سے آپ کے ساتھ آفس جاؤں گا۔'' عمر سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔ یہ اب نئی دُھن اس کے دماغ میں سما گئی تھی۔ شاہ زیب کا منہ بند کرنے کی خاطر انہیں اورنگزیب بھائی سے بات تو کرنی تھی۔ انہیں پتا تھا بھائی نے اتنی جلدی مائرہ کی شادی نہیں کرنی ہے۔ وہ بھی پڑھ رہی تھی۔ کم سے کم شاہ زیب تک ان کا جواب تو پہنچ جاتا اسی طرح اس کے ساتھ نمٹا جا سکتا تھا۔

وہ اورنگزیب بھائی سے بات کرنے کا سوچ رہے تھے کہ وہ خود ہی چلے آئے۔ عمر اُن سے تپاک سے ملے۔ سب کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد دونوں بیٹھ گئے۔

''شاہ زیب کہیں نظر نہیں آ رہا ہے..... کہاں ہے؟'' ان کی متلاشی نگاہیں بے چین سی لگ رہی تھی۔

''دوستوں کی طرف گیا ہے۔ آپ سنائیں کیسے آنا ہوا؟''

''بس ایک کام تھا تم سے اس لیے آیا ہوں۔ اصل میں مائرہ نے اپنی ماں سے بات کی ہے کہ شاہ زیب ہر دوسرے تیسرے دن اس کے کالج چلا آتا ہے۔ اس کا یہ عمل مناسب نہیں ہے۔ ابھی یہ بات کسی کو پتا نہیں ہے مگر جب کھل گئی تو میری بیٹی کی کتنی بدنامی ہوگی۔ یہ بات کسی نے نہیں سوچی...... میں اسی لیے آیا ہوں کہ اسے سمجھاؤ۔ یہ چیز اچھی نہیں ہے۔'' عمر کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔ شاہ زیب نے اپنی حرکتوں سے انہیں اور خاندان کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ انہوں نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ یہ وقت ہوش سے کام لینے کا تھا نہ کہ جوش کا۔

''بھائی جان میں آپ کی طرف آنے کی سوچ رہا تھا۔ اچھا ہوا آپ خود چلے آئے۔ میرا دل ہے کہ شاہ زیب اور مائرہ کی شادی کر دی جائے۔ ہماری بہتری اسی میں ہے۔ شاہ زیب کا جوان خون ہے، جذبات پر بند نہیں باندھے جا سکتے۔ آپ دو تین ماہ میں تیاری کریں میں بھی کرتا ہوں اور مائرہ کو رخصت کروا کے لے آتا ہوں۔ اس مسئلے کا سب سے اچھا یہی حل ہے۔'' عمر کی بات پر اورنگزیب خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

''چلو ٹھیک ہے، میں گھر جا کر شیریں سے بات کرتا ہوں۔ میرے خیال سے تمہاری بات ٹھیک ہے شادی کر دینی چاہیے۔'' ان کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ عمر نے سکون کی سانس لی یہ مسئلہ تو حل ہوا۔

☆☆☆

فوزیہ نے نوید کا پیچھا لے لیا تھا کہ آپ عمر بھائی سے رشتے کی بات جلدی کریں۔ مائرہ اور شاہ زیب کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے کہ اس کا مجازی خدا فضول میں تاخیر کر رہا ہے۔ اسے خدشہ تھا کہ.... کہیں کوئی اور دریکتا کا رشتہ نہ مانگ بیٹھے، فرح کی باتیں اس نے اپنے کانوں سے سنی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے قاسم کو گھر داماد بنوانے کے چکر میں تھی اور اس کی پلاننگ بڑی دور تک کی تھی۔

☆☆☆

چھٹی کے دن عمر زیب دیر سے ناشتا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ دونوں بچے بھی موجود تھے۔ دریکتا صرف چھٹی کے دن ہی ناشتا کرتی، باقی دن اسے کالج پہنچنے کی جلدی ہوتی اور وہ ناشتے کے نام پر صرف چائے یا دودھ ہی پیتی۔ آج ناشتے میں خاصا اہتمام تھا۔ شاہ زیب بھی ٹائم سے اٹھ گیا تھا۔ اسے شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ اپنی شادی کی تمام تر شاپنگ وہ خود کر رہا تھا۔ مائرہ کے لیے برائیڈل خالصتاً اس کی اپنی چوائس تھی۔ جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا اس کا اشتیاق و بے قراری اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ مائرہ سے بات بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی۔ جب سے شادی کی تیاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس نے پپا کے ڈانٹنے پر گاؤں جانا چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے مائرہ فون پر بات بھی کم ہی کرتی۔ ویسے بھی شادی کے دن قریب تھے اس نے کافی حد تک برداشت کا مظاہرہ کیا تھا۔ دُریکتا خریدی ہوئی چیزیں کھول کر بیٹھ جاتی۔ کپڑے، جوتے، جیولری، جانے کیا، کیا الا بلا، پر اسے بہت اچھا لگتا۔ وہ پپا سے ایک ایک چیز پر رائے لیتی

اور شاہ زیب سپنوں اور رنگوں کی دنیا میں کھو جاتا جہاں مائرہ اس کے ہمراہ ہوتی کوئی رکاوٹ نہ کوئی دوری ہوتی۔

وہ جلدی، جلدی ناشتا کر رہا تھا اسے اپنے دوست ارمان کے ساتھ آج اپنی شادی کی خصوصی شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ پپا نے ٹوکا بھی آرام سے کھاؤ۔

"پپا ارمان آ رہا ہے، میں لیٹ ہو جاؤں گا۔" اس نے دودھ کا گلاس آدھا پی کر باقی چھوڑ دیا اور نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے اٹھ گیا۔ وریکتا نے ناشتے کے بعد تمام برتن اٹھوائے۔

عمر زیب، طاہر لغاری کو فون کرنے لگے۔ اشعر نے اگلے ہفتے انگلینڈ واپس چلے جانا تھا۔ وہ چاہ رہے تھے کہ اشعر کی زبردست سی دعوت کی جائے۔

"السلام علیکم!" فون دوسری طرف سے طاہر نے ہی ریسیو کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔ اس عمر میں اور کیا کرنا ہے۔" طاہر نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں قہقہہ لگایا تو عمر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"اشعر کی واپسی کب تک ہے؟"

"یار اس نے بارہ تاریخ کو جانا ہے، رات کی فلائٹ ہے۔" طاہر نے فوراً حساب لگا کر بتایا۔

"تو ایسا کرو کہ میں دس تاریخ کو تمہیں اور اشعر کو اپنے ہاں انوائٹ کر رہا ہوں، آ جانا۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ میں سر کے بل آؤں گا۔ کافی ٹائم ہو گیا ہے اچھا سا کھانا کھائے ہوئے۔" طاہر نے بات کے اختتام پر پھر قہقہہ لگایا۔

"میں تمہیں اچھا سا کھانا ہی کھلاؤں گا چلو بعد میں بات ہوتی ہے۔" انہوں نے بات کر کے جیسے ہی فون رکھا ملازم اندر داخل ہوا۔

"صاحب جی گاؤں سے مہمان تشریف لائے ہیں، میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے...... جاؤ میں اُدھر ہی آ رہا ہوں۔"

وہ سوچ رہے تھے کہ شاید اورنگزیب بھائی اور شیریں

میری سالگرہ بمقابلہ گرمی

اس سال 13 جولائی کو میری انیسویں سالگرہ ہے۔ جولائی میں شدید گرمی تو ہوتی ہی ہے اوپر سے بارشیں بھی اسی ماہ میں ہوتی ہیں جس کے ساتھ حبس میں اضافہ ہو جاتا ہے، اوپر سے لوڈ شیڈنگ سے اچھے بھلے انسان کا عرق نکل جاتا ہے۔ اس گرما گرمی میں کسی کو اپنا ہوش نہیں ہوتا کجا کسی کی سالگرہ اور تحفہ تو دور کی بات کوئی وش کر دے بڑی بات ہے۔ گزشتہ سال تو رمضان بھی جولائی میں ہی آیا اور اس سال بھی رمضان جولائی میں آئے گا تو سالگرہ پر افطاری اسپیشل ہو جائے گی بس...... بچپن میں عید اور سالگرہ کا مہینوں پہلے انتظار کیا جاتا تھا مگر آہستہ آہستہ اب یہ دونوں شوق تھمنے لگے ہیں۔ اب نہ پہلے جیسا جوش و خروش ہوتا ہے نہ خوشی ہوتی ہے۔ یہ دونوں دن بھی عام دنوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ گزشتہ سال اپنی سالگرہ پر میں نے ایک کھجور اور پانی کا گلاس پی کر روزہ رکھا کیونکہ میں امی کے اٹھانے کے باوجود آخری چند منٹوں میں اٹھی اور سارا دن چکراتے، چکراتے گزرا اور افطاری کے وقت سالگرہ یاد رہی نہ کچھ اور صرف اور صرف پانی اور بس پانی...... بعد میں آئس کریم کھائی تو جان میں جان آئی۔ سالگرہ پر میری خواہش ہوتی ہے کہ مجھے بس کیش ملے بقول میرے کیش ہو تو عیش ہو۔

اس سال بھی میری سالگرہ پر روزے ہی ہوں گے اور جولائی میں ہی عید ہو گی یعنی میرے لیے دو خوشیاں ایک ہی ماہ میں......

انیسہ زینب، فاروق آباد

بھابی ہوں گے پر ان کے سامنے نوید بھائی اور فوزیہ بھابی مہمانوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ نوید بھائی نے انہیں گلے لگا لیا حال احوال پوچھا۔ فوزیہ بھابی نے بھی خوش اخلاقی سے ان کا حال دریافت کیا پھر اس مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد عمر نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

دریکتا کو بھی ان کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ سیدھی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ فوزیہ چچی نے اسے بہت پیار سے گلے لگایا، اکٹھے تین چار بوسے اس کے رخساروں پر ثبت کیے۔

''کیسی ہے میری بیٹی؟ تم نے تو گاؤں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ کافی عرصے سے چکر نہیں لگایا۔ ویک اینڈ پر اسجد بھی آیا تھا تمہارا پوچھ رہا تھا۔ فارینہ کہہ رہی تھی آج تمہیں ساتھ لے کر آؤں۔'' انہوں نے اپنی چھوٹی بیٹی کا نام لیا۔ دریکتا محبت کے اس پُرخلوص مظاہرے سے بہت متاثر ہوئی۔

''چلوگی ناں میرے ساتھ گاؤں؟'' وہ پُرامید نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کا سر خود بہ خود ہی میکانکی انداز میں اثبات میں ہلا۔

''چچی میں آؤں گی ضرور لیکن ابھی نہیں میرے کورسز ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد آؤں گی۔''

''ہاں، ہاں ضرور آنا سب بہن بھائی تمہارا پوچھتے ہیں۔'' دریکتا کا دل محبت سے سرشار ہو گیا کہ اس کے کزنز اس سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ کر کچن کی طرف آ گئی تاکہ خانساماں کو کھانے کے بارے میں بتائے۔ چچا اور چچی آئے تھے، اہتمام لازمی تھا۔

''بھائی، ہم آپ کے پاس خاص کام کے سلسلے میں آئے ہیں۔'' دُرِیکتا کے جانے کے بعد فوزیہ چچی نے بات کرنے کے لیے تمہید باندھی تو عمر کو ایسا لگا جیسے وہ خاص دریکتا کے سلسلے میں ہو۔ انہوں نے بے اختیار پہلو بدلا۔ فوزیہ نے نوید کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ باقی بات تم کرو۔ نوید فوراً نگاہوں کا اشارہ سمجھ گئے۔

''عمر میں تمہارے پاس اپنے بیٹے اسجد کے رشتے کے لیے آیا ہوں۔ تم دُرِیکتا کو ہماری بیٹی بنا دو۔ بس ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ بات کر کے اب عمر کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ جس پر اچانک پریشانی کے سائے پھیل گئے تھے۔

''ابھی دُرِیکتا پڑھ رہی ہے چھوٹی ہے..... میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا ہے۔'' عمر بول تو رہے تھے مگر انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کی آواز کسی کنوئیں سے نکل رہی ہو۔ اس موقع پر فوزیہ، نوید کی مدد کے لیے آگے بڑھیں۔

''ابھی اسجد بھی پڑھ رہا ہے ہم کون سا کہہ رہے ہیں کہ ابھی شادی کریں کوئی رسم کر لیتے ہیں تاکہ سب کو پتا چل جائے۔ جب دُرِیکتا پڑھائی سے فارغ ہو جائے تو پھر شادی کر لیں گے۔ میں تو کہتی ہوں کہ فی الحال اسجد اور دریکتا کا نکاح کر دیا جائے۔ رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی۔ اب دائرہ کو ہی دیکھ لیں دُرِیکتا سے ڈھائی تین سال ہی بڑی ہو گی۔ اس کی تو شادی بھی ہو رہی ہے۔ لڑکیاں جلدی سیانی ہوتی ہے۔ بھائی میں دریکتا کو بیٹی بنا کر رکھوں گی۔ آپ بس ہاں کر دیں۔'' عمر پریشانی سے بھائی اور بھاوج کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں نکاح والی بات بھی چبھ رہی تھی۔ جانے کیوں پس منظر میں انہیں کسی منفی صورتِ حال کا احساس ہو رہا تھا۔

انہیں اس بات کا خدشہ پہلے سے تھا کہ دُرِیکتا کا رشتہ ان سے ضرور طلب کیا جائے گا۔ دریکتا کا رشتہ طلب کرنے کے پیچھے ان کی اپنی غرض پوشیدہ تھی اس لیے عمر زیب پریشان تھے۔

''میں آپ کو کچھ دن بعد جواب دوں گا۔'' بالآخر انہیں ایک جواب سوجھ ہی گیا۔ جانے کیوں وہ خود کو اتنا کمزور محسوس کرنے لگے تھے جو صاف انکار نہیں کر پائے تھے۔

''ٹھیک ہے بھائی آپ سوچ لیں پر جواب ہاں میں ہونا چاہیے۔ شاہ زیب کی شادی بھی قریب ہے۔ میرے دل میں بھی اسجد کے لیے بہت ارمان ہیں۔

میں چاہتی ہوں کہ شاہ زیب کی شادی کے موقع پر سیکڑوں مہمانوں کی موجودگی میں دریکتا کو منگنی کی انگوٹھی پہناؤں۔ عمر بھائی یہ میری خواہش ہے۔ امید ہے آپ ہمارا خیال کریں گے۔'' آخر میں فوزیہ کا لہجہ لجاجت سے بھر گیا عمر بے بسی سے دیکھ کر رہ گئے۔

انہیں پریشانی اور سوچوں کے سپرد کرکے فوزیہ بھابی اور نوید بھائی چلے گئے۔ رات عمر کو نیند ہی نہیں آئی۔ جانے کیوں دل بے کل سا تھا۔

☆☆☆

سیل فون مسلسل سُریلی آواز میں گنگنائے جارہا تھا۔ عمر نے نمبر دیکھا گھر سے کال تھی۔ انہوں نے آن کرکے کان سے لگایا۔ دوسری طرف رحیم داد تھا ان کا گھریلو ملازم۔ اس نے بتایا کہ گاؤں سے ہارون صاحب اور ان کی بیگم آئے ہیں۔ آپ گھر تشریف لے آئیں۔'' عمر نے فون بند کرکے رکھا تو چہرے پر پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے۔

''الٰہی خیر...... پتا نہیں اب ہارون بھائی کیوں آئے ہیں۔'' وہ آہستہ سے بڑبڑائے اور بیل بجا کر پیون کو بلایا۔ اس نے ان کا بریف کیس اٹھا کر گاڑی میں رکھا۔ باوردی شوفر نے دروازہ کھولا۔ ان کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ ہوکر جانے پہچانے راستوں پر دوڑنے لگی۔ فقط دو دن پہلے ہی تو نوید بھائی اور فوزیہ بھابی آئے تھے۔ پتا نہیں کیا مسئلہ تھا۔ وہ انہی خیالات کی رو میں بہتے ہوئے گھر پہنچے۔ ہارون بھائی اور فرح بھابی انہی کے انتظار میں تھے۔ سلام دعا سے فارغ ہوتے ہی اپنی آمد کا مدعا بیان کردیا۔

''عمر میں قاسم کے لیے دُرِ یکتا کا رشتہ مانگنے آیا ہوں۔ تم ہمارے چھوٹے بھائی ہو۔ میرے بیٹے پر سب سے زیادہ حق تمہارا بنتا ہے اور میں نہ نہیں سنوں گا...... بتادوں تمہیں کیونکہ دُرِ یکتا مجھے بہت پیاری ہے بیٹیوں کی طرح۔'' عمر کو لگ رہا تھا جیسے ابھی صبر کھودیں گے۔ کیا انداز تھا رشتہ مانگنے کا جیسے رشتہ مانگنے نہ آئے ہوں دھمکی دینے آئے ہوں۔ ان کی مرضی وہ ہاں کریں یا نہ..

''عمر بھائی مجھے پتا ہے آپ دُرِ یکتا سے بہت محبت کرتے ہیں آخر کار وہ عائلہ کی نشانی ہے۔ شاہ زیب کی شادی کریں گے، مائرہ بہو بن کے آئے گی اور اسی طرح دُرِ یکتا کو بھی رخصت ہو کے جانا پڑے گا۔ مگر میں نے اور ہارون نے یہی سوچا ہے کہ شادی کے بعد قاسم آپ کے ساتھ اسی گھر میں رہے گا۔ اس طرح دُرِ یکتا بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ رخصت ہو کے بھی آپ کے ساتھ رہے گی۔ میں بھی بیٹی کی ماں ہوں، نہیں چاہتی کہ دریکتا کی شادی کرکے آپ اکیلے ہو جائیں۔ یہ فیصلہ صرف آپ کی تنہائی اور بیٹی سے آپ کی انتہائی محبت دیکھ کر ہم دونوں نے کیا ہے۔'' فرح اس طرح بول رہی تھیں جیسے انہیں ہی عمر زیب کی بھلائی سب سے زیادہ عزیز ہو۔

''ہاں عمر، اب ہاں کردو ایسا رشتہ اور کہاں ملے گا۔'' ہارون بھائی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خود سے قریب کرلیا۔ اس نے بڑی آہستگی سے ہارون بھائی کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا جانے انہوں نے اس کی خاموشی سے کیا نتیجہ اخذ کیا تھا۔

''اچھا آرام سے سوچ پھر بتانا...... مگر شاہ زیب کی شادی کے موقع پر کوئی رسم ضرور ہونی چاہیے۔ کیوں فرح تم بھی تو بولو۔'' انہوں نے اپنا چہرہ بیوی کی طرف کرلیا تھا۔ جہاں خاموش سی تائید نظر آرہی تھی۔ خوشی ان کے چہرے سے چھلکی پڑرہی تھی کیونکہ ہارون ان کے مجازی خدا نے بہت اچھے طریقے سے بات کی تھی عمر زیب نے ایک لفظ تک نہیں بولا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ نیم رضامند تھے۔ عمر بالکل خاموش بیٹھے تھے درمیان میں بھائی بھاوج کی کسی بات پر محض سر ہلا رہے تھے۔

دریکتا کالج میں تھی فی الحال وہ ان سرگرمیوں سے لاعلم ہی تھی۔ دوسرے عمر زیب نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ شاہ زیب کی شادی کی تیاری میں لگی تھی۔ کالج سے آنے کے بعد سارا وقت اُدھر ہی مصروف رہتی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اندر ہی اندر کیا فیصلے

ہو رہے ہیں۔ جوں، جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے اس کی خوشی بھی بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

طویل ڈرائیو وے میں وہ شاندار سی گاڑی آ کر رکی۔ دُرِّ یکتا نے کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ طاہر انکل کے ساتھ وہ لمبا چوڑا نوجوان جو اندر کی طرف آ رہا تھا اس کے لیے مکمل طور پر اجنبی تھا۔ آج طاہر لغاری اور ان کے بیٹے کی ان کے گھر دعوت تھی۔ وہ کچن میں خود موجود مختلف کھانوں کی تیاری کا جائزہ لے رہی تھی کیونکہ پپا نے کہا تھا کہ کہیں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ طاہر لغاری کا بیٹا پہلی بار ان کے گھر آ رہا تھا۔

اس لیے خانساماں کے سر پر کھڑے ہو کر اس نے سب کام کروایا تھا۔ پپا نے اس سے کہا تھا جب مہمان آ جائیں تو ڈرائنگ روم میں آ کر مل لینا۔ سو ان کے حکم کی تعمیل میں وہ ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے وقت وہ رک سی گئی۔ انکل طاہر کا بیٹا پہلی بار ان کے گھر آیا تھا اس سے پہلے اس کا سامنا نہیں ہوا تھا اس لیے وہ جھجک سی گئی۔ طاہر انکل نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کا بیٹا کھڑا ہو گیا اور بڑے مہذبانہ طریقے سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ بہ مشکل وہ تین چار منٹ وہاں رکی۔ طاہر انکل آتے جاتے رہتے تھے پر ان کا بیٹا پہلی بار آیا تھا اور اسے اجنبیوں سے نامعلوم سی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ جیسے اس وقت طاہر انکل کے بیٹے سے ہو رہی تھی۔ اس نے شکر کیا کہ ڈرائنگ روم سے باہر آئی۔ عمر، طاہر اور اشعر تینوں باتیں کر رہے تھے کچھ دیر میں شاہ زیب بھی آ گیا اور ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

کھانا دُرِّ یکتا نے ہی سرو کیا۔ عمر نے اسے بھی کھانے میں شامل ہونے کو کہا پر اس نے معذرت کر لی۔ کھانے کے بعد عمر نے طاہر سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائنگ روم میں اشعر اور شاہ زیب ہی تھے۔ طاہر، عمر کے ساتھ ہو لیے۔ وہ انہیں لے کر باہر لان میں آ گئے۔

''ہاں بھئی کیا بات ہے جو اس طرح مجھے یہاں لے آئے ہو؟'' طاہر لغاری اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں بولے۔

''خاص بات ہی ہے تبھی یہاں لایا ہوں۔'' اس بار انہوں نے اپنی پریشانی چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ طاہر ان کے مزید بولنے کے انتظار میں تھے۔

''میں پہلے ہی شاہ زیب کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے پریشان تھا اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ پہلے نوید بھائی اپنے بیٹے کے لیے دُرِّ یکتا کا رشتہ مانگنے آئے اور اس کے دو دن بعد ہارون بھائی آ گئے۔ وہ مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں فوراً ہاں کر دوں تو وہ کوئی چھوٹی موٹی رسم کر لیں بلکہ وہ نکاح کا کہہ رہے تھے۔ عجیب سی دھونس اور دھمکی تھی ان کے انداز میں بلکہ فرح بھابی کہہ رہی تھیں کہ میں قاسم کو گھر داماد بنا لوں اس طرح میری بیٹی میری آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ اب دو بھائی ہیں دونوں کی ایک ہی خواہش ہے۔ میں سخت پریشان ہوں ایک کو ہاں کرتا ہوں تو دوسرا ناراض ہوتا ہے، دوسرے کو ہاں کرتا ہوں تو پہلا ناراض ہو جائے گا۔ سوچ، سوچ کے میرا دماغ تھک گیا ہے۔ مجھے پرانے زخم بھی بھولے نہیں ہیں۔ میں اپنی بیٹی کو وہاں کیسے دے دوں۔ شاہ زیب کی ضد نے مجبور کیا ہے ورنہ اس کا رشتہ بھی میں نے دل پر پتھر رکھ کے طے کیا ہے۔ میرے اپنوں کو واقعی اگر مجھ سے محبت ہوتی تو میں یہ سب خوشی، خوشی کرتا لیکن ان کو اپنے، اپنے مفاد عزیز ہیں.....'' بولتے، بولتے عمر کی آواز بھرا گئی تو طاہر لغاری نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا جیسے تسلی دینا چاہ رہے ہوں۔

''اس مسئلے کا ایک حل ہے میرے پاس۔''

''کیا.....؟'' عمر تیزی سے بولے۔

''تم اشعر کو اپنا بیٹا بنانا پسند کرو گے؟'' عمر پر تو شادیِ مرگ والی کیفیت طاری ہو گئی۔ طاہر یہ کیا کہہ رہے تھے کہیں ان کے کان دھوکا تو نہیں کھا رہے تھے۔

''کیا کہا تم نے؟'' انہوں نے تصدیق چاہی۔

"میں اگر اشعر کے لیے دُرِّ یکتا کا رشتہ مانگوں تو دے دو گے؟" اس بار انہوں نے ایک، ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ عمر طاہر سے لپٹ گئے۔

"ایسا ہو جائے تو میری پریشانی ختم ہو جائے۔"

"میں آؤں گا ایک دو، دن تک باقاعدہ رشتہ لے کر۔ تم فکر مت کرو۔" انہوں نے عمر کا کندھا زور سے دبایا۔ اچانک ہی انہیں اپنا وجود ہلکا پھلکا ہونے کا احساس ہوا۔ طاہر نے تو بہت بڑی پریشانی دور کر دی تھی۔ اشعر کو دیکھتے ہی ان کے دل نے بے اختیار ایک خواہش کی تھی کہ دُرِّ یکتا کو بھی کوئی ایسا ہی ہم سفر نصیب ہو۔ ان کے دل کی خواہش رب نے جان لی تھی۔ سب کچھ بہت آسان ہو گیا تھا۔

☆☆☆

عمر زیب نے دُرِّ یکتا کو کالج جانے سے منع کر دیا تھا کہ گھر میں کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ انہیں در یکتا سے اشعر کے رشتے کی بات کرتے ہوئے حجاب سا ہو رہا تھا۔ وہ اسے بہت پیار کرتے تھے مگر اس موضوع پہ بات کرنا انہیں بہت مشکل لگ رہا تھا۔ کوئی عورت ہوتی تو آرام سے بات کر لیتی وہ خود کیا بات کرتے۔ بس کہا بھی اتنا کہ کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ اچھے طریقے سے ڈریس اپ ہو جاؤ۔ انہیں شدت سے عائلہ کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ در یکتا کو محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی خاص بات ہو کیونکہ پپا بہت سنجیدہ لگ رہے تھے۔

طاہر لغاری کی طرف سے کچھ رشتے دار مرد اور تین چار عورتیں تھیں۔ پپا نے اسے ملازمہ کے ساتھ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں آنے کو کہا تھا۔ آج شاہ زیب بھی گھر پر ہی تھا۔ خیر وہ سوچتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ چاروں عورتیں اس سے اچھی طرح ملیں۔ مردوں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سب اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ نروس سی ہو کر نگاہیں جھکا کر رہ گئی۔ اسے کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ چائے کے برتن اٹھانے کے بہانے وہ باہر آئی تو سکون کی سانس لی۔ شاہ زیب رہ، رہ کر اسے شریر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

پتا نہیں کیا بات تھی جو اتنا اسرار پھیلا ہوا تھا۔ وہ باہر آ گئی تو کچھ دیر بعد شاہ زیب بھی اس کے پیچھے آ گیا۔

"تمہیں پتا ہے یہ مہمان کیوں آئے ہیں؟" وہ اب بھی اسے شرارت سے دیکھ رہا تھا۔ میکانکی انداز میں اس کا سر نفی میں ہلا۔

"طاہر انکل کی طرف سے یہ سب تمہارے رشتے کے لیے آئے ہیں۔ طاہر انکل بھی پہنچنے والے ہوں گے مٹھائی لینے رک گئے تھے۔" شاہ زیب نے ساری حقیقت اس پر عیاں کر دی۔ وہ خود میں عجیب سا محسوس کرنے لگی۔ واقعی تھوڑی دیر بعد طاہر انکل بھی آ گئے۔ شاہ زیب اسے دوبارہ اندر مہمانوں کی طرف لے گیا۔ تمام مہمانوں کا منہ میٹھا کروایا گیا۔ طاہر انکل نے خود اسے اپنے ہاتھوں سے مٹھائی کھلائی۔ مزید در یکتا سے یہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا تو جلد ہی اٹھ آئی۔ پیچھے عمر، طاہر لغاری سے کہہ رہے تھے۔

"میں کل گاؤں جاؤں گا شاہ زیب کی شادی کی تاریخ لینے..... ساتھ در یکتا کے رشتے کے بارے میں بھی بتا دوں گا کہ طے کر دیا ہے مگر مجھے لگتا ہے اس بات سے بہت سے مسائل پیدا ہوں گے۔" وہ اب بھی پریشان ہی تھے۔

"تم اگر یہ تصور کرتے ہو کہ اس سے مسئلے پیدا ہوں گے تو ہم اشعر اور در یکتا کا نکاح کر لیتے ہیں ویسے بھی اشعر کی سیٹ کینسل ہو گئی ہے، تم جس طرح کہو۔" طاہر لغاری نے کچھ دیر سوچنے کے بعد تجویز پیش کی۔ عمر کے دل کو یہ بات بھا گئی۔

"ٹھیک ہے اسی طرح کر لیتے ہیں۔" وہ فوراً مان گئے۔ وہیں بیٹھ کے صلاح مشورہ ہوا۔ اشعر کی سیٹ کینسل ہو گئی تھی۔ اس نے اگلے ہفتے کی دوبارہ بکنگ کروائی تھی۔ اس کی واپسی سے چار دن پہلے نکاح کی تقریب رکھی گئی۔ اپنے خاص، خاص ملنے جلنے والوں کو عمر نے دعوت دے دی تھی۔ اب گاؤں جانا تھا۔

☆☆☆

"کیا کہہ رہے ہو عمر تم نے در یکتا کا رشتہ طے

بھی کر دیا اور اب نکاح کی دعوت دینے آئے ہو؟''
سب سے پہلے نوید بھائی اس پر چڑھ دوڑے۔
''بس کیا بتاؤں طاہر لغاری نہیں چھوڑ رہا تھا۔''
انہوں نے کمزور انداز میں صفائی دی۔
''تمہیں سگے خونی رشتوں سے بڑھ کر دوست عزیز ہے۔ کیا بات کی ہے تم نے؟'' ہارون بھائی کا چہرہ غصے سے لال سرخ ہو رہا تھا۔
''بہرحال آپ سب نے آنا ہے۔'' عمر نے ان کے غصے کو اہمیت نہیں دی اور نگزیب کو بھی دل میں سخت غصہ تھا پر مائرہ، عمر کی بہو بننے جارہی تھی انہوں نے غصہ ظاہر کرنے کی حماقت نہیں کی۔ شاہ زیب کی شادی کی تاریخ وہ لے آئے تھے۔ دو ہفتے بعد مائرہ نے بہو بن کے ان کے گھر آجانا تھا۔ سب ان سے ناراض تھے۔ ہارون اور نوید بھائی اور دونوں بھابیوں نے کھل کر اپنا غصہ ان پر ظاہر کر دیا تھا۔

☆☆☆

اشعر کو طاہر لغاری نے جس طرح نکاح کے لیے رضامند کیا تھا وہی جانتے تھے۔ وہ ابھی نکاح جیسے بندھن کے حق میں نہیں تھا۔ ٹھیک ہے ان کے کہنے پر عمر انکل کی مشکلات جاننے کے بعد اس نے اس رشتے پر نیم آمادگی ظاہر کر دی تھی مگر اب نکاح والی بات اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ عمر انکل کی بیٹی اسے خاصی کم عمر اور امیچور نظر آئی تھی دیکھنے میں جب وہ دعوت پر ان کے گھر گیا تھا۔ کم سے کم بھی وہ اس سے سات آٹھ سال چھوٹی ہوگی۔ دُرِ یکتا کے مقابلے میں وہ مضبوط سوچ کا مالک میچور نوجوان تھا۔ طاہر نے منتیں کر کے اسے منا ہی لیا۔

☆☆☆

طاہر انکل کے بیٹے کے ساتھ کل شام اس کا نکاح تھا۔ یہ بات شاہ زیب نے اس تک پہنچائی تھی پھر رات پپا بھی اس کے پاس چلے آئے اور دھیرے دھیرے بتاہی دیا کہ کل اس کی زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ وہ سن کر خاموش سی ہوگئی۔ عمر نے جانے اس کی خاموشی سے کیا مطلب نکالا کہ اس کے پاس بیٹھ گئے۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''بیٹا میں زندگی کی سختیوں کے ساتھ مقابلہ کرتے، کرتے تھک گیا ہوں۔ ایک دن تمہاری شادی ہونی ہے اس گھر سے تمہیں رخصت ہونا ہے تو مجھے ان حالات میں جو مناسب لگا ہے وہی کیا ہے۔ میں اپنوں کے ساتھ مزید لڑ نہیں سکتا۔ تمہارے دونوں چچا ناراض ہوگئے ہیں کیونکہ میں ان کی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ تمہیں اگر کوئی اعتراض ہے تو مجھے بتادو۔ میں زبردستی نہیں کروں گا۔'' ان کے اتنا کہنے کی دیر تھی دُرِ یکتا ان سے لپٹ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔
''نہیں پپا...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' عمر شانت سے ہوگئے۔ اسے چپ کروانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی سسکیاں تھم گئیں تو عمر بھی اٹھ گئے۔ ان کے جانے کی دیر تھی وہ پھر سے رونے لگی پر اس بار اس کی کوشش تھی کہ اس کے رونے کی آواز باہر نہ جائے۔

☆☆☆

طاہر لغاری دو تین دوستوں کے ہمراہ بیٹے کی بارات لائے تھے اور یہاں عمر نے اچھے خاصے لوگوں کو انوائٹ کیا ہوا تھا۔ گاؤں سے دیگر رشتے داروں کے ساتھ اورنگزیب بھائی اور ان کی فیملی بھی آئی تھی۔ ہارون اور نوید بھائی کے گھر والے عمر کے تین چار بار راضی کرنے کے باوجود نہیں آئے تھے۔ اس وجہ سے عمر زیب بہت دکھی اور آزردہ نظر آرہے تھے۔ ان کی خوشی ادھوری سی تھی۔ دل ہی دل میں اورنگزیب بھائی بھی ناخوش تھے پر مائرہ کی وجہ سے خاموش تھے۔ ورنہ باقی دونوں بھائیوں کی طرح وہ بھی نہ آتے۔ پر مصلحت کا تقاضا تھا کہ اپنی ناپسندیدگی کو عیاں نہ کیا جائے۔ عمر سے تعلقات بگاڑنے کا رسک وہ لے نہیں سکتے تھے۔
شیریں، دُرِ یکتا کے پاس بیٹھی تھیں۔ مولوی نکاح کا رجسٹر اٹھائے اندر داخل ہوا تو وہ سمٹ سی گئی۔ ایجاب وقبول کے بعد دُرِ یکتا نے دستخط کیے۔ اس دوران اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر ابل پڑا۔ شیریں دھیرے دھیرے اس کی پیٹھ سہلا رہی تھیں۔ بظاہر وہ بھی خوش تھیں پر طاہر لغاری کے ساتھ ان کے

دوست احباب اور اشعر کو دیکھنے کے بعد مارے حسد کے دل خاک ہوا جا رہا تھا۔ وہ بھی اسی حق میں تھیں کہ دُرِ یکتا کی شادی خاندان میں ہی ہو۔ پر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تب ہی تو قدرت نے اسے اشعر لغاری کی شریکِ سفر بنا دیا تھا۔ نکاح اور کھانے کے بعد مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہو گئے تھے۔

☆☆☆

دُرِ یکتا نے کام والا بھاری سوٹ تبدیل کیا اور ایک، ایک کر کے ساری جیولری بھی اتاری۔ سب کہہ رہے تھے کہ وہ بہت خوب صورت لگ رہی ہے لیکن اس نے خود کو ایک بار بھی آئینے میں نہیں دیکھا۔ اس نے ماں کی کمی کو بہت بری طرح محسوس کیا تھا۔ وہ ماں جو اسے جنم دے کر خود اسے ابدی جدائی دے گئی تھی۔ اس نے ساری جیولری اتاری اور کپڑے بھی تہہ کر کے الماری میں رکھے۔ شیریں تائی کب کی سو چکی تھیں۔ وہ بھی کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹی تو آج کے دن کے تمام واقعات آنکھوں کے آگے پھرنے لگے۔ آج سے وہ صرف اپنی پپا کی بیٹی نہیں رہی تھی بلکہ اشعر لغاری کی منکوحہ بھی بن گئی تھی۔ اب زندگی صرف اپنی نہیں رہی تھی کوئی اور بھی حق جتانے والا آ گیا تھا۔ اس نے اشعر کی شکل صورت اور سراپا یاد کرنے کی کوشش کی تو ذہن کی اسکرین پر وہ لمبا چوڑا کسرتی جسم کا مالک مغرور آنکھوں والا نوجوان جھم سے اتر آیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

اشعر نے تھکے، تھکے انداز میں شوز کے تسمے کھولے پاؤں کو موزوں کی قید سے آزاد کیا۔ آج کا دن بڑا مصروف اور ہنگامہ خیزی لے کر آیا تھا۔ اس نے شاور لے کر کپڑے تبدیل کیے۔ طاہر لغاری اسے پاکستان میں ہی رکنے پر اصرار کر رہے تھے جبکہ وہ کوئی فیصلہ کر نہیں پا رہا تھا گومگو والی کیفیت میں تھا۔ اب تو ایک ذمے داری بھی سر پر آ گئی تھی۔ بیٹھے بٹھائے ہی ایک دم سے بات نکاح پر ختم ہوئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ شادی

سالگرہ کا تحفہ

میں نے اپنے میاں جانی پرنس افضل شاہین سے کہا: ''پچھلی سالگرہ پر تو آپ نے مجھے شاندار لوہے کا بیڈ دیا تھا اس سال کیا دینے کا ارادہ ہے۔''

میرے میاں جانی نے معصومیت سے کہا: ''اس بار اس میں کرنٹ چھوڑنے کا ارادہ ہے۔''

تحریر: پروین افضل شاہین۔ بہاول نگر

کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن لائف پارٹنر کے بارے اس کے ذہن میں جو تصور تھا اس کے مقابلے میں دُرِ یکتا اسے کافی چھوٹی لگی تھی۔ دیکھنے میں بھی سولہ سترہ سال کی نظر آ رہی تھی اسے شاہ زیب کی اتنی جلدی شادی پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے کالج کی شاید تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی اور شادی کی ضد پر اڑ گیا تھا۔ عمر انکل نے بھی بتایا تھا او اس کی منکوحہ بھی کالج کی اسٹوڈنٹ تھی جانے کون سی خاندانی روایات اور مجبوریاں تھیں جو عمر انکل اتنی جلدی یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بستر پر جاتے، جاتے وہ یہی کچھ سوچتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

اسے سی آف کرنے پپا کے ساتھ عمر انکل اور شاہ زیب بھی آئے تھے۔ اشعر کا خیال تھا کہ شاید ان کے ساتھ دُرِ یکتا بھی ہو پر گاڑی سے عمر انکل اور شاہ زیب کو اترتے دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی۔ اسے یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ اسے مایوسی کیوں ہوئی تھی۔ نکاح کے بعد اس کے دل میں ذرہ بھر بھی یہ خواہش نہیں اٹھی تھی کہ اپنی منکوحہ کا چہرہ دیکھے اور اس نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ ہاں نکاح کے دو دن بعد پپا نے اسے تصویریں دی تھیں کہ تمہارے نکاح کی ہیں۔ اشعر نے انہیں سرسری

ساد یکھ کر ایک طرف ڈال دیا تھا لیکن ابھی ائرپورٹ پر عمر انکل اور شاہ زیب کے ساتھ دُرِ یکتا کو نہ پا کر دل نے کچھ محسوس ضرور کیا تھا اور وہ محسوسات کیا تھے اشعر انہیں کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔

☆☆☆

دُرِ یکتا ایک، ایک کر کے تمام تصویریں دیکھ رہی تھی۔ اس نے اتنی بار دیکھی تھیں کہ ایک، ایک تصویر اسے ازبر ہو گئی تھی۔ اس نے اشعر کی تصویر اٹھائی جہاں وہ نکاح نامے پر سائن کر رہا تھا۔ اس میں اس کے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے میں یوں پیوست تھے جیسے زندگی بھر مسکراہٹ سے ناآشنا رہے ہوں۔ اس نے ایک اور تصویر اٹھا کر چہرے کے قریب کر کے دیکھی۔ اشعر کے کندھے اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا وہ بہت مغرور اور خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال نظر آ رہا تھا۔ دریکتا نے براہِ راست تو اسے ایک بار بھی اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا جس طرح ابھی دیکھ رہی تھی۔ پپا اور شاہ زیب اسی کو سی آف کرنے ائرپورٹ گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں وہ بور ہو رہی تھی سو تصویریں نکال کر دیکھنے بیٹھ گئی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا اگر وہ کبھی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو وہ شاید اتنی غور سے نہ دیکھ سکے جس طرح ابھی تصویروں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی گہری گھور بادامی آنکھوں کی چمک ایک، ایک تصویر میں نمایاں تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ ان آنکھوں کی چمک کا کبھی سامنا نہیں کر پائے گی...... اتنی مغرور سی آنکھیں تھیں۔

☆☆☆

شاہ زیب خوشیوں سے سرشار تھا۔ پپا نے شادی کے انتظامات بہت اعلیٰ پیمانے پر کیے تھے۔ دریکتا نے مائرہ کو فون کر کے ایک، ایک تفصیل بتائی تھی۔ سب جاننے کے بعد وہ مغرور سی ہو گئی تھی۔ تنی گردن کچھ اور ابھی تن گئی تھی۔ ایک اعلیٰ خاندان کا ڈیشنگ لڑکا اس کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنے باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا اور اپنی منوا کر چھوڑی اور اب شادی پر پانی کی طرح پیسہ بہا رہا تھا مائرہ مغرور نہ ہوتی تو کیا کرتی۔

اس کے جاننے والوں میں کسی اور نے اس جیسی شاندار قسمت نہیں پائی تھی۔ شاہ زیب کے مقابلے میں وہ اتنی خوب صورت بھی نہیں تھی پھر بھی وہ اس کا دیوانہ تھا، اس کی آنکھ کے اشارے پر سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ دوسری طرف پینا تھی جس نے بڑی حسرت اور ارمانوں سے بھانجی کا رشتہ مانگا تھا۔ اس کے پیچھے باسط کی دلی خواہش بھی کارفرما تھی مگر شیریں کے ارادے کچھ اور تھے۔ باسط کے ارمان مٹی میں مل گئے مگر دل سے مائرہ کو پالینے کا جنون ختم نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کی شادی کی اطلاع ان کے گھر تک بھی پہنچ گئی تھی۔ پینا جانے کی تیاری کر رہی تھی آخر کو شیریں اس کی بڑی بہن تھی نہ جاتی تو لوگوں نے یہی کہنا تھا کہ مائرہ کے نصیب سے جل گئی تھی۔ اس نے دل پر بھاری پتھر رکھ لیا تھا پر باسط ایسا نہیں تھا، اس کے سینے میں پھانس گڑ گئی تھی کہ اسے شاہ زیب کے مقابلے میں ٹھکرایا گیا ہے کیونکہ وہ اس کی طرح دولت مند نہیں تھا نہ ہی ورثے میں اسے لمبی چوڑی جائیداد ملنے والی تھی گرچہ وہ ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا پر شاہ زیب کے مقابلے میں اس کی حیثیت معمولی ہی تھی۔ ویسے بھی وہ پڑھ رہا تھا کیرئیر بننے میں تو عرصہ لگتا ہے۔ شاہ زیب کے سامنے وہ شیریں خالہ کو کیسے نظر آتا۔ گھر والوں کو بغیر بتائے وہ ملک سے باہر جانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

☆☆☆

مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ مائرہ کو مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔ پینا سوائے باسط کے تمام فیملی کے ساتھ مایوں سے ایک دن پہلے گاؤں پہنچی تھی۔ اُدھر ہارون زیب اور نوید زیب نے عمر کے مکمل طور پر بائیکاٹ کا اعلان کیا تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی عمر کے ہاں شاہ زیب کی شادی میں شریک نہیں ہوگا۔ ہاں اورنگزیب بھائی کی ساری خوشیوں میں وہ شریک تھے۔ ان کی کدورت عمر کی حد تک تھی، اورنگزیب بھائی سے انہیں کوئی گلہ نہیں تھا۔

☆☆☆

بہت دھوم دھام سے شاہ زیب کی طرف سے مائرہ کی مہندی آئی تھی۔ آج تو عمر زیب بھی بہت خوش اور مسرور تھے۔ بات، بات پر مسکرا رہے تھے۔ تقریب میں موجود دونوں بھائیوں نے ان سے بات نہیں کی تھی پر وہ اس تلخی کو پی گئے کیونکہ آج بہت عرصے بعد انہوں نے شاہ زیب اور دُرِ یکتا کے چہرے خوشی سے چمکتے دیکھے تھے۔ مکمل طور پر سجی بنی دریکتا میں آج انہیں عائلہ کی مشابہت محسوس ہو رہی تھی اور آج گاؤں مہندی لے کے آنے سے قبل شاہ زیب نے باپ کے گلے لگ کر اپنی تمام کوتاہیوں کی معافی مانگی تھی۔ عمر کا دل شانت تھا اس کی جھلک ان کے چہرے پر بھی تھی۔

مائرہ کو مہندی لگانے کے لیے بڑھتی ہوئی بینا کے قدم وہیں ساکت ہو گئے۔ عمر اور دُرِ یکتا مائرہ کے پاس ہی موجود تھے پرانے زخموں سے کھرنڈ اترنے لگا۔ کوئی اس کے اندر پوری قوت سے چیخا تھا۔ اتنے برس بعد بھی اسے ٹھکرائے جانے کی اذیت بھولی نہیں تھی۔ عمر کو دیکھ کر ایک، ایک تلخی اور کڑواہٹ نوکِ زبان پر رکھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تھکے، تھکے قدموں سے پیچھے آ کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

شاہ زیب دولہا بن کے بہت اچھا لگ رہا تھا، مردانہ وجاہت اسے ورثے میں باپ کی طرف سے ملی تھی۔ اورنگزیب تایا کے گھر بارات کا استقبال پھولوں کی پتیوں سے ہوا۔ مائرہ کو شہر کے سب سے مہنگے بیوٹی پارلر کی بیوٹیشن حویلی میں خود تیار کرنے آئی تھی۔ اس کی خدمات شاہ زیب نے بھاری معاوضے پر حاصل کی تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مائرہ کے دل میں کوئی حسرت باقی رہے۔ جب وہ شہر میں ان کے گھر تھی تو مستقبل کے خوابوں کی، اپنی خواہشوں کی باتیں اس سے کرتی تھی۔ اسے بہت شوق تھا کہ اپنی شادی کے دن وہ سب سے بہترین پارلر سے تیار ہو۔ سو شاہ زیب نے اس کی یہ خواہش پوری کر دی تھی۔

مہنگے عروسی لباس، قیمتی زیورات اور میک اپ میں مائرہ سچ مچ کسی اور جہان کی مخلوق لگ رہی تھی...... پہچانی ہی نہیں جا رہی تھی۔ ویسے بھی اپنی شادی سے دو ماہ پہلے اس نے بیوٹیشن کی ہدایات پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب اس کی دو ماہ کی خود پہ کی گئی محنت کا پھل اس کے سامنے تھا۔ ہر نگاہ اسی پر فوکس تھی اس کے حسن کو سراہ رہی تھی۔ جب اسے شاہ زیب کے برابر لا کر بٹھایا گیا تو سب دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔

فوٹو سیشن ہو رہا تھا۔ دریکتا اور عمر زیب، مائرہ اور شاہ زیب کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ بینا کی نظر اسٹیج پر ہی مرکوز تھی۔ شاہ زیب ہو بہو عمر کی جوانی کی تصویر لگ رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وقت ایک دم بہت پیچھے چلا گیا ہو۔ بینا کو یوں لگ رہا تھا جیسے شاہ زیب کی جگہ عمر زیب ہو اور مائرہ کی جگہ عائلہ مگر نہیں اسٹیج پر شاہ زیب اپنی دلہن مائرہ کے ساتھ موجود تھا۔ قسمت نے ایک بار پھر انہیں شکست دے دی تھی۔ پہلے انہیں شکست ہوئی، ٹھکرائے جانے کی اذیت جھیلنی پڑی اب یہی اذیت ان کے لاڈلے بیٹے باسط کے حصے میں آئی تھی۔ پہلے اس کا ذمے دار عمر تھا اور اب اسی عمر زیب کا بیٹا تھا جس نے اس کے باسط کی ساری خوشیاں چھین کر اپنی جھولی میں بھر لی تھیں۔ کتنا خوش اور پرسکون لگ رہا تھا وہ۔ کاش اس وقت مائرہ کے ساتھ زندہ حقیقت بنا باسط ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ اپنے دکھ بھول جاتی، بینا کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

''کاش باسط کا نصیب مائرہ ہی بنتی۔'' بینا کے دل نے پوری شدت سے انہونی کی خواہش کی تھی۔

شیریں سے جب بینا نے باسط کے رشتے کی بات کی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ اورنگزیب تم سے پہلے ہی عمر کو ہاں کر چکے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہیں ہرگز خالی ہاتھ نہ لوٹاتی۔ اب میں مجبور ہوں اپنے مجازی خدا کے سامنے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ شاہ زیب اور اس سے وابستہ دولت و جائداد کو دیکھتے ہوئے ان کی رال ٹپک پڑی تھی۔ خون کے رشتے اپنی جگہ مگر دولت و جائداد، روپے پیسے کی اپنی ایک الگ اہمیت تھی۔

شیریں نے خون پر اسی چیز کو اہمیت دی تھی۔ جس کی بدولت آج مائرہ، شاہ زیب کے پہلو میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ شاہ زیب کے ساتھ اس کے شاندار مستقبل کا آغاز ہو چکا تھا۔ عمر زیب کی دولت کا وہی تو وارث تھا۔ شادی کے بعد اس نے تو مائرہ کا بے دام غلام بن کے رہنا تھا ابھی سے وہ اس کی جنبشِ ابرو کا منتظر ہوتا تھا۔ بعد میں جو ہونا تھا وہ شیریں جیسی ماں کے لیے باعثِ سکون تھا۔ اپنے انمول گر انہوں نے رخصتی سے قبل مائرہ کو اچھی طرح ازبر کروا دیے تھے۔ ویسے بھی وہ بہت ہوشیار تھی اور سمجھداری میں شیریں سے کچھ بڑھ کر ہی تھی۔ جس طرح شیریں نے ساری عمر اورنگزیب جیسے خود سر اور اکھڑ شوہر کو اپنے اشاروں پر چلایا تھا اسی طرح وہ مائرہ سے بھی یہی توقع کر رہی تھی۔ شاہ زیب تو پہلے سے ہی مائرہ کے ٹرانس میں تھا۔ اسے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو اس کی ایک مسکراہٹ اور ناز و انداز سے گھائل ہوا جاتا تھا۔

رخصتی کے وقت مائرہ سب گھر والوں سے ملی۔ بیوٹیشن نے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ تمہاری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلنا چاہیے۔ اس نے پوری ایمان داری سے اس پر عمل کیا تھا۔ شیریں اور اورنگزیب، مائرہ کے دیگر بہن بھائی یہاں تک کے دریکتا کے بھی اس موقع پر آنسو نکل آئے تھے پر مائرہ کی آنکھیں خشک صحرا کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

عمر زیب اور دریکتا نے اسے پکڑ کر سجی سنوری گاڑی میں لا کر بٹھایا۔ شاہ زیب ساتھ، ساتھ چل رہا تھا گاڑی میں پچھلی سیٹ پر دولہا، دلہن کے ساتھ دریکتا بیٹھی تھی۔ بارات کی واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا مگر یہ شاہ زیب کے سنہرے خوابوں کے آغاز کا سفر تھا۔ وہ آج کس قدر خوش تھا اسے اپنی اس خوشی کے اظہار کے لیے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ بات، بات پر اس کے لب مسکرا رہے تھے اور مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ بالآخر اس نے پیا کی تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود مائرہ کو پا ہی لیا تھا ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے۔ اب اسے مائرہ کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر اس سے بات کرنے کی خاطر گاؤں یا کالج کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب وہ صرف اور صرف اس کی تھی۔

☆☆☆

''کوئی ایسی نرم بہار ہو جہاں میں یقین دلا سکوں
کہ تیرا ہی نام ہے فصلِ گل کہ تجھی سے ہی یہ کراتیں
ترا قرض ہیں مرے روز و شب مرے پاس اپنا تو کچھ نہیں
مری روح، مری متاعِ دل، میری سانس تیری امانتیں''

شاہ زیب کی دھیمی خمار آلود آواز مائرہ کی سماعتوں میں قطرہ قطرہ بہار کی پہلی بارش کی طرح برس رہی تھی۔ اس کا بیڈ روم تا حدِ نظر گلاب کے پھولوں سے بھرا ہوا مشامِ جاں تک کو معطر کر رہا تھا۔ مائرہ کا استقبال اس نے پھولوں سے کیا تھا۔ کانچ کی نازک گڑیا کی طرح اسے تھاما تھا۔ کتنی دیر اس کے چہرے سے زرتار دوپٹا ہٹا کے وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا جیسے اپنی آنکھوں کو یقین دلانا چاہتا ہو کہ واقعی اس کے سامنے مائرہ ہی ہے۔ اس کا خواب، اس کی آرزو، اس کی پہلی خواہش، چلتے چلتے صحرا میں مانگی ہوئی دعا کی طرح واقعی وہ مائرہ ہی تھی، اس کی ہم سفر، اس کی خلوتوں کی ہم نشین، اس کی قربتوں اور تنہائی کی ساتھی، اس کی محبت مائرہ...... ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے اس کی بن چکی تھی۔ وہ آنکھوں کے راستے اس کا سراپا پور، پور جذب کر رہا تھا۔ دل میں اتار رہا تھا۔ خاصی دیر بعد اسے رونمائی کا گفٹ دینے کا ہوش آیا۔ ہیرے جڑے پلاٹینم کا بہت نازک اور اسٹائلش سا سیٹ اس نے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ مائرہ نے ایک نظر دیکھ کر وہ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ شاہ زیب اسے دیکھ رہا تھا ان نگاہوں کی زبان مائرہ کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ شاہ زیب کی وارفتگی، بے تابی اور بے قراری سب کچھ خود ہی بتا رہی تھی اور جب مائرہ نے اس کے ہاتھ میں اپنا نازک سا ہاتھ دیا تو وہ مارے خوشی کے بے قابو سا ہو گیا۔ مائرہ نے بالآخر اسے پذیرائی بخش دی تھی۔

(باقی آئندہ)



نکالی

نگہت اعظمی

یہ ایسی انہونی خبر تھی کہ جس کا کسی نے تصور ہی نہیں کیا تھا۔ اس خبر کے پھیلتے ہی سارے خاندان میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور ہر ایک تفصیل جاننے کے لیے بے قرار ہو گیا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' سب ہی حیران تھے، کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا، وہ اتنی ذہین اور سمجھدار تھی۔ زمانے کو دیکھ رہی تھی اور اس نے اتنی بڑی حماقت کر دی۔ کسی کو اس سے اس بے وقوفی کی توقع

نہیں تھی۔ وہ جو ہمیشہ ہر کلاس میں پوزیشن لیتی، ہر تقریری مقابلے میں کپ جیت کر آتی، اخباروں میں مضامین لکھتی، اس نے فزکس میں ایم ایس سی میں پوزیشن لی تھی اور اب ایک کالج میں لیکچرار تھی، وہ جو بے حد پُر اعتماد اور بولڈ تھی، خاندان والے، دوست احباب سب اس بات پر حیران ہوئے کہ وہ اپنی سیاہ رنگت کے باوجود اتنی پُر اعتماد کیسے ہے جبکہ اپنے پورے گورے چٹے خاندان میں وہ نظر بٹو کے نام سے مشہور تھی۔ اس میں خدا کی کیا مصلحت تھی کہ خدا نے اس جیسی پیٹ بھر کالی لڑکی کو جہاں آرا کے گھر بھیج دیا۔ جہاں ہر شخص گورا چٹا اور خوب صورت تھا اور خدا کی اس دین پر پورا گھرانا دل کھول کر ناز کرتا تھا۔ ایسے حسین و جمیل گھرانے میں اس کی پیدائش پر جتنا افسوس کیا جاتا کم تھا۔

وہ پیدا ہوئی اور نرس نے گلابی کمبل میں لپٹی ہوئی سرخی مائل گہری سانولی بچی کو دادی کی گود میں تھمایا تو دادی جہاں آرا اور نانی نسیم بانو کے چہرے فق ہو گئے۔ ایک تو لڑکی اوپر سے اتنی کالی۔ جہاں آرا کی آنکھوں سے تو باقاعدہ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

''اب کیا ہوگا۔'' ملکہ، ساس کو روتے دیکھ کر خود بھی چھکوں پھکوں رونے لگیں۔

''اللہ نصیب اچھا کرے۔'' نانی نسیم بانو نے بڑی مشکل سے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کے سیلاب پر بند باندھتے ہوئے اس طرح دعا کی جیسے انہیں دعا کے قبول ہونے پر رتی برابر بھی یقین نہیں ہو اور وہ دعا کرتے ہوئے بھی سارے خاندان کی ان لڑکیوں کو ذہن میں لائیں جن کی رنگتیں قدرے سانولی تھیں اور پھر ان کے دل کو شدید صدمہ پہنچا جب انہیں کوئی ایسی لڑکی نظر نہ آئی جس کے نصیب ان کی خود ساختہ نعمت کے حساب سے خوش نصیب کہلائے جاسکتے۔ کیونکہ ان کی لغت میں خوش قسمت وہی لڑکی تھی جو سسرال کے جھنجٹ سے آزاد الگ گھر میں رہتی ہو، جس کے گھر میں کام کرنے کے لیے دو چار نوکر ہوں۔ جسے سارا دن سوائے ٹی وی دیکھنے اور فون پر لمبی، لمبی گفتگو کرنے کے اور کوئی کام نہیں ہو اور ان کے نزدیک وہ لڑکیاں بیچاریاں تھیں جو بے حد متحرک اور فعال زندگیاں گزار رہی تھیں۔ وہ سسرال والوں کے ساتھ رہتی تھیں، نوکریاں بھی کرتی تھیں، گھر بھی سنبھالتی تھیں۔ انہیں اپنی نواسی کا مستقبل ایسا ہی تاریک نظر آرہا تھا۔ ملکہ نے جو واقعی اپنے حسن و جمال کی وجہ سے ملکہ کہلانے کی مستحق تھیں۔ بہ مشکل سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے اپنی مظلومی کا احساس دلایا۔

''خیر یہ تو سخت گناہ ہوتا، اب آنے والے کو آنے سے تو نہیں روکا جاسکتا۔ یہ تو اللہ کی دین ہے۔'' جہاں آرا کو فوراً گناہ ثواب کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کے صاحبزادے کو بچوں کا بہت شوق ہے۔

''اللہ کی دین تو ہے لیکن انسان کو بھی اللہ تعالیٰ نے عقل اور سمجھ دی ہے۔ اس دفعہ تو ڈاکٹر نے بھی بہت باتیں سنائی ہیں کہ ذرا بچی کی حالت تو دیکھیں جسم میں خون نام کو نہیں رہا۔'' نسیم بانو نے ڈاکٹر کے بہانے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

تینوں ماں، نانی، دادی ساری دوپہر سوگ کی کیفیت میں بیٹھی رہیں امید تھی کہ شام کو مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھ جائے گا شاید کہہ سن کر دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے لیکن تینوں کی نظریں دروازے پر جمی رہیں اور کوئی مبارک باد دینے ہی نہیں آیا۔ اور ویسے بھی پانچویں بچے کی دفعہ کون مبارک باد دیتا ہے اور وہ بھی لڑکی کی بلکہ اب تو تیسرے بچے کی بھی مبارک باد ایسے دی جاتی ہے جیسے تسلی اور دلاسا دیا جارہا ہو۔ رشتے دار، عزیز تو پھر بھی لحاظ کر لیتے ہیں لیکن لیڈی ڈاکٹرز تو ایسی باتیں سناتی ہیں جیسے والدین سے کوئی بڑا بھاری جرم سرزد ہو گیا ہو۔

بیچاری ماں بننے والی عورت کو پورے نو مہینے ڈاکٹروں کے کڑے تیوروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بات، بات پر لعن طعن ...... "کیا ضرورت ہے اتنے بچے پیدا کرنے کی؟"

"تمہاری فیملی تو مکمل تھی؟"

"لوگوں کے پاس کھانے کو نہیں اور تمہیں بچے پیدا کرنے سے فرصت نہیں۔"

"ظاہر ہے جب ہر سال بچے پیدا ہوں گے تو کمزوری تو ہوگی ہی۔" اور ایسے بے شمار جملے جو دل کو زخمی کر دیتے ہیں۔ بچہ کمزور ہو تو ماں ذمے دار، بچے کا وزن زیادہ ہو تو ماں کا قصور...... ماں میں خون کی کمی ہو تو بھی ماں قصور وار، وہ مائیں جن کا پہلا بچہ پیدا ہونے والا ہو اور وہ مائیں جن کا تیسرا یا چوتھا بچہ دنیا میں آنے والا ہو، دونوں کی صورتوں میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ تیسرے چوتھے بچے والی ماں کے چہرے پر ایسی پریشانی اور شرمندگی ہوتی ہے جیسے جیل سے فرار ہوئی کوئی ملزمہ......

بہر حال ملکہ کو تو ڈاکٹروں نے اتنی اور ایسی، ایسی باتیں سنائی تھیں کہ ہر دفعہ چیک اپ کرانے کے بعد وہ دھواں دھار روتی ہوئی گھر آتی اور ساری بھڑاس احسن پر اتارتی۔ احسن حد سے زیادہ ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ اس کی ساری باتیں سن کر خاموشی سے مسکراتے رہتے اور آخر میں مشورہ دیتے۔

"میرا خیال ہے اس دفعہ تم اسپتال کے چکر میں مت پڑو، اماں کی پرانی دائی کریمہ ہے، بہت تجربہ کار بھی ہے اور اماں کو پسند بھی ہے۔ بس اسی سے کیس کروالو۔" احسن کے اس مشورے پر اس کا دل چاہتا کہ وہ گلے میں پھندا ڈال کر پنکھے سے لٹک جائے یا چوہے مار دوا پانی میں گھول کر شربت کی طرح غٹاغٹ پی جائے۔

☆☆☆

ملکہ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں اور چاروں

بے حد خوب صورت گورے چٹے، گولڈن بال، سبز آنکھیں جو دیکھتا پیار کیے بغیر نہیں رہتا۔ اب ایسے گورے چٹے حسین بچوں میں جب رانی نے آنکھ کھولی تو سارے خاندان کی عورتوں کے کلیجے منہ کو آنے لگے۔ اسپتال میں صرف ملکہ کے جیٹھ اور جیٹھانی مبارک باد دینے آئے اور وہ بھی اس لیے کہ جیٹھانی کی بہن کی دیورانی کے گھر سات سال بعد پہلا بیٹا پیدا ہوا تھا وہ بھی اس اسپتال میں تھیں جہاں رانی پیدا ہوئی تھی۔ وہ بھی رانی کو دیکھنے آگئیں اور جیسے ہی اسے دیکھا ایسا خاموش ہوئیں کہ منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ تھوڑی دیر بعد جب حواس بحال ہوئے تو بچی کو گود میں لیا۔

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ.....'' انہیں آگے کوئی جملہ سمجھ میں نہیں آیا۔ ''ماشاء اللہ سے خوب سو رہی ہے۔'' انہوں نے بڑی مشکل سے جملہ مکمل کیا۔

''رنگ تو سانولا ہے لیکن نقشہ بہت اچھا ہے، انشاء اللہ بڑی ہو کر بہت خوب صورت نکلے گی۔'' نسیم بانو نے بیٹی کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر ایک اور جملہ داغ دیا۔

''انشاء اللہ، انشاء اللہ!'' جیٹھانی نے ملکہ کو جلانے کے لیے ہنس کر کہا۔

''مجھے لگتا ہے اس کا رنگ روپ بالکل دادا پر گیا ہے۔ محسن بھائی بھی تو سانولے تھے۔'' نسیم بانو سے جہاں آرا کا مختلف زاویے بناتا ہوا چہرہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

''نہیں بھئی...... یہ آپ نے خوب کہا۔ احسن کے باپ کب سانولے تھے بھلا..... ان کا رنگ تو سرخی مائل گندمی تھا۔'' جہاں آرا نے میاں کے اچھے خاصے سانولے رنگ کو گندمی رنگ میں تبدیل کر دیا تو باوجود کوشش کے جیٹھانی سائرہ اپنی مسکراہٹ نہ ضبط کر سکیں۔

''یہ رنگ روپ تو چار دن کی چاندنی ہے اصل چیز تو انسان کی سیرت ہے۔'' نسیم بانو نے پھر سب کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔

''ہاں بھئی اصل چیز تو سیرت ہے جبھی تو لڑکوں کی مائیں لڑکیاں تلاش کرنے افریقا جاتی ہیں۔'' نسیم بانو کے تسلی اور دلاسے سن سن کر جہاں آرا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ انہوں نے کلس کر ایسا جملہ کہا کہ بے اختیار سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☆☆☆

ملکہ نے بڑی بیٹی کا نام ملیکہ رکھا تھا۔ منجھلی کا نام شہزادی اس بچی کا نام انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا اور پیدا ہونے کے بعد بھی بہت دنوں تک نہیں سوچا تو گھر میں کام کرنے والی ماسی خود ہی سے رانی کہنے لگی اور ہوتے، ہوتے یہ نام سب کی زبانوں پر چڑھ گیا۔

رانی جوں، جوں بڑی ہو رہی تھی لوگوں کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ سو دفعہ کہہ چکنے کے بعد بھی لوگوں کی نیت سیر نہیں ہوتی۔ جب بھی اسے دیکھتے کوئی نہ کوئی ضرور یہ جملہ کہہ کر اپنا اگلا پچھلا حساب برابر کر دیتا۔

''یہ بچی کس پر پڑ گئی، احسن کے خاندان میں تو کوئی اتنا کالا نہیں ہے۔'' لوگ سمجھتے ہیں کہ بچے مٹی کی مورت ہوتے ہیں یا بے جان کھلونے جن میں سوچنے اور سمجھنے کی حس نہیں ہوتی۔ ان کو جو چاہے کہہ دو، جس طرح چاہو ان کی تذلیل کر دو، جس طرح چاہو ان کا مذاق اڑا لو۔ ان پر کوئی اثر ہی نہیں ہوگا۔ پتا نہیں لوگوں کو بچوں کے معصوم چہروں پر چھائی ہوئی وہ شرمندگی اور محرومی نظر کیوں نہیں آتی جو اس قسم کے جملوں کو سن کر ان پر ٹوٹ، ٹوٹ کر برستی ہے۔ ان معصوم بچوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہے، کہنے والوں کو اس کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

رانی بھی بچپن سے یہ جملے سن رہی تھی اس کے

لیے اپنی اس خامی کو دور کرنا تو ممکن نہیں تھا لیکن اس نے اپنی شخصیت کی اس طرح گرومنگ کی کہ اس کی سیاہ رنگت اس کے دلکش اندازِ گفتگو، اٹھنے بیٹھنے کے سلیقے، تمیز اور تہذیب کے پیچھے چھپ گئی۔ اس میں بے شمار صلاحیتیں تھیں۔ وہ بہت لائق تھی۔ بہت اچھے کھانے پکاتی تھی۔ بہت اچھا لباس پہنتی تھی لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود جب بھی اس کا کوئی رشتہ آتا۔ اسے مسترد کر دیا جاتا بڑی دونوں بہنوں اور بھائیوں کی شادیوں کے بعد وہ کالج میں بھی پڑھا رہی تھی اور تقریباً پورے گھر کی ذمے داری بھی اس کے کاندھوں پر تھی۔

☆☆☆

''بنے بھائی کا چھوٹا بیٹا امریکا سے مستقل پاکستان آ رہا ہے۔'' وہ کالج سے آ کر ایک پلیٹ میں سالن اور چاول لے کر اماں کے کمرے میں آئی تو اماں نے فوراً سب سے اہم اور تازہ خبر اس کے گوش گزار کی۔

''کون بنے بھائی؟'' اس نے غائب دماغی سے پوچھا۔

''اے وہی ہماری اماں کے چچازاد بھائی کے بیٹے جو بہت سالوں پہلے امریکا چلے گئے تھے۔''

''اچھا، اچھا وہی...... جن کی خوب صورتی کے قصیدے آپ ہر وقت پڑھتی رہتی ہیں اور ان کے حسن کو... حضرت یوسفؑ کے حسن سے تشبیہ دیتی ہیں......'' رانی نے چاول کا چمچہ منہ کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

''مذاق کی بات نہیں ہے ان جیسا خوب صورت پورے خاندان میں کوئی نہیں۔'' اماں کو اس کا اس طرح کہنا اچھا نہیں لگا۔

''سنا ہے ان کی بیوی بھی بہت خوب صورت ہیں۔''

''ایسی ویسی...... ایسی گوری کہ ہاتھ لگاؤ تو میلی ہو جائیں۔'' اماں کو اب بھی بامحاورہ اردو بولنے کا بہت شوق تھا۔

''پھر بچے بھی دودھ کی طرح سفید ہوں گے؟'' اس نے چاولوں پر لوکی گوشت کا شوربہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بتاؤں...... سنا ہے وہاں سب انہیں انگریز سمجھتے ہیں۔'' اماں ہر گورے شخص کو انگریز سے تشبیہ دیتی تھیں۔

''تو پھر وہ یونانی دیوتا کب پاکستانیوں کو اپنے دیدار سے فیض یاب کرا رہے ہیں؟''

''وہ کل رات کی فلائٹ سے آئے گا اور ہمارے گھر ہی ٹھہرے گا۔'' اماں کا لہجہ خوشی سے لرزنے لگا تھا۔

''تمہارے ابا بتا رہے تھے لڑکا بہت قابل ہے اور نیک بھی بہت ہے اور پاکستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''اوہ......'' اسے ساری کہانی سمجھ میں آ گئی اور اماں کی خوشی بھی، یعنی وہی حسین خوب صورت امریکا پلٹ کزن اور وہی سانولی بے نیاز سی مغرور لڑکی۔

''کمال ہے وہیں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا ایکا ایکی پاکستان کی محبت کیسے جاگ گئی؟'' اس نے اماں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''یہی تو اس کی شرافت ہے کہ باپ دادا کے وطن میں رہنا چاہتا ہے۔'' اماں کے اپنے بنائے ہوئے نیکی اور شرافت کے معیار تھے۔

''اور اس سے بڑی شرافت یہ کہ باپ دادا کے وطن کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' وہ زور سے ہنس دی۔

''یہی تو انسان کی بڑائی اور شرافت ہے کہ وہ اپنے آپ کو نہ بھولے، اپنی اصل سے جڑا رہے۔'' اماں کے لہجے سے تو ابھی سے اس کے لیے محبت چھلکنے لگی تھی۔

دوسرے دن جب اس نے بلال کو دیکھا تو

اسے یقین آگیا کہ اماں بالکل صحیح کہہ رہی تھیں۔ وہ بہت خوب صورت تھا اور بہت گورا چٹا انگریزوں سے بھی زیادہ...... پورے خاندان میں ہلچل مچ گئی پھر کہانی اس طرح آگے بڑھی کے ہر رشتے دار نے جن کے گھر میں جوان لڑکیاں موجود تھیں اپنے گھر موصوف کو دعوت میں بلایا۔ ایک سے ایک ڈشز تیار کی گئیں غیر شادی شدہ لڑکیاں اس طرح تیار ہوئیں کہ سادگی اور معصومیت ٹوٹ، ٹوٹ کر برسے۔ سب کو اندازہ تھا کہ بیچارہ امریکا کی چالاک اور بے حیا لڑکیوں سے اکتا کر پاکستان آیا ہے کہ یہاں کی معصوم اور سیدھی سادی لڑکی سے شادی کر کے اپنی زندگی چین سے گزارے کہ امریکن اور انگریز لڑکیاں تو پاکستانی مردوں کی زندگیاں اجیرن کر دیتی ہیں اور پاکستانی شرم وحیا کی پتلیاں تو شوہروں سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ بس چلے تو ان کے قدموں کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنا کر لگائیں اور ہمیشہ کے لیے نابینا ہو جائیں۔

اسے لڑکیوں سے زیادہ لڑکیوں کی ماؤں پر غصہ آرہا تھا جو لڑکیوں سے زیادہ اتاؤلی ہو رہی تھیں۔

''اے یہ سدرہ تو اچھی خاصی تھی۔ آج اس نے کیا گت بنائی تھی؟ لگ رہا تھا دو دن سے بالوں میں کنگھی ہی نہیں کی۔'' بڑے ماموں کے گھر بلال کی پُرتکلف دعوت تھی جس میں ممانی جان نے بادلِ ناخواستہ ان سب کو بھی بلایا تھا کہ بلال ان کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس دعوت میں ساری ڈشز بقول ممانی جان، سدرہ نے بنائی تھیں۔ بلال کے سوا سب نے خوب، خوب کھایا۔ بلال نے صرف چکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ اس کا معدہ ان چیزوں کا عادی نہیں تھا۔ وہیں سدرہ نے کچھ اس انداز سے اپنے بال بنائے تھے کہ اس پر بھولی بھالی، معصوم، تنگ حسینہ کا گمان ہو رہا تھا۔ جسے میک اپ اور بناوٹی پن سے سخت نفرت ہو اور شاید یہی لک دینے کے لیے اس نے بالوں میں تھوڑی بیک کامبنگ بھی کر لی تھی جو اماں کو پسند نہیں آئی تھی۔

''پاکستان کی لڑکیاں تو بڑی ٹیلنٹڈ ہیں سدرہ نے اتنی کم عمری میں کتنے سارے کورسز کیے ہیں۔ میں تو حیران رہ گیا۔'' بلال نے انگریزی لہجے میں سدرہ کی تعریف کی جسے سن کر وہ بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکی۔

''بھلا کتنی عمر میں......؟'' بلال کی زبان سے سدرہ کی تعریف اماں سے برداشت نہ ہو سکی انہوں نے فوراً سوال کر دیا۔ ''تمہیں معلوم ہے اس کی عمر کیا ہے؟'' انہوں نے براہِ راست بلال سے سوال کر دیا۔

''میرا خیال ہے اٹھارہ، انیس سال کی ہو گی۔'' وہ گڑبڑا گیا۔

''رانی سے پورے تین سال بڑی ہے اس سال پورے پچیس سال کی ہو جائے گی۔'' اماں نے غصے میں رانی کی عمر بھی بتا دی۔

''واقعی...... پر وہ تو کہہ رہی تھی کہ وہ رانی سے پورے تین سال چھوٹی ہے۔'' بلال حیران رہ گیا۔

''تین سال چھوٹی......'' اماں سدرہ کے سفید جھوٹ پر بلبلا کر رہ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں حقیقتاً آنسو آگئے۔

''اماں کوئی بات نہیں، آپ اتنی سی بات دل پر نہ لیں۔'' رانی نے اماں کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھ کر انہیں تسلی دی۔

''یہ اتنی سی بات ہے...... ارے کتنا بڑا جھوٹ ہے۔'' اماں کو دکھ یہ تھا کہ سدرہ تو گوری بھی ہے اب اگر بلال کو یقین آگیا کہ وہ رانی سے کم عمر ہے تو رانی کا پتا بالکل صاف ہو جائے گا۔

''مجھے بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنی کم عمر ہے۔'' بلال کے اس طرح کہنے پر اماں کی جان میں جان آئی ورنہ رانی کو یقین ہو گیا تھا کہ اماں کی تھوڑی

دیر اور یہی کیفیت رہتی تو انہیں اسپتال لے جانا پڑتا۔

☆☆☆

''بیٹا تم کیا ہر وقت سر جھاڑ منہ پھاڑ پھرتی رہتی ہو، تیار رہا کرو تمہاری عمر کی لڑکیاں کتنی تیار رہتی ہیں۔'' رانی رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی تو اماں اس کے سر پر پہنچ گئیں۔

''اچھا ذرا روٹی پکالوں پھر پارلر چلی جاؤں گی۔'' اس نے پیڑے بناتے ہوئے اتنی سنجیدگی سے جواب دیا کہ اماں اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

''ابھی.....اس وقت، اتنی رات کو؟'' اماں گڑبڑا کر بے ربط جملہ بولنے لگیں۔

''آپ ہی تو کہہ رہی ہیں کہ تیار رہا کرو۔''

''مطلب یہ کہ گھر میں بھی ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہنو، مہمان آئے ہوئے ہیں تمہیں نہ جانے اس بھورے رنگ سے کیا عشق ہے کہ ہر وقت یہی پہنے رہتی ہو۔'' اماں چاہتی تھیں وہ ذرا شوخ رنگ کے کپڑے پہنے اور اسے فان اور مسٹرڈ کلر سے عشق تھا۔

''آپ فکر نہ کریں، میں روٹی پکا کر ریڈ کام والا سوٹ پہن لوں گی جو میں نے بھائی جان کی بارات میں پہنا تھا۔'' وہ مسکرائی تو اماں کو جیسے پتنگے لگ گئے۔

''پتا نہیں کیسا دماغ پایا ہے......کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ سارے خاندان کی لڑکیاں مہنگے مہنگے کپڑے پہن کر روز بہانے، بہانے سے گھر آرہی ہیں ایک تم ہو کہ ہر وقت ماسی بنی پھرتی رہتی ہو کبھی اس سے ڈھنگ سے دو گھڑی بات بھی نہیں کرتیں۔ بیچارہ بچہ پہلی بار پاکستان آیا ہے کیا سوچے گا کہ پھوپی کے گھر والے کس قدر بداخلاق تھے کسی نے منہ دے کر بات تک نہ کی۔''

''ایسی بات نہیں ہے اگر ایسی بات ہوتی تو وہ حضرت یہاں رہتے ہی کیوں۔ وہ جب یہاں رہ رہے ہیں تو اس کا مطلب خوش ہیں اور ہماری مہمان

غزل

نظر سے دور ہے دل میں قیام رکھتا ہے
گزر بسر بھی یہیں صبح و شام رکھتا ہے
اسے خبر ہے مگر پھر بھی دور رہ کر ہی
ہمارے درد کا تو انتظام رکھتا ہے
نئے وہ زخم سجاتا ہے اس قرینے سے
پرانے بھی نہ بھریں اہتمام رکھتا ہے
فنا جو کرتا ہے ہستی کسی کی چاہت میں
دیار عشق میں افضل مقام رکھتا ہے
گھٹن کے دور میں دیکھا جمال جانے کیوں
قرینہ لفظوں کا اور احترام رکھتا ہے

مرسلہ: پروین اختر، کراچی

نوازی سے مطمئن بھی۔'' وہ اماں کا مطلب مکمل طور پر سمجھنے کے باوجود انجان بن کر بول رہی تھی اور اماں کے دل میں نہ جانے کیسے، کیسے خدشات پیدا ہو رہے تھے۔

☆☆☆

''آپ کو پتا ہوگا کہ میں یہاں کیوں آیا تھا؟'' دوسرے دن وہ لاؤنج میں بیٹھی اپنا لیکچر تیار کر رہی تھی تو بلال اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر وہ اسے دیکھتا رہا پھر بہت آہستگی سے بولا۔

''جی، مجھے کیا پورے شہر کو پتا ہے۔'' وہ کتاب بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''اب چونکہ میں آپ کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں لہٰذا میرا فرض بنتا ہے کہ آپ کو سب سے پہلے بتاؤں کہ......'' وہ کہتے، کہتے رک گیا۔

''کہ آپ کو لڑکی پسند آگئی ہے!'' اس نے بات درمیان سے کاٹ دی۔

''آپ واقعی بہت ذہین ہیں۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''اور آپ واقعی بہت بھولے ہیں۔'' اس نے بے وقوف کہنے سے اجتناب کیا۔ ''آپ کو نہیں پتا پاکستانی لڑکیوں کا یہ سب سے پسندیدہ موضوع ہے۔'' اس کا لہجہ خاصا تمسخرانہ تھا۔

''آپ نے موصوفہ کا نام نہیں پوچھا؟'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''پوچھنے کی ضرورت نہیں، وہ میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''کیوں، آپ کو یہ غلط فہمی کیسے ہوئی؟ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا؟''

''اس لیے کہ ہماری ساری کہانیوں اور سارے ڈراموں میں یہی دکھایا جاتا ہے۔ ایک بہت خوب صورت، دولت مند، پڑھا لکھا لڑکا ایک انتہائی معمولی مڈل کلاس لڑکی کو پسند کر لیتا ہے اور اس طرح ساری امیر کبیر حسین لڑکیاں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔'' رانی نے کچھ اس طرح کہا کہ وہ بے ساختہ مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

''میں تو آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا، آپ تو خاصی میچور لگتی ہیں۔'' اس کے اس جملے پر اسے یقین ہو گیا کہ اس کی حسِ مزاح کچھ زیادہ تیز نہیں ہے۔

''تو کیا ہوا اب سمجھ لیجیے، آپ کے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔'' رانی نے بہت بے نیازی سے کہا۔

''ویسے کیا خیال ہے ہم اس کہانی کو ایک مرتبہ پھر حقیقت کا رنگ نہ دے دیں؟'' بلال نے بڑی مشکل سے یہ جملہ ادا کیا اور اسے دیکھے بغیر تیزی سے لاؤنج سے باہر نکل گیا اور وہ ایسے ساکت ہو گئی جیسے کسی نے اسے میخوں سے ٹھوک دیا ہو۔

☆☆☆

بلال کچھ دنوں کے لیے دوبارہ امریکا جا رہا تھا۔ اس کے جانے میں دو دن رہ گئے تھے جب وہ کالج سے آئی تو اماں کو خوشی کے مارے لرزتے دیکھ کر اس کی سانس رکنے لگی۔

''کیا ہوا؟'' بھابیوں کے مُتے ہوئے چہرے اور اماں کا چمکتا ہوا چہرہ کوئی خوشگوار کہانی سنا رہا تھا۔

''بلال نے تمہیں پرپوز کیا ہے۔'' بھابی نے تقریباً روتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

''تو......؟'' بھابی کی توقع کے برعکس وہ نہ تو بے ہوش ہوئی اور نہ ہی اس نے بھنگڑا ڈالنا شروع کیا۔

''تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟'' بھابی کی حیرت بجا تھی کیونکہ صبح ہی بلال نے اماں سے بات کی تھی اور بلال کے کمرے سے نکلتے ہی اماں نے سارے خاندان والوں کے نمبر ملانے شروع کر دیے تھے اور جب سے مسلسل فون کی بیل بج رہی تھی۔ خاندان میں گویا خودکش حملہ ہو گیا تھا۔ سب ہی تصدیق کے لیے فون کر رہے تھے اور یقین نہ آنے کے باوجود بھرائے ہوئے لہجے میں مبارک بادیں بھی دے رہے تھے۔ بھابیاں بیچاری ہر ایک کو یقین دلاتے، دلاتے روہانسی ہوئی جا رہی تھیں۔ کیسی انہونی تھی کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا گویا سب ششدر تھے۔

جب اس نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تو بھابی کو خاصا اچنبھا ہوا۔

☆☆☆

بلال امریکا چلا گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر سب ششدر تھے۔

''ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ ناممکن ہے...... کوئی ایسا کیسے کر سکتا ہے۔'' لیکن کیا کیا جائے ایسا ہو چکا تھا۔

کیسی انہونی خبر تھی، خبر کی تصدیق کے لیے مسلسل فون کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور بھابی اب خوشی سے کھنکتے ہوئے لہجے میں اس خبر کی تصدیق کر رہی تھیں کہ۔'' رانی نے بلال کے رشتے سے انکار کر دیا اور اس لیے انکار کر دیا کہ اسے گورے رنگ کے مرد اچھے نہیں لگتے۔''

جب سے پاکستان سے آئی تھی دل میں واپسی کی ہڑک تھی۔ لندن کی روشنیوں میں شام روشن نہ ہو پاتی اور اپنی زمین کی اداسی دل میں اندھیرا کر دیتی تھی۔

عاشر کو ان سرما کی چھٹیوں میں اتنا تنگ کیا کہ بالآخر انہوں نے ہاں کر ہی دی۔ میں بہت زیادہ پُرجوش تھی مجھ سے زیادہ میری بچیاں بہت زیادہ... پُرجوش تھیں۔ میں جو انہیں پریوں کی داستان کی طرح

مدرز ونڈر لینڈ؟

نوشین ناز اختر



اپنے وطن کے قصے سنایا کرتی تھی ان کے لیے پاکستان ایک ونڈر لینڈ تھا۔

''پاکستان ایک بھرپور اسلامی ملک ہے۔ پاکستان میں سب لوگ ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا بے حد خیال کرنے والے ہوتے ہیں۔ پاکستان ہمارا ملک ہے، اپنا ملک ہے...... ہمارے اپنوں کا ملک ہے۔''

میں نے واقعی ان کے اندر پاکستان کا کریز بنادیا تھا اور پاکستان جاکر وہاں میری بڑی بیٹی باقاعدگی سے اپنی ڈائری لکھتی گئی۔ آج کالج جاتے ہوئے وہ اپنی ڈائری مجھے دے گئی تھی۔ جس پر لکھا ہے۔ ''ایلس اِن مدرز ونڈر لینڈ۔''

☆☆☆

23-12-2014

آج ہم کو پاکستان آئے ہفتہ ہوگیا ہے۔ میری امی کی آنکھوں کی روشنی کچھ مدھم سی ہوگئی ہے۔ جتنا وہ خوش تھیں اب اتنی ہی زیادہ مرجھائی ہوئی ہیں۔ امی کی بہن یعنی سیما خالہ کے گھر آج کل ہماری رہائش ہے۔ دراصل یہ ہماری نانی امی کا گھر تھا جو انہوں نے اپنی دو بیٹیوں میں برابر تقسیم کروایا۔ میری امی کا حصہ جو کرایے پر چڑھا ہوا تھا۔ اب ہمارے آنے پر وہ خالی کروایا گیا تھا اور ہمیں کم از کم چار ماہ مسلسل کہہ کر یہ کام کروانا پڑا تھا ورنہ خالہ نے تو ہر بار یہی کہہ کر امی کو ٹال دیا تھا۔

''آپ کا جب فائنل ہوجائے تب ہی کرایے دار کو جانے کا کہیں گے۔''

بابا نے اپنے کسی جاننے والے کو اس کام کے پیچھے لگایا تب جاکر ہمارے پہنچنے تک وہ گھر سے نکلے جس پر خالہ کو بے حد اعتراض تھا کیونکہ کرایہ ان کو ملتا تھا۔ امی کو اپنے اخراجات کا رونا رو، رو کر بھی انہوں نے امی تک وہ کرایہ آنے نہ دیا تھا۔ گھر کی حالت بہت ابتر تھی۔ خالہ نے اتنا تکلف بھی نہ کیا کہ گھر کو پینٹ ہی کروادیتیں۔ ہمیں آکر بے حد گندگی اور بدمزگی کا احساس ہوا تھا۔

سب ہمارے گرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ امی سب کے لیے تحائف لائی تھیں۔ ہر کوئی گفٹ لے کر بجائے خوش ہونے کے ناخوش نظر آرہا تھا۔

امی کے بھانجے کو جیکٹ کے بجائے ٹیب چاہیے تھا۔ امی کی بہن کو کاسمیٹک کے بجائے وائٹ گولڈ کی کسی چیز کی توقع تھی۔ امی کی بھانجی کو چاکلیٹ اور لانگ کوٹ کے بجائے ایم پی فور نئے فون سیٹ کی توقع تھی۔ انکل نے بھی پرفیوم اور شرٹس پکڑ کر برا سا منہ بنایا تھا۔ منہ سے تو کچھ نہ بولے تھے لیکن ان کے چہرے کے تاثرات بتارہے تھے کہ ہم ان کی توقع پر بھی پورے نہیں اترے تھے اور یہ توقع پر پورے نہ اترنے کا سلسلہ پھر لمبا ہوگیا۔ وہ ڈھیروں سامان جو ہم خاندانِ عالیہ کے لیے لائے تھے وہ پہلے ری جیکٹ ہوکر پھر وصولا جارہا تھا۔

ہم سے کوئی پیار سے بات کرتا تو ہم پل میں خوش ہوجاتے لیکن جب وہ میٹھی، میٹھی باتوں میں ہمارے تحائف ٹھیک سے نہ لانے کی نااہلی جتاتے تو ہمیں اپنوں کی مروت کا بے حد شدت سے احساس ہوتا۔ واقعی ہمارے ملک میں بہت بامروت لوگ موجود تھے۔

''کیا تحائف ہم پر کوئی ادھار تھے؟ کیا تحفہ لیتے ہوئے منہ بنانا یہاں کا رواج ہے؟'' میری چھوٹی بہن نے سوال کیا تھا۔

میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ کیا کہتی بس خاموشی کے دامن میں پناہ لے لی۔

☆☆☆

24-12-2014

آج پاکستان میں ہر طرف دھند چھائی ہوئی ہے لیکن میں سوچ رہی تھی کہ شاید یہ یہاں رہنے والوں کے رویّوں کا غبار تھا جو باہر پھیلا ہوا تھا۔ دھند

تھی کہ غبار......؟

خالہ کی ایک ہمسائی ملنے آئی تو اس نے آتے ہی امی سے پوچھا۔ ''تمہارا وہاں کس طرح کے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے؟ ہم تو اپنے مذہب کے پکے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے نہیں۔'' انہوں نے ناک چڑھا کر کہا۔

''مگر خالہ...... وہاں تو سارے مسلمان گھرانے کسی بھی فرقے کے ہوں آپس میں خوش، خوش ملتے ہیں۔ جمعے کی نماز کے لیے مرد ہی نہیں عورتیں بھی جاتی ہیں۔ اسلامک سینٹر میں بچے کھیلتے ہیں۔ بچیاں کتابیں پڑھتی ہیں اور ہم انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ بعض نمازی تو اپنے بچوں اور فیملیز کو سو سو کلومیٹر دور سے جمعہ پڑھانے لانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ ملک تو بے شک کافروں کا ہے مگر مسلمان اکٹھے مل جل کر ہی رہتے ہیں۔''

''ہم تو اپنے مسلک اور فرقے پر قائم ہیں۔ کسی اور کے ساتھ نہیں۔'' خالہ بی نے برا سا منہ بنایا تھا۔

''تم لوگ وہاں کس سیاسی پارٹی کے ساتھ ہو؟'' ان کی بیٹی نے مجھ سے پوچھا۔

''ہم......؟ دراصل وہاں سیاسی معاملات پر بحث مباحثہ پانچ سال بعد الیکشن پر ہوتا ہے۔'' میں نے اسے جواب دیا تو وہ چڑ کر بولی۔

''ہمارا الیکشن تو ہو چکا ہے مگر ہم دوبارہ کروا کر دم لیں گے تاکہ ہماری پارٹی جیت جائے۔'' پھر اس نے زوردار نعرہ لگایا ساتھ ہی خالہ کی بیٹی نے بھی اس کی مخالف جماعت کے حق میں نعرے بازی کی۔

''اخبار دیکھو یا ٹی وی ملک کا ذکر نہیں ہر جگہ یہی چل رہا ہے۔''

☆☆☆

25-12-2014

''ارے بچوں کو پاکستان کے گاؤں لازم دکھاؤ۔'' امی کی ایک دوست نے ایک اور مشورہ دیا تھا۔ ساتھ ہی اپنے گاؤں چلنے کی دعوت دے دی کہ وہاں مالٹوں کا سیزن ہوگا۔ امی اور ہم سب بہت بہت پُرجوش تھے۔ اس وزٹ کے لیے۔

ہم نے بڑی گاڑی کرایے پر کروائی تو کوئی بیس ہزار ڈرائیور پلس گاڑی دو دن کے لیے لی۔ انکل، آنٹی اور ان کی بچیاں بھی ہمارے ساتھ اپنے ڈھیروں ڈھیر بیگز کے ساتھ لد کر گئیں۔ ہمارے سامان سے زیادہ ان کا سامان تھا۔ وہاں کوئی شادی تھی غالباً یہ ہمیں انہوں نے اچانک بتایا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے ہمیں مزید پُرجوش کیا کہ گاؤں کی شادی ضرور دیکھیں آپ کو بہت مزہ آئے گا۔

''ہمیں تو انہوں نے بلایا نہیں ہے' برا لگتا ہے بنا دعوت کے جانا۔'' بابا نے انہیں ٹوکا۔

''نہیں، نہیں بھائی جان میری نند کی بیٹی کی شادی ہے۔ ہمارا اپنا گھر ہے پھر آپ کو تو میں اپنی بیٹی کے ہاں ٹھہراؤں گی آپ کو مزہ آئے گا۔'' آنٹی نے تسلی دی تھی۔

بہرحال ان کے اتنا کہنے پر ہم کونس ہو گئے تھے اور چل پڑے۔ بابا کی شوگر اچانک لو ہو جاتی ہے رستے میں ہم سب تو کچھ نہ کچھ کھاتے آئے اور ان سب کو بھی کھلاتے آئے تھے۔ وہاں جب پہنچے تو وہاں سب شادی والے گھر جا جا کر کھانا کھا رہے تھے۔ وہ گھر اسی گلی میں موجود تھا۔

ہمیں وہاں بٹھا کر سب اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ ہم حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بابا کو وہ لوگ مردانے میں بٹھا چکے تھے۔ اللہ، اللہ کر کے پونے گھنٹے بعد چائے بسکٹ آ گئے۔ سب کھانا کھانے جاتے رہے اور ہم جو گھر سے کب کے نکلے تھے' آٹھ گھنٹے کی مسافت طے کر کے آئے تھے۔ بے حد مجبوری میں خالی پیٹ چائے پی رہے تھے۔

''ان کا لنچ ٹائم ہے تو کیا ہمارا نہیں؟'' وہ تو پہلے ہی بھوک کی بہت کچی تھی۔ میری چھوٹی بہن نے

سوال کیا۔

کوئی دو گھنٹے کے بعد امی نے اپنے ہی منہ سے کہہ ڈالا۔ ''بھئی ان (بابا) کی شوگر لو ہو جاتی ہے Kindly آپ ان کو کھانا سرو کر دیں۔'' ایسا کہتے ہوئے امی کے چہرے پر شرمندگی اور بیچارگی تھی۔

امی کی سہیلی اپنی بیٹی کے نومولود بیٹے کو گود میں اٹھا لائی۔ امی نے خوش ہوتے ہوئے اسے پانچ ہزار کا نوٹ دیا تھا۔ آتے ہوئے امی اہلِ خانہ کے لیے جو تحائف لائی تھیں وہ بھی ان کے حوالے کر دیے۔ رات میں ہمارے ساتھ تو ہینڈ ہی ہو گیا۔ ہمیں وہ خاتون اپنی نند کے گھر زبردستی لے گئیں۔ وہاں مہندی کا فنکشن شروع ہو چکا تھا۔

''دلہن کو مہندی تو لگائیں۔ سہاگنیں مہندی لگا رہی ہیں۔'' ان خاتون نے آکر امی کے کان میں کہا۔

امی کچھ reluctant تھیں کہ وہ بھلا کون سا رشتے دار ہیں پھر بھی وہ انہیں زبردستی لے گئیں اور وہاں سب سُو سُو روپے وار رہی تھیں دلہن پر سے اور پانچ، پانچ سو دلہن کے ہاتھ پر رکھے جا رہی تھیں۔ امی نہ تو ان کی مہمان تھیں اور نہ ہی رشتے دار لیکن پھر بھی امی نے فوراً سو نکالے جیسے سب دے رہی تھیں ویسے ہی دینے کے لیے لیکن امی کی سہیلی چیل کی طرح دوڑی آئیں۔

''کیا کرتی ہو ناہید..... عزت کا سوال ہے۔ پانچ ہزار کا نوٹ تو کم از کم دو۔ سب کو پتا ہے کہ تم باہر سے آئی ہو بھلا پانچ سو دے کر میری ناک کٹوانی ہے۔'' امی کچھ پل ٹکر ٹکر دیکھتی رہیں لیکن بولی کچھ نہیں چپ چاپ پانچ ہزار کا نوٹ نکال کر دلہن کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ امی کا چہرہ اداس تھا اور میرا دل اداس تھا کہ ہماری کوئی حقیقت نہیں۔ ہم بس تحفے دینے والے اور پیسے دینے والے لوگ ہیں۔ ہم جو آنٹی کا پیار سمجھ کر آگئے تھے وہ دراصل ان کی اپنی ہی غرض تھی۔ اپنے خاندان کو فری میں گاؤں تک لانا تھا۔

پیسے دلوا کر اپنا رعب قائم کرنا تھا۔ واپسی پر آنٹی نے اپنی بیٹی کو بھی پانچ ہزار کا نوٹ دلوایا تھا۔

''امی آپ نے کیوں دیے اتنے پیسے؟ ہم ہوٹل میں Stay کر کے اپنا کھا کر بھی تو وزٹ کر سکتے تھے؟'' چھوٹی بہن ہمیشہ سوال کرتی تھی۔

وہاں ہم سب دوست امریکن سسٹم کے تحت اپنا، اپنا ادا کر کے ہوٹل کا کھانا کھاتی تھیں۔ کبھی پکنک کا پروگرام بنتا تو اپنا، اپنا کرایہ ادا کرتی تھیں۔ نہ کسی کا احسان ہوتا اور نہ دل پر بوجھ آتا تھا۔ پیسہ دینا پرابلم نہ تھا بلکہ مسئلہ تھا کہ جو محبت وہ جتاتے تھے وہ بس کوئی نہ کوئی غرض لیے ہوئے تھی۔ امی نے جو پریوں کا دیس بتا دیا تھا پاکستان کو ہمارے لیے وہ درحقیقت بھوکے بھوتوں کی دنیا بن کر ملا تھا ہم ہے...... بے حد تھکن اور بدمزگی واپسی پر ہماری ساتھی بنی تھی۔

☆☆☆

28-12-2014

آج کا دن بھی بے حد حیران کن تھا۔ امی، بابا کو خالہ نے گھیر لیا تھا۔

''تم لوگ تو وہاں رہتے پاؤنڈز میں کماتے ہو۔ تم لوگ خوش حال ہو، یہ گھر کا باقی حصہ ہمارے نام کر دو۔''

''یہ نیکی تمہارا صدقہ جاریہ رہے گا۔'' خالہ کے شوہر بھی ان کی رائے میں رائے ملا رہے تھے۔

''تو ہم پاکستان آکر کہاں رکیں گے؟''

''آپا آپ کون سا زیادہ دنوں کے لیے آتی ہیں۔ کتنے سالوں بعد تو آئی ہیں۔ آپ کی ضرورت تو یہاں میرے ہاں رہ کر بھی پوری ہو جائے گی۔'' خالہ نے بہت خوشامدانہ لہجے میں کہا تھا۔ بابا اس معاملے میں قطعی لاتعلق بیٹھے تھے۔

امی بے حد پریشان سب کی شکلیں دیکھ رہی تھیں۔ مجھے تو یقین تھا کہ میری بامروت اور خوف

خدا کھانے والی ماں خالہ کی بات فوراً مان لیں گی۔

''دیکھو سدرہ......تم مجھے بے حد عزیز ہو۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے تم واحد رشتہ ہو میرا پاکستان میں۔ تم جیسے آج تک میرے حصے کا کرایہ استعمال کرتی آئی ہو ویسے ہی کرتی رہو۔ میں تمہیں منع نہیں کروں گی لیکن یہ گھر میری ماں کی نشانی ہے ان کا دیا تحفہ ہے۔ میں اس تحفے میں ان کی خوشبو محسوس کرتی ہوں۔ میں اس تحفے سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔'' امی کی بات پر ہم سب نے حیرت اور خوشی سے امی کو دیکھا تھا۔ خالہ نے اس بات پر بہت گستاخانہ شور مچایا۔ ہمیں لالچی تک کہا۔ ہمیں ظالم اور خودغرض بھی کہا لیکن امی چپ چاپ سنتی رہیں۔ ان کا فیصلہ اٹل تھا۔

''سدرہ تمہیں اگر میری بات منظور ہے تو ٹھیک ہے۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔''

''آپا مجھ سے آپ کے کرایے دار ہر ماہ نہیں سنبھالے جاتے...... بہت جھنجٹ ہے یہ سب کچھ۔'' خالہ نے غصے سے کہا حالانکہ وہ کرایہ خود ان کے پاس جاتا تھا پھر بھی احسان ہم پر ہی تھا۔

''تو ٹھیک ہے۔ آئندہ سے تم نہ دیکھنا کرایے داروں کو۔ اکمل بھائی (بابا کے دوست) وہ دیکھ لیا کریں گے۔'' امی نے رسانیت سے کہا۔

''لے، ایسے کیسے غیروں کے ہاتھ پراپرٹی دے دیں گی۔ وہ تو کرایہ خود سنبھال لے گا۔'' خالہ چلائیں۔

''نہیں، وہ میرے اکاؤنٹ میں ڈال دیں گے۔ ہم ان کو پابند کر دیں گے۔'' امی نے کہا تو خالہ نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔

''میرا خیال نہیں ہے آپ کو، میرے گھر کا خرچ دیکھا ہے؟ میرا تو گزارہ اتنا مشکل ہے۔ اوپر سے آپ کرایہ بھی خود رکھیں گی۔ اتنا ظلم کوئی بڑی بہن چھوٹی بہن پر کرتی ہے۔'' خالہ تو کسی کروٹ سکون نہ لے رہی تھیں۔

''دیکھو سدرہ، میں اپنا گھر نہیں بیچوں گی اس کے علاوہ کیا چاہتی ہو تم بتا دو؟'' امی نے بے حد ضبط سے کہا۔

''آپ گھر بیچ دیں یا ہمارے نام کر دیں۔'' خالہ نے کہا۔

''نہیں، میری جڑیں یہاں ہیں۔'' امی نے مضبوطی سے کہا۔ خالہ چپ چاپ روتی غصے سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ وہ امی پر جذباتی دباؤ ہمیشہ ہی ڈال لیتی تھیں۔ خالو ایک دم بوکھلا گئے ان کو صاف نظر آ گیا تھا کہ گیم ان کے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔

''آپا آپ سدرہ کی باتوں پر پریشان نہ ہوں بس ایسے ہی جذباتی ہو جاتی ہے۔ میں تو ہمیشہ سے یہ سارے معاملات بڑے آرام سے دیکھ لیتا ہوں، یہ تو پاگل ہے۔'' وہ جلدی سے بولے تھے۔ ''آپ

سالگرہ مبارک

پاکیزہ کی تمام پیاری، پیاری بہنوں کے نام

تمہاری سالگرہ جب سے مجھ کو یاد آئی
تبھی سے سوچ رہی ہوں، تمہیں کیا پیش کروں؟
کوئی سپنا، کوئی وعدہ، کوئی خوشبو، کوئی پھول
یا تمہیں دل سے نکلتی یہ دعا پیش کروں
تمہارے پاؤں سدا منزلوں کی راہ چلیں
سراب کا تمہاری راہ سے گزر بھی نہ ہو
تمہارے ہاتھ بڑھیں، کامیابیوں کو چھو لیں
کسی ناکامی کا تمہارے ہاں ذکر بھی نہ ہو
مایوسیوں میں کوئی روز و شب بسر بھی نہ ہو
تمہیں عروج اتنا ملے اے جانِ عزیز بہنو
کہ تمہیں پھر کسی زوال کی فکر بھی نہ ہو

از: امینہ عندلیب، سلانوالی

چھوڑیں اکمل بھائی کو معاملات جیسے پہلے سے چل رہے ہیں ویسے ہی چلتے رہیں گے۔"

خالو کی بات پر امی نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ خالہ باقاعدہ ناراض تھیں۔

ہمارا ہی حصہ اور امی پر زورا زوری گویا دل پر ہمالیہ جیسا بوجھ آن گرا تھا۔

☆☆☆

30-12-2014

امی نے آج گھر میں قرآن خوانی کروائی ہے۔ نانی اماں اور نانا ابو کی قبروں پر مٹی ڈلوائی ہے۔ مدرسے کھانا بھجوایا ہے۔

امی آج بہت اداس ہیں اور ابو خاموش......

اور ہم بہنیں حیرت زدہ سی ہیں۔

☆☆☆

31-12-2014

آج ہماری رات کی فلائٹ ہے۔ ہم نے بارہ کو جانا تھا لیکن ہم جلدی جا رہے ہیں۔ یہاں کا ونڈرلینڈ واقعی ہمیں حیرت زدہ کر گیا۔ ہم ہائی نیک گلے پہنتے ہیں۔ امی ہمیں سمپل گلا نہیں پہننے دیتیں اور یہاں لڑکیاں اتنی سردی میں بھی سلیولیس پہن لیتی ہیں۔ امی ہماری نمازوں کی رکھوالی انگلینڈ جیسے غیر اسلامی ملک میں بھی کرتی ہیں لیکن یہاں والدین بچوں کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہیں اور نمازوں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ہم وہاں ہر جمعہ مسجد جا کر نماز جمعہ پڑھتے ہیں۔ قرآن کی دہرائی کرتے ہیں۔ یہاں جمعے کا دن بھی اکثر لوگوں کو بھول جاتا ہے۔

وہ جو پیور مسلم ملک کا Concept لے کر ہم یہاں آئے تھے مگر یہاں تو بہت ملاوٹ ہو چکی ہے۔ ہمارے پہنچتے، پہنچتے سادگی نمائش میں بدل گئی ہے۔ محبت، منافقت میں اور مروت، غرض کی شکل دیکھ چکی ہے۔ یہاں اللہ اور اس کے رسول کو بھی فرقوں نے بانٹ لیا ہے۔ اپنی، اپنی مسجدیں ہیں سب کی اپنے، اپنے محلے میں۔

کیا پاکستان بٹ رہا ہے؟ خدا نہ کرے مگر یہ تکلیف ہم لے کر جا رہے ہیں۔ ہم یہاں سے سیدھے عمرہ کرنے جا رہے ہیں۔ امی اتنی بے سکون تھیں کہ بابا کو ان کی خواہش کا احترام کرنا ہی پڑا۔

☆☆☆

1-01-2015

آج ہم حرم پاک پہنچ چکے ہیں۔ بہت مختلف سا احساس ہے ایسے جیسے دل کی ساری کثافتیں دھل گئی ہوں۔ امی اب اداس نہیں ہیں۔ بابا بھی اتنے چپ نہیں ہیں اور ہم اتنے حیرت زدہ نہیں ہیں۔ میں سامنے ہوٹل کے اس کمرے میں دور سے خانہ کعبہ کا منظر بہت آسانی سے دیکھ سکتی ہوں۔ ہزاروں کا ہجوم ایک جیسے لباس میں اللہ تعالیٰ کے گھر کا طواف کر رہا ہے۔ ان میں کسی کا چہرہ پاکستانی، ایرانی، انڈونیشین، ترکی، عربی، بنگلا دیشی، چینی، جاپانی نظر نہیں آ رہا ہے بلکہ......بس دور سے ایک منظر نظر آ رہا ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ سب مسلمان ہیں۔ اور اپنے رب کے گھر مہمان آئے ہیں۔ وہاں کسی کی کوئی پہچان نہیں ہے سوائے اس کے کہ سب مسلمان ہیں۔ ایک اللہ......ایک رسول اکرمؐ کے ماننے والے ایک کلام پاک، ایک قوم......بس مسلمان۔

"سسٹر یہاں سے واپسی پر تین ہی تحفے ہوتے ہیں۔ آبِ زم زم، جائے نماز، تسبیح اور کھجور۔" میری چھوٹی بہن میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اچانک بڑبڑائی۔ وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی مگر میں ایک دم سے ہی لرز کر رہ گئی۔

"کیا کل یہاں سے جانے والوں کے تحفے لے کر بھی منہ بنانے کے عادی رشتے دار منہ بنائیں گے؟ کھجور لمبی والی کیوں نہیں ہے؟ جائے نماز چائنا کا کیوں ہے، ترکی کا کیوں نہیں۔ آبِ زم زم پلاسٹک کی بوتل میں دے کر ہمارا دل دکھایا ہے۔ شیشے کی بوتل

میں کیوں نہیں لائے؟ لوگ کیا کہیں گے؟"

"کیا ہم اپنی اسلامک سینٹر فیلوز کے لیے کوئی تحفہ لے لیں؟" بہن نے بڑی معصومیت سے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے ہاں میں سر ہلایا پر منہ میں آیا جملہ روک لیا۔ میں کیوں اس کی یادوں کی جھولی میں کوئی اور منفی یاد بھروں۔

☆☆☆

2-2-2015

امی کی بڑی خواہش تھی کہ واپسی سے پہلے آنحضورؐ کا گھر دیکھا جائے اور وہ جگہ جہاں بیٹھ کر وہ عبادت کرتے تھے۔ ابا نے ساری معلومات کر لی تھیں جب ہم اس جگہ پہنچے تو وہاں ایک خوب صورت اور صاف ستھری لائبریری بنی ہوئی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں آپؐ پیدا ہوئے جن کی وجہ سے ہم مسلمان ہیں۔ انؐ کی زندگی اور تعلیمات پر کئی زبانوں میں لکھی کتابیں موجود ہیں۔ شاید دنیا کے مالکِ حقیقی کی بھی یہی پسند رہی ہوگی کہ اسے ماننے والے پڑھیں، جانیں اور اپنے رویے بہتر کریں۔ دنیا بھر میں محبت سے چیزیں اچھی ہو جاتی ہیں البتہ ہم نے ان دنوں زیادہ گڑبڑی دیکھی ہیں۔

غارِ حرا جانے کے لیے جب ہم پہاڑ پر چڑھ رہے تھے تو ہم دونوں بہنیں آگے تھیں پھر امی اور پھر بابا۔ بڑے جوش و جذبے سے اوپر چڑھ رہے تھے۔ اچانک امی کی چیخ سنائی دی۔ ان کا پاؤں کسی پتھر سے پھسل گیا تھا۔ جو منظر میں نے دیکھا اس نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ امی چوٹیں کھاتی لڑھکتی نیچے جا رہی تھیں۔ بابا نے انہیں تھامنے کی کوشش کی اور خود بھی گر پڑے۔ امی چوٹوں سے یا صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ بابا کی کمر پر شدید چوٹ آئی تھی۔

ہم دونوں بہنیں بے بسی سے کھڑی رو رہی تھیں۔ پتا نہیں کہاں سے ایک عورت نے آکر میرے آنسو پونچھے اس کی بیٹی میری بہن کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے ابو نے میرے بابا کو اٹھا کر بٹھایا تھا۔ وہ ان کی کمر دھیرے، دھیرے ہاتھ پھیر رہے تھے۔ دو تین سعودی عورتوں نے امی کا سر سنبھال کر اپنی گود میں رکھا تھا۔ ایک شرطے (پولیس والا) نے گاڑی روک رکھی تھی۔ بابا کو آگے بٹھا کر امی کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا گیا۔ ہمارے بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ انہی انکل آنٹی نے دوسری گاڑی کو روکا اور اپنی بیٹی کے ہمراہ ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔

اسپتال کے لیے زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ بابا کی پٹی ہوگئی۔ امی کو جلد ہوش آ گیا۔ میں منتظر رہی کہ پاکستانی انکل، آنٹی یا ان کی بیٹی کب ہمیں عقل سکھانے آ بیٹھیں۔ کب ہم سے پوچھیں تم کون لوگ ہو؟ یعنی کس فرقے سے ہو یا کس سیاسی پارٹی کے ہو۔ میں منتظر ہی رہی مگر جانے کیوں وہ یہ پوچھنا بھول گئے یا پھر وہ بھی ہمارے جیسے ہوں گے شاید ان باتوں پر دکھی اور آزردہ ہونے والے۔

انہوں نے جس بے غرضی سے ابو، امی کا دھیان رکھا اور ہمیں ہوٹل تک پہنچا کر گئے لگتا ہی نہیں تھا، ہمارے ملک کے ہیں۔ ان سے پوچھنے کا وقت تھا نہ موقع وہ کئی روز امی، بابا کی خیریت پوچھنے آتے رہے۔ سچ کہوں ایسے لوگوں کی دل قدر کرتا ہے۔ واپسی کے وقت امی نے آنٹی سے گلے ملتے ہوئے ایسے ہی تو نہیں کہا تھا۔

"رابطے میں رہیے گا...... رب نے مجھے ایک مخلص بہن دے دی ہے' پہلے بھی وہ اپنے رسولؐ کے ذریعے ہی رشتے بناتا تھا۔ آج بھی انہیؐ کے قدموں کی خاک کے صدقے مجھے ایک نیا رشتہ عطا ہوا ہے۔"

میں حیرت سے کھڑی اپنی ماں کے جملے پر غور کیے جا رہی ہوں اور میری حیرت ہے کہ کم ہونے میں نہیں آ رہی اتنی حیرت تو مجھے اپنی مدرز وںڈر لینڈ جا کر بھی نہیں ہوئی تھی۔

☒☒

منی ناول

جنگل کا پھول

زاہدہ پروین

آٹھواں حصہ



بہو کا جہیز دیکھ کر نائمہ بیگم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دنیا ان کو مبارک باد دینے دوڑ پڑی، ان کا سر فخر سے بلند ہوتا چلا گیا۔ گو کہ نند بھاوج برسوں سے ایک ساتھ رہ رہی تھیں مگر نائمہ بیگم کو کبھی درست اندازہ نہ ہو پایا تھا کہ شمسہ بیگم کے کیا عزائم اور کیا تیاریاں ہیں بیٹی کی رخصتی کے لیے..... مگر اب جو انہوں نے رخصتی کے ساتھ، ساتھ ٹرک بھر جہیز کا سامان لدوا کر سسرال روانہ کیا تو وہ پلک جھپکانا بھول گئیں۔



نائمہ بیگم اس امر سے تو واقف تھیں کہ روبی ایک شاندار جہیز کے ساتھ ان کے آنگن میں اترے گی مگر اس درجہ عظیم الشان جہیز کا اندازہ نہیں تھا انہیں.....

چنانچہ جہاں شمسہ بیگم کا وہ ہمیشہ سے احترام کرتی تھیں وہیں رخصتی کے بعد روبی انہیں مزید محبوب اور عزیز ہوگئی۔ پل کے پل اس کے آنگن میں اترتے ہی نائمہ بیگم کی کوٹھی قیمتی اور انمول، نادر و نایاب اشیا سے جگمگا اٹھی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ متین احمد کی تعلقہ داری پھر سے زندہ ہوگئی ہو...... انہوں نے بیٹی کو موتیوں میں تول کر رخصت کیا تھا۔ دیکھنے والے جہیز دیکھ کر اش اش کر اٹھے تھے۔

مارے خوشی اور فخر کے نائمہ بیگم کے زمین پر پیر نہیں لگ رہے تھے، سر سے پاؤں تک نہال ہو اٹھی تھیں۔ نند اور نندوئی نے ان کے تمام ارمان پورے کر دیے تھے۔ خرم اور خاور کے لیے بھی وہ ایسے ہی خوشحال گھرانوں سے بہویں لانے کی تمنائی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ ساری دنیا کو چھوڑ کر انہوں نے خرم کے لیے سیٹھ رستم علی خان کی صاحبزادی کو پسند کیا تھا۔ وہ تو قدرت کو ہی کچھ اور منظور تھا ورنہ انہوں نے تو پورے کے پورے انتظامات کے ساتھ قدم آگے بڑھا لیے تھے۔

روبی کا آنکھیں خیرہ کر دینے والا جہیز پا کر رات سے ہی نائمہ بیگم نے پچھتانا شروع کر دیا تھا۔ وہ سوچ، سوچ کر ہاتھ ملے جا رہی تھیں کہ کاش! انہوں نے اپنی جلد بازی اور عجلت میں سیٹھ رستم علی خان کے گھر کا رشتہ رد نہ کیا ہوتا اور فضول میں ان کی طرف سے اپنے دل و دماغ میں خوف و خطر کو جگہ نہ دی ہوئی تھی ورنہ اس گھرانے کی بیٹی کسی طرح بھی روبی سے کم حیثیت بہو ثابت نہ ہوتی۔

''خیر...... کوئی بات نہیں۔'' انہوں نے کھیر کھلائی کے وقت نہایت کروفر سے اپنے آپ سے وعدہ کیا۔

''روبی کے ذریعے رستم علی خان جیسے گھرانوں سے باقی کی دو بہویں لانی ہیں۔'' جہاں نائمہ بیگم، روبی کا جہیز دیکھ، دیکھ کر مطمئن اور نہال ہو رہی تھیں۔

وہیں ڈاکٹر خاور اک آہ بھر کر رہ گئے تھے۔ ان کی نگاہوں میں بے اختیار شرمین کی کم مائیگی اور سفید پوشی کا نقشہ گھومنے لگا تھا۔

وہ تین دنوں سے ان کے حواسوں کے اوپر سے قیامت گزر گئی تھی۔ سوچ، سوچ کر ان کے دل و دماغ شل ہوگئے تھے۔ سوچیں جیسے گڈمڈ ہو کر رہ گئی تھیں۔ مارے حیرت کے وہ گنگ رہ گئے تھے۔

شرمین بیچاری کا معاملہ تو جہاں کا تہاں رہ گیا تھا اور درمیان میں قصہ آن موجود ہوا تھا خرم اور ریشم کا۔

موقع محل ایسا تھا کہ اتنی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین اطلاع وہ اپنے تک محدود رکھنے پر مجبور تھے۔ معمولی اعصاب والا شخص تو چیخ اٹھتا۔ لیکن ہزار حیران و پریشان ہونے کے باوجود انہوں نے نہایت بردباری اور صبر و تحمل سے کام لے کر اپنی سوچوں پر جبر کر کے یہ خبر فقط اپنی ذات تک ہی محدود رکھی تھی۔

وجہ یہ تھی کہ اول تو گھر میں بابر کی شادی کے ہنگامے عروج پر تھے دوسرے ان کی سمجھ میں یہ گتھی نہیں سلجھ پا رہی تھی کہ وہ یہ تشویش ناک خبر سب سے پہلے کس کو دیں۔ آیا وہ یہ اطلاع اپنی والدہ کو دیں......؟ یا پھر بابر بھائی کو اس راز میں شامل کریں؟ یا پھوپی، پھوپا کے گوش گزار کریں؟ یا پھر..... خود ہی خرم سے دریافت کریں؟ مگر خود کو وہ اس بات کا اہل ہرگز نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ بھائی کو منہ پھوڑ کر کہہ دیں کہ وہ اس کی زندگی کا اتنا نازک راز پا گئے ہیں۔ وہ کس قدر شرمندہ ہوتا۔ اس سچائی کا سامنا کر لینے کے بعد سے وہ سخت قسم کی کشمکش میں مبتلا ہو کر رہ گئے تھے۔

بارات کے اتنے ہنگامے اور بکھیڑے ہونے کے باوجود وہ بار، بار اسی ایک نکتے پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ خرم اس بے جوڑ شادی پر آخر کیوں اور کیسے مجبور ہوگیا۔ وہ کون سی وجوہات تھیں کہ اس نے اپنے گھر والوں سے چھپ کر شادی رچا لی۔

پھر ایک عجیب و غریب اتفاق ہوا۔ اپنی بھاوج کا

جہیز دیکھ کر تو وہ یونہی دل گرفتہ اور ملول ہو رہے تھے، ان کی نگاہوں میں بار، بار شرمین کا بھولا بھالا چہرہ اور چھوٹا سا صاف ستھرا گھر گھومنے لگا تھا اور عین کھیر کھلائی کی رسم کے دوران جبکہ نائمہ بیگم نے اپنے دل ہی دل میں ایک عہد دُہرایا تھا بس اچانک ہی خاور کو اپنے دماغ میں گھومنے والے سوالات کے جوابات مل گئے تھے۔ ان کے ذہن میں یکے بعد دیگرے وہ تمام وجوہات آ گئیں جن کی بنا پر خرم نے چھپ کر شادی کر لی تھی۔

انہیں بہت واضح طور سے اس سوال کا جواب مل گیا کہ خرم اس شادی پر کیوں مجبور ہوا۔ یکایک ان کی تمام حیرانیاں اور پریشانیاں رفو چکر ہو گئیں بلکہ انہیں اپنے بھائی سے انتہائی درجے کی ہمدردی بھی محسوس ہونے لگی۔

خود بخود ہی وہ اپنے کو اور خرم کو ایک ہی کشتی میں سوار سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ دونوں ایک ہی مسئلے کا شکار ہوں...... دونوں کے حالات تقریباً ایک جیسے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ خرم نے بہت بہادری کے ساتھ اعلانِ جنگ کر ڈالا تھا جبکہ وہ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے بیچ میں لٹک رہے تھے۔ گھر میں پہلی شادی تھی۔ اور وہ بھی بڑے بھائی کی...... ہزاروں کام سمیٹنے کو منتظر پڑے تھے۔ لہٰذا خاور نے تمام مسائل کو ایک طرف کر کے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ ولیمے کی تقریب ختم ہوتے ہی خرم کے معاملے کو سلجھانے کی کوشش کریں گے۔

اگلے دن بابر کا ولیمہ تھا۔ مختلف مصروفیات کی بنا پر بہت رات گئے سونے کو ملا تھا۔ وہ بھی ایک فکرمند اور بے چین سی نیند...... اس لیے خلافِ معمول نائمہ بیگم کی آنکھ صبح قدرے دیر سے کھلی۔ اس لیے وہ کافی گڑبڑا کر رہ گئی تھیں۔ ان کے اعصاب پر ہلکا، ہلکا اضطراب اور بے چینی سی طاری ہو گئی۔

''الٰہی! یہ کیا ہو گیا۔ آج تو ہمیں بہت سویرے بیدار ہو کر مختلف انتظامات کو دیکھنا تھا۔ بہت اہم دن ہے اور آج ہی ہم دیر سے اٹھے۔'' انہوں نے مضطرب ہو کر جلدی، جلدی وضو کرتے ہوئے بہت ساری باتیں سوچ ڈالیں۔

اس وقت پوری کوٹھی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ ہر کمرے میں سناٹا تھا۔ کل تمام دن کی تھکان کے بعد مکین اور آئے مہمان سب کے سب گہری نیند میں مست و بے خود تھے۔

شمسہ بیگم اور متین احمد ابھی وہیں تھے جہاں سے بیٹی کو رخصت کیا تھا۔ کچھ مہمان جو اُن کی طرف آئے تھے وہ بھی وہیں مقیم تھے۔ آج دن چڑھے تک شمسہ بیگم سمیت وہ سب کے سب سسرالی مہمان کی حیثیت سے یہیں آنے والے تھے۔ اسی وجہ سے نائمہ بیگم کے حواس پر کچھ ہول کی سی کیفیت زیادہ شدت سے طاری تھی۔

دیر سے جاگنے کے باوجود نمازِ فجر کا وقت ابھی باقی تھا۔ وضو کر کے انہوں نے جانماز بچھائی اور جلدی سے نیت باندھ لی۔ نماز ادا کرنے کے بعد انہوں نے حسبِ معمول وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ وظیفہ ان کا ہر روز کا معمول تھا۔ نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں اس لیے کسی بھی صورت جلد از جلد پڑھ لینا چاہ رہی تھیں پھر اس کے بعد وہ آج کے انتظامات پر ایک آخری نگاہ ڈال لینا ضروری سمجھ رہی تھیں۔ گوکہ دعوت کا انتظام نہایت عالی شان اونچے پیمانے پر تیار تھا مگر وہ اپنی بے چین فطرت کے ہاتھوں بے بس تھیں۔ جب تک بخیر و خوبی ولیمے کی دعوت اختتام کو نہ پہنچ جاتی۔ ان کی وہمی طبیعت کو قرار ملنا ناممکن تھا۔

وظیفے کے دوران انہیں محسوس ہوا کوئی دبے پاؤں کمرے میں آیا ہے، انہوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ بابر کی پریشان صورت دیکھ کر وہ دنگ رہ گئیں۔

☆☆☆

''بیٹے! ڈاکٹرنی نے تو صاف بڑے آپریشن کا نام لیا ہے۔'' ذکیہ خالہ نے خرم کو آگاہ کرتے ہوئے کہا پھر کچھ اچانک یاد آنے پر ریشم کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''بیٹی! تم نے اسپتال والی دوا کھالی؟''

''جی خالہ جی......'' قریب ہی دوسری چارپائی پر لیٹی ہوئی ریشم نے جواب دیا۔

''درد کم ہوا؟''

''جی ہاں، اب تو بہت آرام ہے۔''

''شکر ہے مولا کا......'' انہوں نے مطمئن ہو کر کہا۔ پھر سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وہ خرم سے مخاطب تھیں۔

''بیٹا! تم تو اپنے کام پر چلے گئے مگر درد سے تمہاری بیوی کو کسی پل قرار نہیں تھا۔ اس کے پیٹ میں بہت زوروں کا درد تھا۔ تم تو موجود نہیں تھے مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اسے کسی ڈاکٹرنی کو دکھا دینا چاہیے۔ عبداللہ کی دادی بھی یہی مشورہ دے چکی تھیں۔ مجھے تو زیادہ معلومات نہیں تھیں مگر مجھے انہوں نے اپنی ایک واقف کار ڈاکٹرنی کے پاس بھیجا۔ اس نے معائنہ کر کے کہا ہے کہ ان کا آپریشن کرنا پڑے گا۔'' اس خبر سے خرم کے ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے تھے اور جو ذکیہ خالہ نے تفصیل بتائی تو اس کے اوسان جاتے رہے۔ وہ گردن جھکا کر رنجیدہ سا بیٹھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے؟ ان کی باتوں کے جواب میں کیا کہے؟

وہ اس کے محسوسات کو سمجھ رہی تھیں۔ ظاہر ہے خرم بھی کوئی تجربہ کار مرد نہیں تھا۔ بظاہر کوئی عزیز رشتے دار بھی نہیں تھا۔ شادی کے بعد خدا، خدا کر کے یہ پہلا موقع آیا تھا مگر بقول شخصے، سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے تھے۔ خالہ کو اس کی سنجیدہ اور رنجیدہ صورت پر بہت رحم آیا۔

''بچہ بیچارہ کیا کرے؟'' انہوں نے دل میں سوچا...... پھر نرمی سے بولیں۔

''بیٹے! تم تو بالکل ہی رنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے۔ اللہ پاک اپنا کرم فرمائے گا...... اس قدر پریشان نہ ہو، جس کا کوئی نہ ہو، اس کا خدا ہوتا ہے، اللہ سے بہتری کی دعائیں مانگتے رہو۔''

''اب مجھے کیا کرنا چاہیے خالہ؟'' خرم نے قدرے سکون کی سانس لی اور آہستہ سے پوچھا۔

''سردست تو یوں کرو کہ تم ان ڈاکٹرنی صاحبہ سے ایک ملاقات کر لو۔ انہوں نے تمہاری بیوی کا نام لکھ لیا تھا۔ وہی تمہیں سب کچھ سمجھا دیں گی۔'' خالہ نے سنبھل کر جواب دیا۔

خرم ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ بڑے بھائی کی شادی سر پر آ گئی تھی ادھر بیوی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ ایک دم ہی اس کی صورت اتر گئی۔ جتنا ذکیہ خالہ اسے تسلی دینا چاہ رہی تھیں، اتنی ہی اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ بالآخر خوب سوچ سمجھ کر اس نے خالہ سے مشورہ لیا۔

''خالہ آپ ہی مشورہ دیجیے، ملازمت کے سلسلے میں مجھے دو تین دن کے لیے گھر سے دور رہنا پڑے گا...... مم...... میرا مطلب ہے کہ میں رات کو بھی گھر نہیں آ سکوں گا ایسی صورت میں کیا ہو گا؟'' خالہ تو اس کی بات پر غور کرنے لگیں مگر ریشم گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' اس نے فوراً اسے تسلی دی۔'' ابھی چپ رہو۔ بتا دوں گا تمہیں۔''

''بھیا! تم ایسا کرو کہ...... کل ہی ڈاکٹرنی صاحبہ سے مل لو۔ مجھے تو انہوں نے یہی بتایا ہے کہ ابھی کچھ دن باقی ہیں۔ پھر اللہ کا نام لے کر اپنے کام سے نکل جاؤ کیونکہ نوکری ہے تو سب کچھ ہے۔ یہاں ہم لوگ بھی ہیں، دیکھتے رہیں گے، اللہ سب بہتر کرے گا۔'' خالہ نے اپنی تجویز پیش کر دی۔

''چلیے ٹھیک ہے ایسا ہی کر لیتے ہیں۔'' خرم نے قدرے پُرسکون ہو کر کہا۔

تھوڑی دیر تک تسلی تشفی کی باتیں کرتے رہنے کے بعد خالہ اپنی طرف چلی گئیں تو کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ جیسے کرنے کو اب کوئی بات ہی نہ رہ گئی ہو۔ خرم اپنی سوچوں میں گم صم بیٹھا تھا۔ چند منٹ منتظر رہنے کے بعد ریشم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھی۔

''آپ نے بتایا نہیں کہاں جانا ہے آپ کو؟'' بہت ملائم لہجے میں دریافت کیا ریشم نے۔ خرم نے نگاہ اٹھا کر گہری نظروں سے اسے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''بتاتا ہوں ابھی۔'' وہ کچھ توقف کے بعد کہتا اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ کپڑے تبدیل کر کے منہ ہاتھ دھو کر دوبارہ اس کے پاس آیا اور اس کا سر ہلا کر بولا۔ ''اب..... کھانا بھی ملے گا یا وہ بھی خالہ ذکیہ آ کر دیں گی؟'' وہ جلدی سے ہڑ بڑا کر جیسے ہوش کی دنیا میں آ گئی۔ اپنی خود فراموشی پر شرمندہ ہوئی اور پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔

''بھول گئی تھی، ابھی لاتی ہوں کھانا۔'' وہ آہستہ قدموں سے باہر چلی گئی۔ ذرا دیر کے بعد آئی تو کھانے کی ٹرے اور پانی کا مگ اس کے ساتھ تھا۔

کھانا تو اب تک خود اس نے بھی نہیں کھایا تھا۔ پوری توجہ اپنی طبیعت کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ ہول، ہول کر برا حال تھا کہ ہائے آپریشن ہوگا...... اور اب میاں کی فکر ہو گئی تھی کہ وہ اچانک کہاں جا رہے ہیں؟ تاہم یہ وقت فقط کھانے کا تھا۔ دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ وہ برتن رکھ کر آئی تو خرم اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا اسی کا انتظار کر رہا تھا، پیار سے اسے اپنے قریب بٹھایا، خود بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ہاں بھئی! یہ کیا شر پھیلا رکھا ہے؟'' خرم نے ہاتھ بڑھا کر ریشم کے بال بکھرا دیے۔

''شر میں نے پھیلایا ہے یا آپ نے؟'' ریشم نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ خرم کے جانے کا سن کر ریشم اپنا مسئلہ بھول بیٹھی تھی۔

''ذکیہ خالہ کہہ رہی ہیں رو، رو کر اپنی آنکھیں پھوڑ رہی ہے، بھئی ایسی کیا آفت آ گئی ہے، کل میرے ساتھ چلنا ذرا اسپتال......''

''میں کیا کروں گی اسپتال جا کر، خود تو سیر کرنے جا رہے ہیں۔'' اس نے منہ پھلا کر جواب دیا۔ خرم نے پیار سے اسے لپٹا لیا اور اس کے گال تھپتھپا کر بولا۔

''دونوں ہی کام کرنے پڑیں گے جان من، اسپتال نہ جاؤ گی تو میں...... بابا جان کس طرح بنوں گا۔'' ریشم کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ ذرا تھم کر بولی۔

''اور میری دوسری بات کا کیا جواب ہے؟''

''دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ بقول تمہارے ''سیر کے لیے جا رہا ہوں۔'' جی نہیں میں سرکاری دورے پر جا رہا ہوں، واپسی میں زیادہ سے زیادہ دو دن لگیں گے مگر پھر ترقی بھی تو ہماری ہی ہوگی، دیکھا تم نے! ہمارا آنے والا بچہ ماشاء اللہ کس قدر خوش نصیب ہے۔''

سادہ دل ریشم کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ شوہر کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہنا اس کی سرشت میں داخل تھا۔ پیار بھری چند باتوں سے ہی دل و دماغ آئینہ ہو گیا اور اس نے سرشار ہو کر اپنا سر خرم کے شانے پر ٹکا دیا۔ کہاں کا آپریشن اور کیسی تکلیف، تمام سوال' جواب دم سادھ گئے اور وہ ہر فکر سے بے پروا ہو گئی۔ عورت کو بھی قدرت نے عجیب ٹھنڈی میٹھی مٹی سے تخلیق کیا ہے، اپنے دکھ درد فراموش کرتے دیر ہی نہیں لگاتی۔

دوسرے دن خرم، ریشم کو لے کر اسپتال گیا، محض اتفاق ہی تھا کہ ڈاکٹر خاور، اپنے بھائی کی شادی کے سلسلے میں تین دن کی لیو پر تھے ورنہ اسپتال میں شاید کہیں نہ کہیں دونوں بھائیوں کی مڈبھیڑ ہو جاتی۔

ڈاکٹر شاکرہ نے ان سے وہی باتیں کیں جو خالہ ذکیہ سے کی تھیں بلکہ آج تو ان کے پاس الٹرا ساؤنڈ رپورٹ بھی تھی جو ڈاکٹر کی معائنہ رپورٹ کی تصدیق کر رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحبہ! کیا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ یہ کیس' نارمل کیس ہو جائے؟'' خرم نے جھجکتے جھجکتے ان سے پوچھا۔

''یہ زبردستی کا معاملہ نہیں ہوتا مسٹر...... جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔'' خرم کی رنگت ایک دم فق ہو گئی۔

''نن..... نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے خدانخواستہ......'' خرم نے بوکھلا کر کہا تو ڈاکٹر نے ان کی بات کاٹ کر تحمل سے کہا۔

''اگر زیادہ تاخیر سے کام لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ بچہ بلکہ ماں کی جان بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ آپ تو ایک تعلیم یافتہ شخص ہیں اپنی وائف کو بھی سمجھا سکتے ہیں...... دراصل ابھی تک یہ آپریشن یہاں زیادہ عام

نہیں ہیں اس لیے پبلک خوفزدہ ہو جاتی ہے ورنہ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی۔'' اس کے بعد ان دونوں کے درمیان بہت ضروری قسم کی گفتگو شروع ہوئی۔ ڈاکٹر کی رہنمائی پر خرم نے اسی وقت ریشم کا نام رجسٹرڈ کرایا۔ فیس وغیرہ اور ضروری کارروائی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ کاؤنٹر پر اپنی تسلی کرتے رہے۔ طے یہ پایا کہ آج سے چوتھے روز ریشم کو اسپتال میں ایڈمٹ کر دیا جائے گا پھر اسی دن شام کو آپریشن تھا۔

تمام کارروائی سے نمٹ کر یہ دونوں گھر کے لیے نکلے تو خرم خود کو کافی ہلکا پھلکا اور پرسکون پا رہا تھا۔ ڈاکٹر شاکرہ سے روبرو بات کر کے اس کا ذہنی خلفشار بڑی حد تک کم ہو گیا تھا اور اب تو اپنی باتوں اور رویے سے ریشم کے اندر کا خوف زائل کرنے کی بھرپور کوششوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

☆☆☆

والدہ کو وظیفہ پڑھتے دیکھ کر بابر پلنگ کی پٹی پر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

چہرہ ملول...... انداز بجھے بجھے سے۔ بیٹے کا حد درجہ سنجیدہ رویہ نائمہ بیگم کے لیے شدید الجھن کا باعث بن گیا۔ انہوں نے مزید جلدی، جلدی وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کا ماتھا بری طرح ٹھنکا تھا۔ جانماز تہ کرتے ہوئے وہ ان کے سلام کا جواب دینا بھی بھول گئیں۔

''خیریت تو ہے ناں بیٹے! کیا کہنا چاہتے ہو؟'' تجسس کے عالم میں دھیرے سے پوچھا۔

''اماں جان......!'' بابر نے کچھ کہنا چاہا مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ لاچاری کے ساتھ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

''کہتے کہتے...... رک کیوں گئے؟ کیا بات ہے؟'' نائمہ بیگم نے پریشانی کے لہجے میں دریافت کیا۔

بابر کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ کچھ کہنا چاہ تو رہے تھے مگر کہہ نہیں پا رہے تھے۔ وہ حقیقت میں بہت پریشان اور دلگیر نظر آ رہے تھے کچھ، کچھ بدحواس کچھ، کچھ بکھرے ہوئے سے۔ نائمہ بیگم چلتی ہوئی ان کے قریب آ گئیں اور دوبارہ پوچھا۔

''بتاتے کیوں نہیں؟ آخر بات کیا ہے؟'' بابر نے بولنے کے لیے منہ کھولا مگر شاید حوصلہ نہ ہوا۔

باہر سے چڑیوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ تاہم سونے والے اب تک گہری نیند سو رہے تھے۔ نائمہ بیگم کے لیے بابر کی خاموشی سوہانِ روح بنی جا رہی تھی۔ ان کا عجیب وغریب رویہ ایک نہ سلجھنے والی گتھی بنتا جا رہا تھا۔ جب بات برداشت سے باہر ہو گئی تو انہوں نے آگے بڑھ کر بابر کے دونوں شانے جھنجوڑ ڈالے اور قدرے سختی سے پوچھا۔

''صاف بتاتے کیوں نہیں؟ کیا ہوا کہ جان سے مارو گے؟'' بابر نے آہستگی سے خود کو ان کی گرفت سے آزاد کیا، اپنی ساری ہمتوں کو یکجا کیا اور ان کے مقابل کھڑے ہو کر متانت سے گویا ہوئے۔

''آپ...... ایسی باتیں مت کیجیے...... میں خود بھی کم پریشان نہیں ہوں...... سمجھ میں نہیں آ رہا ہے...... میں خود کیا سمجھوں اور آپ کو کیا بتاؤں...... میری زبان نہیں اٹھ رہی ہے کہ آپ کو حالات سے آگاہ کروں۔''

نائمہ بیگم نے حد درجہ حیران ہو کر بیٹے کی صورت دیکھی اور پریشان ہو کر دوبارہ دریافت کیا۔

''آخر کس کے بارے میں بتانا چاہتے ہو؟ بات کس کی ہے؟ اتنی سویرے، سویرے تمہیں کس نے کیا کہہ دیا ہے؟ اب کھل کر بتا ڈالو...... ورنہ ہم جاتے ہیں باہر......'' آخر میں انہوں نے دھمکی دے ڈالی۔ بالآخر بابر نے زبان کھولی بھی تو کیسے......

''معلوم بھی ہے رات آپ کی بہو صاحبہ نے میرا کیا حشر کیا؟''

''ہماری بہو...... یعنی روبی......؟''

''جی ہاں...... '' بابر نے سنجیدگی سے بتایا۔ ''اس قدر بدتمیزی اور زبان درازی کی تو میں کسی غیر سے بھی توقع نہیں کر سکتا تھا...... اور وہ بھی......'' کہتے، کہتے وہ یکلخت تھم گئے اور بے دردی سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگے۔

نائمہ بیگم چکرا کر رہ گئیں۔ غش کھاتے، کھاتے بچیں۔

چند لمحے ان کے حواس گم رہے، دریائے حیرت میں غوطہ زن گم صم کھڑی رہیں جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔

''گگ..... کون؟ رو..... روبینہ.....؟''

صورتِ حال کا اندازہ ہوا تو ہکلا کر پوچھا۔

''جی ہاں..... روبینہ صاحبہ.....'' بابر نے بے حد تپے ہوئے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ اب وہ روانی سے بول رہے تھے۔

''مجھے ..... میری گستاخی پر معاف کر دیجیے گا اماں جان..... دراصل اس وقت میرا دماغ صحیح طور پر کام نہیں کر رہا..... میں آپ سے کیا عرض کروں کہ وہ..... کس قدر بد مزاج اور بد دماغ ہیں، یوں لگتا ہے، یوں کہنا چاہیے..... جیسے نکاح کے دو بول ہوتے ہی وہ خدانخواستہ عقل سے پیدل ہو گئی ہوں۔ کم از کم میں تو ان کو اس قدر بد دماغ اور نازک مزاج ہرگز نہیں سمجھتا تھا۔ آپ کو اگر معلوم ہو تو کہہ نہیں سکتا۔ مجھے تو آپ سب نے بالکل ہی اندھیرے میں رکھا..... یا پھر ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو گیا ہو۔ مگر مجھے یقین ہے ان کی بدمزاجیوں سے کم از کم آپ ضرور واقف تھیں۔'' نائمہ بیگم حیرت سے منہ پھاڑے اپنے سنجیدہ مزاج، کم گو اور بردبار بیٹے کو دیکھے جا رہی تھیں، جن کا چہرہ ہر آن غم و غصے کی زیادتی سے سرخ پڑتا جا رہا تھا۔

''کچھ تو بتاؤ..... آخر جھگڑا ہوا کیوں؟'' تھوڑی دیر کے گہرے سکوت کے بعد نائمہ بیگم نے جیسے خواب کی سی کیفیت میں پوچھا۔

''سب سے پہلے تو انہوں نے آپ کے دیے ہوئے کنگنوں پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ...'' بابر نے گہری نظر سے ماں کو دیکھا پھر ٹہلتے ہوئے بولے۔ ''یہ تھوس، بدزیب اور پتھر کے زمانے سے چلے آنے والے کنگن کیا میرے لیے ہی سنبھال کر رکھے گئے تھے؟'' پھر تو ان پر جنون سا طاری ہونے لگا۔ آپ کے چڑھائے ہوئے سارے زیورات جو پہن رکھے تھے اتار، اتار کر پھینکنا شروع کر دیے..... وہ پھینکتی گئیں..... اور پھینکتی گئیں.....''

"اتار، اتار کر پھینکنے لگی......" نائمہ بیگم کی زبان سے بے ساختہ کلمۂ حیرت نکلا۔ پہلی نظر میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ غش کھا کر گر پڑیں گی۔

"جی ہاں اماں جان......! اسی پر موقوف نہیں کیا بلکہ یہ تک کہا کہ......" ممانی جان نے میرے شوق اور ارمانوں پر پانی پھیر ڈالا اور جان بوجھ کر مجھے دقیانوسی اور بے ڈھب چڑھاوا چڑھایا، میں ایسی گئی گزری نہیں ہوں کہ اچھے برے کی شناخت نہ کر سکوں۔ کل رخصتی کے وقت میری ساری سہیلیاں چہ مگوئیاں کر رہی تھیں اور بری کے سامان اور لوازمات کو تضحیک کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ کہتی تھیں کہ ہر چیز پرانے زمانے کی اور آؤٹ آف فیشن ہے۔ بھاری، بھاری ڈریسز...... اللہ کسی کو ایسی تنگ نظر ممانی جان نہ دے جو ہر معاملے میں اپنی پسند اور اپنے ہی نظریے کو فوقیت دیں۔ کسی کو خاطر میں نہ لائیں...... میرے ساتھ تو معلوم نہیں انہوں نے کس جنم کی دشمنی نکالی ہے......"

"ہائے میرے مالک...... یہ روبینہ کو کیا ہو گیا ہے...... ایک دن کی بیاہی دلہنیں بھی بھلا ایسی باتیں کرتی ہیں؟ اور وہ بھی اپنی ممانی کے خلاف...... مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔" نائمہ بیگم گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہیں پلنگ پر بیٹھ گئیں اور گھٹی، گھٹی آواز میں بے یقینی سے بولیں۔

"اُدھر...... اعتراضات کر، کر کے میرا بھیجا خالی کر ڈالا ہے محترمہ نے اور ادھر آپ کو یقین نہیں آ رہا۔ یہ سمجھ لیجیے وہ مجھے نہیں بلکہ آپ کو بھی برا بھلا کہہ رہی ہیں...... یقین نہیں ہے تو سن لیجیے جا کر اپنے کانوں سے۔" بابر چڑ گئے، بھنا کر بولے۔

"ہائے میرے بچے......" وہ بلبلا کر بولیں۔ پل بھر میں ان کا سارا طنطنہ اور جاہ و جلال دم سادھ گیا تھا۔ انہوں نے فریادی نظر بیٹے پر ڈالی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"بیٹا، تم خود ہی انصاف کرو، میں نے اس کے حق میں کہاں کانٹے بوئے؟ سارے کپڑے لتے، زیورات اور دیگر تیاریاں تم بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے ہو، آخر کس چیز میں کمی بیشی پائی اس نے؟ میں نے تو دن رات ایک کر کے بری تیاری کی تھی، ضرور اسے کسی نے ورغلایا ہے، میرے لعل...... تم اس کی باتوں اور اعتراضات پر مت جانا...... دیکھو میری طرف سے اپنا دل اور خیالات نہ برے کرنے بیٹھ جانا۔ بھلا میں کوئی تمہاری دشمن تھی کہ چڑھاوے میں بے انصافی کرتی؟" بابر نے اسی طرح بے چینی اور اضطراب کے عالم میں ٹہلتے، ٹہلتے ان کی تمام باتیں سنیں پھر بہت ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں...... یا وہ...... میں یہ نہیں کہتا...... بہرحال! یہ تو طے ہے کہ درونِ خانہ کچھ نہ کچھ بھید ہے ضرور...... اور جو کچھ بھی ہے، مستقبل کے لیے بہتر نہیں ہے۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

نائمہ بیگم سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئیں۔

☆☆☆

خرم کے گھر سے جانے کے بعد ریشم یوں بھی روزانہ اکیلی رہ جایا کرتی تھی مگر آج جیسے ہی وہ اگلے دو دن نہ آنے کا کہہ کر روانہ ہوئے گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ کئی کام جو اس کے نہیں کرنے کے تھے وہ بھی کر ڈالے لیکن وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ اس کی جان کو دو تین طرح کی فکریں لگی ہوئی تھیں مگر وہ ہر طرف سے دھیان ہٹا کر اپنی توجہ ایک ہی نکتے پر مرکوز کر لینا چاہ رہی تھی۔ یعنی اس کا آنے والا بچہ لیکن خیال بار، بار بٹ جاتا اور خود بخود خرم کے متعلق سوچنے لگتی۔ وہ بے دلی سے اندر جا کر لیٹی، طبیعت پر سستی سی چھائی جا رہی تھی حتیٰ کہ اسے نیند آنے لگی۔ تبھی کھٹ پٹ کرتی اسے آوازیں دیتی بسنتی آ گئی۔

"یہ سونے کا کون سا وقت ہے؟" اس نے آتے ہی اعتراض کیا۔

"تو...... سو کون رہا ہے؟" ریشم نے جمائی لے کر جواب دیا۔

"جنگل بابو گئے؟"

"ہاں گئے...... دو دن کے بعد آئیں گے۔"

"آہا...... مزہ آ گیا۔ خوب کھیلیں گے، کودیں گے، ناچیں گے، گائیں گے، جی بھر کے مزے کریں گے۔" بسنتی نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔

"وہ کون سا تجھے یہ سب کرنے سے منع کرتے ہیں، بدتمیز کہیں کی۔ یہاں دل کو سمجھانا مشکل ہو رہا ہے اور تمہیں دل لگی سوجھی ہے۔" ریشم نے اسے ملامت کی نظر سے دیکھا۔

"چل...... بے وقوف نہ ہو تو......" بسنتی نے اسے پیار سے ایک چپت رسید کردی۔ پھر اٹھ کر گھر کی جھاڑو لگانے لگی۔ صفائی ستھرائی سے فرصت پا کر اس کے پاس آئی اور ہاتھ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"لا دوپہر کے لیے روٹی نکر پکا دوں تیرا۔"

"چھوڑ بھوک ووک تو لگتی نہیں ہے مجھے۔" اس نے کسلمندی سے جواب دیا۔

"اچھا چل شین دیدی کے گھر چلتے ہیں، تیرا دل بھی بہل جائے گا۔" بسنتی اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ کچھ سوچ کر ریشم فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں کمرا بند کر کے شرمین کی طرف چلی آئیں۔

دادی اماں برآمدے میں بیٹھی تلاوتِ کلامِ پاک کر رہی تھیں اور پیاری بوا باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ دونوں بچے اور شرمین اسکول گئے ہوئے تھے۔ پورے گھر پر ایک پُرسکون خاموشی کا تسلط تھا۔

یہ دونوں ایک چارپائی پر بیٹھ کر اپنی باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ تلاوت سے فارغ ہو کر دادی اماں نے اشارے سے ریشم کو اپنے قریب بلا کر سر سے پاؤں تک اس پر پھونک ماری پھر محبت سے دریافت کیا۔

"طبیعت کیسی ہے بیٹی؟"

"اچھی ہوں دادی اماں......" اداسی سے جواب دے کر وہ وہیں ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"اور سب خیریت ہے ناں......؟" انہوں نے اسے بغور دیکھا۔

"بڑی ماں جنگل بابو اسے دو دن کے لیے آپ کے حوالے کر گئے ہیں۔" بسنتی نے دور سے چہک کر انہیں اطلاع دی۔

"ارے...... یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہے۔" انہوں نے اسے لپٹا کر دلار سے کہا۔

"اوہو...... بڑے راز و نیاز اور لاڈ و پیار ہو رہے ہیں۔" ذکیہ خالہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"آؤ، آؤ ذکیہ......" دادی اماں نے خوش ہو کر انہیں پاس بٹھالیا۔

وہ سبزی کی ٹوکری میں بہت سی میتھی لیے ہوئے تھیں۔ دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ میتھی کے پتے توڑ توڑ کر ٹوکری میں رکھنے لگیں۔ دادی اماں اور ریشم بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ گھر میں خوب چہل پہل ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں بسنتی کی ماتا جی بھی ان لوگوں میں آ کر شامل ہو گئیں۔ جب سے ریشم کے آپریشن کی بات ان گھروں میں گھوم گئی تھی، وہ بیچاری بہت متفکر ہو گئی تھیں۔

"ہماری طرف تو یہ کرتے ہیں کہ جب زچگی کے دن بہت قریب آ جاتے ہیں تو گرم دودھ میں اچھا گھی ڈال کر پلاتے ہیں۔" وہ دیر سے کچھ کہنے کو بے چین تھیں۔ بالآخر آہستہ سے بولیں۔

"ایسا تو ہم بھی کرتے ہیں۔ بھلا اچھا گھی کون سا ہوتا ہے؟" ذکیہ خالہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"دیسی گھی کو کہہ رہی ہوں گی۔ کیونکہ آج کل وہ موا بناسپتی بھی تو بہت کھایا جاتا ہے۔" دادی اماں نے کہا۔

"ہاں، یہی میں کہہ رہی تھی۔" ماتا جی نے سادگی سے کہا۔

"آپ لوگ بھی ایسا ہی کریں۔ اب کا ہے کا انتظار ہے، دن تو قریب آ گئے ہیں، آج ہی سے اسے روزانہ رات کو گرم، گرم دودھ کے پیالے میں گھی ڈال کر پلانا شروع کردیں۔" ذکیہ خالہ کی آنکھیں خوشی سے دمکنے لگیں۔ انہوں نے میتھی توڑنا موقوف کردی اور بڑے جوش و خروش سے بولیں۔

"ارے ہاں، یہ ترکیب ٹھیک رہے گی، میں آج

ہی کرتی ہوں کچھ۔"

"اچھا گھی میرے پاس رکھا ہے، مجھ سے لے لینا۔" ماتا جی نے فوراً پیشکش کر دی۔ ذکیہ خالہ نے آپ ہی آپ مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

"بس ٹھیک ہے، اللہ کرے اسی طرح مشکل آسان ہو جائے اور مولا کرے نوبت بڑے آپریشن کی نہ آئے۔" پھر ذکیہ خالہ نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں، مجھے یاد آرہا ہے، پہلے قدرتی طریقے سے ماں بننے کے لیے ایسے ہی جتن کیے جاتے تھے، آخری مہینے میں لڑکیوں سے بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ ہاتھ اونچے کر کر کے دیواریں جھاڑو، جالے اتارو، یہ بھی ایک طرح کی ورزش ہوتی ہے اور خوب چہل قدمی بھی کروائی جاتی تھی۔ اور زچگی میں آسانی ہو جاتی ہے اور پھر.... ادھر درد لگے اور دودھ میں گرم، گرم کسٹر آئل ڈال کر پلایا جاتا......"

"اللہ میری توبہ......" ریشم نے زور سے ابکائی لے کر کہا۔ "خالہ...... کیسی...... گندی سندی باتیں کر رہی ہیں۔" خالہ اور ماتا جی ہنسنے لگیں۔

"تم لوگوں نے تو سب کچھ طے کر لیا مگر میرا خیال اس کے برعکس ہے۔" دادی اماں جو بہت دیر سے خاموش تھیں، سوچ میں ڈوبے، ڈوبے بولیں۔ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ فکر مند لہجے میں کہنے لگیں۔ "میرے خیال میں تو...... گھی، دودھ پلانے کا خیال ترک کر دیں۔"

"کیوں......؟" ذکیہ خالہ اور ماتا جی نے بیک وقت حیرانی سے پوچھا۔

"وہ یوں......" دادی اماں نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "کہ ڈاکٹر نے اس کیس کو آپریشن کیس بتایا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ آپریشن ہی ہوگا۔ جب ایک فیصلہ اور رائے ہو چکی ہے تو اس میں دخل دینا عقلمندی نہیں ہے۔"

"دخل کون دے رہا ہے؟" ذکیہ خالہ نے اعتراض کیا۔

"ہم تو تجربے کار لوگوں کی ایک کوشش کرنا چاہ رہے ہیں، ہو سکتا ہے یونہی آسانی ہو جائے اور لڑکی آپریشن کے عذاب سے بچ جائے۔" ماتا جی نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اے بی بیوں بس رہنے دو۔" اس مرتبہ دادی اماں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ختم کرو اس بیکار کی بحث کو۔ گھریلو ٹونے ٹوٹکوں سے یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے۔ جب ڈاکٹر نے اپنی رائے دے دی ہے تو پھر بلا سوچے سمجھے تھوڑی دی ہوگی؟ وہ پڑھی لکھی ہیں، سمجھدار ہیں، آلے لگا، لگا کر جانچ کی ہے انہوں نے...... اور پھر ان کے میاں سے بھی پوری بات ہو چکی ہے، اب تو بہتری اور جان سلامتی کی دعا کرنی چاہیے ہے تمہارے الٹے سیدھے ٹوٹکوں سے اگر خدانخواستہ کوئی نقصان ہو گیا تو......؟"

سب چپ کے چپ رہ گئے۔

"بیٹا! آج بیسنی روٹی پکائی ہے تم بھی یہیں کھانا شرمین بھی آتی ہوگی۔" اتنے میں پیاری بوا نے آکر ریشم کو مخاطب کیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" دادی اماں نے خوش دلی سے کہا۔

"بنتی......!" ماتا جی نے اپنی بیٹی کو پکارا۔ مگر وہ عورتوں کی خاص باتیں چھڑتے ہی رفو چکر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

بابر کے کمرے سے چلے جانے کے بعد نائمہ بیگم کی تمام ہمتیں جیسے مصلوب ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا کہ دلہن کے کمرے میں جا کر حقیقتِ حال معلوم کریں۔

زندگی میں پہلی بار اصل معنوں میں بدحواس ہوئی تھیں۔ ہاتھ پیر پھول کر رہ گئے تھے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ ان کے دل میں بھتیجی کی بے انتہا محبت تھی، اس کی طرف سے کبھی دل میں معمولی ترین بھی بال نہیں آیا تھا۔ بسا اوقات وہ اسے اپنی بیٹی معصومہ پر فوقیت دیتی نظر آتی تھیں۔ بلکہ ابھی پرسوں تک تو خود روبینہ، ممانی پر جان چھڑکتی تھی۔

مگر یہ کیا ہو گیا تھا؟ کیا نکاح کے دو بول ہوتے ہی رشتے تبدیل ہو گئے تھے۔ احساسات اور جذبات سب کے سب تبدیل ہو چکے تھے؟ سوچ، سوچ کر نائمہ بیگم کے دماغ کی چولیں ہلنے لگیں مگر نتیجہ کچھ سمجھ نہیں آسکا۔ خبر نہیں کیوں وہ خود بخود شرمسار ہونے لگیں۔ پچھتاوا گھر گھر کر آنے لگا۔

''کاش! میں زیورات کی گھڑائی اور بری کی خریداری میں روبی کی پسند ناپسند معلوم کر لیتی۔'' مگر انہیں کیا خبر تھی کہ آج کل لڑکیاں کس راہ پر چلی جا رہی ہیں؟ انہوں نے اپنی مطلق العنان فطرت کے اثر کو.. نظر رکھا تھا۔

اب دن خاصا چڑھ چکا تھا۔ باہر چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ آئے ہوئے مہمان جن میں ہر عمر کے مرد و زن، لڑکیاں، بالیاں، بچے کچے شامل تھے، بیدار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی گھبراہٹ میں اضافہ ہونے لگا۔ چونکہ آج ہی ولیمے کی تقریب بھی تھی اس لیے بے شمار کام اور انتظامات تھے جو کرنے کو باقی تھے۔

وہ اسی انداز میں سوچوں اور تفکرات میں مستغرق بہت حیران و پریشان بیٹھی تھیں کہ معصومہ تیز، تیز قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، منہ سے آواز نہ نکلتی تھی، کسی نامعلوم وحشت سے ہونٹ سوکھے جا رہے تھے، وہ چاروں طرف دیکھتی بھالتی ماں کے قریب آئی اور سرگوشی میں گویا ہوئی۔

''اماں جان! آپ تو سویرے سے یہاں بیٹھی ہیں، ذرا بھائی جان کے کمرے میں چلیں...... روبی بھابی نے عجیب و غریب حرکتیں کی ہیں، بابر بھائی جان انہیں منہ اندھیرے سے سمجھا، سمجھا کر عاجز آ چکے ہیں، ابھی مجھے بلوا کر کہا ہے کہ اماں جان کو بلا لاؤ۔'' نائمہ بیگم کے ہاتھوں کے رہے سہے توتے اڑ گئے۔

''اے اب کیا ہو گیا نگوڑی کو۔ رخصت ہوتے ہی...... پر پرزے نکال لیے؟ تم تو وہیں تھیں، آخر کر کیا رہی ہے؟'' پیر میں چپل پہنتے ہوئے پریشانی کے لہجے میں بولیں۔

''مجھے نہیں معلوم......'' معصومہ نے روہانسی ہو کر جواب دیا۔ ''میں تو روشن آپا کے بچوں میں لگی ہوئی تھی کہ بوا نے آ کر کہا بھائی جان نے آپ کو کمرے میں بلوایا ہے۔''

''تم اندر گئی تھیں؟''

''جی ہاں......''

''تم نے وہاں کیا دیکھا؟''

''مجھے نہیں معلوم......'' معصومہ نگاہیں چرا کر بولی۔ ''آپ خود ہی جا کر دیکھ لیجیے......'' معصومہ عجلت میں کمرے سے نکلتے ہوئے کہہ گئی۔

ناچار نائمہ بیگم بھی اٹھیں۔ صحیح معنوں میں ان کا دل زور، زور سے دھڑک رہا تھا۔ پاؤں من، من بھر کے ہو رہے تھے۔

خیر...... کسی نہ کسی صورت اوپر کا زینہ چڑھ کر بابر کے کمرے میں آئیں۔ یہاں کا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ بری کا ایک بھاری بھرکم جوڑا تو انتہائی کسمپرسی کے عالم میں انہیں دہلیز پر ہی پڑا مل گیا۔ اب جو نظریں گھما کر دیکھا تو کمرا کیا تھا، جیولری اور شاندار ملبوسات کا شاپنگ سینٹر دکھائی دیا۔ بری کے تمام جوڑے کوئی اِدھر، کوئی اُدھر، کوئی صوفے پر کوئی بیڈ پر...... کوئی فرش پر اور کوئی کرسی پر پڑا جگمگا رہا تھا۔ زیورات کے سیٹ بیڈ کے بیچوں بیچ پڑے دمک رہے تھے۔ بیوٹی بکس کا ساز و سامان ڈریسنگ ٹیبل پر اوندھا پڑا تھا۔ دودھیا روشنیوں میں کمرا جگمگ، جگمگ کر رہا تھا۔

بابر تپائی پر ایک پاؤں رکھے کھڑے بے دردی سے ہونٹ چبا رہے تھے۔ نائمہ بیگم کی حیرت کی شدت سے پھیلی، پھیلی نگاہیں اڑتی، اڑتی نئی نویلی دلہن...... روبی پر جا ٹکیں۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی تھی۔ نائمہ بیگم کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ادب سے سر جھکا کر آداب کیا۔ انہوں نے نظر بھر کر بہو کو دیکھا۔ قاعدے سے آنچل برابر کیے وہ اتنے شائستہ انداز میں لجائی لجائی کھڑی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا

بھر کا حسن، روپ اور نکھار اسی پر اتر آیا تھا۔
صبح سے جو اطلاعات مسلسل مل رہی تھیں۔ نائمہ بیگم کو سراسر جھوٹ کا پلندا معلوم ہوئیں۔ اور یہ جو پورا کمرا منتشر حالت میں پڑا جگمگا رہا تھا یہ عجب ہی کہانی سنا رہا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے کس طرح نہ یقین کرتیں؟ لیکن انہیں یقین کرنا دشوار لگ رہا تھا کہ یہ سب بکھراؤ اس نئی نویلی دلہن کے حنائی ہاتھوں کا کارنامہ ہے؟ وہ جن آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں، وہ انہیں اتنی ہی معصوم، حیرت زدہ، بے ضرر اور بے خبر دکھائی دے رہی تھی۔
نائمہ بیگم تمام رنجش بھول کر آگے بڑھیں اور محبت سے اس کی بلائیں لیں۔ بابر نے کھنکھار کر صورتِ حال کا احساس دلایا۔ انہوں نے چونک کر انہیں دیکھا پھر محبت بھرے نرم لہجے میں پوچھا۔
''یہ تم لوگوں نے کیا قیامت بپا کر رکھی ہے؟'' لحہ بھر تھم کر اضافہ کیا۔ ''پورا کمرا کباڑ خانہ بنا ڈالا۔'' روبی تو خاموش رہی، بابر نے اس پر ایک چبھتی سی نگاہ ڈال کر کہا۔
''آپ کی بہو بیگم کو بری کی کوئی چیز بھی پسند نہیں آرہی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ تمام جوڑے اور زیور غریب غربا میں تقسیم کر دیے جائیں۔'' نائمہ بیگم ایک دم سے سینے پر ہاتھ رکھ کر منہ کھولے رہ گئیں۔ بات آمنے سامنے ہو چکی تھی...... مگر بہو خاموش تھی۔ گویا بابر نے جو کہا تھا، اس کی تصدیق کر رہی تھی۔
نائمہ بیگم شدید قسم کی کشمکش میں مبتلا ہو کر رہ گئیں۔ اب مزید سوچ بچار کا وقت بھی کہاں رہ گیا تھا۔ ذرا دیر کے بعد بابر کے مہمان آنا شروع ہو جاتے، سب سے بڑھ کر شمسہ بیگم اور متین احمد اپنے کنبے کے ساتھ پہنچنے کو تھے۔ اگر خدانخواستہ ان کو یہاں کے عجیب و غریب اور نئے حالات کا علم ہو جاتا تو نائمہ بیگم کی کس قدر سبکی ہوتی۔
یہ سب خیالات پل کی پل ان کے دماغ کی اسکرین پر چل گئے، اس وقت غیر معمولی صبر و تحمل، دانشمندی اور سوجھ بوجھ کی ضرورت تھی پھر انہوں نے ایسا ہی کیا۔
''کیا بات ہے بیٹی......! ہم سے خفا ہو؟'' روبی کا شانہ تھپتھپا کر شیریں لہجے میں دریافت کیا۔ مگر وہ خاموش رہی۔ انہوں نے برا مانے بغیر دوبارہ ملائمت سے پوچھا۔
''تمہیں کون سی چیز پسند نہیں آئی؟ کم از کم اپنی زبان سے بتاؤ تو سہی؟'' لیکن پیہم اصرار کے باوجود وہ چپ تھی۔ شاید خود بولنا نہیں چاہ رہی تھی۔ بالآخر اس کی مشکل بابر نے حل کر دی۔
''اماں جان! بہتر تو یہی ہے کہ یہ تفصیل آپ مجھ سے سنیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جتنے طلائی سیٹ آپ نے چڑھائے ہیں، سب کے سب بدوضع، ٹھوس اور پرانے ٹائپ کے ہیں، ان میں کوئی نزاکت، خوشنمائی اور ڈیزائننگ نہیں ہے، ان کو پہنے، پہنے ان کے کان ہاتھ، پاؤں سب جھول جائیں گے۔ بقول خود ان کے کہ...... ''میں جانور نہیں ہوں۔'' مزید ان کا فرمان ہے کہ جوڑے بھی تمام کے تمام بہت بھاری اور غیر معقول ہیں، میرے پہنے جانے لائق ہرگز بھی نہیں ہیں......'' نائمہ بیگم کے دل پر تیر پہ تیر لگ رہے تھے، ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ بری حالت تھی۔
جتنے خطیر اخراجات انہوں نے بری، بارات پر کیے تھے اگر جو اُن کی دلاری، روبی کا معاملہ نہیں ہوتا تو وہ کھڑے، کھڑے شاید توپ پر رکھ کر اڑا ڈالتیں اور ایسی بے نقط سناتیں کہ سننے والوں کو نانی یاد آجاتی اور ان کے چودہ طبق روشن ہو، ہو جاتے۔ مگر اس وقت وہ سخت گوگوں کے عالم میں تمام تفصیلات سن رہی تھیں بلکہ سننے پر مجبور تھیں۔
بابر کے ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ اماں کو اپنی ایک رات کی بیاہی دلہن کے ارشادات گوش گزار کر رہے تھے مگر اب نائمہ بیگم اپنی سارے محسوسات بروئے کار لاکر نیچے ہر آن بڑھنے والی چہل پہل اور رونقیں ملاحظہ کر رہی تھیں۔ سمجھ چکی تھیں کہ نیچے مہمانوں کی آمد کا آغاز ہو چکا ہے۔ بیچ کے بیچ انہوں نے بابر کو

ٹوک دیا اور سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہ تمام باتیں تو بعد میں دیکھی جائیں گی۔ مگر اب کیا، کیا جائے؟" اپنی اب تک کی عمر میں بابر نے والدہ کو کبھی ایسا نرم مزاج نہ پایا تھا۔ اس وقت تو ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے، وہ ناقابلِ یقین حد تک میٹھی اور ملائم ہو رہی تھیں۔ انہوں نے لاچاری اور بے بسی سے جواب دیا۔

"اس وقت تو یہ مسئلہ زیر بحث ہے اماں جان کہ دعوتِ ولیمہ کی آج کی تقریب میں کون سا جوڑا زیب تن کیا جائے۔ کیونکہ یہ جو آپ نے بہترین، اعلیٰ ترین کامدار غرارہ سوٹ تیار کروایا ہے......"

"کیا یہ بھی دلہن کو پسند نہیں آیا؟ الٰہی ہم کیا کریں؟" انہوں نے سر تھام لیا۔

"جی ہاں...... اول تو رنگ ناپسندیدہ ہے بلکہ یہ ان فرشی قسم کے غراروں سے سخت الرجک ہیں۔ بقول ان کے......" میں مغلیہ دور کی مغلیہ شہزادی نہیں ہوں۔" بابر نے وضاحت کی۔ انہیں کچھ نہ سوجھا تو بے اختیار آگے بڑھ کر روبی کے دونوں حنا آلود ہاتھ تھام لیے اور التجا کی۔

"بیٹی...... آج تو تمہیں اسی غرارہ سوٹ کو پہن کر ہماری عزت کی لاج رکھنی پڑے گی۔ ورنہ اگر تم نے آج اپنے میکے کا کوئی سوٹ یا ساڑی وغیرہ پہنی تو تمہاری اماں کیا سوچیں گی؟" وہ ابھی تک نگاہ جھکائے کھڑی تھی۔

"اماں جان بالکل درست فرما رہی ہیں۔ جہیز کے سوٹوں میں سے پہنو گی تو جگ ہنسائی ہوگی۔" بابر نے بڑھ کر والدہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

چنانچہ روبی نے سسرال کا غرارہ سوٹ تو پہن لیا تھا مگر زیور کے نام پر ادھر کا ایک چھلا تک نہیں پہنا۔

تب نائمہ بیگم کو ایک بار پھر مداخلت کرنی پڑی۔ اس طرح قسمیں دے، دے کر اسے آدھا زیور سسرال کا پہنوایا اور وعدہ کیا کہ ولیمے سے فارغ ہو کر فوراً سے پیشتر اس کی پسند کے مطابق زیورات اور ملبوسات

بنوادیں گی۔

تب کہیں جا کر روبی نے اپنی ضد توڑی۔

☆☆☆

شدید سردی نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اوپر سے آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا۔ ٹھنڈی ہوائیں کلیجے کے آر پار ہوئی جا رہی تھیں، دھوپ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

آج چھٹی ختم ہو چکی تھی اور ڈیوٹی شروع...... نہ چاہتے ہوئے بھی ڈاکٹر خاور کو اسپتال کا رخ کرنا پڑا۔ آج ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ شدید زکام اور جسم میں حرارت لگ رہی تھی۔ تاہم شکر کا مقام تھا کہ بابر کی شادی کا ہنگامہ بخیر و خوبی نمٹ چکا تھا اور دلہن رخصت ہو کر گھر آنگن میں اتر چکی تھی۔

ڈاکٹر خاور کوٹھی کے پورچ میں آئے، گاڑی نکالی اور تیزی سے اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے، اس وقت بلو جینز اور سیاہ ہائی نیک میں اوپر خوب صورت سی جیکٹ پہنے بڑے وجیہہ لگ رہے تھے۔ سردی اور نزلے سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

ایک موڑ مڑتے ہی جونہی وہ سیدھی سڑک پر پہنچے، ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ پلکیں جھپکانا بھول گئے۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وفعتاً پورے چاند کی چاندنی میں نہا گئے ہوں۔

واقعہ یہ تھا کہ ان کی گاڑی سے آگے ذرا سائڈ میں ایک خالی تانگا جا رہا تھا۔ اس سے اگلے تانگے میں شرمین ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ سیاہ شال کے ہالے میں اس کی صورت دمک رہی تھی۔ خاور نے آج اسے بڑی مدت کے بعد دیکھا تھا اور دیکھتے ہی پہچان گئے تھے۔ دل میں خوشگوار سی دھڑکنیں بیدار ہونے لگیں۔ وہ اپنی طبیعت کو فراموش کر کے اسے دیکھنے میں محو ہو گئے۔ تانگا معمولی رفتار سے چلے جا رہا تھا۔ انہوں نے بھی اسپیڈ ہلکی ترین کر لی۔ خاور پر خود فراموشی کا ایسا حملہ ہوا تھا کہ تانگے کے پیچھے فاصلہ دے کر چلتے، چلتے وہ اپنے اسپتال ایریا تک پہنچ گئے۔

جب تانگا بڑے گیٹ کے اندر پہنچ گیا تب انہیں احساس ہوا کہ وہ ٹھیک اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ چکے ہیں گویا تانگے کی سواریوں کو بھی یہیں آنا تھا۔ خاور کو بے حد حیرت ہوئی یہ جان کر کہ شرمین اسپتال میں آئی ہے۔

شرمین اور وہ لڑکی تانگے سے اتریں، آگے کی سیٹ پر کچھ سامان سنبھالے پیاری بوا بیٹھی تھیں، وہ بھی اتریں۔ خاور نے دور سے انہیں بھی پہچان لیا۔ تینوں اسپتال کی عمارت میں داخل ہو گئیں۔ حیرت زدہ خاور ان کے تعاقب میں تھے، جب وہ لوگ ایک پرائیویٹ روم میں چلی گئیں تو روم نمبر دیکھ کر خاور ڈیوٹی روم چلے گئے۔ وہ جتنا سوچ رہے تھے اتنی ان کی حیرت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ فی الحال انہیں شرمین کے سوا کوئی دوسرا یاد نہیں تھا۔

''کہیں...... دادی اماں کو تو کچھ نہیں ہو گیا؟''

اچانک ان کے ذہن میں خطرے کا الارم بجا۔ انہوں نے جلدی سے اپنی اٹینڈنس لگائی اور میز سے چابی اٹھا کر عجلت میں اسی مطلوبہ روم کی طرف چل دیے۔

اندر داخل ہو کر وہ گویا پتھر کے بن گئے۔ خرم نرم گرم کمبل میں لپٹے ایک نوزائدہ بچے کو لیے کھڑے تھے۔ بیڈ پر ریشم لیٹی تھی، جس کے ڈرپ لگی ہوئی تھی اور باہر سے آنے والی تینوں خواتین اس کے گرد کھڑی تھیں۔ سچویشن دیکھ کر ڈاکٹر خاور کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''خرم......!'' خاور کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

''ارے بھائی آپ......؟'' خرم کی آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

دونوں بھائی آمنے سامنے تھے۔ آج کوئی پردہ، کوئی حجاب اور کوئی دوری باقی نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر خاور کو اچانک ہی اسی اسپتال میں پیش آنے والا واقعہ یاد آ گیا جو وہ بابر کی شادی کے دوران بھی یاد رکھے ہوئے تھے، آج اپنی تمام جزئیات سمیت سمجھ میں آ چکا تھا وہ قصہ......

لیٹی ہوئی ریشم نے بھی انہیں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اور شرمین...... وہ تو یوں لگ رہا تھا جیسے

پٹ سے گر کر بے ہوش ہو جائے گی۔ یک ٹک انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ اور تو اور پیاری بوا نے بھی ڈاکٹر خاور کو پہچان لیا تھا۔ اور پہچانتے ہی آگے بڑھ کر ان کی بلائیں لیتی خوش ہو کر بولیں۔

''اے ڈاکٹر بیٹا.....! آپ... اس اسپتال میں ہوتے ہیں، آج بہت دنوں کے بعد دیکھا۔ آپ تو کبھی پھر پلٹ کر ہی نہیں آئے۔''

''او ہو بوا آپ ہیں؟ کیسے مزاج تو بخیر ہیں؟ اور وہ...... ہماری دادی اماں کیسی ہیں؟'' خاور نے پہلے ان کو جواب دینا ضروری سمجھ کر خیریت معلوم کی۔

''اللہ کا شکر ہے میاں.....'' انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''یہ دیکھو، شرمین بٹیا بھی تو آئی ہے۔'' خاور نے جی بھر کر اسے دیکھا۔ اس نے نگاہیں جھکالیں۔

خاور اب خرم کی طرف متوجہ ہوگئے۔ جس کی پیشانی اتنی سردی میں بھی پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔

اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر خاور کو دل ہی دل میں سخت خفت محسوس ہو رہی تھی۔ بھائی پر رحم بھی آ رہا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ سب کچھ منظرِ عام پر آ گیا تھا۔

''خرم.....! اس میں کیا ہے؟'' خاور نے سرخ پھولدار کمبل کے اندر جھانکا۔

''یہ..... یہ.....'' خرم کی زبان لڑکھڑائی۔ انہوں نے گھبرا کر چاروں طرف کھڑی خواتین کو دیکھا۔ پھر ایک دم ہی کہہ گئے۔

''یہ..... آپ کا بھتیجا ہے خاور بھائی....'' اتنا کہتے ہوئے انہوں نے بچہ کمبل سمیت آگے بڑھا دیا۔

"congratulation brother"

ڈاکٹر خاور نے جھجکے بغیر بچے کو اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا اور بوسہ دے کر بولے۔ شرمین کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

''اگر...... یہ دونوں آپس میں بھائی ہیں تو پھر.....؟'' اتنے عرصے ڈاکٹر خاور کے ہاں ٹیوشن کے دوران اول تو اس نے کبھی خرم کو دیکھا نہیں تھا اور اگر دیکھا تھا تب بھی آج تک پہچان نہ سکی تھی، وہ چور نظروں سے دونوں بھائیوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔

ریشم کے سرہانے بیٹھی ذکیہ خالہ ہلکے ہاتھوں سے اس کا سر دبائے جا رہی تھیں اور تمام معاملات کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ کچھ ان سے ملتا جلتا حال بسنتی کا بھی تھا جو شرمین کے برابر کھڑی غور، غور سے دونوں بھائیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

یہ لوگ گھر سے ریشم، خرم اور ذکیہ خالہ کے لیے کھانا لے کر آئی تھیں کیونکہ کل شام ریشم کا آپریشن ہوا تھا اور یہی دونوں رات بھر اس کے پاس رکے تھے۔ چونکہ ابھی کم از کم اسپتال میں دو دن کا قیام باقی تھا۔ اس لیے گھر سے ایک بستر کے علاوہ دیگر ضرورت کا سامان بھی منگوایا تھا۔ خرم ان سب کے بہت احسان مند تھے جو اس مشکل گھڑی میں اپنوں کی طرح اس کے اور ریشم کے کام آ رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ دنیا ابھی فرشتہ صفت لوگوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔

کافی دیر کے بعد سب واپسی کے لیے اٹھے تو خاور اصرار کر کے خود سب کو اپنی گاڑی پر گھر تک چھوڑ کر آئے۔ اسپتال واپس پہنچ کر انہوں نے جلدی، جلدی اپنی ڈیوٹی سے متعلق ضروری لوازمات سے فرصت پائی اور اسی روم میں واپس آئے۔ ریشم پُرسکون نیند سو رہی تھی۔ ذکیہ خالہ بھی کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔ بچے کو نرس واپس لے جا چکی تھی۔ کمرے میں خرم بھی موجود تھا اور ایک طرف کرسی پر متفکر سا بیٹھا تھا۔

خاور کو اچانک دوبارہ دیکھ کر ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر محبت اور احترام سے بھائی کا ہاتھ تھام لیا اور سیدھے اپنے بنگلے پر لے گئے۔ اس دن دونوں بھائی دیر تک ذاتی قسم کی گفتگو میں مصروف رہے۔ خرم نے اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

☆☆☆

اور پھر...... ولیمے کی صبح سے تو جیسے اس کی ضدوں نے ضد کرلی۔ نائمہ بیگم بہو کی ایک ضد پوری کرتیں تو وہ دوسری کرلیتی دوسری پوری کردی جاتی تو تیسری شروع ہو جاتی۔ یوں لگنے لگا... جیسے وہ اس کی ضدیں اور فرمائشیں پوری کرنے کو رہ گئی ہوں پوری نہ کریں گی تو پتھر کی بن جائیں گی۔

شادی کے ایک ہفتے کے بعد ہی روبی نے سسرال کے زیورات میں نت نئی مین میخ نکال، نکال کر ایک طرف کردیے اور اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق زیورات کے سیٹ بنوانے شروع کردیے تھے۔ وہ سسرالی جوڑے، سینڈلیں، پرس اور میک اپ بکس جو نائمہ بیگم نے ہزار چاؤ چونچلوں اور ارمانوں کے ساتھ پانی کی طرح روپیہ بہا، بہا کر تیار کروائے تھے۔ دن رات درزیوں کے سروں پر کھڑی رہی تھیں، بہو بیگم نے بیک جنبشِ زباں رد کرڈالے تھے۔ ان جوڑوں کو تو وہ دیکھنا تک پسند نہیں کررہی تھی، تمام کے تمام بکسوں میں ڈلوا کر بند کردیے گئے تھے اور نئے سرے سے نئے، نئے ملبوسات دن رات سلنے شروع ہوگئے تھے۔

مجال ہے کہ نائمہ بیگم کے لبوں سے اُف تک بھی نکلی ہو، انہیں تو ہر پل اپنی عزت ہی خاک دھول میں اٹی نظر آرہی تھی۔ بیچاری کی جان عجیب مخمصے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ نہ نگلتے بن رہی تھی نہ اگلتے...... چہیتی نند کی لاڈلی بیٹی اب دلاری بہو بن کر ان کے انگنا میں اتری تھی تو کسی صورت اس نازو پلی کے مزاج ہی نہ مل رہے تھے۔ نخرے تھے جو ہر روز بڑھتے ہی چلے جارہے تھے۔

سخت ترین حیران کن بات تو یہ تھی کہ شادی سے پہلے تو کبھی وہ ایسی نہیں تھی...... ہرگز نہیں...... اگر یہ کہا جائے کہ پہلے اس کے تنک چڑھے مزاج کا اندازہ نہیں تھا تو یہ بھی ایک ناقابلِ یقین بات تھی کیونکہ ہر وقت، ہر لمحے کی دانتوں کاٹی روٹی تھی۔ مگر اب تو حقیقت یہی تھی کہ بقول شخصے ناک پر مکھی بیٹھنے نہ دے رہی تھی۔ ہر پل منوں جلال چڑھا رہتا، ایسے میں نائمہ بیگم کا اپنا مزاجی جلال بالکل ڈاؤن ہو کر رہ گیا تھا۔ معلوم نہیں کیا ہوگیا تھا کہ وہ اس کے آگے پیچھے چک پھیری ہی پھرنے لگی تھیں۔

معصومہ، جو شادی سے قبل روبی کے دم کی ساتھی تھی، اب کئی، کئی دن اس سے بات نہیں کرتی تھی۔

اسے ہمہ وقت اپنے سولہ سنگار اور نت نئے انداز کے فیشنوں سے فرصت نہ تھی تو گھر کے دوسرے افراد کو کیا دیکھتی اور سمجھتی۔

نائمہ بیگم کے لیے سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ وہ نند شمسہ بیگم سے بھی دل کا احوال نہیں کہہ سکتی تھیں۔ اول تو شمسہ بیگم ابھی تک اپنی کوٹھی پر واپس نہیں آئی تھیں جس رہائش گاہ پر رہنے گئی تھیں، متین احمد نے وہاں کچھ کام نکال لیے تھے اور اگر وہ یہاں ہوتیں بھی تو روبی کا معاملہ کچھ ایسا معاملہ تھا کہ وہ ان سے بیان کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھیں، ان کے رشتے اب تبدیل ہوچکے تھے لہٰذا بات بڑھ بھی سکتی تھی، بگڑ بھی سکتی تھی۔ پھر وہ خوب جانتی تھیں کہ بڑھی ہوئی باتیں ذرا، ذرا سی رنجشوں کی آڑ لے کر بگڑتی ہی چلی جاتی ہیں...... بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں...... پھیلتی ہی جاتی ہیں...... کبھی جڑ سے ختم نہیں ہوا کرتیں۔ ابھی تلاش کا وہ سرا جو اُن کے ہاتھوں میں مصلحتوں کی زنجیر بنا دبا ہوا ہے، اگر خدانخواستہ ایک بار چھوٹ گیا تو پھر اتنے گہرے پانیوں میں جا گرے گا کہ پھر پلٹ کر ہاتھ نہیں آسکے گا۔ چاہے کتنا ہی ماہر غوطہ خور کیوں نہ جا اترے۔

چنانچہ نائمہ بیگم مصلحتوں کی ڈوری مضبوطی سے تھامے لرزاں اور خیزاں بیٹھی تھیں۔ روبی کے عجیب و غریب رویّے نے ان کا سارا طنطنہ آتے ہی نکال ڈالا تھا۔ ایک دن بھی تو ایسا نہیں آیا تھا جب شادی کے بعد روبی نے ان کے ساتھ اچھی بہو کی طرح بات کی ہو۔

بابر ہر بات سے آگاہ تھے مگر کیا کرتے...... روبی کی غیر موجودگی میں انہوں نے سیکڑوں دفعہ ناک بھوں چڑھائی تھی، دبی زبان سے اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا تھا مگر نائمہ بیگم انہیں بھی صبر و تحمل کی تلقین کرتی

رہیں۔ اب تو کبھی، کبھی بابر بیوی کے لیے کڑھتے ہوئے آپ کی بہو بیگم کا ٹائٹل دینے لگے تھے۔

تنہائی میں بہت زیادہ دماغ لڑانے اور دنوں سوچنے کے بعد ان کے دماغ میں اس مسئلے کا سبب یہی آیا تھا کہ چونکہ روبی میکے سے نہایت شاندار اور عظیم الشان جہیز کے ساتھ آئی ہے اس لیے ایک دم مغرور اور بدلحاظ ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر افسوس کہ نائمہ بیگم یہ حقیقت نہ تو روبی کے سامنے کہہ سکتی تھیں نہ شمسہ بیگم کے آگے رونا رو سکتی تھیں۔ یوں بھی وہ اندر سے ایک وضع دار خاتون تھیں، اتنی اوچھی نہ تھیں کہ کھلم کھلا رونا رونے لگتیں۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ گھر کی بجھی بجھی اور خاموش فضا دیکھ کر کڑھنے لگتیں۔ پہلے یہی گھر تھا جہاں ہر طرف قہقہے، چہچہے اور مسکراہٹیں ہوا کرتی تھیں، اب ہر کوئی بیزار، بیزار صورت بنائے پھرتا۔

خرم کا آنا کبھی کبھار ہی تھا، اسے گھر کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ معصومہ نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ باقی رہ گئے خاور، وہ ضرور کچھ نہ کچھ نتیجہ نکالنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ دونوں چھوٹے لڑکے بھی اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے۔

بابر کا کالج کے بعد جو وقت بچتا، وہ نئی نویلی بیوی کی نذر ہو جاتا۔ چھٹی کے دن تو مجال نہ تھی کہ گھر کے اندر ٹک جاتے، روبی پہلے سے ہی پروگرام تیار رکھتی، کبھی پکنک...... کبھی پکچر...... کبھی ڈرائیونگ...... کبھی شاپنگ اکثر رات کا کھانا باہر کھا کر آیا کرتے تھے۔

ایک دن...... روبی برآمدے میں بیٹھی ایک فیشن میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی کچھ فاصلے پر تخت پر نائمہ بیگم چھالیا کتر رہی تھیں۔ معصومہ بھی وہیں موجود کامی کو اس کا ہوم ورک کروا رہی تھی۔

''السلام علیکم......'' اچانک بابر نے اندر داخل ہو کر سلام کیا اور اپنی والدہ کو دیکھ کر سیدھے انہی کی طرف آئے اور ان کے قریب تخت پر بیٹھ گئے۔ وہ کالج سے ڈیوٹی آف کر کے آتے تو سیدھے ان کے پاس ہی آتے تھے۔

''آ گئے بیٹا!'' نائمہ بیگم نے پیار سے پوچھا۔

معصومہ فوراً اٹھ کر گئی اور بھائی کے لیے طشتری میں پانی کا گلاس لے کر آ گئی۔

''پھوپی جان وہیں کی ہو کر رہ گئی ہیں، کب آئیں گی آخر......؟'' بابر نے پانی پی کر گلاس اسے واپس دیا اور والدہ سے بولے۔

''ہاں سچ تو ہے، وہ تو وہیں کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہاں انتظار کر کر کے تھک گئے ہیں، اب تو گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔'' نائمہ بیگم بیزاری کے عالم میں بولیں۔

''اماں جان! آپ خود کہیے پھوپی جان کو واپس آنے کا۔'' معصومہ اصرار کر کے بولی۔

''ہاں اب ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ بابر اب تم دلہن کے ساتھ وہاں جاؤ تو ہمارا پیغام انہیں دے دینا۔'' انہوں نے گردن ہلا کر جواب دیا۔

''بہت اچھا۔'' بابر نے کہتے، کہتے جیب سے ایک بھاری لفافہ نکالا اور ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''یہ لیجیے اماں جان......'' ابھی بات ان کی زبان سے پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ واقعہ پیش آ گیا جس نے پورے گھر کو لرزا کر رکھ دیا۔

اچانک ہی روبی اپنی جگہ سے اٹھی اور چیل کی طرح جھپٹا مار کر وہ لفافہ لے اڑی۔

''اب...... اس تنخواہ کی حقدار میں ہوں......'' وہ تیزی سے بولی۔ پھر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ بابر ہونقوں کی طرح منہ تکتے رہ گئے، دیکھتے ہی دیکھتے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا مارے غصے کے وہ اٹھ کر اس کے پیچھے چلے مگر نائمہ بیگم نے فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''جانے دو بیٹا! اصل میں یہ اسی کا حق ہے۔'' وہ تحمل سے بولیں۔

''کیسے...... ان کا حق ہے؟'' انہوں نے بگڑ کر کہا۔

''تمہاری بیوی ہے آخر...... اس کا حق نہیں ہوگا تو پھر کس کا ہوگا؟''

''دراصل آپ نے ہی اسے سر چڑھایا ہے۔'' وہ

چڑ کر بولے۔

''ہم نے کہہ دیا ہے تم سے کہ دل چھوٹا مت کرو...... اپنی زندگی کے سکون کو تہ نظر رکھو...... آج نہیں تو کل، تمہاری تنخواہ جانی تو اسی کے پاس تھی ناں......''
نائمہ بیگم نے رسان سے جواب دیا۔

بابر بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نائمہ بیگم گہری سوچ میں پڑ گئیں۔ اس وقت کے واقعے نے ان کی آنکھیں کھول ڈالی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں۔

''زیادہ بڑے گھر کی ہے ناں روبی، اس لیے دماغ خراب ہے اس کا۔ جس کے پاس زیادہ مال ہو، اسی کو اور زیادہ کی ہوس ہوتی ہے۔ جس کے پاس کم ہو، وہ قناعت پسند اور صابر ہوتا ہے۔ غریب آدمی کا دل اللہ تعالیٰ آبِ زر سے بناتا ہے اور امیر آدمی انسانی احساسات کو سونے، چاندی کے ترازو میں تولنے کا عادی ہوتا ہے۔'' اس وقت ان کے دل میں ایک خیال آرہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ دماغ متضاد خیالات کی... آماجگاہ بنا ہوا تھا، تھک ہار کر وہ وہیں پاندان کے قریب تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئیں۔ روبی کا عجیب اور غریب سلوک ان پر سوچ کے نئے، نئے در وا کر رہا تھا۔

بابر کے ولیمے پر انہوں نے خرم اور خاور کے لیے کئی لڑکیاں پسند کی تھیں۔ انہیں بطورِ خاص مدعو کیا تھا تاکہ کسی آخری فیصلے کے بعد وہ ضروری اقدام کریں اور ان لڑکیوں کو اپنے لڑکوں سے منسوب کرلیں مگر ولیمے کی صبح اول تو روبی کے رویّے نے انہیں دلبرداشتہ اور بدحواس کردیا تھا دوسرے اب وہ تنہائی میں کوئی فیصلہ کرنے بیٹھتی تھیں تو یہ سوچ، سوچ کر تھرا اٹھتیں کہ پہلی بہو نے کتنا نہال کیا ہے جو دوسری بہوئیں کریں گی۔

لڑکیاں جتنی بھی تھیں وہ سب کی سب نائمہ بیگم کی بے حد حسبِ مرضی اور حسبِ خواہش تھیں۔ اب انہیں اپنے معیار اور اپنی پسند سے ڈر لگنے لگا تھا۔ بابر کی شادی نے ان کی آنکھیں کھول ڈالی تھیں۔ کسی بھی لڑکی یا اس کے گھرانے پر اعتبار اٹھ گیا تھا ان کا۔

شاید ذرا سی دیر کے لیے ان کے تھکے ہوئے اعصاب پر غنودگی سی طاری ہوگئی تھی۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے جھکی، جھکی آنکھوں والی ایک معصوم صورت لڑکی ان کے قریب کھڑی ہو۔ گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھیں۔ وہی برآمدہ تھا... وہی تخت وہی ماحول، وہی فضائیں، وہی وہ خود تھیں مگر وہ...... وہ لڑکی نہیں تھی جو ابھی ان کے خواب وخیال میں آئی تھی۔ نائمہ بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

کچھ دنوں سے ان کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔

جوں جوں روبی بہو بننے کے بعد سے انہیں اپنے نئے نئے جلوے دکھا رہی تھی، توں توں ان کے لاشعور پر نقش صورت ابھر کر سامنے آرہی تھی۔ انہوں نے کس برے لہجے میں لتاڑا تھا اسے۔ کون، کون سا علیظ الزام تھا جو نائمہ بیگم نے اس شام اس پر نہیں لگایا تھا۔ اس کی شرافت پر جی بھر کر کیچڑ اچھالی تھی۔

مگر مجال ہے کہ اس نے پلٹ کر ایک حرفِ شکایت بھی زبان سے نکالا ہو۔ کیا اس کے منہ میں زبان نہیں تھی؟ وہ دن گیا اور یہ دن آیا۔ نائمہ بیگم کو پلٹ کر اس کی صورت دکھائی نہیں دی تھی لیکن روبی کے ناروا سلوک کے ساتھ جانے کیوں انہیں وہ بھولی بھالی صورت یاد آنے لگی تھی۔

''کیا ہوا اماں جان؟'' معصومہ نے انہیں سر پکڑے دیکھ کر گھبرا کر پوچھا۔

''معصومہ!'' انہوں نے کھوئے، کھوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تمہیں معلوم ہے وہ لڑکی کہاں رہتی ہے جو بچوں کو پڑھانے آتی تھی؟''

''کون... مس شرمین؟''

''ہاں وہی، وہی......'' شرمین کا نام ان کے منہ سے سن کر معصومہ کا دل زور، زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

''ان کا پتا بہت آسانی سے معلوم ہوسکتا ہے کیونکہ وہ ہمارے ہاں ڈاکٹر شاکرہ کی معرفت آئی تھیں۔''

(باقی آئندہ)

زینی اور گرنی

غزالہ فرخ



ہلکی سی ہوا چلی، سکون آمیز ٹھنڈک کا احساس ماحول کو خوشگوار کر گیا۔ یہاں اس شہر میں ایسا خوب صورت موسم شاذ و نادر ہی نظر آتا تھا۔ سمندر کی طرف سے آنے والی گیلی سیلن زدہ ہوا...... اور ہوا چلنے کے باوجود حبس اور پسینے کا مسئلہ...... زینی نے بڑھ کر فلیٹ کی بیرونی کھڑکی کھول دی۔ موسم کی رنگینی ان کے فلیٹ کو خوش کن احساس اور مدھر سے ماحول سے بھر گئی۔ خزیمہ بڑے جذب کی کیفیت میں زینی کی طرف

بڑھا۔ اس نے دھانی رنگ کا لباس پہنا تھا اور ریشمی حسین بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا یقیناً وہ بھی اس حسین موسم کا اور اس دلنشیں منظر کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی۔ خزیم کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو ہلکی سی خوب صورت مسکان اس کے دلکش چہرے کو مزید دلنشیں بنا گئی۔

''آپ کو پتا ہے خزیم، جب سرد موسم یونہی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ پہلی دستک دیتا تو میری گرینی اون کے رنگ برنگے گولے خرید لاتیں اور میرے لیے خوب صورت مفلر بُنا کرتیں، یقین کریں خزیم میں ابھی تک گرینی کے ہاتھ کے بُنے ہوئے مفلر کی نرمی اور گرمی اپنی گردن کے گرد محسوس کرتی ہوں۔'' زینی نے ہولے سے آنکھیں موند لی تھیں یوں لگ رہا تھا کہ موسم سرما کی سرد اور خوشگوار ہوا اس کے ذہن میں اس کی گرینی اور ان کے ہاتھ سے بنے شاہکار کو زندہ کر گئی تھی۔ خزیم کے بڑھتے قدم رک گئے تھے بولا کچھ بھی نہیں خاموش تو زینی بھی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ موندی ہوئی آنکھوں سے وہ اپنی گرینی کے ساتھ گزرے ان لمحات کو اپنے قریب بہت قریب محسوس کر رہی ہے اور وہ قربت اتنی مسحور کُن ہے کہ وہ اس کی موجودگی سے بالکل بے خبر ہو گئی ہے۔ موسم کی خوب صورتی تو اسی لمحے خزیم کے لیے ان سرد ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہوا ہو گئی تھی۔ وہ قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گیا زینی کے ذہن سے وہ ساتھ..... وہ قربت ذرا سرک سی گئی تھی۔ وہ ذرا سست قدموں سے خزیم کے قریب آ گئی۔

''چائے لیں گے یا کافی؟''

''کافی۔'' اس وقت اب کسی چیز کی چاہ نہ رہی تھی مگر یونہی کہہ ڈالا۔ وہ اپنے ریشمی خوب صورت بالوں کو ہاتھوں پہ موڑ کر گرہ سی بناتی کچن کی طرف بڑھ دی۔

☆☆☆

زینی کی خزیم کی زندگی میں آمد بھی اچھا بھلا ڈراما ہی تھی۔ خزیم کسی معروف کنسٹرکشن کمپنی کے تھرو یہاں جدہ میں مقیم تھا فرم کی طرف سے پانچ سال کا معاہدہ تھا رہائش بھی دی گئی تھی۔ ایک سال کے بعد پاکستان کا وزٹ بھی فرم کے خرچے پر ہوتا، وہ حال ہی میں پاکستان سے لوٹ کر آیا تھا۔ ابھی واپسی کو شاید بیس بائیس دن ہی گزرے تھے کہ امی جی کا فون آ گیا۔

''خزیم واپسی کی تیاری کرلو تمہارے لیے ایک لڑکی پسند کی ہے۔''

''کیا کہا آپ نے؟'' خزیم حیران ہوا۔

''وہی خزیم میاں جو آپ نے سنا..... آخر کار رب نے میری سن لی اور مجھے ویسی بچی مل گئی جیسی میں تمہارے لیے چاہتی تھی۔''

''مگر امی..... میری پیاری امی آپ جانتی ہیں کہ میں ابھی پاکستان میں اپنی چھٹیاں گزار کر آیا ہوں اور فرم منیجر میرے ماموں تو نہیں کہ اب دوبارہ مجھے چھٹیاں دیں گے اور.....''

''جو بھی ہے اور جیسے بھی ہے میں تمہاری جلد از جلد شادی کرنا چاہتی ہوں اور اسی لڑکی سے.....''

''مگر امی جی آپ کی یہ انتہائی پسندیدہ لڑکی یکا یک کہاں سے دریافت ہوئی۔ اس ایک ماہ کے دوران آپ نے مجھے پوری ڈیڑھ درجن لڑکیاں دکھائیں اور ایک سے بھی مطمئن نہیں ہو پائیں اور اب یک دم.....''

''بس یوں سمجھو خزیم میاں کہ جوڑے آسمانوں پر بنے ہوتے ہیں اور وہ کب زمین پر ملتے ہیں اور انہیں کس وقت ایک ہو جانا ہے۔ یہ وقت بھی اللہ تعالیٰ نے طے کیا ہوتا ہے ہم لوگ بھلا کس طرح یہ سب پلان کر سکتے ہیں۔''

امی جانتی تھیں کہ وہ ایسی ہی باتیں کرے گا تبھی تو خوب ہوم ورک کر کے رکھا تھا اور بہت پُر مغز جواب سوچ کر ہی اسے فون کیا گیا تھا۔ شریکِ حیات کے اس ساتھ پر اب اس کا دل بھی راضی ہو گیا تھا گھر بھر سے دور اس اجنبی شہر میں صرف کام اور کام اور پھر

تھک ہار کر گھر آؤ تو ایک انمٹ سناٹا جی چاہنے لگا تھا کہ کچن میں چوڑیوں کی ہلکی سی چھنک ہو اور بیڈروم میں پیاری سی مہک ..... وہ جانے کہاں جا پہنچا تھا کہ امی نے اس کے خیالات کی رو کو توڑ ڈالا۔

''تم سن رہے ہو خزیم؟''

''جی۔''

''اور سمجھ بھی رہے ہو؟''

''نہیں۔''

امی برا مان گئی تھیں تبھی تو فون بند کر دیا تھا۔ بات ٹل گئی مگر اگلے ہی روز وہ اسکائپ پر موجود تھیں بہت برے موڈ کے ساتھ۔

''تم نے بھائی صاحب سے چھٹی کی بات کی؟'' شاید ماموں والی بات امی کے دل کو لگ گئی تھی۔

''وہ نہیں مانے امی جی۔''

''تو پھر چھوڑ دو ایسی نوکری جو تمہارے گھر بسانے میں حائل ہو اور واپس چلے آؤ۔'' اور سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

خزیم کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ پیاری سی امی کا وقتی ابال نہ تھا بلکہ وہ اس معاملے میں سنجیدہ تھیں تبھی تو اگلے روز واقعی منیجر صاحب سے رابطہ کیا جواب واقعی نفی میں تھا۔ امی تو اپنے مادرانہ جذبات سے مجبور تھیں مگر ایم ڈی صاحب بھلا کس طرح اس عجیب سے کیس کے حق میں فیصلہ دے دیتے۔ امی کو ان کے دوٹوک فیصلے سے آگاہ کرنے میں خزیم کو کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر کافی بحث کے بعد امی اس بات پر رضامند ہو گئی تھیں کہ نکاح فون پر کر دیا جائے تاکہ کاغذات بننے کا سلسلہ شروع ہو۔ اور امی کی پسندیدہ لڑکی خزیم کی دلہن بن کر یہاں آ سکے مگر امی شدتِ جذبات میں اصل بات کو سرے سے ہی فراموش کر چکی تھیں کہ اس موسٹ وانٹڈ لڑکی کو دیکھنے کا حق اس کا بھی تھا۔

مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق خود ہی ذرا جھجکتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو امی ہنس پڑیں۔

''لو باؤلی ہو گئی ہوں بالکل..... چل ٹھیک ہے احمد کو بولوں گی بھائی کو تصویر بھجوا دے۔''

What's app پر بھیجی گئی تصویریں دیکھ کر خزیم جان پایا کہ امی یونہی دیوانی نہیں ہوئی تھیں زینی تھی ہی ایسی کہ ان کے چاند سے بیٹے کے گھر کو اپنی آمد سے جنت بنا سکتی تھی ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد خزیم کا دل بے ایمان سا ہونے لگا تھا۔ وہ جوان تھا اور عملی میدان میں کامیابیوں کو چھوتا ہوا مرد اب وہ اس اسٹیج پر تھا کہ ایک حسین ساتھی کو اپنے گھر میں، اپنے دل میں جگہ دے سکے تبھی تو ٹیلی فون پر ہی نکاح کرنے کو تیار ہو گیا تھا بلکہ بے چینی سے اس گھڑی کا انتظار کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

اب زینی شرعی اور قانونی طور پر خزیم کی تھی سب کچھ بڑی ہی خوب صورتی اور آسانی سے ہو گیا تھا امی بھی خوش تھیں اور ابو بھی..... دراصل زینی ابو کی دریافت تھی۔ ابو کے پیارے دوست کی صاحب زادی، ابو کے دوست اور ان کی بیوی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں زینی کو اس دنیا میں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ زینی اپنی ددھیال میں ہی پلی بڑھی تھی۔ دوست حیات نہ تھے اس لیے اس خاندان سے رابطہ کٹ کر رہ گیا تھا۔ اب کسی تقریب میں زینی کو دیکھا تو اپنے پیارے دوست کی دوستی کی نسبت سے سارے ہی پیارے جذبات امڈ آئے۔ جانتے تھے کہ خزیم شریف الطبع بچہ ہے۔ ماں باپ کے انتخاب کو کبھی رد نہ کرے گا۔ امی تو اتنی خوش تھیں کہ وہ نکاح کی رسم کے بعد کاغذات کی تیاری کے درمیانی وقفے تک زینی کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی تھیں۔

وہ اب اس کی تھی۔ اس کی اپنی ..... اس کی نصف بہتر اس پردیس میں اب وہی اس کی خوشیوں کا سرمایہ تھی اس تصور سے گھر کو اپنی تقرری کی لسی اور

خوب صورت قدموں کی چاپ سے سنوارنے، سجانے والی تھی۔

امی جی شادی کی تیاریاں خوب جی جان سے کر رہی تھیں۔ فون کرتیں تو اسے شادی کی تیاری بتاتے ہوئے جذباتی ہو جاتیں۔ زینی مکمل طور پر تو ان کے گھر میں نہیں رہی تھی مگر امی اور فاریہ کے ساتھ اپنی شادی کی شاپنگ میں شریک ہوتی۔ امی کے پہلے بیٹے کی شادی تھی وہ شاید اپنے سارے ارمان اس پر ہی نکال لیتیں۔ امی زینی کے لیے بہترین ڈیزائنرز کے سوٹ بنوا رہی تھیں خزیم اکثر یاد کرواتا۔

''میری پیاری امی کپڑوں اور جیولری پر اتنی رقم صرف نہ کریں۔ یہاں تو اسے باہر جاتے وقت عبایا پہننا پڑے گا اور سر پر اسکارف بھی۔''

جانے کیسے وقت گزر گیا۔ خزیم کے دوستوں کا خیال تھا کہ وہ اس معاملے میں بہت خوش قسمت نکلا اس کی بیگم صاحبہ جلد ہی اس کے پاس آ رہی تھیں مگر کوئی اس کے دل سے پوچھتا کہ اسے گزرتا ہوا ایک، ایک منٹ صدیوں پر محیط ہوتا نظر آ رہا تھا۔ ایک دن گزر جاتا تو وہ من ہی من میں مسرور ہوتا کہ اس کے اور زینی کے درمیان حائل فاصلوں میں ایک دن کم ہو گیا۔

اور واقعی جدائی کے سارے لمحات بیت گئے اب تو وصل کی گھڑیاں تھیں، اس کی نازک سی گڑیا اس کے سامنے تھی۔ یہاں اس شہر میں اس کے کافی دوست تھے کئی کی فیملی بھی ساتھ تھی مگر اس نے آج کسی کو مدعو نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی شریکِ حیات کا استقبال خود کرنا چاہتا تھا، دل نہ مانا تھا کہ ان لمحات کا فسوں اور خوب صورت پل وہ کسی اور کے ساتھ شیئر کرے۔ اگلے روز وہ سب کو اپنے فلیٹ پر مدعو کر کے دعوت دے دیتا۔

گلابی لباس تھا اور انہی رنگوں کی آمیزش سے بنا خوب صورت عبایا وہ سامنے آئی تو خزیم پل بھر کے لیے ٹھٹک سا گیا۔ تصویریں اس کا حسن مکمل طور پر خود میں سما نہ پائی تھیں۔ خزیم نے اسے سادہ لباس میں دیکھا تھا اور پھر نکاح کے موقع پر سرخ زرتاری جوڑے میں مگر وہ حقیقت میں اپنی تصویروں سے بھی بہت آگے تھی۔ قدرت کی خوب صورتی کا حسین شاہکار۔ اسے اپنے سامنے یوں ساکت سا پایا تو زینی کی نظریں جھک گئیں۔

''میں اس نئے ملک..... نئے ہم سفر کے ساتھ اس نئے گھر میں تمہاری آمد پر تمہارا استقبال کرتا ہوں۔''

اس کے فلیٹ کا دروازہ تھا اور وہ اسے کھول کر درمیان میں کھڑا ہو کر چھاتی پر دایاں ہاتھ رکھے ذرا سا جھک کر اسے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ وہ یک دم ہنس پڑی سپید گالوں میں نمایاں ہوتے ہوئے خوب صورت گڑھے اور مترنم سی ہنسی کی کھنک یوں لگا جیسے اس کا فلیٹ معصوم اور دلکش خوشیوں سے بھر گیا۔

''سفر کیسا کٹا ہم سفر کے بنا جانم؟ اکیلے سفر کرنے کا پہلا، پہلا تجربہ تھا ناں؟''

''ارے نہیں، مجھے مشکل نہیں ہوئی۔''

''مجھ سے ملنے کا اشتیاق تمہارے سفر کو تمہارے لیے آسان بنا گیا۔''

''ارے نہیں خزیم اصل میں سیٹ پر سر ٹکا کے آنکھیں موندے میں اپنی گرینی کے بارے میں سوچتی رہی، ان کے ساتھ گزارا ایک، ایک لمحہ ان کی محبت کا حصار بن کر میرا سفر آسان بنا گئے۔'' وہ جذب کی کیفیت میں تھی اور بھاری بھرکم گلابی جوڑا بدل کر آرام دہ ٹراؤزر اور شرٹ میں تھی۔ خزیم نے کسی اچھے ہوٹل سے کھانا آرڈر کیا تھا اور کھانے کے بعد کافی بھی اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ وہ ذرا جھجک سی رہی تھی مگر خزیم کے مکمل اعتماد اور مسرور کن انداز نے اسے بہادر بنا دیا وہ اب بڑے سکون سے اپنے سفر اور اس کی کیفیت بتا رہی تھی۔

''گرینی ہر دم میرے ساتھ رہیں خزیم۔''

''گڑیئی؟''

''جی ..... ماما پاپا کا پیار تو دیکھا نہیں میں نے ..... بس میری ساری زندگی کا پیار بھرا رشتہ یہی تھا ناں۔''

رات بھیگتی جارہی تھی ہاتھوں میں تھامے کافی کے مگ بھی خالی ہو گئے تھے۔ وہ ہزاروں میل سفر طے کر کے اس کے پاس آئی تھی اس کی خواب گاہ میں اس کے بستر پر..... وہ آگے بڑھا اور بتی گل کر دی۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ خزیم کے جاگنے سے پہلے ہی کچن میں موجود تھی۔ ہلکا پھلکا سا ناشتا بنا کر ٹرے تھامے وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئی تو وہ جاگ گیا تھا۔

''اپنے گھر میں خوب صورت پہلی صبح مبارک ہو جانم۔'' خزیم پھر ذرا جھک کر وا اپنے ہاتھ کو سینے پر رکھے پیار سے کہہ رہا تھا۔ ناشتے کے دوران وہ مکمل طور پر خاموش تھی۔

''اداس ہو؟''

''نہیں۔''

''خوش ہو؟''

''جی!''

''پھر اتنی خاموش کیوں ہو؟''

''گڑیئی یاد آ گئیں بس..... وہ کہا کرتی تھیں کہ زینی تو ایک شہزادی ہے، تیرے لیے ایک شہزادہ رتھ سجائے آئے گا اور..... اور.....''

''تم اداس ہو تو گڑیئی سے بات کر لو۔''

''اب ان سے کیسے بات کر پاؤں گی وہ تو نہیں ہیں ناں۔''

''کہاں ہیں وہ؟''

''وہ.....'' وہ ایک پل کو رکی ایک سسکی ان خوب صورت لبوں سے نکلی، اپنی انگلی کو آسمان کی طرف کیا اور آگے بڑھ کر خزیم کے سینے سے جا لگی۔ وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی، خزیم کی شرٹ اس کے متواتر آنسوؤں سے نم ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے دوست اور ان کی فیملیز زینی سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں اور قدرے متاثر بھی۔ اس کی شخصیت خوب صورتی اور رعنائی کا مرقع تھی۔ اس گھر میں آئے اسے ایک ہی دن گزرا تھا مگر وہ سارے گھر کو اچھی طرح سنبھال رہی تھی وہ فلیٹ جو اس کے آتے ہی مکمل گھر بن گیا تھا۔ خزیم خوش تھا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد امی اور ابو سے بات ہوئی۔

''خزیم خوش ہو ناں بچے؟'' خزیم کا خیال تھا کہ امی بھی یہ سوال کریں گی مگر امی نے فوراً پوچھا۔

''خزیم، زینی ٹھیک ہے ناں ..... خوش تو ہے وہ؟ راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی..... اسے خوش رکھنا۔''

''امی پلیز خود ہی بات کر لیں ناں۔'' اس نے فون زینی کو تھمایا تو وہ ذرا گڑبڑا گئی۔

''اب میں امی جی سے کیا بات کروں؟''

''میری شکایتیں لگا دو، امی جی تمہاری محبت میں سرشار ہیں سچ مان جائیں گی۔''

''ایسے بھلا...'' پھر اس نے اپنا حال چال بتا کر فون بند کر دیا۔

''تو میرے ساتھ بھی جب بات کی یونہی سرسری سی۔''

''خزیم مجھے فون کرنے کی عادت نہیں ہے ناں۔'' اداسی اس کے انداز میں سرایت ہوتی نظر آئی تو وہ بڑھا اور زینی کو محبت سے اپنے ساتھ لگا لیا۔

اگلی صبح وہ اٹھی تو طبیعت ست سی تھی اٹھ کر ناشتا بنایا۔ خزیم تو ابھی ایک ہفتے کی چھٹی پر تھا وہ بیڈ پر ٹرے لے کر آ گئی۔

''تم ٹھیک تو ہو زینی؟''

''ہوں..... بس ذرا جسم میں درد ہے۔''

''ارے تم کیوں اٹھیں، میں خود ناشتا بنا لیتا پہلے بھی تو بناتا تھا۔ چلو اب چین کر چائے کے ساتھ کھا لو اور ریسٹ کرو۔'' وہ واقعی گھبرا گیا تھا۔

''ارے نہیں، آپ یونہی پریشان ہو گئے کوئی گیٹ ٹو گیدر ہو تو بعد میں میری طبیعت یوں ہی خراب ہو جاتی ہے۔''

''تھک گئیں تم...... اتنے سفر کے بعد کافی مہمان آ گئے ناں۔''

''نہیں خزیم، اصل میں میری گرینی کہتی تھیں کہ میرا خون بڑا ہلکا ہے مجھے بہت جلد نظر لگ جاتی ہے۔ میں جب کہیں جاتی یا گھر میں کوئی فنکشن ہوتا تو وہ میرے اوپر سے مرچیں وار دیتیں تو میری نظر اتر جاتی تھی۔''

''اوہ۔'' وہ بس اتنا کہہ کر ہی خاموش ہو گیا اب بیوی کی محبت میں سرشار وہ گرینی کی طرح نظر تو نہیں اتار سکتا تھا۔ ایک ہفتہ جیسے پر لگا کر اڑ گیا تھا۔ دونوں پیار اور محبت کے نشے میں سرشار تھے۔ زینی بڑی عقیدت سے کہتی۔

''خزیم آپ تو بہت اچھے ہیں، میں سوچتی تھی کہ میں اکیلی کیسے رہ پاؤں گی۔''

خزیم نے اس ہفتے میں اسے تقریباً سارا ہی شہر دکھا دیا تھا۔ بڑے، بڑے مالز میں جاتے مگر وہ شاپنگ کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوتی۔ وہ تو ابھی تک پاکستان سے لایا ہوا سامان مکمل طور پر ان پیک نہیں کر پائی تھی۔

آج بھی وہ خوب صورت بیچ پر گھوم کر آئے تھے اور ڈنر بھی باہر ہی کیا گھر واپس آئے تو خزیم بنا کپڑے تبدیل کیے ہی لیٹ گیا۔

''میں تو بہت تھک گیا ہوں بھئی، اب چینج بھی نہیں کروں گا بس ایک کپ چائے پلا دو۔''

''ارے نہیں۔'' وہ ٹھٹک گئی اور تیزی سے بولی۔ ''ایک تو پہلے کپڑے بدلیں۔ نائٹ سوٹ پہنیں تاکہ ایزی ہو کر سو پائیں اور رات سونے سے پہلے چائے نہ پئیں، نیند بھاگ جائے گی۔''

''تمہاری گرینی نے بولا ایسا؟'' وہ مذاق کے موڈ میں تھا۔

''ہاں تو اور کیا؟'' وہ بہت سنجیدہ تھی۔

وہ کمرے سے چل دی اور خزیم کروٹ بدل کر رہ گیا۔ آفس سے لی ہوئی چھٹیاں ختم ہونے کو تھیں صبح اسے اپنا آفس جوائن کرنا تھا، یہ ایک ہفتہ جیسے دن عید اور رات شبِ برات تھی۔ اس کے دوستوں نے بھی اسے قطعاً ڈسٹرب نہیں کیا۔ وہ ان لو برڈز کو مکمل تنہائی دینا چاہتے تھے مگر اس عرصے میں وہ اکیلے کب تھے۔ زینی کی گرینی ہر وقت، ہر لمحے ان کے درمیان تھیں۔

زینی اب شادی شدہ تھی۔ اپنے پی کی نگریا میں مگر اپنی گرینی کے ساتھ گزرے لمحات کے فسوں سے آزاد نہ ہو پائی تھی پل بھر کے لیے ذہن پراگندہ سا ہوا مگر حسین ساتھی کی سنگت تھی سر کو جھٹکا اور یہ خیال دماغ سے بھگانے لگا۔

خزیم اپنی ڈیوٹی پر چل دیا تھا وہ صبح اس کا لباس تیار کرتی۔ اس کا پسندیدہ ناشتا بناتی اور بھرپور مسکراہٹ سے اسے روانہ کرتی۔ آفس جانے کے بعد بھی خزیم کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہوتا کہ وہ اس فلیٹ میں تنہا ہوگی، بے طرح مصروفیت کے باوجود اسے فون کرتا۔

''ٹھیک ہو جانم؟''

''جی۔''

''اداس ہو؟'' وہ بس ہنس دیتی۔

''کیا کر رہی ہو؟'' سوال ہوتا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' بس ایسی ہی چھوٹی سی بے معنی سی باتیں مگر اس کی آواز سن لیتا تو دل کو سکون ہو جاتا۔

اس روز آفس سے واپس آیا تو گجرے لیتا آیا۔ زینی خوش ہو گئی۔

''خزیم مجھے گجرے بہت پسند ہیں مگر گرینی مجھے پہننے نہیں دیتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ کنواری لڑکیوں کا گجرے پہننا غلط ہے مگر اب دیکھیں ناں جب میں نے گجرے پہنے تو وہ دیکھ ہی نہیں پائیں۔''

خزیم بدمزہ سا ہوا چہرے کا رنگ پل بھر کے لیے بدلا مگر بولا کچھ نہیں کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے وہ ملول سی نظر آرہی تھی۔

''جاؤ کھانا لے کر آؤ۔'' وہ قدرے سختی سے بولا تھا وہ خاموشی سے کچن کو چل دی۔

☆☆☆

''امی جی زینی خوش ہے، وہ بہت اچھی لڑکی ہے اسے شریکِ حیات بنانا میری خوش قسمتی ہے، میں آپ کے انتخاب پر بہت خوش ہوں مگر......''

''مگر......؟'' امی تو یک دم گھبرا گئیں آج کتنے ہی دنوں کے بعد وہ امی سے دل کی بات کہہ پایا تھا۔

''مگر امی جی زینی اپنی گرینی سے اپنا ذہنی تعلق توڑ نہیں پائی...... اس کی گرینی کی یاد ہر لمحہ، ہر موقع پر ایک آسیب کی طرح اس کے ذہن پر سوار ہے۔''

''اوہ، میں تو ڈر گئی تھی جانے کیا بات ہوگئی۔ پگلے تو، تو اپنی سسرال سے بہت دور ہے ورنہ تو لڑکوں کو شادی کے بعد اپنی بیویوں کے لیے ان کے میکے والوں پر کافی توجہ دینی پڑتی ہے اور یہاں تو صرف اس کی گرینی کا ذکر ہی ہے وہ سامنے تو نہیں ہیں۔''

''یہ صرف گرینی کا ذکر ہے امی جی؟ آپ نہیں جانتیں امی کہ ہر عمل، ہر حرکت، ہر واقعے کے ساتھ اس کی گرینی کے اقوال ان کی ہدایات ہمارے شاملِ حال ہوتی ہے۔''

''ذرا سوچو خزیم اس بچی نے ماں باپ کو بہت جلد کھو دیا اس کے بعد کسی بہن بھائی کا پیار نہیں پایا، دوھیال میں پلی تو وہاں دادی کی ذات میں اس نے اپنے تمام تر رشتوں کی محرومی ختم کرنے کی کوشش کی ہوگی اور اگر اب......''

''ٹھیک ہے امی جی...... زینی آرہی ہے پھر بات کریں گے۔'' خزیم کی ملازمت کا سب سے بڑا پہلو یہ تھا کہ وہ خانۂ خدا سے قریب تھا اور گاہے بگاہے وہاں حاضری کا شرف حاصل ہو جاتا اس دفعہ وہ تنہا نہ تھا اس کی پیاری زینی اس کے ساتھ تھی۔

عمرے کی نیت کی اور احرام باندھا تو زینی کی خوب صورت آنکھیں نم ہو گئیں۔

''خزیم میں کتنی خوش قسمت ہوں، آج اللہ تعالیٰ کی رحیم ذات نے ہمیں مل کر عمرے کی سعادت بخشی۔'' وہ سسکیوں سے رو رہی تھی اس کا نازک سا وجود ہچکولوں کی زد میں تھا۔ طواف کرنے کے دوران بھی اس کا چہرہ جذب کی کیفیت میں سرخ ہو رہا تھا۔

''مبارک ہو زینی آج اللہ تعالیٰ کی رحیم ذات نے ہمیں مل کر عمرے کی سعادت بخشی۔'' سعی کی منزل پوری کرنے کے بعد جب خانۂ خدا سے باہر آرہے تھے تو خزیم نے پکارا۔

''آج آپ کے ساتھ یہ شرف حاصل کیا خزیم یوں لگا کہ میری زندگی مکمل ہو گئی۔'' وہ ذرا مغموم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

وہ بہت خوش تھے انہیں رات واپس جانا تھا۔ اگلے روز سے اپنا آفس جوائن کرنا تھا۔

''خزیم پلیز آج کی رات یہیں رک جائیں، اس سرزمین سے اتنی جلد واپس جانے کو جی نہیں چاہتا اور یوں بھی مجھے اپنی گرینی کے نام کا طواف بھی کرنا ہے اور یہ شرف میں اکیلے کیسے حاصل کر سکتی ہوں۔''

خزیم نے ٹھنڈی آہ بھری مگر اس مقدس اور پاک جگہ کوئی بھی ملال دل میں لانے کا نہیں سوچا اور واقعی وہ ایک رات رکنے کے لیے ہوٹل تلاش کرنے لگا۔

☆☆☆

زینی کی سنگت میں وقت جیسے بڑی ہی سرعت سے گزرا۔ زینی نے بڑی خوش اسلوبی سے گھر سنوارا تھا۔ اس نے اپنی خوش سیرتی سے قائل کر لیا تھا مگر یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ وہ ایک پل کو بھی خود کو گرینی کے خیال سے آزاد نہ کر پائی تھی۔ وہ مکمل طور پر اپنی گرینی کے خیال کی گرفت میں تھی۔ خزیم وقتی طور پر گھبرا جاتا مگر پھر خود کو نارمل کرنے کی کوشش

کرنے لگتا۔ امی درست کہتی تھیں کہ وہ دونوں وہاں تنہا تھے۔ پاکستان میں ہوتے تو ہر رشتے کو اس کی اہمیت کے مطابق نبھانا پڑتا مگر یہاں صرف اچھا شوہر بننے کا رول نبھانا تھا۔ پاکستان میں اسے اچھا بیٹا، بھائی، داماد بننے کو جانے کیا، کیا کاوش کرنا پڑتی۔ بس یہی بات اسے پُرسکون کرنے کی وجہ بنتی مگر اس روز تو انتہا ہی ہوگئی۔

زینی کی کئی دن سے طبیعت خراب تھی کھانا کم کھاتی اگر وہ زبردستی کھلا دیتا تو الٹی ہو جاتی۔ سست سی ہوگئی تھی بڑی کوشش سے خود کو مستعد ثابت کرنے کی کوشش کرتی مگر بدن ٹوٹے پڑتا اور جی ماندہ سا تھا۔ خزیم نے اپنے دوست جبار سے ذکر کیا تو وہ مذاق کرنے لگا۔

''مجھے لگتا ہے کہ والدِ بزرگوار بننے والے ہو...... بھئی کسی گائنا کالوجسٹ کے پاس لے جاؤ بیگم صاحبہ کو۔''

خزیم نے ایسا ہی کیا آج اسے زینی کی رپورٹ پک کرنی تھی رپورٹ پازیٹو تھی۔ وہ خوشی اور بیکراں مسرت کے احساس سے جھوم اٹھا۔ راستہ کتنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ایسی خبر اپنی جانم کو موبائل پر نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ خود اسے اپنے سنگ لگا کر پیار سے اس کے کان میں یہ سرگوشی کرنا چاہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پیار بھری رفاقت کا انعام دیا تھا اور وہ اتنی بڑی خوشی سے فیض یاب ہونے والے تھے۔

زینی بستر پر تھی اور رنگت زرد ہوگئی تھی پلکیں موندے ہوئے تھی۔ خزیم دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ وہ سوئی ہوئی نہ تھی مگر گردوپیش سے بالکل بے خبر اس حقیقت سے بھی انجان کہ ان کی زندگی کیسے خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولنے والی ہے۔ خزیم کھنکھارا مگر اس نے پلکیں نہیں کھولیں۔

''جانم اٹھو، دیکھو میرے لیے یہ دن، یہ گھڑی کتنی اہم ہے کہ میں تمہیں یہ خوشخبری سنانے والا ہوں۔''

''آج کے دن کوئی بھی خبر میرے لیے خوش کُن نہیں ہو سکتی۔ آج کے دن میں نے اپنی زیست کے سب سے اہم رشتے کو کھو دیا تھا۔ میری گرینی مجھ سے...... اپنی زینی سے بہت دور چلی گئی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہی میری زندگی کا آغاز تھیں اور وہی اختتام۔'' اس کے الفاظ اشکوں میں بھیگ رہے تھے اور آواز جیسے کسی دور غار سے آرہی تھی۔ وہ جذبات کی شدت سے تھک گئی تو خاموش ہوگئی۔

اس نے پوچھا ہی نہیں کہ وہ کون سی خبر تھی جو خزیم کی زندگی میں گل و گلزار کھلا رہی تھی۔ ایسے کڑے وقت میں امی ہی بہترین دوست ثابت ہوئیں۔ امی کو اتنی بڑی خوشخبری سے آگاہ کرتے ہوئے وہ پریشان سا بولا۔

''مگر امی وہ اپنی گرینی کی یاد میں اس خوشی کو بھی میرے ساتھ شیئر نہیں کر سکی ایسا کیسے چلے گا امی جی......'' وہ روہانسا ہو گیا۔

''نہیں اب نہیں خزیم، میرے پیارے بیٹے اللہ تعالیٰ بچہ دے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا''...... امی نے تو دریا کو کوزے میں بند کیا اور فون بھی بند کر دیا۔ خزیم نے رپورٹ کو سائیڈ ٹیبل پر دھر دیا اپنے آپ کو نارمل رکھا اور اگلی صبح معمول ہی کی طرح آفس چل دیا۔ دوپہر کو موبائل کی بیل بجی خزیم نے موبائل آن کیا۔

''خزیم میں بہت شرمندہ ہوں...... کل آپ مجھے یہ خوشخبری دینا چاہ رہے تھے اور میں......'' خزیم خاموش رہا۔

''اصل میں خزیم میں نے اپنی تنہا بنجر زندگی میں صرف گرینی کا ہی پیار پایا ہے وہی میرے ساتھ ہنسی ہیں اور وہی میرے سنگ روئی ہیں۔ میں ان کی ذات کو زندگی کا محور بنا چکی تھی بس اب نہیں خزیم...... مجھے معاف کر دیں۔ میں اپنی زندگی کو آپ کی سنگت میں اور......'' وہ شرما گئی۔ ''اور آنے

والے مہمان کے ساتھ مکمل کرلوں گی...... مجھے معاف کردیں خزیم...... مجھے معاف کردیں۔"

"ٹھیک ہے زینی، اللہ تعالیٰ ہمیں بچہ دے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" خزیم نے بھی امی کے ہی انداز میں پہلے دریا کو کوزے میں اور پھر فون کو بند کردیا۔

اس ننھی پری کے دنیا میں آنکھ کھولنے تک کا سارا عرصہ بڑے ہی متضاد طریق سے گزرا۔ زینی نے اپنے آپ کو بدلنے کی کافی کوشش کی تھی کئی مواقع پر وہ خود کو گرینی کے انداز میں ڈھالنے سے احتراز کرتی۔ کئی دفعہ اس کے لبوں پر گرینی کا نام آتا مگر وہ خود کو روک لیتی، وہ ایک ننھی سی جان کو اس دنیا میں لانے والی تھی مگر وہ اس...تکلیف اور مسائل کو بھول کر خود کو گرینی کی یادوں اور اس کی بازگشت سے بچنے کی کوشش کررہی تھی۔

خزیم کا دل ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہوجاتا۔ وہ خود کو پیار کرنے والا شوہر سمجھتا تھا اور اپنے تئیں اسے ہر آسائش اور مسرت دینا چاہتا تھا مگر صبح سے شام تک وہ تنہا ہوتی اور اس کے سامنے اپنی واحد پیار کرنے والی ہستی کا ذکر کرتی تو وہ گھبرا جاتا۔

آخر وہ دن آگیا کہ جب ننھی گڑیا نے اپنی پیاری سی نیلگوں آنکھیں کھول دیں مگر خوشی کے اس خوب صورت لمحات میں وہ دونوں تنہا نہ تھے بلکہ امی جی ان کے ساتھ تھیں اگرچہ ابو کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا اور گردوں کی رپورٹ بھی ٹھیک نہ آئی تھی مگر پھر بھی امی انہیں چھوڑ کر صرف ایک ہفتے کے لیے ان کے ساتھ تھیں۔ وہ شادی کے بعد پاکستان جا بھی نہیں پائے تھے جب چھٹیاں ملیں تو زینی اس پوزیشن میں نہ تھی کہ ہوائی سفر کرسکے مگر اب ان کے پیار کی وہ ننھی سی نشانی اپنی دادی کی گود میں تھی۔ بچی اتنی پیاری اور نرم سی تھی ریشمی بال اور روئی کے گالوں جیسے رخسار......

"ریشم نام رکھوں گا اس کا۔" خزیم سرشار سا بولا۔

"نہیں خزیم......" زینی نے بدقت تمام آنکھیں کھولیں۔ "گرینی کہتی تھیں کہ تمہیں اللہ نے بیٹا دیا تو عبداللہ نام رکھوں گی اور......اور بچی ہوئی تو عنایہ نام رکھنا، یہ میری عنایہ ہے خزیم، ہماری عنایہ۔" بات ختم کرکے اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ خزیم نے شاکی نظروں سے ماں کو دیکھا جو خود بھی کسی تشویش کے زیر اثر نظر آئیں۔

صرف ایک ہفتہ گزار کر زینی کو بہت پیار اور بہت توجہ دے کر اور اپنی پوتی کو ڈھیروں دعائیں دے کر امی واپس چل دیں۔

وقت پھر اسی طرح گزرنے لگا، عنایہ شریف سی بچی تھی زیادہ وقت سوئی رہتی نیلگوں آنکھوں والی گڑیا سی عنایہ واقعی قدرت کی عنایت کردہ نعمت ہی تھی۔

امی کے قیام کے دوران زینی بہت خوش اور مطمئن لگ رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ماں بننے کا شرف عطا کیا تھا اور ایک پیار دینے والی ماں بھی دی تھی۔ امی کے جانے کے بعد وہ بجھ سی گئی تھی۔ امی کے مختصر ساتھ نے اسے پرسکون سا بنادیا تھا۔ بچی کی پیدائش پر وہ کچھ لاغر سی ہوگئی تھی۔ خزیم کی جاب کا وقت کافی زیادہ تھا مگر جتنی دیر وہ گھر میں ہوتا اسے مکمل توجہ دیتا۔ تھوڑا وقت اور سرک گیا زینی نارمل ہورہی تھی۔ بچی کی دیکھ بھال اور گھر داری نارمل انداز میں نبھا رہی تھی اور گفتگو کا انداز بھی واپس آرہا تھا۔ گرینی کی یاد اور ان کے اقوال زریں دن میں کئی دفعہ اسے اپنی طرف متوجہ کرلیتے۔

عنایہ کو ہاتھ کی دو انگلیاں منہ میں ڈال کر چوسنے کی عادت پڑگئی تھی۔ خزیم اس سے گھبرا جاتا۔

"پلیز زینی، اس کی یہ عادت ختم کراؤ۔"

"ارے نہیں خزیم، میں جب کام کرتی ہوں تو خود ہی عنایہ کے منہ......میں انگلیاں دے دیتی ہوں تاکہ وہ مصروف رہے اور اکیلا پن محسوس نہ کرے۔"

"یہ رائے بھی گرینی نے ہی دی ہوگی

تمہیں؟'' وہ چڑ سا گیا۔

''ہاں تو اور کیا..... گرینی بتاتی تھیں کہ جب تم چھوٹی تھیں تو میں تمہیں......''

''پلیز زینی اسٹاپ اٹ ناؤ۔'' وہ اپنی آواز بلند نہیں کرنا چاہتا تھا مگر آخر کار چیخ اٹھا۔

''امی..... امی جی پلیز......''

''گرینی والا مسئلہ ہے؟'' فون پر اس کی آواز ہی امی کو سمجھا گئی تھی کہ معاملہ وہی ہے جس نے خزیم کی پُرسکون زندگی میں ایک بار پھر ہلچل مچائی ہے۔

''ہاں امی۔''

''مگر بیٹا جب تک میں وہاں رہی تو معاملہ اتنا نازک تو نہیں ہوا۔''

''مگر امی جی اب تو ہر وقت ہر زاویے سے وہ اپنی گرینی کو......''

''خزیم میری بات سنو۔'' امی جی کا لہجہ بوجھل اور آواز گمبھیر سی ہو گئی تھی۔ ''جب تم نے پہلی بار مجھ سے شکایت کی تو میں نے زینی کے چچا سے رابطہ کیا اور بیٹا یہ بات دل مضبوط کر کے سننا کہ زینی کی گرینی کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ اس کی دادی اس کی پیدائش سے پہلے ہی دنیا سے چل بسی تھیں۔ زینی کے ماما، پاپا کے بعد اس کی چچی نے اسے ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔ ننھیال میں کوئی آگے نہیں بڑھا یوں کبھی بورڈنگ میں تو کبھی چچا کے گھر میں محرومی کی زندگی گزارتی رہی۔ میرے بچے اس نے گھر کا ماحول یا کسی بزرگ کا پیار دیکھا ہی نہیں۔ تمہیں معلوم تو ہے کہ اس کے والدین کا اس کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ گھرانے سے رابطہ رہا ہی نہیں'' ہم نے اسے ایک تقریب میں دیکھا اور اس کی ذات کی دلکشی نے مجھے متاثر کر دیا۔ میں جان ہی نہیں پائی کہ وہ محبت کے لیے ترسی ہوئی ایک بچی ہے اور اپنی ذات کی تسکین کے لیے ایک خود ساختہ شفیق سی شخصیت کے سحر میں......''

امی جی کہہ رہی تھیں مگر وہ سن کب رہا تھا۔ وہ تو اس بات پر اٹک گیا تھا کہ گرینی کا تو کوئی وجود تھا ہی نہیں یعنی اس کی دادی کا پرتو بھی زینی کی زندگی میں ندارد تھا۔

میں خزیم علی اس وقت پاکستان جانے والی فلائٹ میں محوِ پرواز ہوں۔ آج یکم جنوری ہے، سال نو کا پہلا دن اور سب سے بڑھ کر زینی کی سالگرہ کا دن جو میرے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی گود میں ہماری گڑیا عنایہ نیند کے مزے لے رہی ہے۔ میں دیارِ غیر کو مکمل طور پر خیرباد کہہ آیا ہوں۔ میرا پانچ سالہ معاہدہ اختتام پذیر ہے۔ میری قابلیت اور محنت کی وجہ سے میری فرم میرا کنٹریکٹ بڑھانے کو تیار تھی مگر مجھے اب یہ سب نہیں چاہیے۔ میرا رب میرے دیس میں بھی روزی عطا کرے گا۔ جس روز امی جی نے مجھے اس حقیقت سے آگاہ کیا تو میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اپنی بیوی کو مکمل اور خوب صورت گھر کا ماحول دوں گا جہاں امی، ابو کا پیار فارعہ اور احمد کے ساتھ نوک جھوک۔ کبھی ننھی سی تلخیاں کبھی معصوم سی خوشیاں۔ یہ سب اس کی زندگی کی محرومی ختم کر دیں گی خود ہی تخلیق کیا ہوا گرینی کا بت مسمار ہو گا اور وہ حقیقی زندگی میں قدم رکھے گی۔ امی کے ساتھ گزرے چند دنوں نے اسے اعتماد اور مان بخشا تھا اور یہی بات مجھے اپنے اس پلان کی کامیابی کی ضامن لگ رہی تھی۔

اور سب سے بڑی بات کہ میں محض ایک شوہر نہیں، ایک بچی کا باپ بھی ہوں اور دل سے چاہتا ہوں کہ میری بچی سب رشتوں کے درمیان پروان چڑھے کہ یہ تلخ و شیریں تجربات ہی ایک لڑکی کو نارمل اور مکمل بناتے ہیں۔ اس سال کی پہلی صبح اور اس کی روشنی میری زینی کی زندگی میں محرومی کے سارے اندھیرے مٹا دے گی ہم سب کو زندگی کی اس نئی ڈگر پر رواں یہ نیا سال مبارک ہی ہو گا۔



ناولٹ

تم میرے کون ہو؟

رضوانہ پرنس

بادل بہت زور سے گرجے تھے۔ فائزہ نے ہول کر فرحان کی طرف دیکھا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیے۔

''اتنی عمر ہوگئی ہے لیکن گرج چمک سے اب بھی بچوں کی طرح ڈرتی ہیں آپ۔'' فائزہ ان کی بات پر کچھ کھسیا کر ہنس دیں۔

''خیر...... اب میں اتنا بھی نہیں ڈرتی ہوں اس وقت پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہیں بجلی گری ہو۔'' فائزہ کی وضاحت پر فرحان صاحب کچھ

کہنے ہی والے تھے کہ کسی نومولود بچے کی آواز پر دونوں نے بے اختیار چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''ارے یہ تو کسی بچے کے رونے کی آواز ہے۔''

فرحان صاحب تیزی سے مین ڈور کی جانب بڑھے کیونکہ اب دروازہ بھڑ بھڑانے کی آواز بھی بچے کے رونے کی آواز میں شامل ہوگئی تھی۔ وہ بھی فرحان صاحب کے پیچھے پیچھے دروازے تک چلی آئیں۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو گیٹ پر بیٹھنے والا چوکیدار ہاتھوں میں نومولود بچے کو لیے کھڑا تھا۔ بچہ ایک خوب صورت گدے میں لپٹا ہوا تھا اور رو، رو کر ہلکان ہوا جارہا تھا۔ چوکیدار کے قدموں میں بچے کا بیگ بھی پڑا ہوا تھا۔

''صاحب بارش کی وجہ سے میں گیٹ سے ہٹ کر ساتھ بنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ کسی نے گیٹ کھٹکھٹایا۔ میں نے چھوٹی کھڑکی سے باہر جھانکا تو کوئی شخص چادر لپیٹے کھڑا تھا۔ میرے پوچھنے پر بھی جب اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں اپنی بندوق لے کر جلدی سے گیٹ سے باہر آیا تو اتنی سی دیر میں وہ شخص نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔ بس یہ بچہ اور اس کا یہ بیگ......''

''کمال ہے ایک شخص یہ بچہ ہمارے گیٹ پر ڈال گیا اور تم اسے پکڑ ہی نہیں سکے۔'' فرحان صاحب نے غصے سے اس کی بات کاٹی۔

''ارے ہم اس بچے کا کیا کریں، کیوں اٹھا لائے ہو اسے یہاں؟'' فائزہ نے بھی غصے میں ولی داد کو گھورا۔

''پھر میں کیا کرتا بیگم صاحبہ...... اتنا سا بچہ ہے، بارش میں بھیگنے کے لیے کیسے چھوڑ دیتا۔'' ولی داد نے روتے ہوئے بچے کو بڑی بے بسی سے دیکھا۔ کچھ لمحوں کے لیے تینوں کے درمیان خاموشی کی ایک چادر سی تنی رہی بس بچے کے رونے کی آواز فضا میں ارتعاش بکھیر رہی تھی۔

''فائزہ، میرے خیال میں فی الحال ہم بچے کو اندر لے جاتے ہیں۔ رو، رو کر ہلکان ہو رہا ہے پتا نہیں کب سے بھوکا ہے، میں بیگ کی تلاشی لیتا ہوں شاید کوئی اتا پتا مل جائے۔'' فرحان صاحب نے کچھ ہمدردی سے اس بچے کو چوکیدار سے لیتے ہوئے فائزہ سے کہا تو وہ اپ سیٹ سی ہو کر واپس پلٹ گئیں۔

''تم فکر نہیں کرو، ہم صبح کسی تھانے میں اس بچے کی...رپورٹ درج کروادیں گے پھر اس کے وارثوں کو ڈھونڈنا ان کا کام ہوگا۔'' انہوں نے بچے کو صوفے پر لٹاتے ہوئے فائزہ کو تسلی دی۔ بچے کا چہرہ رو، رو کر سرخ ہو رہا تھا اور ہونٹ بھی نیلے پڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ فائزہ کو بے اختیار بچے پر ترس سا آگیا۔ انہوں نے جلدی سے بچے کا بیگ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ بچے کی ضرورت کی ہر چیز اس میں بہت قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ دودھ کی بوتل میں گرم دودھ بھی تیار کر کے بھر دیا گیا تھا۔

''فرحان' پوری پلاننگ کے ساتھ بچے کو ہمارے گھر پر چھوڑا گیا ہے۔ دیکھیں تو دودھ کی بوتل ابھی تک گرم ہے۔'' بچے کو دودھ پلاتے ہوئے انہوں نے فرحان صاحب کو مخاطب کیا جو بچے کے بیگ کی تلاشی لینے میں مگن تھے۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو اور مجھے بیگ میں سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملی جو اس بچے کی نشاندہی کر سکے۔'' انہوں نے مایوس ہو کر بیگ بند کرتے ہوئے بیگم کی جانب دیکھا۔ تب ہی اچانک فائزہ کی نظر گدے کے بالکل سائڈ پر پن اپ کیے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی جو ذرا سا کمبل ہٹ جانے سے نظر آنے لگا تھا۔ فائزہ نے بے تابی سے وہ کاغذ نکالا۔ فرحان صاحب بھی بے اختیار تیزی سے نزدیک آئے اور فائزہ کے ہاتھ سے وہ کاغذ لے لیا۔ وہ خط پڑھتے جارہے تھے اور فائزہ ان کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو نوٹ کرتے ہوئے عجیب وسوسوں میں اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کر رہی تھیں۔

''کیا ہوا فرحان...... مجھے بھی بتائیں۔'' انہوں

نے بے چینی سے شوہر کی جانب دیکھا تو وہ شکستگی سے انہیں خط تھماتے ہوئے سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ فائزہ نے ایک سانس میں سارا خط پڑھ ڈالا۔ ان کا چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا۔ بچہ دودھ پیتے ہوئے گہری نیند میں چلا گیا تھا۔

"نہیں...... نہیں فرحان، مجھے یہ کسی کی سازش لگ رہی ہے۔" انہوں نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں فرحان صاحب سے کچھ ایسے کہا جیسے وہ متمنی ہوں کہ وہ بھی فائزہ کی بات سے اتفاق کریں لیکن پھر ان کے چہرے پر بکھرے تناؤ کو دیکھ کر جیسے وہ مایوس سی ہو گئیں۔

"نہیں، مجھے تو اس خط کے ایک، ایک لفظ سے سچائی کی خوشبو آتی محسوس ہو رہی ہے۔" وہ خاصے ٹوٹے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ فائزہ دوبارہ وہ خط اٹھا کر پڑھنے لگیں۔

"فرحان صاحب یہ بچہ آپ کا پوتا ہے، آپ کے بیٹے راحیل نے میری بچی روبی سے خفیہ شادی کی پھر کچھ دنوں بعد پلٹ کر اسے پوچھا تک نہیں۔ روبی پرسوں رات اس بچے کو جنم دے کر ہمیشہ کے لیے سو گئی۔ بس اب میرا بھی اس بچے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کی امانت آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اگر کوئی شک ہو تو اس کا ڈی این اے ٹیسٹ کروا سکتے ہیں۔" فائزہ نے ایک نظر پیار سامنے سوئے اس معصوم سے وجود پر ڈالی اور پھر دل گرفتگی سے فرحان صاحب کو دیکھا۔

"فرحان یہ ہماری خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی۔ شکر ہے کہ راحیل اور نیہا صبح ہی ہنی مون کے لیے جا چکے ہیں۔ اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہے ورنہ تو اور ہی غضب ہو جاتا۔" فرحان صاحب نے ان کی بات پر اثبات میں سر ہلایا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو فائزہ...... کتنی دھوم دھام سے شادی ہوئی ہے ہمارے بیٹے کی۔ وہ خوشیاں، وہ رونقیں ابھی تک گھر کے درو دیوار پر بکھری نظر آ رہی ہیں لیکن پھر یہ اچانک......" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر بے بسی سے بچے کی جانب دیکھا۔ ابھی کچھ روز قبل ہی تو نیہا ان کی اکلوتی بہو بن کر اس گھر میں داخل ہوئی تھی۔ نیہا ان کے دیرینہ دوست ہاشم صاحب کی بیٹی تھی۔ وہ لوگ لاہور میں رہتے تھے لیکن فاصلوں نے ہاشم اور فرحان کی دوستی پر کوئی خاص فرق نہیں ڈالا تھا۔ بزنس کے سلسلے میں ان دونوں کا ہی کراچی اور لاہور کا چکر لگتا رہتا البتہ بیوی بچوں کی آپس میں ملاقاتوں کا سلسلہ کافی عرصے سے مفقود تھا۔ ہاشم صاحب کے بڑے بیٹے کی شادی پر جب فرحان اپنی بیگم اور بیٹے کے ساتھ لاہور آئے تو شادی کی ساری تقریبات کو انجوائے کرتے ہوئے راحیل کی نگاہ بھٹک کر بار، بار نیہا پر بھی پڑتی رہی جو دولہا کی بہن ہونے کے ناتے ہر تقریب میں پیش، پیش تھی۔ کچھ پل، کچھ لمحے زندگی میں آ کر جیسے ٹھہر سے جاتے ہیں۔ راحیل بھی ان پُرسحر لمحات سے نکل ہی نہیں پایا۔ چمکتی آنکھوں اور گلابی رخسار والی نیہا اسے کچھ ایسی بھائی کہ اس نے چپکے سے اپنی ماں کو راز دار بنا کر اپنی پسند سے آگاہ کر دیا کہ وہ ڈرتا تھا کہ شادی کی اس تقریب میں شامل کوئی جن اس کی پری کو لے کر اڑ نہ جائے۔ فائزہ کو بھی یہ پیاری سی لڑکی اپنی سویٹ نیچر کے ساتھ بہت پسند آئی تھی۔ انہوں نے فوراً ہی فرحان صاحب سے ذکر کیا انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اور یوں کراچی واپس جانے سے قبل ہی نیہا اور راحیل کا رشتہ پکا ہو چکا تھا۔ دونوں گھرانوں کی باہمی رضامندی اور خوشی کے ساتھ راحیل جلدی ہی اپنی محبت کو دلہن کے روپ میں ڈھال کر ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لے آیا۔ فائزہ کتنی خوش تھیں، ان کے خوب صورت سے گھر میں ہر سو ایک بہار سی بکھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ دعوتوں کے سلسلے، مہمانوں کا آنا جانا۔ ہنسی، قہقہے اور خوشیاں گھر کے کونے، کونے سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ آج صبح جب راحیل اور نیہا ہنی مون کے لیے سنگاپور گئے تو انہیں بھی اپنے بکھرے ہوئے گھر کو سمیٹنے کا کچھ وقت ملا تھا۔ سارا دن نوکروں کے ساتھ مل کر وہ نیہا کے جہیز کے سامان کو ڈھنگ سے رکھوانے اور گھر کی صفائی

ستھرائی کرانے میں مصروف رہی تھیں کہ ان کچھ دنوں میں آنے جانے اور مہمان داریوں میں مصروف رہ کر انہیں وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ کتنی خوش اور مطمئن لگ رہی تھیں وہ کچھ دیر قبل لیکن انسان کی قسمت ایک پہیے کے مانند گھوما کرتی ہے، کبھی اسے اوپر لے جاتی ہے اور کبھی نیچے پہنچا دیتی ہے۔ ایسا ہی کچھ ان کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ پریشانی اور فکر مندی نے ان کے چہرے پر ہلدی سی بکھیر دی تھی۔

''اگر یہ بچہ سچ مچ راحیل کا ہے تو بھلا نیہا یہ بات برداشت کر پائے گی۔ وہ تو ایک لمحہ بھی نہیں لگائے گی، راحیل کو چھوڑنے میں۔'' انہوں نے دہل کر سوچا۔ انہیں اپنے بیٹے پر کتنا اعتماد تھا، کتنا فخر کرتی تھیں وہ اس پر...... اور وہی نہیں بلکہ پورا خاندان اور سب ہی جاننے والے اس کے کردار اور عادت و اطوار کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ پھر بھلا کیسے وہ اپنے ماں، باپ کے اعتماد کو دھوکا دے کر یوں چھپ کر شادی کر سکتا ہے۔ وہ اور فرحان ایسے تو نہیں تھے کہ اس کی پسند کو ریجیکٹ کر دیتے۔ اس نے جب نیہا کے لیے اپنی پسند کا اظہار کیا تھا تو وہ اس کی پسند کو اپنے دل کا ٹکڑا بنا کر گھر لے آئی تھیں۔ پھر بھلا کیسے ممکن ہے کہ ان کا بیٹا انہیں دنیا کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہ رکھے۔ کچھ دنوں کی دلہن ہمیشہ کے لیے یہ گھر چھوڑ کر چلی جائے۔ ان کی آنکھیں بے اختیار بھر آئیں۔ سامنے فرحان صاحب بھی شاید ان ہی سوچوں میں گھرے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''اب کیا ہوگا فرحان...... میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔'' وہ بے بسی سے رو دیں۔ فرحان صاحب نے ٹھنڈی سانس بھر کر انہیں دیکھا۔

''دیکھو فائزہ اس وقت ہمیں بہت دانشمندی سے کام لینا ہے، اگر جذبات میں آ کر ہم نے کوئی قدم اٹھایا تو سوائے جگ ہنسائی کے کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہماری عزت اور ساکھ لمحوں میں مٹی میں مل جائے گی۔'' ایک لمحہ رک کر انہوں نے فائزہ کے ستے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جیسے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''فائزہ فی الحال آپ راحیل سے ہرگز اس بچے کے بارے میں کوئی باز پرس نہیں کریں گی کیونکہ اس کا بہت برا اثر ان کی شادی پر پڑ سکتا ہے۔ اس کی شرمندگی، اس کی پریشانی نیہا یقیناً محسوس کرے گی اور راحیل اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش میں کہیں کوئی الٹا سیدھا قدم نہ اٹھالے۔'' فرحان صاحب کی بات پر فائزہ نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

''اللہ نہ کرے فرحان...... لیکن پھر ہم اس بچے کا کیا کریں۔ اگر یہ ہمارا ہی خون ہے تو کیسے اسے کسی یتیم خانے یا پولیس والوں کے حوالے کر دیں۔'' فرحان صاحب نے دھیمے سے ان کے ہاتھوں کو تھپتھپاتے ہوئے انہیں تسلی آمیز لہجے میں سمجھایا۔

''فی الحال جب تک ساری بات کنفرم نہیں ہو جاتی۔ یہ بچہ ہمارے ہی پاس رہے گا۔ فرحان اور نیہا کو ہم یہ بتائیں گے کہ ہماری پرانی ماسی کی بیٹی کو اپنے سسرال والوں سے خطرہ تھا کہ وہ اس کا بچہ چھین لیں گے اس لیے وہ کچھ دنوں کے لیے اپنا بچہ یہاں چھوڑ کر پنجاب چلی گئی ہے، ویسے بھی اتفاق سے نیہا کے سامنے اس دن ماسی کے جوان داماد کے مرڈر کا قصہ ہو رہا تھا، یاد ہے ناں تمہیں؟''

''لیکن فرحان اگر یہ بچہ راحیل کا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے کافی عرصے پہلے ہی اس لڑکی کو چھوڑ دیا ہوگا ورنہ اسے کچھ تو پتا ہوتا۔'' وہ ہنوز تھی سلجھانے میں مصروف تھیں۔ تب ہی بچہ کسمسا کر تھوڑا سا رویا تو فائزہ نے جلدی سے بوتل دوبارہ اس کے منہ میں لگاتے ہوئے اسے غور سے دیکھا تو دل میں ایک ماتا کی لہر سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے راحیل کا بچپن مجسم ہو کر دوبارہ ان کی آغوش میں آ گیا ہو...... ہو بہو بالکل ایسا ہی تو تھا ان کا راحیل...... اور رونے اور کسمسانے کا بھی وہی انداز تھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھے گئیں۔ آنکھوں میں چمکتی محبت اتنی

واضح تھی کہ فرحان صاحب نے بے اختیار چونک کر ان کے بدلتے ہوئے احساسات کو محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

''لیکن امی اس ماسی کو تو آپ کی نوکری چھوڑے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ آپ ناحق اس کی بیٹی کے چکر میں پڑ رہی ہیں، کل کلاں کو اس کے سسرال والے بچہ لینے یہاں آگئے تو ہم لوگ کسی مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔'' راحیل جب سے آیا تھا، ان لوگوں کے درمیان بس یہی ٹاپک چل رہا تھا۔

''راحیل ٹھیک کہہ رہے ہیں آنٹی..... یہ کافی risky معاملہ ہے۔'' نیہا بھی سو فیصد راحیل سے متفق تھی۔

''نہیں بیٹا ایسا کچھ نہیں ہے، اول تو اس کے سسرال والوں کو ہمارے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ دوسرے میں نے پتا کروایا ہے کہ وہ لوگ بہت ہی غریب لوگ ہیں، وہ لڑکی ناحق ڈری ہوئی ہے ان لوگوں کو اس کے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' فرحان صاحب کی وضاحت پر راحیل کو مزید الجھن ہوئی۔

''مجھے تو پھر یہ معاملہ مزید مشکوک لگ رہا ہے۔ کوئی ماں بھلا کیسے اپنا چھوٹا سا بچہ یوں غیروں کے حوالے کر کے جا سکتی ہے۔''

''اوفوہ راحیل..... تم تو بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو، کسی کے کام آنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ بھئی کچھ بھی سلسلہ ہو اس کا اگر چند دن ہم اس کے بچے کو رکھ لیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔'' اس بار فائزہ نے بہت الجھ کر اسے ٹوکا تو وہ خاموش ہو گیا لیکن دل ہی دل میں اب بھی وہ اپنے ماں، باپ کی باتوں سے متفق نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اور نیہا جب ہنی مون سے واپس آئے تو فائزہ کی گود میں ایک ننھا منا پیارا سا بچہ دیکھ کر حیران ہی رہ گئے اور جب انہیں بچے کی تفصیلات پتا چلیں تو الجھن میں بدل گئی تھی۔ حیرانی تھی تو یہ کہ فرحان صاحب جیسے سمجھدار اور دور اندیش آدمی بھی اس معاملے میں پوری طرح سے اپنی بیگم کے ساتھ تھے۔

☆☆☆

''راحیل مجھے تو معاملہ گڑبڑ لگ رہا ہے، پتا نہیں کیا راز ہے اس بچے کے یہاں رہنے میں۔ بھلا اتنی محبت سے کوئی ماسی کے بچے کو یوں اپنے سینے سے لگا کر رکھتا ہے۔'' اس دن نیہا نے بہت رازدارانہ انداز میں راحیل سے کہتے ہوئے سامنے لاؤنج میں بیٹھی فائزہ کو بچے سے لاڈ پیار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

''چھوڑو نیہا یہ امی اور پاپا کا مسئلہ ہے، ہوسکتا ہے کہ اس میں ان کے کسی قریبی عزیز کا نام آتا ہو جو... فی الحال وہ ہم لوگوں کو بتانا نہیں چاہ رہے ہوں۔'' راحیل نے ٹالنے والے انداز میں کہا تو نیہا جیسے برا مان گئی۔

''ارے واہ تو کیا ہم لوگ کوئی غیر ہیں، اپنے اکلوتے بیٹے اور بہو سے بھلا کوئی اتنی بڑی بات چھپاتا ہے۔'' نیہا کی خفگی بجا تھی، اسی لیے راحیل نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ ویسے اسے فائزہ کا کھنچا کھنچا سا رویہ بھی کافی حیران کر رہا تھا۔ ہنی مون سے واپسی پر فائزہ نے کافی کولڈ انداز میں اس کا استقبال کیا تھا۔ نیہا سے ان کی محبت کا وہی انداز تھا لیکن راحیل کو اپنے لیے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ جبراً اس سے مسکرا کر بات کر رہی ہوں۔ پاپا بھی کافی سرد مہری سے اس سے ملے تھے۔ یہ اس کی کچھ دنوں کی غیر حاضری میں آخر ایسا کیا ہو گیا تھا جو ایک معما بن کر اسے الجھنے پر مجبور کر رہا تھا۔

فائزہ اس بچے کو شرجیل کے نام سے پکار رہی تھیں۔ یہ نام انہوں نے راحیل کے نام کی مناسبت سے رکھا تھا۔ جسے نیہا نے زیادہ محسوس کیا تھا۔ شک کا ناگ جیسے اس کے دل میں آہستہ، آہستہ اپنا زہر پھیلا رہا تھا۔ فائزہ کا اس بچے کے لیے اتنا والہانہ پیار اسے کسی بہت بڑی انہونی کا احساس دلانے لگا تھا۔ اس دن وہ کسی کام سے فائزہ کے کمرے میں گئی تو اسے دروازے میں ہی ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ فائزہ اسے بہت پیار سے لوری سناتے ہوئے سلا رہی تھیں۔ چہرے پر بکھری ممتا کی روشنی کو نیہا نے غور سے دیکھا اور کچھ الجھی، الجھی سی اندر آگئی۔ فائزہ نے بے اختیار

اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ شرجیل تقریباً سونے ہی والا تھا۔ وہ خاموشی سے سامنے پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی اور وقت گزارنے کے لیے ٹیبل پر رکھا ہوا البم اٹھا کر دیکھنے لگی۔ یہ کافی پرانا البم تھا جس میں فائزہ اور فرحان کی جوانی کی تصویروں کے علاوہ راحیل کے بچپن کی تصاویر بھی تھیں۔ وہ دل جمعی سے اس البم کو دیکھنے لگی۔ تبھی اچانک ہی اس کی نظر ایک تصویر پر جم کر رہ گئی تھی جس میں فائزہ چند ماہ کے راحیل کو گود میں لیے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے بے اختیار غور سے شرجیل کی جانب دیکھا۔ ہو بہو راحیل کا بچپن تھا وہ...... کتنی مشابہت تھی دونوں کی شکلوں میں...... وہ ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ بیٹھی رہ گئی۔ تبھی فائزہ، شرجیل کو بیڈ پر احتیاط سے لٹا کر اس کے نزدیک چلی آئیں۔ وہ اس کے ہاتھ میں البم دیکھ چکی تھیں اور انہوں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسا بھی تھا کہ ناحق یہ پرانا البم الماری میں سے ڈھونڈ کر نکالا۔ اصل میں وہ راحیل کے بچپن کی تصویر کو شرجیل سے ملا کر پوری طرح سے اطمینان کر لینا چاہ رہی تھیں کہ یہ راحیل کا ہی بیٹا ہے لیکن نیہا کے بے وقت اس کمرے میں آجانے سے ان کا اطمینان نیہا کے اضطراب میں بدل گیا تھا۔

''آنٹی مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے راحیل ایک بار پھر شرجیل کے بچپن میں ڈھل کر دوبارہ آپ کی گود میں آگیا ہے۔'' اس نے غور سے راحیل کی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا تو فائزہ گڑبڑا کر رہ گئیں۔

''اچھا لیکن میں نے تو کچھ ایسا محسوس نہیں کیا۔ خیر تم بتاؤ کیسے آنا ہوا تمہارا میرے کمرے میں؟'' فائزہ نے بات ٹالتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''جی، اصل میں آج میں اور راحیل.... ڈنر پر باہر انوائٹڈ ہیں، میری دوست کی ویڈنگ اینورسری ہے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کافی سرد لہجے میں بتایا۔ فائزہ نے اس کے بدلتے ہوئے موڈ کو بہت اچھی طرح محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم اتنی بڑی بات کو کب تک راحیل سے چھپائیں گے۔ یہ بچہ سو فیصد راحیل کا ہی ہے۔ ہمیں ڈی این اے کرانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ فرحان اس کے اور راحیل کے بچپن میں ذرا سا بھی فرق نہیں ہے۔ اب ہمیں اس معاملے کو راحیل سے ڈسکس کرنا ہی پڑے گا۔'' وہ بہت پریشان لہجے میں بولتی ہی چلی گئیں۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو فائزہ بیگم مجھے بس ایک اندیشہ ہے کہ راحیل ہرگز بھی اس بات کی بھنک نیہا تک نہیں پہنچنے دے گا۔ اور اس بچے کو کسی ادارے کے سپرد کرنے میں ذرا دیر نہیں لگائے گا۔ تم خود ہی سوچو کہ صرف شک کی بنا پر نیہا اتنی پوزیسو ہو رہی ہے اگر اسے حقیقت پتا چل گئی تو وہ بھلا راحیل کو معاف کر سکے گی؟'' فرحان صاحب کی بات میں وزن تھا اور وہ خود بھی اپنے بیٹے کا گھر توڑنے کے حق میں نہیں تھیں لیکن اس مسئلے کا حل نکالنا بھی ضروری تھا۔ دونوں کافی دیر اسی موضوع پر بات کرتے رہے اور بالآخر یہ طے پایا کہ اگلے ماہ جب نیہا اپنے والدین سے ملنے لاہور جائے گی تب اس کی غیر موجودگی میں راحیل سے کھل کر بات کی جائے گی۔

☆☆☆

''بیٹا میرے خیال میں تم جلد ہی لاہور کا چکر لگا کر آجاؤ...... اگلے ماہ خاندان میں دو شادیاں ہیں پھر تمہارا جانا ذرا مشکل ہو جائے گا۔'' فائزہ کی بات پر نیہا نے کچھ حیران ہو کر ان کی جانب دیکھا۔ آج کل اس کی ساس اسے لاہور بھیجنے کے لیے نہ جانے کیوں اتنی مصر تھیں۔ وہ کچھ کھٹک سی گئی۔

''کوئی بات نہیں آنٹی میں شادیوں کے بعد چلی جاؤں گی۔'' اس نے گہری نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا جیسی تمہاری مرضی......'' وہ کچھ مایوسی سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آج شرجیل کو ان کے

گھر میں آئے ہوئے تقریباً تین ماہ ہونے والے تھے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ شرجیل مزید پیارا ہوتا جارہا تھا۔ گل گوتھنا سا شرجیل گھر میں سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اب تو راحیل بھی آفس سے واپسی پر کچھ دیر اس سے ضرور کھیلتا تھا۔ البتہ فائزہ نے یہ احتیاط ضرور برتی تھی کہ اپنے ملنے جلنے والوں اور رشتے داروں کے سامنے شرجیل کو لانے سے گریز کیا تھا۔ اس طرح وہ لوگوں کے سوالات سے فی الحال تو بچی ہوئی تھیں لیکن آگے کیا ہونے والا ہے یہ فکر ہمہ وقت انہیں ہولائے رکھتی تھی۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ نیہا کو لاہور بھیج کر وہ کھل کے راحیل سے اس معاملے پر بات کر کے کوئی حل نکال سکیں۔ لیکن نیہا کا جیسے کوئی ارادہ ہی نہیں لگ رہا تھا لاہور جانے کا۔ انہیں کبھی، کبھی راحیل پر بھی حیرت ہوتی کہ آخر وہ کیوں نہیں چونک رہا یا وہ اپنے بیتے ہوئے دنوں میں جھانکتا ہی نہیں ہے۔ انہیں راحیل پر دل بھر کے غصہ آنے کے ساتھ، ساتھ شدید الجھن بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ ذہنی ٹینشن نے انہیں کافی چڑچڑا بنا دیا تھا۔ فرحان صاحب کا ساتھ، ان کی سپورٹ نے فائزہ کو کچھ حوصلہ دیا ہوا تھا ورنہ شاید ان کے ضبط کا دامن اب تک چھوٹ چکا ہوتا۔ ادھر راحیل اب اپنی ماں کے سرد رویے کو کچھ زیادہ ہی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ جو ہر دم اس کے ناز نخرے اٹھایا کرتی تھیں، ہر لمحہ اس کے لیے فکر مند رہتی تھیں۔ اس کا ہر دکھ، ہر پریشانی بنا بتائے ہی جان جایا کرتی تھیں اب کیسے اس سے لاتعلق سی رہنے لگی تھیں وہ تو ہمیشہ ان کی ممتا کے حصار میں رہا تھا لیکن اس بچے نے آکر جیسے اس سے اس کی ماں ہی چھین لی تھی۔ اور اس دن تو اس کی برداشت کی حد ہی ختم ہوگئی۔ جب رات ڈنر پر اس نے خانساماں کے ہاتھ کا پکا ہوا کریلے قیمہ دو لقمے کھا کر چھوڑ دیا اور شکایتی نظروں سے فائزہ کی جانب دیکھا۔

''امی، یہ میری فیورٹ ڈش آپ ہمیشہ اپنے ہاتھ سے بناتی تھیں۔ آپ دیکھیں ناں نصیر نے کتنا بدمزہ بنایا ہے، مجھ سے بالکل بھی نہیں کھایا جارہا۔'' اس نے کچھ خفگی سے اپنے سامنے رکھی پلیٹ کو پرے کھسکایا۔

''شرجیل کی وجہ سے مجھے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ میں کچن کا رخ کرسکوں۔'' انہوں نے بہت خشک لہجے میں جواب دیا تو راحیل پھٹ ہی پڑا۔

''شرجیل، شرجیل..... اس کے علاوہ کیا آپ کے لیے باقی رشتوں کی اہمیت ختم ہوگئی ہے۔ اب میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ پتا نہیں کون اپنا گناہ ہمارے سر منڈھ کر چلا گیا ہے۔'' غصے سے اس کی آواز کافی اونچی ہوگئی تھی۔ نیہا نے گھبرا کر اس کو چپ کرانا چاہا کیونکہ وہ اپنی ساس کو اس وقت ضبط کی انتہا پر دیکھ رہی تھی۔ ان کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کا تناؤ بتا رہا تھا کہ ان کی بھی برداشت کی حد بس ختم ہی ہونے والی ہے۔ فرحان صاحب اس وقت اتفاق سے اپنے کسی دوست کے یہاں کھانے پر گئے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ شاید معاملے کو تھوڑا اسنبھال ہی لیتے۔

''پلیز راحیل خاموش ہوجائیں، یہ آپ آنٹی سے کس لہجے میں بات کررہے ہیں۔'' نیہا کے چپ کروانے پر وہ مزید بھڑک اٹھا۔

''اس بچے نے میری ماں مجھ سے چھین لی ہے، میری بیوی کی نگاہوں میں ایک شک کی سی کیفیت مجھے ہر وقت ایک کوفت میں مبتلا رکھتی ہے، دیمک کی طرح آہستہ، آہستہ میری خوشیوں کو کھا رہی ہے اس بچے کی موجودگی۔'' وہ تڑخ کر بولا تب فائزہ کی بھی برداشت جیسے جواب دے گئی۔

''بکواس بند کرو راحیل اور ابھی اور اسی وقت میرے کمرے میں آؤ تاکہ میں تمہیں تمہارے سوالوں کا جواب دے سکوں۔'' انہوں نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے زور سے اپنی پلیٹ کو پیچھے دھکیلا اور تیزی سے کھڑی ہوگئیں۔ تبھی ان کے سائڈ پر رکھا ہوا موبائل بج اٹھا۔ اسکرین پر فرحان صاحب کا نام جگمگا رہا تھا۔

''ہیلو فرحان آپ ابھی اور اسی وقت گھر واپس

آ جائیں۔'' غصے سے کھولتے ہوئے لہجے میں انہوں نے موبائل کانوں سے لگا کر چیخ کر کہا لیکن دوسری طرف سے نہ جانے کیا کہا گیا کہ ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آنکھیں جیسے پھٹ سی گئیں۔

''ارے یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔'' وہ لہرا کر تقریباً گرنے لگی تھیں تبھی راحیل نے دوڑ کر ان کو تھام لیا۔

''کیا ہوا امی...... سب خیریت تو ہے ناں؟''

اس نے بے حد گھبرا کر ان سے پوچھا تھا لیکن اسے جواب کون دیتا وہ تو بے ہوش ہو کر اس کی بانہوں میں جھول چکی تھیں۔ موبائل ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرا ہوا تھا۔

☆☆☆

''آنٹی پلیز تھوڑا سا کچھ کھا لیں، صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے آپ نے۔'' نیہا نے بہت پیار سے کھانے کی ٹرے ان کے سامنے رکھتے ہوئے اصرار کیا تو انہوں نے اپنی متورم آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں نیہا مجھے ذرا بھی بھوک نہیں لگ رہی۔ اچھا تم ایسا کرو کہ مجھے ایک کپ چائے پلا دو۔'' ان کے انکار پر نیہا نے محبت سے ایک نوالہ بنا کر زبردستی ان کے منہ میں دے دیا۔

''نہیں آنٹی خالی پیٹ میں چائے نقصان کرتی ہے، تھوڑا سا کھا لیجیے پھر میں چائے بھی بنا دوں گی۔'' نیہا کے ملتجی لہجے پر انہوں نے کچھ نوالے تو لے لیے لیکن آنسو ایک بار پھر ان کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ دل کسی صورت اس حقیقت کو نہیں مان رہا تھا کہ فرحان اتنا اچانک ہمیشہ کے لیے انہیں چھوڑ کر جا چکے ہیں، کتنے ہنستے مسکراتے ہوئے وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر اپنے دوست کے یہاں جانے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ فائزہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ آخری بار اپنے زندگی کے ساتھی کو دیکھ رہی ہیں، اب وہ کبھی لوٹ کر واپس نہیں آئیں گے۔ تیز رفتار ٹرک نے کس بے دردی سے ان کی کار کو روند ڈالا تھا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے تھے۔ پولیس نے فرحان صاحب کے موبائل سے ہی فائزہ کو فون کر کے اس المناک حادثے کی خبر دی تھی کہ فرحان صاحب نے فائزہ کا نمبر میری بیگم کے نام سے جو سیو کیا ہوا تھا موبائل اس حادثے میں بالکل محفوظ رہا لیکن اسے استعمال کرنے والا ختم ہو گیا تھا۔ یہ تھی ایک انسان کی زندگی کی حقیقت......

تبھی شرجیل کے رونے کی آواز پر وہ چونک گئیں۔ کل رات سے انہیں کسی بات کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ شدید صدمے نے جیسے ان کے ہوش و حواس معطل کر کے رکھ دیے تھے۔ شرجیل کو کون دیکھ رہا تھا کسی نے اسے کچھ کھلایا پلایا بھی تھا یا نہیں...... وہ تو ان کی گود کی گرمی بھی پہچانتا تھا۔ وہ بے قرار ہو کر اپنے بیڈ سے اتر کر دروازے کی جانب بڑھیں تو نیہا کی آواز پر ان کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

''آنٹی پلیز...... ابھی کچھ مہمان خواتین گھر میں موجود ہیں، بلاوجہ کا تجسس پھیل جائے گا اسی لیے میں نے اسے نذیراں کے حوالے کر دیا ہے اور تاکید کر دی ہے کہ شرجیل کو لے کر کمرے سے باہر نہ آئے۔'' فائزہ ٹھنڈی سانس لے کر واپس پلٹ آئیں لیکن دل پوری طرح سے شرجیل میں ہی اٹکا رہا تھا کہ کہیں وہ بھوکا تو نہیں ہے، رو تو نہیں رہا۔

☆☆☆

''راحیل اب میری برداشت جواب دے رہی ہے، خدا کی قسم آنٹی نے تو حد کر دی ہے، آج میرے کمرے میں شرجیل کی دو بڑی سی فوٹوز لا کر دیوار پر لگا دیں اور فرمانے لگیں کہ اگر تمہاری نظروں کے سامنے یہ تصویریں رہیں گی تو تمہارا بچہ بھی ایسا ہی پیارا ہوگا۔'' بات پوری کرتے ہوئے آخر میں اس کی آواز بھرا گئی۔

''ارے، ارے تو اس میں رونے کی کیا بات ہے، شرجیل ہی کی تصویر لگائی ہے ناں کسی بن مانس کی تو نہیں۔'' راحیل نے بے اختیار اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے اسے شرارت سے دیکھا تو وہ مزید تپ گئی۔

''ہاں، میرے لیے وہ کسی بن مانس سے زیادہ خوفناک ہے، تبھی میں نے اس کی فوٹوز اسی لیے اتار دی تھیں۔ اور تب سے آنٹی کا موڈ سخت آف ہے لیکن مجھے کوئی پروا نہیں..... آئی ہیٹ ہم.....'' اس کے لہجے میں جیسے شعلے سے دہک رہے تھے۔ وہ جو ایک نرم دل اور محبت کرنے والی لڑکی تھی اس وقت صرف نفرت، عداوت اور جیلسی کا ایک مجسمہ نظر آرہی تھی۔ راحیل نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اسے دیکھا۔ اسے نہ جانے کیوں نیہا پر ترس سا آنے لگا، اسے وہ اپنی جگہ ٹھیک ہی لگی۔ کوئی بھی عورت ہوتی تو اس چوئیشن پر کچھ ایسا ہی بی ہیو کرتی..... شرجیل ایک معما بن کر ان کی زندگی کو الجھائے جا رہا تھا۔ اس بچے کی ماں پھر دوبارہ پلٹ کر واپس ہی نہیں آئی تھی۔ فرحان صاحب کے انتقال کے بعد تو جیسے فائزہ کی روح شرجیل میں سمٹ آئی تھی۔ اتنی محبت تو شاید بچپن میں انہوں نے راحیل سے بھی نہیں کی تھی، یہ خیال راحیل کا تھا جس کا اظہار وہ بارہا اپنی ماں سے کر چکا تھا۔ فرحان صاحب کو اس دنیا سے گئے تقریباً آٹھ ماہ ہو رہے تھے۔ اسی دوران نیہا کے ماں بننے کی خبر نے گھر کے اداس ماحول میں کچھ خوشی کی آمیزش ضرور کر دی تھی لیکن شرجیل کی وجہ سے کچھ نہ کچھ بدمزگی ایک کڑواہٹ بن کر گھر کی فضا کو مکدر کر دیتی۔ نیہا کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے شرجیل اس کے آنے والے بچے کی ہر خوشی، اس کے ہر حق پر ایک سانپ بن کر بیٹھا رہے گا۔ وہ پریگننٹ تھی، فائزہ کو پہلی بار دادی بنانے جا رہی تھی لیکن فائزہ کو جیسے اتنی بڑی بات سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نیہا کی ناز برداری کرنے کے بجائے ان کی ساری توجہ بس شرجیل پر ہی مرکوز رہتی..... شرجیل کی ماں کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ اور اسی بات پر نیہا کی کئی بار فائزہ سے تلخ کلامی بھی ہو چکی تھی۔ راحیل نے بھی ماں سے بارہا اس بچے کے بارے میں جاننا چاہا تھا، اسے کسی ادارے میں بھیجنے پر بھی اصرار کیا تھا لیکن وہ اس کی بات پر کچھ ایسے... بے کسی سے رو دیتیں کہ وہ ان کے آنسوؤں کے سامنے بے بس سا



ہماری سالگرہ

ویسے ہم باقاعدہ سالگرہ نہیں مناتے لیکن گھر والے وش کر دیتے ہیں اور تحائف بھی دیتے ہیں۔ ہمیں اپنی بیسویں سالگرہ یاد آرہی ہے۔ اس دن 25 جولائی کو ہم الرٹ ہو گئے کہ ابھی کوئی نہ کوئی ہمیں وش کرے گا۔ صبح سے لے کر شام ہو گئی نہ کسی نے میسج کیا نہ ہی کوئی فون کال آئی نہ گھر والوں نے وش کیا۔ امی اور بڑی بھابی مارکیٹ گئی ہوئی تھیں اس دن وہ شام کو واپس آئیں، ہم گلے ملے اور رو دیے اور کہا کہ آج کسی نے ہمیں وش نہیں کیا ہم تو سب کی سالگرہ یاد رکھتے ہیں اور باقاعدہ سب کو وش کرتے ہیں مگر آج ہمیں سب نے بھلا دیا لیکن کسی نے ہمیں جواب نہیں دیا۔ ہمارے آنسوؤں میں مزید طغیانی آگئی آخر دس منٹ بعد بھابی باہر گئیں اور گاڑی سے فریش پائن ایپل کیک نکالا اور امی اور بھابی نے ہمیں مشترکہ وش کیا اور خوب صورت تحائف جو مری سے لائی تھیں اسٹالر اور بیگ و جیولری ہمیں دی تو ہمارے دانت اندر جانے کا نام ہی نہیں لیں۔ تو یہ تھی ہماری یادگار سالگرہ جو ہمیں مرتے دم تک یاد رہے گی۔

تحریر: شہلا نواز، لاہور

ہو جاتا۔ لیکن دل ہی دل میں اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ اس بچے کے بارے میں سب کچھ معلوم کر کے رہے گا۔ فرحان صاحب کے انتقال کے بعد فائزہ' شرجیل کے لیے مزید حساس ہوگئی تھیں...... جانتی تھیں کہ اب انہیں تنہا ہی شرجیل کے لیے لڑنا ہے، کئی بار سوچا کہ راحیل کو اس بچے کی سچائی بتا دیں لیکن پھر یہ خیال دل کو سہما دیتا کہ راحیل اپنی بیوی اور آنے والے بچے کا سوچ کر یقیناً شرجیل کو ان سے چھین کر کہیں بھجوا دے گا۔ بھلا اپنی محبوب بیوی اور ہونے والے بچے کے سامنے شرجیل کی کیا اہمیت ہوگی اس کی نظروں میں......اور پھر نیہا کو اگر پتا چل گیا کہ شرجیل، راحیل کا بیٹا ہے پھر اس کی نفرت کا کیا عالم ہوگا جبکہ ابھی بنا کسی رشتے کے وہ شرجیل سے اتنی جیلس ہے اب تو ان کی پشت پناہی کے لیے فرحان صاحب بھی موجود نہیں تھے۔ اور شرجیل سے ان کی محبت جیسے دیوانگی کی شکل اختیار کرتی جارہی تھی۔ وہ ان کا پہلا پوتا تھا اور یہ دکھ انہیں چین نہیں لینے دیتا تھا کہ ان کا معصوم پوتا ماں، باپ کے پیار سے محروم یتیموں کی طرح اس گھر میں رہ رہا ہے بھی تو اپنی ڈھیر ساری محبت اور شفقت بھری آغوش میں وہ اپنے چہیتے بچے کو چھپا کر جیسے اس کی اس محرومی کی تلافی کیا کرتی تھیں۔ اور جس بات نے نیہا کو مزید اپ سیٹ کردیا تھا وہ فائزہ کا شرجیل کو اپنے سب جاننے والوں اور رشتے داروں کے سامنے لے آنا تھا۔ اب تو وہ سب کو بہت فخریہ بتانے لگی تھیں کہ انہوں نے ایک غریب مگر بہت شریف گھرانے کے...۔ اس بچے کو ایڈاپٹ کرلیا ہے، پہلی بار جب فائزہ نے اپنی پھوپی زاد بہن رابعہ کے سامنے اپنی گود میں بیٹھے ہوئے گول مٹول سے شرجیل کو پیار کرتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا تو نیہا کو جیسے اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ رابعہ نے بھی بہت اچنبھے سے فائزہ کو دیکھا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے فائزہ لیکن ماشاء اللہ سے تمہارا اپنا پوتا یا پوتی اس دنیا میں آنے والے ہیں پھر غیروں کا بچہ گود لینے کی کیا ضرورت تھی۔'' رابعہ کے اعتراض پر فائزہ جیسے برا ہی مان گئیں۔

''رابعہ انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے، اس بچے کی ماں مرچکی ہے اور اس کے گھر والے اسے پالنا افورڈ نہیں کرسکتے، میں اسے اپنا بچہ سمجھ کر پالوں گی۔ پالنے کی محبت خون کے رشتوں سے زیادہ بڑھ کر ہوتی ہے۔'' اور فائزہ کا یہ جملہ جیسے نیہا کے دل میں کانٹے کی طرح سے اتر کر اسے ہر لمحہ ایک چبھن کا احساس دلاتا رہتا تھا۔

☆☆☆

''امی جازی کو صبح سے ٹمپریچر ہے اور آپ سے اتنا بھی نہیں ہوا کہ ایک بار جا کر اسے پوچھ لیں۔'' راحیل کچھ خفا، خفا سا ان سے فون پر گلہ کر رہا تھا۔

''ارے تو کیا مجھے الہام ہونا تھا۔ صبح آفس جاتے ہوئے بھی تم نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ میں ابھی جا کر دیکھتی ہوں۔'' فائزہ ایک دم پریشان ہوگئیں۔ ان کے صفائی دینے پر راحیل کے لہجے میں مزید خفگی در آئی۔

''امی آپ کو شرجیل سے فرصت ملے تب ہی تو آپ کو اپنے اردگرد کے لوگ نظر آئیں گے۔ جازی میرا بچہ اور آپ کا پوتا ہو کر بھی آپ کی محبت سے محروم ہے، اس سے بڑی اور کیا زیادتی ہوگی امی۔'' وہ پوری طرح سے فائزہ سے متنفر لگ رہا تھا۔

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو راحیل...... جازی میری جان، میرے جگر کا ٹکڑا ہے...... پتا نہیں تم اور نیہا اس کا مقابلہ ہر وقت شرجیل سے کیوں کرتے رہتے ہو۔ کیا بیر ہے تم لوگوں کو اس معصوم سے بچے سے۔'' فائزہ بھی اس بار کچھ ناراض ہو کر بولیں۔

''امی ہمیں شرجیل سے کوئی بیر نہیں البتہ آپ سے ضرور شکایت ہے، آج جازی تقریباً دو ماہ کا ہورہا ہے لیکن آپ نے کبھی اسے وہ توجہ نہیں دی جس کا وہ مستحق ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جازی رورہا ہوتا ہے اور آپ شرجیل کو کھلانے پلانے میں مصروف رہتی

ہیں۔ جو تڑپ شرجیل کے لیے ہے آپ کے دل میں وہ جازی کے لیے نہیں ہے۔" راحیل کو بھی جیسے آج اپنے دل کے پھپولے پھوڑنے کا موقع مل رہا تھا۔

"جب تم شام کو گھر واپس آؤ گے تب میں اس موضوع پر تم سے بات کروں گی۔ فی الحال میں جازی کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ ارے نیہا ہی اپنے کمرے سے نکل کر مجھے کچھ بتا دیتی تو کیا بگڑ جاتا...... لیکن وہ بھی موقع ڈھونڈتی ہے بات کا ایشو بنانے کا۔" بہت تپے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے فون بند کر دیا اور کچھ الجھی ہوئی سی نیہا کے کمرے کی جانب چلی آئیں۔ لیکن اندر سے آتی نیہا کی آواز نے ان کے قدم دروازے پر ہی روک دیے، وہ فون پر اپنی مما سے بات کرنے میں مصروف تھی۔

"نہیں مما، اب میرا شک یقین میں بدلتا جا رہا ہے، شرجیل کا آنٹی سے ضرور کوئی بہت گہرا رشتہ ہے۔" وہ بہت وثوق بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ فائزہ سن سی کھڑی رہ گئیں۔ نیہا اپنی ماں کے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی تھی۔

"ہاں، میں نے کل اس مسئلے پر کافی جھگڑا کیا ہے راحیل سے۔ خدا کی قسم مما اگر راحیل کا تعلق شرجیل سے ثابت ہو گیا ناں تو اسی لمحے جازی کو لے کر یہ گھر چھوڑ دوں گی، ویسے راحیل نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس بچے کو کسی ادارے کے سپرد کرے گا۔ جی ہاں مما ایک دو جگہ بات کی ہے اس نے۔" آخری جملے کو سن کر تو جیسے فائزہ کی جان ہی نکل گئی۔ کانپتے ہوئے قدموں سے واپس اپنے کمرے میں آگئیں۔ سامنے بیڈ پر ننھا شرجیل بہت گہری نیند سو رہا تھا۔ کتنا پیارا اور معصوم لگ رہا تھا وہ سوتے ہوئے' وہ یک ٹک اسے دیکھے گئیں۔ آنکھیں بے اختیار آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔ دل جیسے بیٹھا جا رہا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سال ہونے کو تھا شرجیل کو ان کی گود میں آئے ہوئے راتوں کی نیند، دن کا چین سب قربان کر دیا تھا انہوں نے اس بچے پر...... اتنی ٹوٹ کر محبت آتی تھی کہ اپنی جان بھی اس پر وار دینے کو دل کرتا۔ وہ بھی تو بس ہر وقت ان کی آغوش میں ہی سمایا رہتا تھا اپنی معصوم پیاری، پیاری حرکتوں سے ان کا دل کچھ ایسے لبھاتا تھا کہ وہ سب کچھ جیسے بھول کر بس اسی میں کھو کر رہ جاتی تھیں۔ جازی سے بھی انہیں بہت محبت تھی لیکن شرجیل کے لیے وہ صرف اس کی دادی ہی نہیں بلکہ ماں اور باپ کی جگہ بھی پُر کر رہی تھیں یہ بات کیوں نہیں سمجھ میں آ رہی تھی راحیل کو اور رہا نیہا کا شک تو اسے دور کرنا اب ان کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ انہوں نے اتنی سی دیر میں بہت کچھ سوچ لیا۔ اور پھر دل ہی دل میں ایک فیصلہ کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

"لیکن فائزہ تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ راحیل ہی کا بیٹا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خط کسی نے راحیل کی دشمنی میں لکھ دیا ہو، کوئی اسے پھنسانا چاہتا ہو، بدنام کرنا چاہتا ہوں۔" نازیہ کے سمجھانے پر فائزہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

"یہ راحیل ہی کا بچہ ہے نازیہ...... ذرا تم غور سے اس کی شکل دیکھو...... تم نے راحیل کا بھی بچپن دیکھا ہوا ہے ناں ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ یہ بچہ بالکل راحیل کے بچپن کی کاپی نہیں ہے۔" فائزہ کی بات پر نازیہ چپ سی ہو گئی کہ اس سچائی کو وہ چاہتے ہوئے بھی نہیں جھٹلا پائی تھی۔

"اور پھر نازیہ اگر کسی نے راحیل کو بدنام کرنے کی سازش کی بھی تھی تو اب تک وہ ایسے خاموش نہیں بیٹھا رہتا۔ مزید کوئی نہ کوئی قدم اٹھا کر اسے پریشان کرتا ہی رہتا۔" فائزہ کی بات میں وزن تھا لیکن پھر بھی نازیہ کا دل اتنی بڑی بات ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا۔ فائزہ جو کہ اس کے بچپن کی دوست تھی۔ اسکول اور کالج بھی دونوں کا ایک ہی تھا۔ ہمیشہ ایک دوسرے کی ہمراز اور غم گسار رہی تھیں۔ شادی کے بعد نازیہ اسلام آباد اور فائزہ کراچی میں ہی رہتی رہی تھیں۔ شوہر، بچوں اور دیگر ذمے داریوں اور مصروفیات کے علاوہ

دونوں شہروں کے درمیان حائل فاصلوں نے ان کی دوستی کو دھندلا ضرور دیا تھا لیکن دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت ہنوز ویسی ہی تھی۔ نازیہ کے دونوں بچوں کی پیدائش پر وہ خاص طور پر اسلام آباد گئی تھیں جبکہ راحیل کی پیدائش پر نازیہ بھی فوراً کراچی پہنچی تھی۔ شروع، شروع میں تو یہ دونوں ہی اسلام آباد اور کراچی کو ایک کیے رکھتی تھیں لیکن پھر جوں، جوں وقت گزرتا گیا بچے بڑے ہوتے ہوگئے تو مصروفیات کا رنگ بھی بدلتا گیا۔ اب ملاقاتیں محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ البتہ فون پر اکثر دونوں کا رابطہ رہتا تھا۔

لیکن اتفاق ہی تھا کہ پچھلے ایک سال سے وہ پاکستان میں نہیں تھی۔ پہلے اپنی بیٹی کی ڈلیوری کے سلسلے میں وہ کچھ عرصے شارجہ میں رہی اور پھر بیٹے کے اصرار پر وہ اور اس کا میاں شہزاد چند ماہ کے لیے بیٹے کے پاس کینیڈا چلے گئے۔ اور پھر ابھی انہیں واپس آئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ اچانک ہی کل شام فائزہ کی کال آگئی کہ وہ صبح کی فلائٹ سے اس کے پاس آرہی ہے۔ فائزہ کی آواز، اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ جس ایمرجنسی میں وہ آرہی ہے اس کے لیے کوئی بہت بڑی وجہ ہے، نازیہ نے اس وقت تو زیادہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن ائرپورٹ پر فائزہ کی گود میں ایک کیوٹ سے بچے کو دیکھ کر جہاں اسے شدید حیرت ہوئی تھی وہاں اسے معاملے کی سنگینی کا بھی کچھ احساس ہوگیا تھا۔ جانتی تھی کہ فائزہ کا پوتا ابھی دو، ڈھائی مہینے کا ہی ہے پھر یہ ڈیڑھ سالہ بچہ کون تھا جو اس کی گود میں تھا اور اس وقت فائزہ کی کہانی سننے کے بعد سے وہ مسلسل فائزہ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن فائزہ اس کی کوئی بات نہ سمجھنے کو تیار تھیں اور نہ ہی ماننے کو۔

"دیکھو نازیہ انسان کی زندگی میں پریشانیوں اور الجھنوں کی سب سے بڑی وجہ صحیح وقت پر فیصلہ نہ کرنا ہے، زندگی کا تقاضا ہے کہ انسان کو ہر روز کسی نہ کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنا پڑتا ہے کچھ فیصلے کم نتیجہ خیز ہوتے ہیں جبکہ کچھ فیصلے آپ کی دنیا، آپ کی زندگی کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ میرا یہ فیصلہ مجھے ساری زندگی ایک کسک، ایک دکھ کے ساتھ جینے سے بچالے گا۔" ان کے لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ نازیہ بس ان کو دیکھتی رہ گئی۔ پھر کچھ لمحوں کے بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"تو تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" فائزہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"میں نے ہمیشہ کے لیے وہ گھر چھوڑ دیا ہے۔ فرحان میرے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں، مجھے پیسوں کی بالکل پرابلم نہیں ہے، راحیل کی ماشاء اللہ اپنی فیملی ہوگئی ہے، اب اسے شاید ماں کی اتنی کمی محسوس نہیں ہوگی لیکن شرجیل کو میری ضرورت ہے، میں اسے لاوارثوں کی طرح کسی ادارے میں نہیں پلنے دوں گی۔"

اب ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ نازیہ نے زبردستی انہیں تھوڑا سا پانی پلایا تو وہ کچھ سنبھلیں۔

"فائزہ کیا تم اب بھی راحیل کو اس بچے کی حقیقت نہیں بتاؤ گی۔" نازیہ کی نظروں میں الجھن تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو نازیہ کہ راحیل کچھ سمجھ نہیں رہا۔ ارے وہ جانتے بوجھتے انجان بن رہا ہے، حقیقت سے نظریں چرا رہا ہے۔ وہ نیہا کو کھونا نہیں چاہتا اور اب تو جازی نے بھی آکر اس کی دنیا مکمل کردی ہے۔ لیکن میں پھر بھی اسے لفظ، لفظ ہر بات بتاؤں گی لیکن... فی الحال نہیں، ابھی میں بہت خاموشی سے تمہارے گھر رہوں گی۔ اسے ڈھونڈنے دو ہم لوگوں کو..... تھوڑا سا وہ بھی تو پریشان ہو..... کچھ سزا اسے بھی تو ملے۔ پھر کل ہی میں اپنے وکیل سے بات کر کے پراپرٹی اور بزنس میں اپنا حصہ الگ کروانے کی بات کروں گی۔ اور یہیں تمہارے گھر کے آس پاس ہی اپنے لیے گھر خرید کر بس یہیں اسلام آباد میں ہی شفٹ ہوجاؤں گی۔ البتہ راحیل کی خوشیوں کی خاطر نیہا کو کبھی بھی شرجیل کی حقیقت نہیں بتاؤں گی۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"لیکن فائزہ یہ تمہارا بہت بڑا فیصلہ ہے، راحیل تمہارا اکلوتا بیٹا ہے تم اس کے بغیر کیسے رہ سکتی ہو۔ بھلے تم راحیل کو بلا کر سارا معاملہ ڈسکس کرو، ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی راہ نکال لے۔" نازیہ کافی پریشان ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے، میں ایسا ہی کروں گی لیکن فی الحال ابھی میں کچھ دن سکون سے یہاں رہنا چاہتی ہوں۔" فائزہ کی بات پر نازیہ نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"اور اپنے بیٹے کو جو بے سکون کرو گی اس کا کیا ہوگا۔"

"پلیز نازیہ میں اس کے بچپن میں بھی تو اسے اس کی شرارتوں پر پنشمنٹ دیا کرتی تھی تو بڑے ہونے پر اسے سزا دینے کا حق کیوں مجھ سے چھین رہی ہو۔" اس بار ان کے لہجے میں ناگواری محسوس کر کے نازیہ خاموش تو ہو گئی لیکن ذہن بدستور الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

"مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ امی آخر کہاں جا سکتی ہیں، ان کی ساری دوستوں کے گھر پتا کر لیا ہے۔ کہیں بھی نہیں ہیں۔" راحیل نے رشیدہ آنٹی سے بات کرنے کے بعد فون رکھتے ہوئے بہت پریشانی سے نیہا کی جانب دیکھا جو خود بھی بہت فکر مند نظر آ رہی تھی۔

"ان کی الماری بھی کافی خالی، خالی سی لگ رہی ہے اور شرجیل کا بھی کوئی سامان نظر نہیں آ رہا ہے۔ راحیل، کہیں ایسا تو نہیں کہ....." نیہا نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ کر پریشانی سے ہاتھوں کو مسلا۔

"اوہ نہیں۔" راحیل بے اختیار دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر صوفے پر تقریباً گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا۔ وہ جب کل آفس سے واپس آیا تھا تو نیہا نے پہلی خبر اسے یہ دی تھی کہ آج امی سارا دن کمرے سے باہر نہیں نکلیں۔ راحیل کا دل مزید برا ہو گیا۔ اس کے بتانے پر بھی کہ جازی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، انہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ وہ جا کر اس کا حال ہی پوچھ لیتیں۔ اس کا موڈ آف ہوتے دیکھ کر نیہا نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"راحیل میرا مطلب یہ بات بتانے سے آپ کا دل خراب کرنا نہیں تھا بلکہ مجھے فکر ہو رہی ہے کہ کہیں انہوں نے میری یا آپ کی کوئی بات دل پر کچھ زیادہ تو نہیں لے لی ہے کیونکہ نہ وہ دوپہر کے کھانے کے لیے ٹیبل پر آئیں اور نہ ہی شام کی چائے انہوں نے باہر آ کر پی.....آپ پلیز ان کے کمرے میں جا کر وجہ تو پوچھیں..... میں دو دفعہ ان کے کمرے میں جا چکی ہوں لیکن وہ تو مجھے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتی ہیں اور بہت سرد مہری سے بس ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی ہیں۔" نیہا کافی دل برداشتہ سی لگ رہی تھی۔

"اصل میں صبح آفس سے فون کر کے میں نے جازی کے حوالے سے کچھ شکایت کر دی تھی ان سے۔ بس اسی کا ری ایکشن ہے یہ سب، میں ان کی نیچر جانتا ہوں ابھی منانے گیا تو مزید ناراض ہو جائیں گی۔ کل میرے آفس جانے کے بعد تم ان کا موڈ بہتر کرنے کی کوشش کرتی رہنا۔ شام کو میں ان کا فیورٹ پرفیوم انہیں گفٹ کرتے ہوئے منانے کی کوشش کروں گا۔" وہ اسے کل کا پروگرام بتاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ رات کا کھانا بھی فائزہ نے کمرے میں ہی منگوا لیا تھا۔

صبح راحیل کے آفس جانے کے بعد نیہا دوبارہ سو گئی تھی کیونکہ جازی نے کل رات اسے کافی جگایا تھا۔ اس وقت دوا کے زیر اثر وہ غافل سو رہا تھا۔ تقریباً دس بجے جازی کے جاگنے پر جب اس کی آنکھ کھلی تو آنٹی کو گھر میں موجود نہیں پایا تھا۔ دوپہر تک وہ یہی سمجھتی رہی کہ شاید وہ اپنی کسی دوست کے گھر گئی ہیں لیکن جب شام ہونے کو آئی اور وہ واپس نہیں آئیں تو اس نے گھبرا کر راحیل کو فون کر دیا۔ آج اتفاق سے ان کا چوکیدار بھی چھٹی پر تھا اور نذیراں ویسے ہی صبح دیر سے کام پر آتی تھی۔ اس وقت سے وہ دونوں ہر جگہ پتا کر چکے تھے لیکن فائزہ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ راحیل کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی ماں اس کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر کہیں چلی گئی تھی یہ احساس اسے

مارے ڈال رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ انہیں کہاں ڈھونڈے...... فکر، پریشانی اور اس پر مستزاد پشیمانی نے مل کر اسے بالکل ہی نڈھال کر دیا تھا۔ صدیوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا وہ ان چند گھنٹوں میں...... نیہا کا حساس دل اس کی یہ حالت دیکھ کر کٹا جا رہا تھا۔

''نیہا میری جان...... دعا کرو کہ میری امی خیریت سے واپس آجائیں۔ اب ہم انہیں شرجیل کے حوالے سے بالکل تنگ نہیں کریں گے۔ مجھے تمہاری قسم ہے نیہا کہ میری زندگی میں سوائے تمہارے کوئی عورت نہیں آئی ہے...... پلیز تم مجھ پر بھروسا کرو میرا شرجیل سے ذرا سا بھی کوئی تعلق نہیں ہے، بس تم امی کو اس سے محبت کرنے دو۔ اب ہم اس بات سے کوئی غرض نہیں رکھیں گے کہ وہ اس بچے پر کیوں اتنی محبت نچھاور کرتی ہیں۔ پلیز نیہا میری خاطر بس میری خاطر......'' راحیل کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''راحیل میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اب شرجیل کی وجہ سے نہ آپ سے لڑوں گی اور نہ ہی کبھی کوئی شک کروں گی۔ آپ تو میری زندگی ہیں راحیل، مجھے معاف کر دیں۔ میں نے اتنے دنوں آپ کو ٹینشن میں رکھا۔ پلیز راحیل اپنے آپ کو سنبھالیں اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں بھی نہیں جی پاؤں گی۔'' وہ راحیل کے لٹتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے بے اختیار رو دی تبھی کال بیل کی آواز پر وہ دونوں چونک گئے۔

''شاید امی واپس آگئی ہیں۔'' راحیل بے قرار ہو کر تیزی سے گیٹ کی جانب دوڑا...... نیہا بھی اس کے پیچھے، پیچھے تھی لیکن گیٹ کھولتے ہی دونوں کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ سامنے اللہ دتہ کھڑا تھا۔ فرمان صاحب نے کراچی سے کچھ دور پر ایک چھوٹا سا فارم ہاؤس خریدا تھا جس کی وہ چوکیداری کیا کرتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ قبل وہ اپنے گاؤں چلا گیا تھا اور شاید واپسی پر فرحان صاحب کے انتقال کی خبر سن کر تعزیت کے لیے چلا آیا تھا۔

''آؤ اللہ دتہ اندر آجاؤ۔'' راحیل نے بہت بجھے دل سے اسے اندر آنے کو کہا تو وہ آنسو پونچھتا ہوا راحیل کے پیچھے، پیچھے لاؤنج میں آگیا۔

''چھوٹے صاحب مجھے تو کسی نے خبر ہی نہیں کی کہ بڑے صاحب ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ وہ تو اتفاقاً مجھے......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر رو پڑا۔

''بس اللہ کی یہی مرضی تھی۔'' راحیل نے بہت بے دلی سے جواب دیا۔ اس وقت اسے اللہ دتہ کا آجانا کافی کوفت سے دوچار کر رہا تھا۔

''چھوٹے صاحب ذرا مجھے بڑی بیگم صاحبہ سے ملوا دیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا تو راحیل اور نیہا ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ راحیل کا اترا بجھا ہوا سا چہرہ دیکھ کر اللہ دتہ کچھ کھٹک سا گیا۔ ''چھوٹے صاحب ہماری بیگم صاحبہ خیریت سے تو ہیں ناں؟'' اس نے بہت گھبرا کر پوچھا تو راحیل نے جلدی سے بات بنانے کی کوشش کی۔

''ہاں، ہاں سب خیریت سے ہیں، اصل میں وہ کسی رشتے دار کی وفات پر شہر سے باہر گئی ہوئی ہیں۔''

''اور منا کیا وہ بھی ساتھ گیا ہے؟'' بے ساختہ ہی اس نے یہ سوال کیا تھا۔

''تم بھی کمال کرتے ہو اللہ دتہ ابھی ہمارا بچہ دو ماہ کا ہی ہے بھلا وہ اسے کیسے ساتھ لے جا سکتی ہیں۔'' راحیل کو اس کے بے تکے سوال پر کافی الجھن سی ہوئی۔

''ارے، ماشاءاللہ آپ بیٹے کے باپ بن گئے ہیں۔ بہت مبارک ہو آپ دونوں کو۔'' اس کی مبارک باد پر نیہا اور راحیل بے اختیار چونکے تھے۔ اس کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ جازی کی پیدائش سے لاعلم ہے۔

''اللہ دتہ پہلے تم نے کس منے کی بات کی تھی۔ تمہیں کیسے پتا کہ یہاں ایک اور بچہ بھی ہے؟'' راحیل نے بہت بے تابی سے اس سے پوچھا۔ نیہا بھی بے اختیار اللہ دتہ کے نزدیک چلی آئی۔ اللہ دتہ کے چہرے کا رنگ اڑ سا گیا۔ چہرے پر بکھری شدید گھبراہٹ جیسے

اپنے اندر کوئی ان کہی کہانی چھپا رہی تھی۔ نیہا کا دل زور، زور سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں کپکپانے لگے۔ اس کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر میں چلنے ہوئے اس ڈرامے کا ڈراپ سین اللہ دتہ کے ہاتھوں سے ہوگا۔ پتا نہیں اب وہ کیا انکشاف کرنے جا رہا تھا۔ نیہا نے سہم کر لاشعوری طور پر راحیل کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا جیسے اللہ دتہ کے منہ سے نکلا ہوا کوئی جملہ اس کے راحیل کو اس سے بہت دور کر دے گا۔ اللہ دتہ سر جھکائے کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھا رہا۔

"دیکھو اللہ دتہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کرو۔ تم یقیناً سب کچھ جانتے ہو، مجھے اس بچے کے بارے میں سچ، سچ بتادو ورنہ میں پولیس کو اطلاع کردوں گا کہ تم وہ بچہ ہمارے گھر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔" راحیل نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا جو اتفاق سے ٹھیک نشانے پر جا لگا۔ اس نے گھبرا کر اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"نہیں صاحب، پولیس کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بچہ میرا نواسہ ہے میری مرحومہ بیٹی کا بچہ ہے وہ۔" اللہ دتہ بے اختیار ہو کر رونے لگا۔ نیہا اور راحیل نے بہت شاکڈ ہو کر اسے دیکھا۔ راحیل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"تم جانتے ہو اللہ دتہ اتنے عرصے سے اس بچے کی وجہ سے میرا خاندان کس اذیت سے گزر رہا ہے۔ میرا گھر ٹوٹتے، ٹوٹتے بچا ہے۔ میری ماں مجھ سے ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔ ارے کتنے نمک حرام نکلے تم...... ہمارا ہی گھر ملا تھا تمہیں یہ ڈراما کھیلنے کے لیے۔ تم ایسے ہی مجھ سے کہہ دیتے میں کوئی بندوبست کر دیتا تمہارے نواسے کا۔" راحیل جیسے آپے میں نہیں رہا تھا۔

"چھوٹے صاحب میں مجبور تھا۔ میں نے یہ سب بڑے صاحب کے کہنے پر کیا تھا۔ یہ بچہ ان ہی کا ہے۔ انہوں نے میری بیٹی سے خفیہ شادی کی تھی۔" اللہ دتہ نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر جو انکشاف کیا تو راحیل سکتے کے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ ایک لمحے کو تو جیسے اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تو نیہا نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ راحیل شرمندگی کے شدید احساس کے ساتھ نیہا سے نظریں نہیں ملا پایا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اللہ دتہ کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی میرے باپ کے بارے میں ایسا الزام لگاتے ہوئے۔ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔" نیہا نے بہ مشکل اسے پیچھے گھسیٹا۔

"راحیل پلیز پہلے اس کی پوری بات تو سن لیں۔" وہ راحیل کو کول ڈاؤن کرنے کی کوشش تو کر رہی تھی لیکن ڈھیر سارا سکون اور اطمینان خود بخود اس کے دل میں اترتا جا رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اللہ دتہ نے اچانک آ کر اسے تپتی دھوپ سے ٹھنڈی چھاؤں میں لا کر بٹھا دیا ہو۔ اسے بے اختیار اس معصوم بوڑھے آدمی پر پیار آنے لگا جس نے اسے عالم برزخ میں رہنے سے بچا لیا تھا ورنہ وہ ظاہر تو نہ کرتی لیکن ایک کسک کے ساتھ ساری زندگی بتا دیتی۔ اسے اپنی خود غرضی پر شرمندگی بھی محسوس ہوئی۔ راحیل اس کا شوہر اس وقت کتنے کرب سے گزر رہا تھا اور وہ...... نیہا نے کچھ ندامت سے راحیل کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو ملامت کی اور پھر اللہ دتہ نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ بتایا کہ حلیمہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اللہ نے شکل صورت بہت پیاری دی تھی لیکن ایک پیر میں پیدائشی نقص ہونے کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلتی تھی اور اسی وجہ سے اچھی عمر ہو جانے کے باوجود اس کی شادی نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ اور اس کی ماں فارم ہاؤس کی صفائی کیا کرتی تھیں۔ فرحان صاحب کبھی فیملی کے ساتھ اور کبھی اکیلے فارم ہاؤس کی دیکھ بھال کی وجہ سے اکثر وہاں آیا کرتے تھے۔ انہیں حلیمہ پر بہت ترس آتا تھا ایک بار جب اس کے رشتے کے لیے آنے والے اس کی لنگڑاہٹ کو بنیاد بنا کر انکار کر کے چلے گئے تو شدید ڈپریشن میں آ کر اس نے خودکشی کی کوشش کی اتفاق سے فرحان صاحب اس وقت فارم ہاؤس میں

موجود تھے۔ ان کی وجہ سے حلیمہ بچ گئی فرحان صاحب نے اس کے آنسوؤں اور اس کے کرب کو شاید کو بہت زیادہ محسوس کیا تھا تبھی اس قصے کے کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے حلیمہ کا رشتہ دیتے ہوئے شادی کی خواہش ظاہر کی اور پھر ان کے اصرار پر اگلے ہی ہفتے خاموشی سے ان دونوں کا نکاح ہو گیا۔

"چھوٹے صاحب میری بیٹی بہت تھوڑی عمر لکھوا کر لائی تھی اور میں بڑے صاحب کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا کہ میری بچی نے اپنے مرنے سے پہلے وہ ساری خوشیاں دیکھ لیں جو شاید اسے کبھی بھی نہ مل پاتیں۔ شادی کے صرف ایک سال بعد ہی منے کی پیدائش پر وہ ہمیشہ کے لیے سو گئی۔ چھوٹے صاحب میری بیوی بوڑھی اور بیمار عورت تھی اور شاید بڑے صاحب اپنے بیٹے کو ہمارے پاس چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے تو بس یہ ہی ترکیب انہیں سمجھ میں آئی کہ......" اللہ دتہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی راحیل چیخ پڑا۔

"میں پاپا کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میرے کاندھے پر بندوق رکھ کر انہوں نے اپنے بیٹے کی اس گھر میں پرورش کا انتظام کیا۔ کتنے خود غرض تھے وہ۔" اللہ دتہ بے اختیار اٹھ کر اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"نہیں، نہیں، چھوٹے صاحب، میرے گاؤں جانے سے پہلے انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ موقع دیکھ کر آپ کو اپنے اس راز میں شریک کر لیں گے لیکن شاید اچانک موت نے انہیں اتنی مہلت نہیں دی۔" وہ بڑی لجاجت سے فرحان صاحب کی طرف سے صفائی دینے لگا۔ تب نیہا نے بھی بہت پیار سے راحیل کا ہاتھ تھام کر اسے سمجھایا۔

"راحیل میرے خیال میں انکل نے آپ کا نام استعمال کر کے بہت دور اندیشی سے کام لیا ہے کیونکہ آنٹی شرجیل کو کبھی بھی ان کے بیٹے کے طور پر قبول نہیں کرتیں لیکن پوتے کی تو اپنی ایک محبت ہوتی ہے جس کا عملی ثبوت ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ راحیل پلیز تم انکل کو دل سے معاف کر دو۔ تمہارے پاپا کی عزت میری عزت ہے میں اسے کبھی بھی کسی کی نظروں میں گرنے نہیں دوں گی اور یہ راز ہمیشہ بس ہم تینوں کے درمیان رہے گا، ہے نا اللہ دتہ؟" اس نے بھیگی آنکھوں سے اللہ دتہ کو دیکھتے ہوئے راحیل کے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

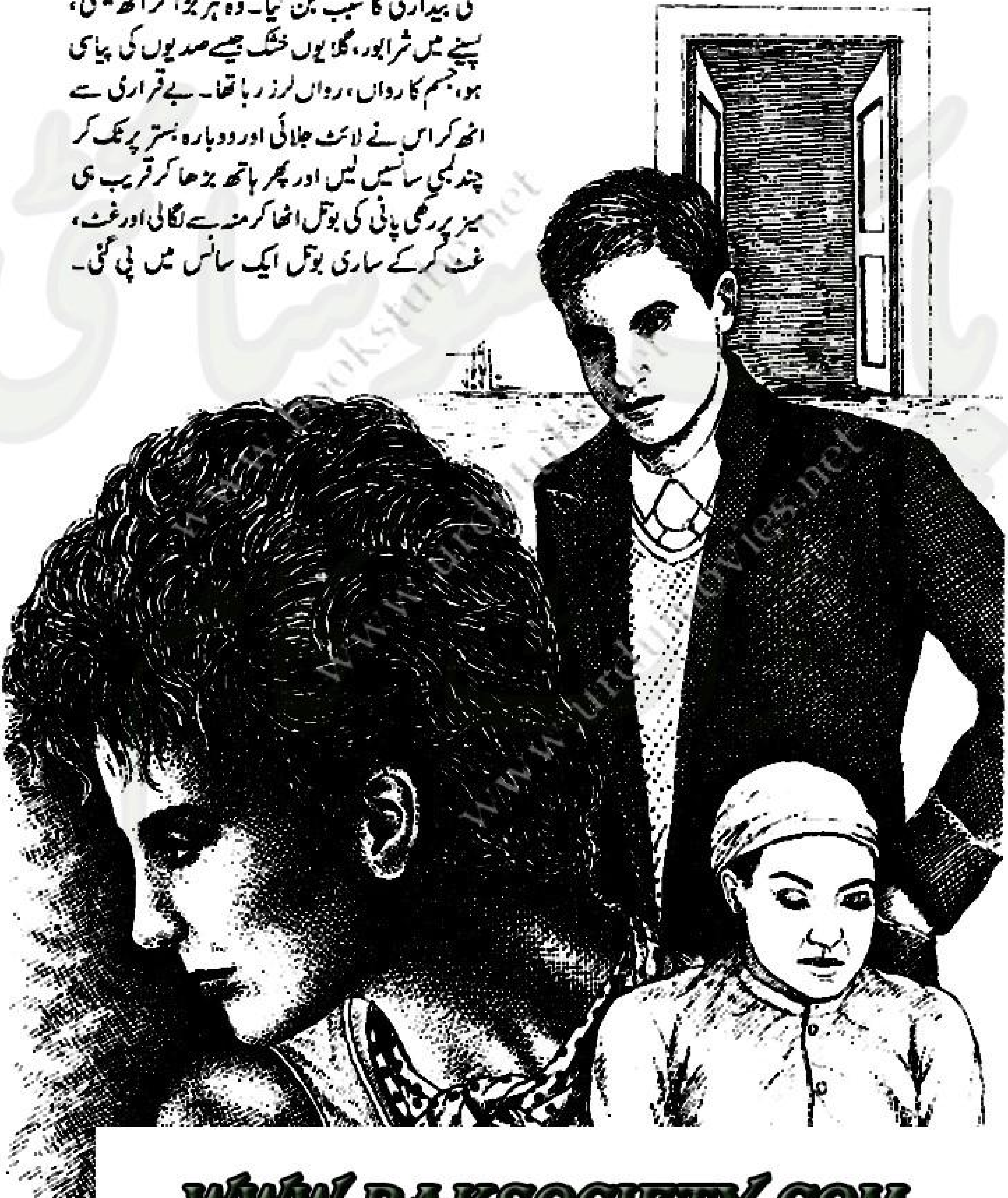
"جی بالکل بہو بیگم یہ راز قبر تک میرے ساتھ جائے گا۔ ویسے بھی وہ میرا نواسہ نہیں بس آپ لوگوں کا ہی خون ہے۔" وہ آنسو پونچھتا ہوا جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا راحیل نے زبردستی اسے کچھ رقم تھما دی۔ اللہ دتہ کے جانے کے بعد وہ بوجھل قدموں سے واپس پلٹنا تو نیہا کا دل چاہا کہ اپنے اس ٹوٹے ہوئے اداس سے پریتم کو اپنے دل میں چھپا لے۔

"راحیل ہم لوگ کبھی بھی آنٹی کو یہ نہیں بتائیں گے کہ شرجیل، انکل کا بیٹا ہے، لاعلمی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہوتی۔ ہمیں ان کا اپنے شوہر کی وفا پر یقین اور ان کی محبت پر مان کبھی بھی نہیں توڑنا ہے۔ وہ ہمیشہ اس غرور کے ساتھ جئیں گی اور میں اپنے ننھے منھے دیور کو بالکل جازی جیسا پیار دوں گی یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔" کتنی محبت اور خلوص سے کہہ رہی تھی وہ۔ راحیل نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ تبھی فائزہ کی موبائل پر آتی کال نے دونوں کے چہرے پر بے اختیار خوشی بکھیر دی۔ فائزہ اس وقت بہت ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ راحیل کو فون کر رہی تھیں اپنے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے سے ہمیشہ کے لیے علیحدگی اختیار کر لینا کوئی معمولی بات تو نہیں تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ فون کی دوسری جانب کتنی ڈھیر ساری خوشیاں ان کی منتظر ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی کبھی انسان کی زندگی میں بکھری مایوسی، دکھ اور پریشانی کو اتنے حیران کن انداز میں خوشیوں میں بدل دیتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے جس کا ادراک فائزہ کو چند لمحوں میں ہونے والا تھا۔

خواب زادی

صبیحہ شاہ

رات پھر وہی خواب بالکل اسی انداز میں اس کی بیداری کا سبب بن گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، پسینے میں شرابور، گلا یوں خشک جیسے صدیوں کی پیاسی ہو، جسم کا رواں، رواں لرز رہا تھا۔ بے قراری سے اٹھ کر اس نے لائٹ جلائی اور دوبارہ بستر پر ٹک کر چند لمبی سانسیں لیں اور پھر ہاتھ بڑھا کر قریب ہی میز پر رکھی پانی کی بوتل اٹھا کر منہ سے لگالی اور غٹ، غٹ کر کے ساری بوتل ایک سانس میں پی گئی۔



حواس ذرا کچھ درست ہوئے تو انگشت شہادت سے سینے پر صلیب کا نشان بناتے، بناتے ٹھہر گئی۔

''کیوں...... بھلا کیوں......؟ وہ گاڈ، وہ جیسس، وہ اللہ جو بھی ہے میری حفاظت، میری مدد کیوں کرے گا؟ میں کبھی چرچ گئی؟ گرینڈ ما کی سب سے بڑی ناراضی یہی تو تھی کہ میں چرچ نہیں جاتی۔ ریسٹورنٹ میں کولیگ ویٹرس ساشا کے خیال میں سارے مسئلوں کا حل کنیش کے سامنے ماتھا ٹیکنا ہے، مسٹر عارف کے گھر والے دن میں بار، بار میٹ بچھا کر جانے کیا اٹھک بیٹھک کرتے ہیں اور مطمئن رہتے ہیں اور میں......'' وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ جیسے، جیسے اس کے مشاہدے کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا جیسے، جیسے وہ مختلف النوع اقوام کے افراد سے اب مل رہی تھی، انہیں دیکھ، سن اور بجھ رہی تھی ہر نئے دن اب ایک نیا سوال اس کے اندر ایک کانٹے کی صورت اگ آتا تھا جن پر جواب کے پھول کھلانا اس کے بس سے باہر کی بات تھی اور اس رات کے آخری پہر ان سوالوں اور خیالوں سے بچنے کا آسان طریقہ تھا فون...... انگلی کے ایک ہلکے سے لمس اور جنبش سے دنیا اس کی نظروں کے سامنے بچھ گئی تھی۔ فیس بک، واٹس ایپ اور بہت سی نئی، نئی ایپلی کیشنز نے تنہائیوں میں بھی محفل سجادی تھی۔ مواصلاتی کمپنی کی جانب سے عید کی خوشی میں خصوصی پیکج کی نوید تھی۔ مختلف آؤٹ لیٹس، شاپس، ریسٹورنٹس کی جانب سے خصوصی رعایتی آفرز کی ترغیب، واٹس ایپ پر ساشا کی بہن کی شادی کی تصویر، فیری اور اس کے بوائے فرینڈ کارل کی ہنستی مسکراتی تصویر تھی۔ جیکب کی آنے والے لانگ ویک اینڈ کے حوالے سے کچھ خصوصی پروگرام کی تجویز تھی۔

جیکب...... مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو روشن اور ذرا دیر پہلے کی وحشت و برافروختگی کو کہیں گم کر دیا تھا اور وہ سب بھول بھال کر اسے...... (جیکب) کو پیغام ٹائپ کرنے لگی اور فیس بک میں لاگ اِن ہوتے ہوئے وہ ذرا دیر پہلے کی کیفیت کو بھول چکی تھی۔

☆☆☆

روز میری المعروف میری، بدھسٹ باپ اور کرسچن ماں روزیٹا کی وہ بیٹی تھی جو نہ کرسچن بن سکی نہ ہی بدھسٹ۔

بدھسٹ یوں نہ بن سکی کہ باپ دو بیٹیوں کا تحفہ دے کر اس کی ماں روزیٹا اور ان کی زندگیوں سے جانے کب اور کیوں نفی ہو چکا تھا، اسے یاد نہیں۔ کھردرے مزاج کی روزیٹا جانے مزاجاً ہی ایسی تھی یا کھردرے حالات نے اسے ایسا بنا دیا تھا۔ پتا نہیں جو بھی تھا پر ماں وہ بڑی شفیق تھی مگر ماں کی شفقت سے لطف اندوز ہونا ان دونوں بہنوں کے لیے انتظار یوں بن جاتا تھا کہ وہ کمانے کی مشین بنی عموماً اپنے جیسے گھروں کی روایات کے مطابق اپنے بچے اپنی ماں کے حوالے کر کے منیلا کی اس مضافاتی بستی سے دور بہت دور بحرین میں گورنمنٹ اسپتال میں روٹی انچارج کی خدمات انجام دے رہی تھی۔ مضبوط بحرینی کرنسی اور بہت اچھے سیلری پیکج کی بدولت روزیٹا اپنی بیٹیوں اور ماں کی کفالت بہت اچھی طرح کر رہی تھی۔ روزیٹا کی ماں بھی نرس تھی۔ فیری اور میری کو بھی انہوں نے نرسنگ اسکول میں داخل کروا دیا تھا کیونکہ سعودی عرب اور خلیجی ممالک میں پیرا میڈیکل اسٹاف کو معاوضے بہت اچھے مل جاتے ہیں۔

چھوٹی فیری نرسنگ اسکول کی ہونہار طالبہ تھی ڈیڑھ سال بعد وہ کوالیفائڈ نرس بن جاتی اس کے عزائم مزید کورسز کرنے کے تھے جبکہ اس سے صرف سال بھر بڑی میری کے رزلٹ شروع سے اچھے نہیں تھے۔ پہلے برس کے آخر میں ہی اس نے اعلان کر دیا کہ وہ نرس نہیں بن سکتی۔

''پھر کیا بن سکتی ہو؟'' نرسنگ کو پروفیشن سے زیادہ عبادت سمجھنے والی بوڑھی نانی کے اس سوال کا جواب اس کے پاس خود نہ تھا...... روزیٹا فون کو کر

کے چیختی چلاتی، برا بھلا کہتی، اس کے تاریک مستقبل سے ڈراتی مگر وہ میری ہی کیا جس پر کسی بات کا اثر ہو جائے۔ وہ ڈھیٹ، بے پروا اور بے نیاز تھی۔ موڈ ہوتا تو خوب چہکتی، ہنستی، بولتی ورنہ دنوں گم صم گھومتی پھرتی۔ سوتی تو سوتی رہتی، کام کرنے پر آتی تو بھوت کی طرح جت جاتی اور جن کی طرح تمام گھر کو چکا کر رکھ دیتی۔ دوستیاں نہ ہونے کے برابر، موڈ ہوتا تو بنی ٹھنی ایسے گھومتی کہ نانی کی سوچیں امکانات کے پہاڑ پھلانگتی اس وقت ہانپ جاتیں جب وہ دنوں ایک ہی اسکرٹ یا جینز میں اجاڑ صورت پھرتی رہتی۔ مچھلی پکڑنا اس کا شوق تھا۔ بس یہ ایک کام تھا جو وہ دل لگا کر کرتی۔ اس بستی میں تالابوں، جھیلوں کی بھرمار تھی اور میری کے شوق کے ڈھیروں سامان...... نانی کو یقین ہونے لگا تھا کہ لڑکی کی فشنگ تو ایک بہانہ ہے اصل میں وہ بدمست باپ کی جینز کے زیر اثر گیان دھیان میں مصروف رہتی۔ دیکھو وہ بڈھا بھی بیٹھا سوچے ہی چلا جاتا ہے لیکن روزیٹا نے روز میری کو بہت زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ ایسے معاشرے کی پروردہ تھیں جہاں حرکت میں برکت اور اپنے کنویں خود کھودنے کی باتیں ہوتی ہی نہیں، عملی طور پر بھی کی جاتی تھیں۔ روزیٹا نے ریکروٹنگ ایجنسی کے تھرو اس کا ورکنگ ویزا نکلوایا تھا اور وہ بے دلی سے مجبوراً سامان کے ساتھ اپنے خواب بھی سمیٹ کر ماں کے پاس بحرین آ گئی۔

ائرپورٹ سے نکل کر اس نے گرم لو کے تھپیڑے اپنے منہ پر محسوس کیے اور ماں کے ساتھ گھر جاتے ہوئے ٹھنڈی موٹر کی ونڈ اسکرین سے دونوں سڑکوں کی درمیانی گرین بیلٹ پر آگے کھجوروں کے درخت پر زرد رنگ کی ننھی ننھی کھجوروں کے گچھے، ان کے گرد آلود بڑے، بڑے نوکیلے پتوں اور گرین بیلٹ پر بچھی خاک آلود گھاس نے اس کا دل خراب کر دیا۔ سڑک پر ہر ایک دو ٹرن کے بعد ذرا دیر کو ساکت سا پانی جس کو ماما sea کہہ رہی تھیں آہنی جنگلوں میں مقید چپ چاپ پڑا تھا۔ بے اختیار اس کو آنکھوں و دل میں اتر جانے والی ٹھنڈک و تراوٹ بھرتا، اپنا سرسبز اور جھیلوں، تالابوں سے سجا roxas city یاد آ گیا۔ ماما اس کو سڑک کے دونوں اطراف اونچی نیچی عمارات کا تعارف کروا رہی تھیں اور وہ غائب دماغی سے سر ہلا رہی تھی۔ حتیٰ کہ ماما کو کہنا پڑا۔

''آر یو اوکے......میری......؟'' ماما اس کا شانہ ہلا رہی تھیں۔

''یس آئی ایم۔'' وہ چونک اٹھی۔ ٹریفک جام میں گاڑی رینگ رہی تھی اور ماما اس کو جانے کیا، کیا بتا اور سمجھا رہی تھیں اور وہ خالی، خالی نظروں سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔ گاہے باہر سڑک پر بھی نگاہ ڈال لیتی۔ آس پاس رینگتی گاڑیوں میں بیٹھے لوگوں کی قومیتوں کے اندازے لگا رہی تھی۔ ماما نے اس کی خاطر دو دن کا آف لیا تھا اور دو دن انہوں نے اسے خوب گھمایا، شاپنگ کرائی، بحرین فورٹ، ڈولفن کلب، لق ودق مالز، ریسٹورنٹس ان کی اتنی خاطر و توجہ پر اس نے خود کو لعنت ملامت کی کہ بہرحال اس کو ایک نہ ایک دن آج نہیں تو سال چھ ماہ بعد ہی جاب تو کرنا ہی تھی۔ اپنے پیروں پر تو کھڑا ہونا ہی تھا تو آج ہی سے کیوں نہیں؟ ماما نے اسے اپنے ہی علاقے کے کچھ لوگوں سے بھی ملوایا اور اس کے بحال ہوتے موڈ کو دیکھ کر انہوں نے اس کی نیچر آف جاب بتائی۔

''میڈ؟'' وہ چلا اٹھی۔

''تو......؟ پڑھا تم نے نہیں زیادہ تو اور کیا کرو گی؟''

''مگر ماما......'' اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''مائی چائلڈ۔'' ماما نے اسے پچکارا۔ ''لوگ تو اب جاہل میڈ بھی نہیں رکھتے......تم نے تو صرف ہائی اسکول پاس کیا ہے۔ میں ایسے میں تمہارے لیے

آفس جاب کہاں سے ڈھونڈوں؟ اسپتال جاب بہت زیادہ احساسِ ذمے داری مانگتی ہے جس کی تم میں کمی ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں؟''

''میں پڑھ لوں گی۔'' وہ منمنائی۔

''پڑھو......'' ماما نے بے نیازی سے کہا۔

''بیس برس کی ہونے جارہی ہو، اپنا خرچہ خود اٹھاؤ میں کب تک کروں گی؟''

ماما کی بے نیازی، اس کا جاب کرنا، میڈ کی جاب کرنا اور اپنے علاقے سے نکل کر دنیا کے کسی بھی علاقے، خطے میں کرنا...... کچھ بھی تو نیا نہ تھا۔

''یہ سب تو ہمارے گھروں میں ہوتا ہے، ہوتا آیا ہے...... پھر میں کیوں ایسے ری ایکٹ کر رہی ہوں؟''

رات گئے لاؤنج میں کارپٹ پر کشن بغل میں دبائے چینل سرچنگ کرتے ہوئے اس نے خود سے پوچھا، خود کو سمجھایا۔ اگلے ہفتے اس کو جوائن کرنا تھا۔ ماما اسپتال جانے لگی تھیں حسبِ معمول ان کی جاب کی ٹائمنگ طویل اور سخت تھی۔ ایمرجنسی کی صورت میں دو دن گھر نہیں آپاتیں۔ دن میں وہ حسبِ معمول صبح جلد ہی اٹھ جاتی۔ واشنگ، کلیننگ، کوکنگ...... اُف اتنی بکھیڑ اور کام والی وہ کب تھی مگر اب تھی کیونکہ اسے اپنے آپ کو مجبوراً ذمے دار پروف کرنا تھا۔ ماما نے پارلر لے جا کر اس کی بڑی اچھی ہیئر کٹنگ واسٹائلنگ کروادی تھی۔ اچھے فیشل اور سروس نے اسے فریش اور خوب صورت لک دے دیا تھا۔ اس روز کوئی ایمرجنسی تھی اور ماما کو نہ جانے کب آنا تھا اس نے نیٹ پر دیکھ کر نئی ایشین ڈش ٹرائی کی تھی۔ اوون بند کر کے وہ جوگرز پہن کر واک کرنے نکلی تو بد کے برج پر اپنے کچھ ہم وطنوں کو چرخی و ڈور لیے نیچے ٹھہرے ہوئے پُرسکون سمندر کے پانی پر جھکے ہوئے پایا۔ خلافِ عادت اس نے ہیلو ہائے کی اور ریلنگ سے نیچے جھک کر دیکھا۔ شفاف پانی میں ہاتھ برابر مچھلیاں اِدھر سے اُدھر مچلتی پھر رہی تھیں۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ جیکب، ساشا اور مجل سے رخصت ہوئی تو وہ ٹرائے اینگل، اسکوائر بن چکا تھا۔ چوتھی روز میری تھی۔ اب شامیں اکثر خوشگواریوں گزرنے لگیں کہ اکثر سمندر میں ڈور ڈالے ان تینوں کے ساتھ میری بھی شامل ہونے لگی۔ روز ہی وہ چھ آٹھ مچھلیاں پکڑنے میں کامیاب ہوجاتے اور پھر کبھی اس کے اپارٹمنٹ میں اور کبھی جیکب کے کچن میں وہ مچھلیاں تل بھون کے کھائی جاتیں۔ گو ان کا مزہ roxas city کی مچھلیوں کا سا نہیں تھا مگر مچھلیاں تو تھیں ناں۔

اگلی صبح جاب جوائن کرنا تھی اور ماما نے رات سونے سے پیشتر اسے برداشت، حاضر دماغی، درگزر، محنت، ایمانداری وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ پر مشتمل طویل لیکچر دیا تھا جسے وہ خلافِ عادت و معمول صبر اور توجہ سے سنتی اور گاہے بہ گاہے...

''یس، یس، اوکے ماما......'' کہتی رہی۔

مسز عارف کا گھرانا دو بچوں، بیوی پر مشتمل چار افراد کا پُرسکون، مہذب اور تعلیم یافتہ گھرانا تھا۔ روز میری کو ان کا گھر اور گھر کے افراد پسند آئے۔ گھر کی صفائی، ستھرائی، کپڑوں کی دھلائی جو فلی آٹو مشین میں کچھ دشوار نہ تھی۔ کپڑوں پر استری، بچوں کے چھوٹے موٹے کام، کچن کو آرگنائز رکھنا، یہ کام اس کے ذمے تھا۔ کھانا روحہ، مسز عارف از خود پکاتی تھیں لیکن ان کے کھانے اتنے ٹیسٹی ہوتے کہ اس کا انٹرسٹ انہیں سیکھنے میں بڑی جلدی ڈیولپ ہونے لگا۔ ابتدا میں کام ختم ہوتے، ہوتے اکثر شام ہوجاتی لیکن جلد ہی اسے ان کاموں کو کرنے کا سلیقہ وطریقہ آنے لگا تو وقت کی بچت بھی ہونے لگی۔ یوں میم روحہ اسے چھٹی دے دیتیں۔ میم روحہ مزاجاً نرم تھیں اور یہ جان کر کہ یہ اس کی پہلی جاب ہے اس کی حماقتوں اور غلطیوں کو درگزر کردیتی تھیں۔ عموماً ڈھائی تین بجے وہ فارغ ہوجاتی اور واپس اپارٹمنٹ آکر تنہائی اور ایک طویل شام میں رنگ اس وقت بھرتے جب جیکب کی شفٹ آف ہوتی...... لیکن

عجیب بات یہ تھی کہ جیکب کی موجودگی اس کی سنگت جہاں اس کو بھلی لگتی وہیں اس کی بے تکلفی اسے الجھن میں مبتلا کر دیتی۔ اسے لگتا کہ اس کے اندر ایک عجیب سی جنگ ہے۔ ہاں...... نہ...... ہاں...... نہیں...... ہاں۔ اسے لگتا کہ جیکب کے ساتھ تنہائی میں اس کے اندر کھلتے پھول اچانک جلنے لگتے ہیں اور طبیعت میں اچانک ہی جھلاہٹ اور بیزاری عود کر آتی۔ اب ایسے میں اکثر جیکب کا موڈ آف ہونے لگا تھا۔ ان ہی دنوں ساشا نے بتایا کہ سی سائڈ پر رات کو آباد ہوتے ہوئے ایک ریسٹورنٹ میں ویٹرس کی جگہ خالی ہے۔ سلیری پیکج بہت اچھا نہیں مگر ٹپ اچھی مل جاتی ہے سو شام چھ سے رات گیارہ بجے تک کے لیے اس نے ریسٹورنٹ کی جاب کے لیے ماما سے پوچھ کے اوکے کر دیا۔ یہ ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ تھا۔ ٹھہرے ہوئے سمندر کے کنارے کرسیاں، میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر جا بجا ڈومینو اور شطرنج کی بساطیں رکھی تھیں لوگ یہاں بیٹھ کر کھیلتے۔ ان کی فرمائش پر انہیں سوفٹ ڈرنکس، کافی، آئس کریم اور شیشہ سرو کیا جاتا۔ ہفتے میں چار دن کام کر کے اچھی خاصی رقم ٹپ کی شکل میں مل جاتی تھی یہ اور بات ہے کہ کبھی، کبھی بڑے ہی عجیب اور ناروا رویے بھی برداشت کرنا پڑتے۔ زندگی بڑے اچھے ڈھب پر چل نکلی تھی۔ ماما مطمئن تھیں، خود مختاری کا احساس شخصیت میں اعتماد کا حسن گھول رہا تھا۔ فیری کے نرس بننے میں سوا سال رہ گیا تھا پھر اسے بھی بحرین آ جانا تھا یا شاید کسی اور خلیجی ریاست۔ جیکب کی رنگ بھری دوستی نے زندگی کو بڑا خوشگوار بنا دیا تھا سب اچھا تھا لیکن...... کہیں کچھ ایسا بھی تھا جو باعثِ الجھن بن جاتا تھا۔ جیکب ایک الیکٹرانک گڈز کی شاپ پر... سیلزمین تھا اس سے دوستی اب دوستی سے بڑھ کر کچھ اور بھی بنتی محسوس ہو رہی تھی لیکن جیکب کے اس حوالے سے تقاضے اسے الجھا دیتے تھے۔ وہ ایک عام سی



پاکیزہ کی اور میری سالگرہ

میرا نام سیدہ علیشاہ ہے، بہاول پور میں رہتی ہوں۔ پاکیزہ مجھے اتنا پسند ہے، اتنا پسند ہے کہ اپنی سالگرہ بھی اب اس کے ساتھ منایا کرتی ہوں۔ پاکیزہ کی یوں تو تمام تحریریں ہی مجھے حد سے زیادہ پسند ہیں مگر جلترنگ کا کوئی جواب نہیں...... سب سے زیادہ پسند آنے والے ناول، چاندنی، عکس اور ترکِ وفا تھے۔

مجھے پاکیزہ کی تمام مصنفات کے ساتھ، ساتھ اس کی تبصرہ نگار بہنوں سے بھی خاص لگاؤ ہے۔ ہاں میں شاعری بھی کرتی ہوں اور انجم باجی میری حوصلہ افزائی بھی کرتی ہیں۔ اسی لیے یہ ایک ایسا ڈائجسٹ ہے جو مجھے میری کزنز کو اور میری تمام سہیلیوں کو بہت، بہت پسند ہے۔ اور ہم سب کی جانب سے بہت بہت سالگرہ مبارک۔

از: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

فلپائنی محنت کش لڑکی تھی جو جاب آورز کے بعد واقعی لڑکی ہی تھی امنگوں، آرزوؤں، خواہشوں، خوابوں سے گندھی۔ وہ اپنی ہم وطن دوستوں کے ساتھ ان کی ارینج کی ہوئی پارٹیز میں ان کی طرح ہی شوق ذوق سے شرکت کرتی، ان کا حصہ بنتی مگر آخر میں جب سب مدہوش ہونے لگتے دنیا کو بھول کر صرف اور صرف اپنی خواہشوں اور خوشیوں کے تابع ہوتے اس وقت روز میری کی طبیعت اکتا جاتی۔ اپنے آس پاس یہ بدمست وجود اسے کریہہ و بیزار کن لگنے لگتے۔

نہ جانے کیوں اب تک وہ ان پارٹیز میں اورنج جوس کے علاوہ کچھ بھی نہیں پیتی تھی۔ جیکب کے بہت اصرار پر بھی نہیں۔ دو مرتبہ تو ایسا ہوا کہ جیکب نے خصوصاً اس کے لیے ویک اینڈ پر خصوصی اہتمام کیے مگر دونوں مرتبہ اس کی طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ اسے معذرت کرنا پڑی اور پھر ہفتہ بھر تک ناراض جیکب کو مناتی رہی اس روز بھی وہ جیکب کو منا کر اور آئندہ کے لیے بہت سے وعدے کر کے گھر آئی تھی اور ٹی وی دیکھتے، دیکھتے صوفے پر ہی سو گئی تھی جب صبح کے قریب وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی تھی۔ ماما ہڑبڑا کر اٹھ آئی تھیں انہوں نے اسے پانی پلایا، سینے سے لگا کر اس کا سر سہلاتی رہیں اور پوچھتی رہیں کہ کیا ہوا۔

''پتا نہیں؟'' اس کی خود سمجھ میں نہ آیا۔

چند دن بعد دوسری مرتبہ پھر وہ اسی عجیب سے خواب سے دہشت زدہ ہو کر اٹھی تو ماما جاب پر تھیں۔ ان کی نائٹ تھی اور وہ تنہا تھی اور پھر یہ خواب ایک تواتر سے نظر آنے لگا۔ شروع میں تو وہ پانی وغیرہ پی کر ذرا شانت ہوتی تو فون سے دل بہلا لیتی، ٹی وی کھول لیتی لیکن بار، بار ایک تواتر سے یہ خواب آنے لگا تو وہ عجیب سی وحشت میں مبتلا ہو گئی۔ ایسے میں نہ تو ٹی وی اچھا لگتا نہ فون۔ ہر مرتبہ ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی، اٹھتی تو پسینے میں تر ہوتی۔ دل کی دھڑکن تیز ہوتی اور سانس یوں پھول رہی ہوتی جیسے میلوں دور سے بھاگتی آئی ہو۔ ہر مرتبہ خواب ایک ہی جیسی تفصیل سے نظر آتا۔ وہ دیکھتی کہ لق و دق بیابان میں چلی جا رہی ہے اور لوگ بھی ہیں مگر بے چہرہ جن کا وجود محسوس تو ہو رہا ہے مگر شناخت نہیں ہوتی۔ گاہے بہ گاہے خوفناک جانور ملتے ہیں۔ اس کی طرف بڑھتے ہیں مگر اچانک غائب ہو جاتے ہیں۔ پیاس لگی ہے پانی...... پانی ...... پانی کی خواہش اور امید میں وہ راہ میں آنے والی ایک عمارت کے دیوہیکل دروازے میں داخل ہونا چاہتی ہے کہ بے پناہ قوت اور جسامت والا ہاتھ اسے جھپٹ کر قریب ہی نظر آتے ایک دوسرے دروازے میں دھکیل دیتا ہے۔ اس تمام صورتِ حال میں ایسی عجیب سی خوفناک وحشت ہوتی کہ وہ جاگنے کے بعد جاگ کر پانی پینے، منہ ہاتھ دھونے کے بعد بھی سو نہیں پاتی۔

اس روز بحرین کا قومی دن تھا چھٹی تھی اور ریسٹورنٹ میں معمول سے زیادہ رش تھا۔ صبح مسٹر عارف کے گھر بھی کام کچھ زیادہ ہی تھا۔ ان کے گھر دوستوں کا گیٹ ٹو گیدر تھا اور جلدی، جلدی کرتے بھی اسے ان کے گھر سے نکلتے ساڑھے چار ہو گئے تھے۔ چھ بجے ریسٹورنٹ پہنچی بھاگم، بھاگ...... ایک مرتبہ تو دل چاہا کہ چھٹی کر لے مگر پھر آج زیادہ ٹپ کے لالچ میں شاور لے کر خوب گرما گرم کافی پی کر فریش ہوئی اور ریسٹورنٹ پہنچ گئی۔ واقعی آج رش زیادہ تھا تو ظاہر ہے کام بھی زیادہ تھا۔ سرو کرتے، ٹیبلز صاف کرتے اور موپنگ کرتے، کرتے ٹانگیں شل ہو گئیں۔ کندھے سن ہو گئے۔ اپارٹمنٹ آ کر یونیفارم اتار کر اس نے دور اچھالا اور ٹاپ اور شارٹس پہن کر اے سی آن کر کے بستر پر اوندھ گئی۔

اگلا دن چھٹی کا تھا۔ سوچا تھا خوب سوئے گی۔ ماما کل ہی کویت گئی تھیں کسی مریض کے ساتھ۔ مریض کی کنڈیشن اچھی نہیں تھی اسے دورانِ فلائٹ ٹریٹمنٹ کی ضرورت پڑ سکتی تھی ان کو دو دن بعد آنا تھا۔

اس روز بھی وہی خواب بالکل اسی کیفیت میں اس کی بیداری کا سبب بن گیا۔ فجر کی اذانیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ آج وہ واقعی پریشان ہوگئی تھی، اندر سے دل یوں کانپ رہا تھا جیسے شدید سردی میں وہ بے لباس کھڑی ہو۔ دل چاہا کہ ماما کو یا فیری کو فون کرے مگر نہیں...... کیا بتاؤں گی؟ کہ خواب میں ڈر گئی۔

دوبارہ سونا چاہا مگر نیند نہ آئی۔ بلڈنگ میں چند دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ یہ نمازی تھے جو صبح کی نماز کے لیے مسجد جارہے تھے۔ وہ بھی اٹھ بیٹھی اور کچھ سمجھ نہ آیا تو کافی بنا کر ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی۔ کچھ اچھا نہ لگا تو فون اٹھالیا۔ جیکب کے ایس ایم ایس تھے جن کو پڑھے بنا ہی اس نے فون رکھ دیا۔ دماغ میں عجیب سی اوھیڑ بن تھی۔ کیوں...... آخر کیوں؟ بار، بار ایک ہی خواب، ایک ہی انداز، ایک ہی تفصیل سے کیوں؟ صبح ہوئی تو معمول کی صفائی ستھرائی اور دھلائی جو چھٹی میں کی جاتی تھی...... کرتے، کرتے اچانک دل میں جانے کیا سمائی کہ کپڑے تبدیل کرکے وہ مسز عارف کے گھر چل دی حالانکہ آج آف تھا۔ روحہ اسے یوں دیکھ کر حیران ہوئیں اور خوش بھی۔ وہ عام روٹین میں جس طرح کام کرتی تھی ویسے ہی اس نے کام شروع کردیا لیکن اس کے انداز میں کچھ ایسا غیر معمولی پن تھا کہ روحہ نے بہت نرمی سے اسے پاس بلایا۔

''کیا بات ہے کچھ پریشان ہو؟'' ان کی بات پر وہ خاموشی سے ان کی شکل تکتی رہی پھر نفی میں سر ہلادیا۔

''اچھا...... تم نہیں بتانا چاہتیں تو تمہاری مرضی۔'' روحہ نے اپنے چھوٹے بچے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ پتا نہیں اچانک اسے کیا ہوا وہ بلک، بلک کر رودی۔

روحہ نے ذرا دیر اسے رونے دیا اور پھر اسے پانی پلاتے ہوئے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے انہوں نے اسے بچے کی طرح چمکار، چمکار کر حوصلہ دیا اور تب سسکیاں لیتے ہوئے دہشت زدہ سی ہو کر اس نے انہیں اپنے خواب کے بارے میں بتایا۔ تب ذرا دیر سوچنے کے بعد وہ بولیں۔

''دیکھو...... خواب اشارہ بھی دیتے ہیں لیکن کبھی کسی کم علم آدمی سے اس سلسلے میں راہ نمائی نہ مانگو۔ میں خوابوں پر یقین رکھتی ہوں لیکن تمہاری راہنمائی میری بساط سے باہر ہے۔''

''پھر......؟'' روز میری پریشانی سے ان کی صورت تکنے لگی۔

''ہاں ایک جگہ ہے......'' روحہ کچھ سوچ کر بولیں۔ ''ایک جگہ ہے جہاں میں تمہیں بھیج سکتی ہوں اور شاید نہیں یقیناً وہ لوگ تمہاری راہنمائی کرسکیں گے۔''

''کون...... کہاں؟'' روز میری بے تابی سے بولی۔

''ڈسکور اسلام۔'' روحہ نے جواب دیا۔ ''یہ ایک ادارہ ہے جہاں اسلام کے بارے میں لوگوں کو آگاہی دی جاتی ہے اور ان کی تربیت و تعلیم کی جاتی ہے۔''

''لیکن میں مسلمان نہیں ہوں۔'' میری نے تیزی سے کہا تو روحہ مسکرادیں۔

''ہاں، میں جانتی ہوں۔''

''تو......؟ وہ مجھے کیوں آنے دیں گے؟''

''کیوں نہیں آنے دیں گے۔'' روحہ نے کہا۔ ''تم جاؤ وہاں میڈم خدیجہ سے ملنا۔''

اسی شام ہی روز میری ڈسکور اسلام کی سادہ سی عمارت میں کھڑی تھی۔ آج اس نے ریسٹورنٹ سے چھٹی کرلی تھی۔

''مجھے میم خدیجہ سے ملنا ہے۔'' اس نے ریسپشن پر موجود صومالین لڑکی سے کہا اور آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد وہ خدیجہ ہاشم کے کمرے میں تھی، یہ دوہرے جسم کی سری لنکن خاتون تھیں۔ گہرے سانولے چہرے پر نرم سا تاثر اور شفیق مسکراہٹ نے چہرے کو کھلتے گلاب کا سا لک دے دیا تھا۔

روز میری نے اپنا تعارف کروایا اور اپنا مسئلہ

بتایا، وہ اس دوران گہری اور سوچتی نظروں سے اس کا جائزہ لیتی رہیں پھر یکا یک اٹھ کر اس سے معانقہ کیا اور مبارک باد دی۔ روز میری ہونق بنی ان کی صورت تکتی رہی۔ مترنم آواز میں اسے بتایا گیا کہ قدرت نے اسے جہنم کا ایندھن بننے سے بچالیا ہے اور اسے جنت کی نوید دی گئی ہے۔

''جی......؟'' روز میری کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''دیکھو روز میری۔'' میم خدیجہ نے گہری سانس لے کر اپنا اسکارف سر پر درست کیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ ''جو بیابان تم بار، بار دیکھتی ہو وہ زندگی ہے۔ جو جانور اور حشرات الارض تم اپنی طرف لپکتے اور اپنے آپ کو ان سے بچتے دیکھتی ہو وہ برے اعمال، بری عادتیں ہیں جن سے تم ہر بار بچ جاتی ہو...... کیوں...... اس لیے کہ تمہاری روح نیک ہے، تم ایک پاکیزہ روح ہو، تم جہاں جن لوگوں کے ساتھ رہتی ہو، اٹھتی بیٹھتی ہو اصل میں تم ان سے مختلف اللہ کی منتخب کردہ بندی ہو اسی لیے وہ ہر بار تمہیں برائیوں سے بچالیتا ہے۔ نیکی اور بدی، حق و باطل تمہارے سامنے ہیں۔ اللہ رب العالمین چاہتا ہے کہ تم نیکی اور حق کو چنتے ہوئے جنت مکین ہو۔ اسی لیے تم جو پہلا دروازہ دیکھتی ہو وہ جہنم ہے جس سے بچا کر تمہیں جنت کے دروازے میں داخل کیا گیا ہے یعنی تمہارے لیے دینِ اسلام چنا گیا ہے۔ سلامتی اور راستی کی زندگی اور موت تمہارا مقدر ہے۔'' وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھتی رہی۔

''کیا تم اسلام کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟'' سوال کیا گیا۔

''بہت زیادہ نہیں بلکہ......'' وہ متذبذب تھی۔ ''بلکہ شاید کچھ بھی نہیں۔''

''تم (Christianity) عیسائیت پر یقین رکھتی ہو؟'' ان کا اگلا سوال تھا۔

''نہیں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ ''مگر میری گرینڈ ما اور ماما کرسچن ہیں۔''

''اور تم؟''

''میں......!'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''دیکھو روز میری، تمہارا خواب بظاہر پریشان کن ہے مگر حقیقت میں خوشخبری ہے تمہارے لیے۔''

ڈسکور اسلام کی عمارت سے نکل کر سب سے پہلے میری نے ریسٹورنٹ کی جاب سے ریزائن کیا اور اگلے چار روز اس نے میم خدیجہ کے ساتھ گزارے۔ دنیا، آخرت، انسان کی تخلیق کا مقصد، خالقِ دو جہاں، جزا و سزا، خالق و مخلوق کا تعلق، بہت سے سوال، بہت سی الجھنیں...... مزید تین دن اس نے میم خدیجہ کی ہدایت پر حورا بنتِ عیسیٰ کی کلاس میں گزارے اور ایک دن اس نے میم خدیجہ کے سامنے کلمہ طیبہ پڑھا اور دل اور زبان سے اللہ رب العزت کی وحدانیت و بزرگی کا اعتراف کیا۔ میم خدیجہ، حورا بنت عیسیٰ اور کمرے میں موجود چند اور خواتین ٹیچرز نے اسے مبارک باد دی اور اسے ایڈمن میں صفیہ عبداللہ کے پاس جا کر اپنا نام رجسٹرڈ کروانے کو کہا گیا اور اگلے دن سے تجوید قرآن کی کلاس جوائن کرنے کو کہا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ ایک خاص مدت کے بعد اس کا امتحان ہوگا اور پھر اسے ایک سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔ اس دوران اس کو دو سو بحرینی دینار وظیفے کے طور پر ملیں گے۔

''کیا میں اپنا قبولِ اسلام دوستوں کو بتا دوں؟'' روز میری نے سوال کیا۔

''نہیں...... مناسب ہوگا کہ کچھ عرصہ ٹھہر جاؤ۔ اس دوران تم ان سوالوں کے جواب اور جان لو جو تم سے کیے جا سکتے ہیں پھر بتا دینا۔''

''اور میڈم روحہ کو؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں...... انہیں بتا سکتی ہو۔''

اور پھر اگلے تین دن گزر گئے میری جس کا مسلم

نام مریم رکھا گیا تھا ڈسکور اسلام نہ پہنچی ہاں تیسرے روز مسز روحہ عارف نام کی پاکستانی خاتون پہنچی جو زارو قطار رو رہی تھیں۔

''وہ مسلم تھی...... اس نے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ مسلم مری تھی لیکن وہ عیسائی قبرستان میں دفن کی جارہی ہے۔''

''کیا ......کون ......کب؟......کیا کہہ رہی ہو......کون مسلم تھی......کب کس کا انتقال ہوا؟''

ریسپشن پر گوسپ کرتی صومالین لڑکی کے کچھ پلے نہ پڑا۔ حوار باختہ ہو گئیں، خدیجہ کے پاس لے جایا گیا۔

''مسئلہ کیا ہے؟'' میم خدیجہ نے پوچھا۔

''آپ کے یہاں تین روز پہلے روز میری نام کی لڑکی نے اسلام قبول کیا تھا اور اس کا نام مریم رکھا گیا تھا۔''

''ہاں۔'' خدیجہ کا دل دھڑک اٹھا۔

''وہ یہاں سے میرے پاس آئی تھی۔'' روحہ آنسو پونچھتے ہوئے بتا رہی تھی۔ ''میں نے اسے مبارک باد دی۔ اسے مہمانِ خصوصی کی طرح بٹھا کر اس کے لیے کھانا تیار کیا۔ ہم سب گھر والوں کے ساتھ اس نے کھانا کھایا۔ ہم نے اس خوشی میں اسے گفٹ دیے وہ خوشی، خوشی گئی اور اگلے روز نہیں آئی۔ شام کو ہمارا فون اس کی دوست ساشا نے اٹینڈ کیا اور بتایا کہ رات سوتے ہوئے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ اس کی ماں فلپائن چھٹیوں پر گئی ہوئی تھی اسے فوراً بلایا گیا وہ آج آئی ہے اور اب اس کی تدفین کی تیاری ہو رہی ہے۔ وہ یہاں بحرین میں ہی دفن کی جارہی ہے مگر عیسائی قبرستان میں۔''

''نہیں......نہیں، ہمارے پاس ریکارڈ ہے اس کا قبولِ اسلام کا اندراج ہے۔'' صفیہ عبداللہ طلب کی گئیں۔ وہ ایک بیزار سے مزاج کی بحرینی خاتون تھیں۔ ریکارڈ دیکھا گیا تین دن پہلے کا کوئی اندراج نہ تھا۔

''کیوں.....؟'' میم خدیجہ غضب ناک ہو گئیں۔

اس روز صفیہ جلدی گھر چلی گئی تھیں اور روز میری کا مسلم ہونا رجسٹرڈ نہ ہو سکا تھا۔ خدیجہ نے صفیہ کو برا بھلا کہتے ہوئے ڈسکور اسلام کے مہتمم اعلیٰ محمد عبدالوہاب کو فون کیا اور اس تدفین کو عیسائی قبرستان میں عیسائی طریقے سے تدفین رکوانے کی درخواست کی۔

محمد عبدالوہاب نے تسلی سے ان کی پوری بات سنی اور نہایت ٹھنڈے لہجے میں انہیں صبر کی تلقین کی۔

''خدیجہ...... ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ وہ اسلام قبول کر چکی تھی اس کے حلقے میں کوئی گواہ نہیں تو ہم یہ تدفین کیسے رکوا سکتے ہیں؟''

''کوئی تو صورت ہو گی؟'' خدیجہ کی آواز رندھ گئی۔ ان کی آنکھوں میں وہ معصوم سی نوعمر ترچھی ترچھی آنکھوں والی بچی کی صورت گھوم رہی تھی۔

''کوئی نہیں۔'' محمد عبدالوہاب کا جواب سن کر وہ چلا اٹھیں۔

''تو......اس پیاری مسلم بچی کو میں کافروں کے طریقے سے دفن ہونے دوں؟''

''کیا، کیا جاسکتا ہے خدیجہ بہن۔'' محمد عبدالوہاب کہہ رہے تھے۔ ''اللہ علیم و خبیر ہے، وہ اپنے بندوں کا حال ہم سے بہتر جانتا ہے۔'' ذرا توقف کے بعد پھر بولے۔

''صرف ایک صورت ہے کہ......ہم اس کی ماں کو حقیقتِ حال بتا دیں۔ اگر وہ ہماری بات کا یقین کر لیتی ہیں تو ٹھیک ورنہ ہم اسی قبرستان میں ذرا دور کھڑے ہو کر اس موقع پر اس نیک روح کے لیے دعائے خیر کریں گے۔ قبول کرنے والا وہ مالکِ دو جہاں ہے۔ میں خود اور میرا اسٹاف ابھی وہاں جاتے ہیں ...... آپ صبر کریں۔'' خدیجہ نے تھکے تھکے ہاتھوں سے فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور آنسو پونچھ لیے۔



قسط 7

رنگِ خلش

رفاقت جاوید

کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری زندگی کے حسین لمحے بھی خلش کی نذر ہو جاتے ہیں اور یہ جوں جوں اس احساس کو من کے اندر گہرائیوں میں دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو خلش کے بے حساب رنگوں کی پردہ نشانی ہمیں مضطرب کرنے لگتی ہے اور مکافاتِ عمل کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے... گناہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا... سزا ہو لازم و ملزوم ہے۔ اس کے باوجود امیدِ شجر سے گہرا ربط و تعلق رکھنا دوا بھی ہے اور عبادت و ریاضت بھی ہے، نشاط وصل بھی اور وجدان بھی ہے۔

ممکن ہے ایسا وقت ہو ترتیبِ وقت میں
دستک کو تیرا ہاتھ بڑھے میرا در نہ ہو



اب اس رشتے کا فیصلہ ایک ایسا دھماکا تھا جس نے اس کی بکھری ہوئی شخصیت کو یکجا کر دیا تھا۔ ماں کے والہانہ پیار و چاہ سے بھی متنفر ہو کر کم مائیگی کی بے آب و گیاہ وادیوں سے خود کو باہر نکالنے کے لیے وہ چونکنا اور متحرک ہو گیا تھا۔ سارا منظر اب بدل چکا تھا۔ کہانی کے کردار اور اسکرپٹ پر اسے کلی اختیار تھا۔

''ہیلو جی کون......؟'' عادل نے موبائل پر اَن نون نمبر دیکھ کر یس کا بٹن دبایا تو دوسری طرف سے آنے والی آواز پہچان نہ سکا۔

''عادل میں وردہ بول رہی ہوں۔ آپ نے تو پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔''

''اوہ وردہ تم...! کیسی ہو...... سم بدل لی ہے تو پہچانوں گا کیسے؟'' وردہ کے عجیب سے لب و لہجے پر پہلے تو وہ چونکا پھر قدرے سنبھل کر بولا۔

''جی عادل میں جو رات بھر آپ سے اسکریبل کھیلا کرتی تھی، شطرنج کی بازیوں میں جان ڈالا کرتی تھی۔ وہی وردہ، جس کی زبان آپ کو بھائی مگر دل عادل، عادل پکارا کرتا تھا۔ آپ نے مجھے کس بات پر ریجیکٹ کر دیا۔ آپ کو تو ریجیکشن کے کرب سے گہری واقفیت بھی ہے اور واسطہ بھی بہت پرانا ہے...... پھر آپ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟'' وردہ روتے ہوئے بولے جا رہی تھی، عادل اتنا شارپ اور حاضر جواب تو تھا نہیں کہ فوراً جواب دے پاتا سو خاموش رہا۔

''عادل آپ نے مجھے بے پناہ اہمیت اور بے تحاشا محبت دے کر مجھے بہت بڑے دھوکے میں رکھا۔ آخر میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا؟'' وہ پھر بے بسی اور تلخی سے بولی۔

''میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا...... وردہ، میں حیران ہوں کہ سب غلط فہمی کا شکار کیسے اور کیوں ہو گئے؟ تم تو میری چھوٹی بہن ہو، کیا بھائی کا اتنا بھی حق نہیں بنتا تھا، ہمارے ذہن کس قدر چھوٹے اور تنگ ہیں۔'' وہ نہایت دھیمے انداز میں بول رہا تھا۔

''یہ تو اٹل حقیقت ہے عادل...... آپ کو بھی ہر حال میں ماننا پڑے گی۔ آئی لو یو اور شادی بھی آپ سے ہی ہو گی۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے مستحکم لہجے میں بولی۔ ''میرے اس دل میں آپ نے اتنی جگہ بنالی ہے کہ کوئی دوسرا اس میں سما نہیں سکتا۔''

''وردہ پلیز جذباتی پن سے باہر نکل آؤ۔ خود میں توازن پیدا کرنے کی ہمت کرو۔ شادی دو دلوں، دو ذہنوں کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ جو یہاں نہیں ہے۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''عادل میں نہیں جانتی کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اور مجھے یہ بھی یقین نہیں آ رہا کہ اب میں آپ سے بات کیوں کر رہی ہوں؟'' اس کا لب و لہجہ ایک دم بدلا۔

''وردہ میں ممی کی رفاقت میں اپاہج بن کر زندگی گزار رہا تھا، میں بقیہ زندگی تمہارے رحم و کرم پر گزارنے سے نفرت کرتا ہوں، اگر تم نے میرے پاکیزہ پیار اور لگاؤ کو غلط رنگ دے ڈالا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں...... اپنے دل و دماغ سے پوچھو کہ میں نے کوئی اشارہ تمہیں اپنا جیون ساتھی بنانے کا دیا تھا؟'' وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔

''عادل آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ میرا پیار آپ کے پاؤں کی زنجیر بن کر آپ کو محتاج اور غلام بنا دے گا۔ آپ نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے، آپ ذرا اپنے ذہن کو ریورس کریں۔ کیا ان بیتے ہوئے لمحوں میں ایک لمحہ بھی ایسا آیا تھا جب میں نے آپ کو پابند کرنے کی کوشش کی ہو یا آپ کے دل میں جگہ بنانے کے لیے کوئی انوکھی اداکاری کی ہو؟'' وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

''کاش ایسا کر لیتیں تو آج اتنا دکھ...... اس قدر پچھتاوا اور غم مجھے نہیں ہوتا۔ فیصلہ بہت جلد شروع میں ہی دو

نوک ہو جاتا نہ تم ہرٹ ہوتیں نہ مجھے بے گھر ہونا پڑتا۔'' وہ آہ بھر کر بولا۔'' وردہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو..... تم میں کسی چیز کی کمی نہیں...... بے انتہا اور بے شمار خوبیوں کی مالک ہو، تمہارے..... نصیب میں بہت محبتیں نچھاور کرنے والا ہم سفر لکھ دیا گیا ہے، مجھ میں کیا کھوجتی ہو...... ایک نامکمل ادھورا مرد تمہیں بھلا کیا دے سکتا ہے؟ وردہ میری ریکوئسٹ ہے کہ اس دیوانے اور پاگل کو بھول جاؤ۔ یہ تمہارے قابل نہیں...... میری بات پر بھروسا کرو...... میرے گھر کا ماحول بھی تمہارے لیول پر پورا نہیں اتر سکتا۔ تم ایک شوخ و شنگ اور زندہ دل لڑکی ہو، یہ قبرستان تمہارا مسکن نہیں۔'' وہ دکھ سے کانپنے لگا تھا۔

'' لیکن میں اس دل کو نہیں سمجھا سکتی۔ میں شدت سے آپ کو اور آپ کے ساتھ گزرے ہوئے ایک مہینے کے ہر سیکنڈ کو مس کرتی ہوں۔ عادل ذرا سوچیں کہ ہم اسی دلنشیں و دلفریب وقت کو واپس لاسکتے ہیں۔'' وہ فسوں میں کھوئی پُراسرار لہجے میں بولے جارہی تھی۔ عادل اس کی باتیں سن کر خود کو خطاوار اور مجرم تصور کرنے لگا۔ ندامت اور پچھتاوے کی لو بھڑکی تو آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ لبوں نے بہ مشکل جنبش کی۔

'' وردہ تم اتنی دور نکل جاؤ گی میں نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔'' وہ اسے سمجھانے لگا۔'' دیکھو میں تو بہت بدنصیب انسان ہوں۔ میری پیدائش پر ہی غور کرلیا ہوتا، میری حسرت زدہ زندگی کو ہی پرکھ لیا ہوتا۔ میں آج تمہیں جیسا بھی نظر آتا ہوں، اس میں میری لیاقت اور ذہانت کا کوئی رول نہیں..... میری اچھائیوں اور خوبی کا کوئی حصہ نہیں...... یہی اصل سچائی ہے جس کی زمانہ گواہی دیتا ہے۔ یہ ممی کے ایثار اور بے لوث محبت کا اجر ہے، میں نے اپنی زندگی میں اسی احسان مندی کے بدلے میں اپنی ماں کی ہر بات پر سر تسلیم خم کیا۔ تصنع اور بناوٹ میری فطرت میں نہیں تھی۔ وہ آج بھی نہیں اس لیے وردہ تم میری کسی بھی اچھائی اور خوبی سے امپریس ہو کر مجھے اپنانے کی کوشش مت کرو۔ میں ممی کے بغیر ایک سوکھا پتا ہوں جو آندھی اور طوفان کی نذر ہوچکا ہے۔ اب میں نے نیا جنم لینے کی ٹھان لی ہے، میری شخصیت اور میرے کردار پر ممی کی چھاپ نہیں ہوگی۔ عادل علی رضا اپنے نام، اپنے نشان اور اپنی نئی پہچان سے اٹھے گا۔ اگر تم نے درمیان میں انٹرپٹ کردیا تو میں بے نشان ہی مر جاؤں گا۔ میں نے نہ تمہیں پہلے فریب دیا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی بناوٹی اور چھوٹی باتوں سے بہلانے کی کوشش کی تھی۔ میں جو بھی تھا اور جو بھی ہوں ہر طرح کے مکروفریب سے پاک ہوں۔ اپنے ماموں کو جاکر سمجھاؤ اور میری گواہی دو..... کہیں میرے کردار پر لگایا ہوا یہ بدنما دھبا دھونے میں میری عمر ہی نہ بیت جائے۔'' وہ لمبی چوڑی تمہید باندھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

'' عادل زندگی میں دوسروں کے غلط اندازوں اور طعنوں تشنوں سے خود اپنی دل آزاری نہیں کرتے۔ انسان کو ڈھیٹ اور یادداشت کا کمزور ہونا چاہیے۔ سب کچھ فراموش کرکے لوٹ آئیں۔ آپ کی وردہ آپ کے انتظار میں زندگی بتاسکتی ہے۔ کیا ایک لڑکی کسی دھوکے باز کے لیے ایسا المناک فیصلہ کرسکتی ہے؟ عادل آپ کو اپنی وقعت اور حیثیت کا ہلکا سا بھی اندازہ نہیں۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

'' تو مجھے خود کو چیلنج کرنے کا چانس تو دو...... اور تم اپنی زندگی کے بارے میں بہترین فیصلہ کرو۔ مت کرو میرا انتظار......'' وہ غمزدہ ہوکر بولا۔

'' ایسا کبھی نہیں ہوگا عادل......'' وردہ نے سختی سے کہا اور فون بند کردیا۔

'' عجیب سچویشن ہے۔ ہر کوئی میری زندگی کو لیڈ کرنے کے لیے تیار ہے۔'' وہ حیرت و تاسف سے بڑبڑایا اور فون آف کرکے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔'' جو جان فدا کرنے کو تیار ہے، وہ میرے دل کے کسی گوشے میں موجود نہیں۔ جس پر میں فدا ہوں، اس کا دل میری محبت و چاہ سے خالی ہے۔ کیا کروں......؟ میرے رب مجھے سیدھا راستہ

دکھا دے۔" ابھی تک وہ یونیورسٹی کی ریذیڈنس میں ہی قیام پذیر تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے خوب صورت لش گرین لان پر نظر جمائے دو رستوں میں سے ایک رستے کا چناؤ کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ "چیلنج کے بغیر زندگی کا کیا مزہ اور کیا فائدہ......؟ نمرا تمہارا حصول مقصدِ حیات ہے اور وردہ تمہارا مجھے حاصل کر لینا میری موت ہے، پلیز وردہ مجھے معاف کر دو......پلیز وردہ......"

☆☆☆

نمرا آج پھر عادل کی عدالت میں پیشی کے لیے پہنچ گئی تھی۔ لان میں اس کی سہیلیوں اور کلاس فیلوز نے ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ نمرا کے بارے میں ہر لیول کی ڈسکشن عروج پر تھی۔ حمیرا خاموش بیٹھی سب کی باتیں سن کر بالآخر چیخ اٹھی۔

"فار گاڈ سیک لڑکیوں کچھ رحم کرو اس مسکین پر......ہم اسے morally support نہیں کریں گے تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ اس وقت معاملہ بہت گمبھیر ہے۔ سر کا آرڈر ٹالنے سے وہ بچ سکتی تو کب کی اس پریشانی سے کنارہ کشی اختیار کر چکی ہوتی۔ طوعاً و کرہاً ایک اسٹوڈنٹ ہونے کے ناتے وہ حکم عدولی نہیں کر سکتی۔ استاد کا اپنا رعب داب بھی تو اسٹوڈنٹ کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، چلو شغل ہی سہی۔ وقتی مزہ ہی سہی......" آمنہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں کو وہ اتنی گھٹیا اور بے عزت لگتی ہے کہ اس کا ردعمل ایسا ہوگا۔ یہ مسئلہ اس کے اصولوں کی وجہ سے ہی اتنا سیریس ہو گیا ہے۔ بیسیوں بار بولا کہ اپنی امی کو اصل بات بتاؤ اور صاف انکار کر دو۔" حمیرا نے سنجیدگی سے کہا۔

"ایک تو نمرا خود کو بہت عقلمند جو سمجھتی ہے ہم سب کا خیال ہے کہ ان سے شادی کا فیصلہ بہترین رہتا۔ سر عادل ایسے گھٹیا سے عاشق تو ہیں نہیں۔ بڑا فٹ فاٹ دل رکھتے ہیں۔ اور ذہانت کا تو جواب نہیں۔ ایسا لیکچر پیش کرتے ہیں کہ جیسے M I T سے چرا لائے ہوں۔" آمنہ نے امپریس ہوتے ہوئے کہا۔

"بھئی! یہ دلوں کے سودے ہیں، اس میں عقل سمجھ کارتی بھر دخل نہیں۔" حمیرا نے کہا۔

☆☆☆

"عادل......آپ نے اس کی خاطر مجھے ٹھکرا دیا؟ کیا حیثیت ہے اس کی۔ کبھی غور کیا ہے......اس کے چہرے پر مسکینیت کی چھاپ، آنکھوں میں حسرتوں کے سائے اور لبوں پر پژمردہ آہیں...... یہ ہے آپ کی پسند......" وہ حقارت سے کہہ رہی تھی۔

آج وردہ اس کے آفس میں آ چکی تھی اور وہاں نمرا کو دیکھ کر ایسی غیر متوازن ہوئی کہ لاوا جو کئی ہفتوں سے اس کے اندر ابل رہا تھا۔ پھٹ پڑا۔ نمرا کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی۔

"وردہ......گھریلو مسائل گھروں تک ہی محدود رہیں تو اچھا ہے، تم میری اجازت کے بغیر یہاں کیوں آئی ہو۔" عادل نے دھیمی آواز میں کہا۔

"منگنی مجھ سے اور شادی کسی اور سے......یہ ہے آپ کی اصلیت......؟" وہ چیخی۔

"تمہارے پاس منگنی کا ثبوت تو ضرور ہوگا۔" وہ ذرا آہستگی سے بولا تو وہ بھی ایک دم سے ذرا سی مدھم پڑ گئی۔

"تم یہ تو مانتی ہو کہ مجھے تم سے والہانہ محبت اور لگاؤ تھا اور اب بھی ہے لیکن صرف ایک چھوٹی کزن سسٹر کے روپ میں......تم نے میرے پیار کو اپنی سوچ کے مطابق جو رنگ دیا۔ میں اس سے بے خبر تھا۔ تم نے مجھے دل و جان سے چاہا یہ بھی سچ تھا۔ لیکن میں نے ایسا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پھر پھپو اور ڈیڈی نے تمہاری خواہش کے مطابق رشتہ طے کیا۔ نہ مجھ سے مشورہ لیا گیا نہ ہی اپنا فیصلہ مجھے بتانے کی ضرورت محسوس کی۔ میرے انکار و اعتراض کے باوجود یہ زبانی کلامی رشتہ جڑا رہا۔ اور تم میری نظروں سے ایسے اوجھل ہو گئیں جیسے ہماری جان

پہچان نہیں تھی۔ یہ سب ناٹک تم نے کیوں کھیلا تھا۔ پھر شادی کی ڈیٹ کا فکس ہونا بھی ممی کی زبانی معلوم ہوا اور تمہارے ماموں تک میرا انکار تو پہنچ گیا تھا۔ ساتھ ہی مجھے گھر سے نکلنے کی دھمکی سنادی گئی۔ وردہ میں مرد ہوں، میری غیرت کوللکارتے وقت ڈیڈی کو مردانگی، انا اور غیرت کا اندازہ کیوں نہیں ہوا؟ کیا مردانگی صرف ان کی زر خرید غلام ہے، انا کی طاقت صرف انہی کی کمانڈ ہے اور غیرت فقط انہی کی پراپرٹی ہے؟" وہ نہایت غصے میں تھا مگر پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"وردہ میں نے گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ آج غور سے سن لو...... میں اسی عام سی لڑکی کے ساتھ اپنا گھر بساؤں گا کیونکہ یہ لڑکی میری نظر میں بہت اعلیٰ وارفع ہے، تمہارا اس سے مقابلہ کرنا بھی اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ میں نمرا سے پیار کرتا ہوں۔ ایک جیتی جاگتی باہوش لڑکی سے۔ یہ مٹی یا پلاسٹک کا کھلونا نہیں...... نہ ہی موم کی گڑیا اور کانچ کا ڈیکوریشن پیس ہے کہ جس کی کوئی قعت اور عمر نہیں ہوتی۔" وہ اتنے ولولے و جوش سے بول رہا تھا کہ اس کا لہجہ کانپ رہا تھا، جسم لرز رہا تھا اور آنکھیں انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ چہرہ شعلوں کے مانند بھڑک رہا تھا۔ نمرا نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور سرعت سے باہر نکل گئی۔ وردہ جو ابھی تک کھڑی تھی پاؤں پٹخ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

"ماما! آپ کا بے حد شرمیلا سات بیٹوں جیسا واحد بھتیجا میں نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے تو مجھے اس ڈبل پرسنیلٹی والے انسان سے بال، بال بچادیا۔" وردہ نے ماں سے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "شرافت کی انتہا دیکھیے کہ ایک تیر استعمال ہو رہا تھا دونشانوں کے لیے۔ ماما بعض اوقات ہم سب کچھ جانتے ہوئے خود کو بے وقوف بنا کر عارضی اور وقتی خوشی پر اپنی تمام عمر قربان کردیتے ہیں۔ مجھ سے بھی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ جس کا ازالہ بہت جلد ہوگیا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

"جب تم نے اپنی غلطی کو تسلیم کرلیا ہے تو پھر رونا کیسا؟ ذہنی سکون اور دلی طمانیت سے ہمکناری ہونی چاہیے۔" عصمت نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ماما میں نے اسے دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ اِک ادھورا اور بچگانہ طبیعت کا مالک ہے، ایسے مرد بہترین شوہر تو ثابت ہوسکتے ہیں لیکن باپ کے روپ میں بالکل ناکارہ اور ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں۔ میں نے پہلی سوچ کو مدِنظر رکھ کر دوسری سچائی کو پسِ پردہ ڈال دیا تھا۔" وہ آنسوؤں کی وجہ سے بات جاری نہیں رکھ سکی۔ خاموشی سے آنسو صاف کرنے لگی۔

"وردہ مجھے ایک تعلیم یافتہ، برسرِ روزگار، عقلمند لڑکی سے اس ردِعمل کی امید نہیں تھی۔ بیٹا جو ہوگیا ہے اسے بھول جاؤ جو ملنے والا ہے اس کے لیے دعا گو رہو کہ تمہارے لیے بہترین ہو۔" عصمت نے اپنے درد کو اس سے چھپاتے ہوئے ہمت و حوصلے سے کہا۔

"ماما میں شادی نہیں کروں گی۔ دل ایک ہے اس میں دوسرے کی دخل اندازی کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ مذاق تو نہیں کہ اسے نکال کر دوسرے کو آباد کرلوں۔" وہ ماں کے کندھے پر سر رکھ کر سسک اٹھی۔

"بیٹا! وہ قابل نہیں تھا جتنی تم نے اسے اہمیت دے ڈالی۔ سنبھلنے کی کوشش کرو۔" عصمت نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو بھائی سے زیادہ بھابی پر غصہ ہے، آج تک اسے اپنے پلو سے باندھے رکھا۔ جب تمہارے حقوق کی باری آئی تو اسے پلو سے کھول کر آزاد اور بے مہار کردیا۔ ہے ہی بدنیت عورت اس لیے تو اس کی آزمائش اور امتحان میں کبھی تخفیف نہیں ہوئی۔"

"ماما...... ایسے مت کہیں، مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ مامی، نیت کی صاف اور کھری عورت ہیں، مجھے ان پر ترس

بھر شک نہیں...... انہوں نے عادل کو گھر سے کیوں جانے دیا۔ ضرور اس کے پس پردہ کوئی بہت بڑی منطق ہے۔''
وردہ نے ماں کو سنجیدگی سے سمجھانا چاہا۔

''جو بھی ہے بس ان تمام ابنارمل شخصیات کو بھلانے کی کوشش کرو۔ آگے بہت حسین اور طویل خوش آئند زندگی تمہاری منتظر ہے۔ اسے گلے لگالو۔ اِک بے وفا، خودغرض اور نادان انسان کی خاطر تم زندگی کی مسرتیں، راحتیں اور فرحتیں تیاگ دو گی، یہ خود سے ناانصافی ہے میری جان، میری اور اپنے پپا کی عمر دیکھو۔ ہمارے جیتے جی تم اپنے گھر کی ہو جاؤ۔ سب والدین کی طرح ہماری بھی یہ خواہش بالکل جائز اور بجا ہے۔'' وہ ملتجی نظروں سے دیکھ کر التجائیہ لہجے میں بولی۔

''ماما اگر میں عادل کو دل سے نکال سکی، اس کے حسن سلوک اور بلند کرداری کو بھلا سکی تو آپ کو مطلع کردوں گی۔ آج کے بعد اس موضوع کو چھیڑنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میں ایک فریبی، جھوٹی اور چالباز لڑکی نہیں ہوں کہ دل میں بساؤں عادل کو اور شادی کسی اور سے رچا کر اس کے بچے پیدا کروں۔''

وردہ کئی راتوں سے مسلسل جاگ رہی تھی۔ ایک انوکھے سے احساس میں مقید ہر وقت عادل کی طرف سے رنجیدگی پر کبھی تڑپ اٹھتی تو کبھی نفرت آگین سوچوں کی گرفت میں آجاتی۔ اس کا دل و دماغ اس سچائی کو تسلیم کرنے سے انکار کررہا تھا کہ اس میں تو کسی چیز کی کمی نہیں تھی پھر ایک مڈل کلاس کی لڑکی کو اس پر فوقیت کیوں کر دی گئی۔ اس نے تو عادل سے خاصی امیدیں وابستہ کررکھی تھیں۔ جن میں سے ایک بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ عالم وحشت میں گھبرا کر بستر پر بیٹھ کر خود کو کوسنے لگتی۔ اور پھر ایک رات وہ بستر پر ہی سربسجود ہوگئی۔ اور اس وقت تک اپنے رب کے حضور اشکوں کا نذرانہ پیش کرتی رہی جب تک اس کے دل کے تمام داغ دھل نہ گئے، زخم بھر نہ گئے، اس کے دل کے نہاں خانوں سے شرک مفقود ہو گیا تھا۔ اور اپنے ہی جیسے انسان سے لولگانے اور ایک عظیم شرک میں ملوث ہو کر اس پاک ذات کی ناراضی اور عذاب الٰہی سے مکمل طور پر آزاد ہو چکی تھی۔ ایسی ہی محبت، عشق اور عقیدت اپنے رب سے کی جائے تو دو جہان سنور جائیں۔

اس کائنات کی ہر شے ویسی کی ویسی ہی تھی۔ مگر وردہ کا دل بدل چکا تھا۔ اب وہ زمین آسمان میں معلق نہیں تھی۔ اس کے پاؤں زمین پر ٹک گئے تھے۔ شرک کو دل سے نکال کر اس نے اپنی نفی کردی اور اپنے رب کے اتنے قریب ہوگئی کہ نئی صبح اِک نئے جنم کے ہمراہ طلوع ہوئی۔

وہ اسپتال جانے کے لیے تیار ہوئی تو اس کے چہرے کی مسکراہٹ و بشاشت کو دیکھ کر عصمت لحہ بھر کو ٹھٹک گئیں۔ مگر سوال کرنا مناسب نہیں لگا۔ دل ہی دل میں شکرانہ ادا کرتی ہوئی اسے ڈھیروں دعائیں دینے لگیں۔ آج وردہ نے ناشتا بھی خوب ڈٹ کر کیا تھا۔ وہ اس کا اوپر نیچے آگے پیچھے جائزہ لیتے ہوئے حیران بھی تھیں خوفزدہ اور پریشان بھی..... ناشتے کے بعد وہ اپنا کمپیوٹر بیگ اٹھائے کمرے میں چلی گئی۔ جب باہر نکلی تو عصمت ششدر رہ گئیں۔ وردہ کو جس چیز سے بے پناہ نفرت تھی سراسر فریب، دھوکا اور اداکاری لگا کرتی تھی، وہ حجاب تھا۔ اس نے اپنے سر کا ہی نہیں سفید گاؤن پہن کر اپنے بدن کا بھی حجاب کرلیا تھا۔ چہرے پر بے بسی تھی نہ ڈر اور خوف تھا نہ ہی کسی قسم کی شرمندگی اور پریشانی تھی۔ روحِ حقیقی وجود میں سرائیت کرگئی تھی۔ اس نے حیرت زدہ ماں کو اللہ حافظ کہا۔ اور مین ڈور کی طرف چل دی۔

☆☆☆

وردہ، عادل کا دامن چھوڑ کر صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑ چکی تھی۔ لیکن عصمت سنبھل نہیں سکیں۔ خاندان بھر میں کسی کو شکل دکھانے کے قابل نہیں رہیں۔ سائرہ سے مرنا جینا ختم کردیا۔ کیونکہ وہ موردِ الزام

اسے ہی ٹھہراتی رہیں۔ کیونکہ عادل ماں کی کسی بات کو ٹالنے کا والا بچہ نہیں تھا۔ اسے گھر سے بھگانے اور الگ سیٹل ہونے میں سائرہ کا ہاتھ تھا۔ اسی کا فیصلہ تھا۔ لاکھ دلائل دینے کے باوجود عصمت نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔ اور دوستی، ہمدردی اور بے غرضی کا جذبہ گم شدگی اختیار کر گیا۔ جس کا قلق سائرہ کو کبھی چین نہیں لینے دیتا تھا۔ جبکہ وہ اس سچائی سے بھی انکار نہیں کرتی تھی۔ اس کے تجربات و مشاہدات سے اس نے یہی دیکھا تھا، محسوس کیا تھا اور اپنی ماں کی زبانی سیکڑوں بار سنا تھا کہ پانی کبھی اونچائی کی طرف نہیں جاتا اترائی کی طرف گرتا ہے۔ وہ تو نشیبی علاقوں کی باسی تھی۔ ان الزامات سے کیسے بچ سکتی تھی۔ بات تو یہ تھی..... کہ ہر بات پر جی حضوری ہے تو امن ہے۔ ورنہ لڑائی اور کنارہ کشی عمر بھر کی ہجولی بن جاتی ہے۔

زندگی میں بھی چناؤ ہے، جہاں کمزور پیچھے ہے اور طاقتور آگے ہے پھر اس کا قوی لوگوں سے کیا مقابلہ.....

سائرہ انہی حالات کا شکار تھی۔ بیٹا بھی ہاتھ سے گیا، وردہ کو بھی کھو دیا اور بدقسمتی یہ کہ اپنی ہمدرد محسن دوست عصمت پر بھی مٹی ڈال دی۔ دل چاہا کہ یونیورسٹی چھوڑ دے۔ حسنات کے قید خانے سے رہائی حاصل کر لے اور اس دنیا کو خیر باد کہہ دے جو سراسر سراب کے سوا اور کچھ نہیں...... لیکن وہ فقط سوچ سکتی تھی۔ عمل کرنے کے لیے جرأت وہمت کہاں سے لاتی۔

نمرا کو دیکھ کر ذہن و قلب میں اچھوتا سا احساس جاگا تھا۔ من میں کلیاں چٹکنے کی صداؤں نے اس نئے رُت پیش ... رعنائیاں بکھیر دی تھیں۔ مگر اس کا اظہار عادل کو نہ ہونے دیا تھا۔ وہ اپنے جیون ساتھی کا انتخاب جس اعتماد اور ولولے سے کر رہا تھا۔ زندگی کا یہ موڑ اس کے حال اور مستقبل کے لیے بہت اہم تھا۔ اس پر اس کی خوشیوں و کامرانیوں کا دارومدار تھا۔ سائرہ نے عادل سے ملنے کے بعد محسوس کیا تھا کہ جب سے اسے اپنی زندگی کو اپنے زور بازو پر گزارنے کا ادراک ہوا تھا، وہ پُرسکون نظر آنے لگا تھا۔ وہ کمسنی اور طفولیت کے گرداب سے نکل کر خود کو معتبر سمجھنے لگا تھا۔ اس کی چال میں خود اعتمادی اور گفتگو میں پختگی تھی۔

اس نے بڑا گھر کرائے پر لینے کے بجائے تین بیڈ اپارٹمنٹ لینے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ اس کا اپنا گھر جو اس کی وراثت تھی۔ وسیع وعریض تھا، سال خوردہ ضرور تھا مگر بہت آرام دہ اور شاہانہ آرکیٹیکچر کا لاجواب شاہکار...... اس نے سوچ بچار کے بعد اپارٹمنٹ کو فوقیت دی جو اس کے لیے بیچ ایبل تھا۔ نہ ملازموں کی فوج کی ضرورت تھی نہ سکیورٹی کا مسئلہ تھا۔

سائرہ نے جب اس کی زبانی وجوہات سنیں اور اس کے لہجے میں خوشی کا عنصر نمایاں دیکھا تو اسے احساسِ زیاں کی اذیت فی الفور کافور ہوتی محسوس ہوئی اور اس کی دوری میں اس نے عادل کو مکمل طور پر پُراعتماد اور کامران و شاد پایا تھا۔ ایک دم سے اس کا سائرہ کے سائے سے نکل کر کھلے آسمان کے نیچے تنہا کھڑے ہو کر اپنے لیے روشن و سہل رستے کا یقین کرنے کا آئیڈیل سیرب لگا تھا۔ ایک طرح سے اسے بہت اچھا لگا تھا۔ لیکن اس نے خاموشی پر اکتفا کیا۔

اس کے کٹے ہوئے پروں کو بڑھنے اور اڑنے کے لیے اسے اسپیس دینا ضروری تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جہاں نرمی زوال کا سبب بنتی ہے۔ وہاں سختی بھی تو سراسر تباہی و بربادی ہے، ہر رویے وسلوک میں توازن ہی کامیابی کا ضامن ہے۔ سائرہ کئی بار خود کو کوستی، حسنات کو لعنت ملامت کرتی...... کیونکہ دونوں ہی اپنے کردار، سلوک اور رویے میں انتہا پسند نکلے تھے۔ حسنات کی بے اعتنائی اور بے رخی اور سائرہ کی پرلے درجے کی توجہ اور محبت کہیں بھی میانہ روی اور توازن نہ تھا۔

وہ اپنے کمرے میں کمبل لپیٹے مطالعہ کر رہی تھی۔ نیند کا دور، دور تک نشان نہیں تھا۔ تنگ آ کر اس نے

tranquillizer سائڈ ٹیبل کے دراز سے نکالی تو اس کی آنکھیں یادوں سے بھر گئیں۔ اس سے وہ عادل کو گلے لگا کر سو جایا کرتی تھی۔ وہ چھ فٹ کا جوانِ رعنا اسے اِک ننھا منا معصوم سا فرشتہ لگا کرتا تھا اور وہ بھی بچگانہ ایکٹنگ کرتے ہوئے ماں سے چمٹ جایا کرتا تھا۔ اس نے بہ مشکل اس کے خیال کو ذہن سے نکالا۔ دل کو تسلی دی اور فریج سے پانی کی بوتل نکال کر مصنوعی نیند کی خاطر گولی کھانا چاہی۔ اسی ثانیے لاؤنج میں کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ اگرچہ وہ اس چاپ کو بخوبی جانتی تھی مگر واسطہ و تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک دم سے دروازہ کھول کر اس نے باہر جھانکا تو حسنات کو اپنے سامنے دیکھ کر بے اختیار بولی۔

''خیریت ہے..... آپ ٹھیک تو ہیں۔'' حسنات کے چہرے پر سرسوں جیسی پیلاہٹ دیکھ کر وہ چونکی۔ آنکھوں میں ویرانی اور چہرے پر نقاہت تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا اور اپنے کمرے میں لے آئی۔ انہوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بیڈ پر لٹا کر اوپر سے... اس نے کمبل ڈال دیا اور اپریٹس لا کر بلڈ پریشر چیک کرنے لگی۔ آج دوسری طرف سے احتجاج نہ تھا۔ غیرت وانا کی سیسہ پلائی ہوئی دیوار گرتی ہوئی محسوس ہوئی تو اس نے تاسف بھری نظروں سے حسنات کی آنکھوں میں جھانکا۔ جہاں کسی قسم کے جذبات کی ہلکی سی رمق بھی نہیں تھی۔ یہ ہے انسان کی اصل حقیقت کہ ایک ڈگری ٹمپریچر کم ہوا یا بلڈ پریشر اپنی مقررہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تو انسان کی تمام پھوں پھاں دھوکا دے جاتی ہے۔ اور وہ ایک بے بس، لاچار، بے معنی اور بے مصرف چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ بہتر ہے تمہارے لیے کہ اب بھی طناز، ظالم اور جابر بنے رہو۔ سائرہ نے دکھ و کرب سے سوچا اور نہایت ملائمت سے بولی۔

''حسنات فکر کی بات نہیں، آپ کا بخار تقریباً نارمل ہے، ہاں ...... بلڈ پریشر قدرے ہائی ہے۔ شوگر بھی چیک کر لیتی ہوں۔ امید ہے نارمل ہوگی۔ آج آپ نے کھانے میں کیا کھایا تھا۔ بد پرہیزی تو نہیں کر لی.....؟'' وہ ملائمت سے پوچھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں کھایا۔ ابھی تک طبیعت ٹھیک نہیں ہو پا رہی۔'' وہ آہستگی سے بولے۔

''کیوں..... کوئی پریشانی ہے کیا؟'' وہ قریب ہو کر بولی۔

''نہیں.....'' وہ سر نفی میں ہلا گئے۔

''اپنی پریشانی مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتے۔ جانتی ہوں۔'' احتجاج میں بلا کی نرمی تھی۔ مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئے۔ اس نے شوگر چیک کی جو نارمل تھی۔ وہ سرعت سے کچن کی طرف چلی گئی۔ تاکہ فوری طور پر ان کے لیے مناسب غذا کا اہتمام کر سکے۔

وہ ترس و رحم اور افسردگی کے ملے جلے جذبات میں سر ہلاتی ہوئی واپس کمرے میں آئی تو حسنات وہاں نہیں تھے۔ یقیناً وہ اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ وہ ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے کی لائٹ آن تھی مگر بستر خالی تھا۔ باتھ روم سے پانی کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے اِک دکھ بھری آہ بھر کر سائڈ ٹیبل پر جگ اور گلاس رکھا اور بیڈ کے قریب ہی رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر حسنات کا انتظار کرنے لگی۔

''آپ کی پسند کی شادی کا یہ انجام ہے حسنات صاحب..... آپ کا بیٹا آپ کی پسند پر بھروسا کر کے اپنی زندگی کی خوشیوں کو داؤ پر کیسے لگا لیتا؟ سوچنے کا مقام ہے، غصہ اور ناراضی دکھانے کا جواز نہیں بنتا۔ کس بل بوتے پر آپ اپنی پسند اس پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ آپ کے زیرِ دست تھا۔ ہر وقت خوفزدہ اور سہما ہوا رہتا تھا۔ کاش کہ وہ آپ کے زیرِ سایہ ہوتا تو اس کی خود اعتمادی و خود اختیاری کا کیا جواب ہوتا۔ آج ہم اکیلے نہ ہوتے۔ آپ کے چہرے پر ملال اور آزردگی نہ ہوتی۔ یہ بے بسی اور لاچاری نہ ہوتی۔'' وہ خود کلامی کی کیفیت میں تھی۔

''حسنات آج آپ اپنے ان ہزاروں ساتھیوں کو آواز دیں کیا آپ کو جواب ملے گا، ہر گز نہیں..... انہیں اپنی

جوانی بیت جانے کا واسطہ دیں۔ جس کا ہر لمحہ ان کی رفاقت میں گزرا۔ اپنی بے حساب قربانیوں کی یاددہانی کرائیں۔ شاید یہ آپ کی فریاد سن لیں۔'' وہ سائڈ ٹیبل پر پڑے کتابوں کے انبار کو دیکھ کر بڑبڑائی۔

''پر ایسا نہیں ہوگا حسنات...... آپ نے سراب سے دل بہلانے کی کوشش کی ہے۔ اپنی جوانی فریب کے نام لکھ دی...... اپنی خوشیاں تیاگ دیں...... آپ نے ان کتابوں سے کیا سیکھا؟ کیا اسے تعلیم کہتے ہیں؟ آپ کے پاس دنیا جہان کے مشہور ترین آرتھرز کی نالج ہے، تفسیر، قرآن مجید اور حدیث و سنت کو آپ نے کس، کس زاویے سے نہیں پڑھا۔ آپ پھر بھی حقوق العباد کی شناخت سے دور رہے۔ میں کیسے تسلیم کرلوں کہ آپ ویل ایجوکیٹڈ پرسن ہیں۔ کیا آپ تک اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بھی نہ پہنچا کہ اسے اعتدال، میانہ روی بہت پسند ہے۔ جس انسان میں یہ خوبی ہوگی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کا پیارا نہ ہوگا۔'' حسنات لڑکھڑاتے ہوئے باتھ روم سے باہر نکلے تو سائرہ اپنی سوچوں کی دنیا سے واپس پلٹی اور حسنات کو سہارا دے کر بستر تک لے آئی۔

''آپ کی طبیعت درست نہیں...... آپ غور سے میری بات سن لیں کہ اب آپ باتھ روم اکیلے نہیں جائیں گے۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں سختی سے کہا اور عادل کو فون ملانے لگی۔ وہ بار، بار فون ملائے جارہی تھی مگر نو رپلائے تھا۔ ایک دم سے وہ فکر مند بھی ہوئی۔

''لگتا ہے بہت گہری نیند میں ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''جسے فون کررہی ہو وہ ہمارے لیے مرچکا ہے، بھول جاؤ اس... نابنجار کو۔'' وہ غصے سے بردھم آواز میں بولے۔

''پلیز ایسی دل دکھانے والی باتیں مت کریں۔ وہ آپ کی زیادتیوں اور بے انصافیوں کو آج تک سہتا رہا۔

اب دھاندلی کو وہ ہضم نہیں کر سکا تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے بہتری ہے۔ دھیرے دھیرے اپنے فیصلے خود کرنے لگا ہے۔ اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد بہت عقلمندی سے اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا ہے، اب خود ہی اسے سیٹ کر رہا ہے اور شادی کا فیصلہ بھی وہ کر چکا ہے۔ وہ بھی بہترین ہی رہے گا۔'' وہ فخریہ انداز میں بولی تو وہ چپ رہے۔

''آپ کے زیر سایہ پل کر جوان ہوتا تو اس کی شخصیت بھرپور اور مکمل ہوتی، ماں...... باپ کا کردار ادا نہیں کر سکتی۔ وہ تو اپنے سائے سے بھی ڈرنے والی ہستی ہے۔ ڈر، خوف اور وہم اس کی شخصیت کا حصہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر قدم پھونک، پھونک کر اٹھاتی ہے، پرلے درجے کی رجنا یا نقیب محتاط اور چھاچھ کو بھی پھونک، پھونک کر پیتی ہے، شاید ماں اسی کو کہتے ہیں ہر امر میں پہلے سے پیش بندی کرنے اور غیر ارادی طور پر اس کے ہوش وحواس پر مسلط رہ کر میں نے اسے ہر لحاظ سے کمزور اور محتاج بنا دیا تھا۔ کیونکہ میں خود جو کمزور تھی، ڈرپوک تھی۔ میرا بچہ ماما کی جبلت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ میرا بچہ مرا نہیں...... حسنات وہ تو زندہ ہو گیا ہے اس گھر کو چھوڑ کر۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''بیٹے کو کانفیڈنس باپ دیا کرتا ہے، وہ دنیا کو سمجھنے اور پرکھنے کی شُدبُد، چھوٹے موٹے پلان اور اپنی زندگی کے بڑے، بڑے فیصلے کرنے کی جرأت و ہمت باپ سے لیتا ہے۔ کوہ ہمالیہ کو سر کرنے کے گر وہ باپ کی رفاقت میں ہی سیکھتا ہے، میں کس قدر نا قابل فہم عورت نکلی کہ میں اپنی تربیت کو مکمل سمجھتی رہی۔ آپ کی دھاندلی پر اس نے میری بند آنکھوں کو کھولا۔ میرے زنگ آلود ذہن جس پر جمود اور یکسانیت کی گہری اور دبیز تہیں جمی ہوئی تھیں اس کے چند الفاظ نے کھرچ ڈالیں۔''

''اب اس طولانی اور بے مقصد تمہید کو مختصراً بیان کر سکتی ہو کہ نہیں۔'' وہ اس برہنہ صداقت کو بھلا کیسے سن سکتے تھے۔ تبھی معاندانہ انداز میں نتھنے پھلا کر بولے۔

''حسنات دل سے آزردگی اور خفگی نکال دیں۔'' وہ صلح جویانہ انداز میں بولی۔ ''اب سر سے پانی گزر چکا ہے، ایک ہی لخت جگر تھا، ہم نے تو وہ بھی کھو دیا۔'' وہ لرزش زدہ آواز میں بولی۔

''اگر یہاں سے جانے میں اس کی بہتری نہ ہوتی تو میں اسے ایک لفظ پر روک لیتی...... آپ کو کیا معلوم کہ ہیرے کی قیمت کیا ہوتی ہے؟ عادل انمول ہیرا ہے، کبھی اس کے قریب ہو کر اسے سمجھنے کی کوشش تو کرتے۔'' حسنات خاموشی سے چھت کو گھورتے رہے۔ ظاہری زندگی کے جان لیوا مہیب خلا نے انہیں کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''آپ سونے کی کوشش کریں۔'' سائرہ نے فوراً موضوع بدلا۔

''میں اب بہتر فیل کر رہا ہوں، تم بھی جا کر سو جاؤ۔'' لہجے کی نرمی پر وہ چونک گئی۔

''میں اسٹڈی میں اپنا لیکچر تیار کر لیتی ہوں، آپ کو اس حالت میں اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں لگتا۔'' اس کی روشن ضمیری پر وہ کھسیانی سی مسکراہٹ پر قابو پا کر کروٹ بدل کر لیٹ گئے۔ سائرہ نے کمرے کی لائٹ آف کر دی اور زیرو پاور کا ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ حسنات کے کمبل کو ٹھیک کر کے وہ کمرے سے ملحقہ اسٹڈی میں آ کر بیٹھ گئی۔

مٹی کے بنے ہوئے انسان کو تکبر وغرور کس بات کا...... حسب ونسب...... جاہ وجلال یہ حسن ورنگ، تعلیم اور معلومات سب نے مٹی کی نذر ہو جانا ہے۔ بقاو ہمیشگی تو اس ذات کو حاصل ہے۔

''حسنات اب بھی کچھ نہیں بگڑا، مجھے نہ سہی اپنے بچے کو تو سینے سے لگالیں جو آج بھی آپ کے پیار وشفقت کا طلبگار ہے پھر آپ کو احساس ہوگا کہ نوشتۂ تقدیر کی آپ کی نسل پر خاص الخاص مہربانیاں ہیں بجز آپ کی بے انصافیوں اور حماقتوں کے......'' وہ کاؤچ پر نیم دراز ہو کر خود کلامی کر رہی تھی۔

''آپ نے مجھے بھی کتاب سمجھ کر محبت کی تھی۔ جسے ایک دفعہ پڑھنے کے بعد دوبارہ کھولنے کی کبھی ضرورت

محسوس نہیں ہوئی مگر میں بدقسمتی سے ہیومن بینگ نکل آئی۔ اور بار، بار پڑھنے کی آپ سے ڈیمانڈ کرنے لگی۔''

☆☆☆

''عادل! مجھے مجبوراً یونیورسٹی آنا پڑا۔ رات سے تمہیں فون کر رہی ہوں۔ میسج بھی چھوڑے مگر کیا مجال کہ تمہیں کچھ احساس ہوا ہو۔ کوئی فکر ہوئی ہو...... کہ فون کرنے کی ضرورت ہی محسوس کر لیتے۔'' سائرہ کافی دیر سے اس کے آفس میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ وہ لیکچر کے بعد واپس آیا تو ماں کو آفس میں دیکھ کر ٹھٹکا۔ اس نے علیک سلیک کیے بغیر ہی اس پر چڑھائی کر دی۔

''کیا کوئی ایمرجنسی تھی؟ ہمارے گھر میں ایمرجنسی کا وارد ہونا ناممکن ہے، وہاں سکوت ہے، موت ہے، ہُو کا عالم ہے۔'' عادل نے غور سے ماں کے افسردہ چہرے کی طرف دیکھ کر کہا اور اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

کمرے میں کچھ دیر مکمل خاموشی طاری رہی۔ سائرہ بیٹے کے جواب سے جز بز سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تو عادل نے اضطراری حالت میں ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کچھ بتائیں گی تو علم ہوگا ناں...... ممی! مجھے الہام تو ہونے سے رہا۔'' چہرے پر فوراً ندامت کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔

''تم رات کہاں تھے؟ تم سے ذاتی سوال کرنے کا حق تو نہیں ہے مگر کیا کروں؟ ناخنوں سے گوشت کو کیسے جدا کروں؟'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد گویا ہوئی۔ ''حسنات پچھلے کئی دنوں سے بہت بیمار ہیں، ایسی حالت میں تمہاری موجودگی کو میں بہت ضروری سمجھتی ہوں کیونکہ وہ تمہارے ڈیڈی ہیں، بہت سے فرائض تم پر بھی تو عائد ہوتے ہیں بیٹا۔ تمہاری طرف سے ان میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔'' سائرہ نے نہایت نرمی مگر سنجیدگی سے اسے سمجھایا۔

''کیا انہوں نے اپنے فرائض نبھائے تھے؟ ممی ڈونٹ ٹیل می اگین۔'' وہ نخوت سے بولا۔

''ہمیں اپنے رب کے سامنے جواب دہ ہونا ہے بیٹا اور سب کے لیے قبر، جزا و سزا بھی اپنی، اپنی ہے اس لیے ہمیں ایسی کفرانہ سوچ سے محتاط رہنا چاہیے۔'' وہ نرماہٹ سے بولی۔

''میں آپ جیسا صابر و شاکر اور عفو و درگزر پر اکتفا کرنے والا انسان نہیں بن سکتا ممی۔'' وہ زہرخند سے بولا۔

''بیٹا ان کی عیادت، بیمار پرسی اور تیمارداری کرنے سے ہماری ناک چھوٹی ہوتی ہے نہ ہی ہماری انا کو کاری ضرب لگنے کا اندیشہ ہے، یہ وقت ہماری عظمت و بڑائی کے امتحان کا ہے، کیا تم اس امتحان میں فیل ہونا چاہتے ہو؟ اگر کسی سے انتقام لینا چاہتے ہو تو اس کی بھرپور قوت، طاقت اور بہترین صحت میں بدلہ لینے کا سوچو نہ کہ کمزوری، نقاہت اور بڑھاپے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر خود کو مطمئن کرو۔ یہ سراسر گھٹیا پن ہے جو تمہیں بہت پریشان رکھے گا۔ اگر حقیقی، ذہنی و روحانی سکون چاہتے ہو تو عفو و درگزر کو اپنی فطرت کا اہم ترین حصہ بنالو۔''

''نو لیکچر ممی! نو ڈسکشن، نو کمپرومائز......'' وہ زہرآلود لہجے میں بولا۔

''تمہیں میری بات ماننا ہوگی، ان کمزور لمحوں میں انہیں مجھ سے بڑھ کر تمہاری توجہ اور خدمت گزاری طاقت بخشے گی کیونکہ آفٹر آل تم ان کی اولاد ہو۔'' وہ پھر بھی دوستانہ انتباہ سے بولی۔

''یہ سب آپ کی ذہنی اختراعات ہیں۔ جن کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ بھلا ڈیڈی میری کمی کیونکر محسوس کرنے لگے۔ مجھے دیکھ کر ان کا پارہ چڑھ جائے گا اور پل بھر میں ان کی نفرت و حقارت کا بخار نہ جانے کتنی ڈگری ہائی ہو جائے۔ ممی اس میں برین ہیمبرج ہونے کا بھی اندیشہ ہے اور فالج ہونے کا بھی خطرہ اور ہارٹ اٹیک تو لازمی ہی ہوگا۔ اس لیے ممی سوری میں انہیں مزید بیمار دیکھنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا۔ اگر آپ کو ان کی صحت عزیز ہے تو مجھے ان کے روبرو لانے سے محتاط رہیں۔''

''ممی تو پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟'' وہ تجسس آمیز لہجے میں بولا۔

''جو ریکویسٹ لے کر آئی ہوں، وہ قابلِ تحسین ہے، قابلِ مذمت نہیں! اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''ممی آپ کی یہ خوش فہمی ہمیشہ کی طرح بے معنی ولاحاصل ہے کہ اس وقت ڈیڈی میری ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے میری جائز طلب وحقوق جسے وہ گستاخی اور نافرمانی کا نام دیتے ہیں اسے..... درگزر کرنے کا قدم اٹھانے کے بعد اپنے گھر کے دروازے میرے لیے کھول دیں گے۔ ایسا تو ان کی زندگی میں ہونے سے رہا..... اور میں بھی یہ گھر چھوڑ کر بہت پُرسکون اور شاداں وفرحاں ہوں..... کیونکہ اب میری غیرت ومردانگی کو دن میں بیسیوں بار جھنجوڑنے کی مجھ میں سکت نہیں رہی۔ میرے اندر کا مرد جو آپ کی لوریوں میں کبھی بیدار ہی نہیں ہوا تھا۔ کم از کم اب میرے ساتھ ہے اور یہی ساتھ دنیا میں رہنے کے رنگ ڈھنگ سکھاتا ہے۔ اس لیے میرے منتخب کردہ رستے پر گامزن رہنے کے لیے مجھے آپ کے مثبت رویے کی ضرورت ہے۔ آپ نے مجھے بیٹی جیسا تحفظ دے کر جو پرورش کی تھی۔ ایک محتاط تربیت کو اولین سمجھا تھا۔ ماں ہونے کے ناتے بے مثال تھا لیکن میرے لیے خسارہ اور ذلت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ممی ایک ہینڈی کیپ بچہ دوسروں کی محتاجی اور مددگاری کب تک وصول کرسکتا ہے۔ آپ کا بدل ڈھونڈتے ہوئے اپنی بے درد، بے رحم فضاؤں میں تحلیل ہو جاؤں گا تو آپ کو ہرگز سکون نہیں ملے گا۔'' وہ ماں کے گلے کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے بولا۔ ''آئی ایم سوری ممی.....! میرا وجود ہمیشہ سے ہی آپ کے لیے آزمائش ثابت ہوا۔''

''ایسی بات نہیں ہے بیٹا..... تم جانتے ہو اپنی اہمیت اور قیمت اس لیے ایسی دل دُکھانے والی باتیں مت کرو۔ یہ باتیں میرے لیے آزمائش بن کر مجھے رُلاتی رہتی ہیں۔ میری جان میں تمہیں واپس لینے نہیں آئی۔ تمہارے فرائض کی یاددہانی کرانے آئی ہوں۔ آگے فیصلہ تمہارا اپنا ہے۔'' وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بیٹا خاندان تم پر انگلی اٹھائے میری تربیت گھر، گھر کا موضوع بن جائے.....اور ہماری داستانیں خاندان بھر کے لیے چٹ پٹے مسالے کا کام کریں۔ میں یہ نہیں چاہتی۔''

''ممی دنیا والوں کی پروا کرنا چھوڑ دیں۔ انہوں نے آپ کو دیا کیا ہے، سوائے ڈر، خوف، وسوسے اور اندیشے کہ یہ نہ ہو جائے، وہ نہ ہو جائے۔ ممی خود کو ہر طرح کے خدشوں سے آزاد کردیں اور ایسی زندگی بسر کریں۔ جس کی آپ نے کم عمری میں خواہش کی تھی۔'' وہ گومگو کیفیت میں بولا۔

''حقیقت اور خواب کا کوئی ملاپ نہیں بیٹا..... دونوں ایک دوسرے کے برعکس ہیں، خواب اپنے حالات کو مدِنظر رکھ کر نہیں دیکھے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں خوش آئند تعبیر نہیں ملتی تو انسان ہر شے سے بددل ہو جاتا ہے۔ انوکھے اور نرالے خواب میں نے بھی دیکھے تھے انہی آنکھوں سے وہ بے وقعت تھے جو انہی آنکھوں کے ذریعے بہہ گئے۔ اب تم ایک سچائی اور حقیقت ہو۔ اک خواب یا سراب نہیں ہو اس لیے زمانے کے کچھ تقاضے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ڈیڈی کو تمہارے جانے کا دکھ ہے، جب سے گئے ہو مرجھا سے گئے ہیں، ہر آہٹ پر چونک کر دروازے کی طرف ٹکٹکی لگا دیتے ہیں۔ آنکھوں میں سوچ و فکر کے سائے لہراتے ہوتے ہیں۔ عادل انہیں تمہارا انتظار ہے بیٹا۔'' وہ پژمردگی سے بولی۔

''آپ کا حکم سرآنکھوں پر..... '' عادل کے لہجے میں نرمی عود کر آئی ''ممی آپ جو سمجھ رہی ہیں اور جو توقعات ڈیڈی سے وابستہ کر بیٹھی ہیں، وہ سب خوش خیالی ہے۔ وہ انسان گوشت پوست اور خون پانی سے نہیں بنا۔ فولاد اور پتھر کا بنا ہوا ہر جذبات واحساسات سے عاری بت کے سوا کچھ نہیں۔ نہ جانے آپ کی فطرت میں اس قدر عاجزی و

انکساری، التجا و فریاد کہاں سے آ گئی؟ ڈیڈی نے اسی لیے تو آپ کو فار گرانٹڈ لیا ہے اور آپ کی نرمی کی وجہ سے میں نے بھی بہت طویل کٹھن سفر طے کیا ہے۔" وہ تڑپ کر بولا۔

" تمہاری تمام باتیں درست ہیں۔ میں ہر لفظ سے اتفاق کرتی ہوں مگر ڈیڈی سے مقابلہ کرنے اور بدلہ لینے کی اجازت کبھی نہیں دوں گی۔ تمہیں ہر صورت ان کی مزاج پرسی کے لیے آنا ہوگا۔ اسے میری عرض سمجھو یا میری غرض کا نام دو۔ اٹ از ویری امپورٹنٹ۔" وہ سختی و درشتی سے بولی۔

" چلیں آپ نے فیصلہ تو سنا دیا لیکن ایک بات یاد رکھیے گا کہ اس پتھر کے انسان سے عفو، معافی اور بخشش کی امید مت رکھیے گا کیونکہ میں ہمیشہ سے ہی ان کے لیے اِک بوجھ رہا ہوں۔"

" کیوں تمہارا ذہن ہر وقت فرسٹریشن کا شکار رہتا ہے۔ نہ بی ہیویئر نارمل نہ ہی گفتگو میں توازن ہے...... بس گلے شکوے اور ہر دم سیلف پٹی...... بیٹا تمہارے ڈیڈی کو نہیں شاید تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضرورت ہے۔" وہ ترحم آمیز لہجے میں بولی۔" میں سمجھ رہی تھی کہ تم اکیلے رہ کر کچھ سیکھ لو گے۔ مجھ سے جو شکایات ہیں شاید ان میں کمی آ جائے گی لیکن میں نے ایسی کوئی تبدیلی تم میں فی الحال تو محسوس نہیں کی۔ عادل خدا کے لیے اپنی اس ذہنی حالت کے ساتھ کسی لڑکی کی زندگی تباہ مت کر دینا۔ سب سے پہلے تمہیں سائیکاٹرسٹ کے پاس علاج کے لیے جانا چاہیے۔ مکمل طور پر تندرست ہو جانے کے بعد شادی کا فیصلہ کرنا...... فیصلہ تم کرو گے اور ساتھ میں چلوں گی۔ اپنے بیٹے کے لیے اس کی پسند کی دلہن لانے میں، میں زمانے سے ٹکر لے لوں گی۔ میری دلی تمنا ہے کہ تمہارا گھر مثالی ہو، ہم آہنگی ہو، ذہنی مطابقت ہو اور باہمی مناسبت کے ماحول میں تمہاری نسل کی پرداخت ہو...... میری جان میں ہر وقت تمہارے روشن مستقبل کے لیے دعا گو رہتی ہوں۔" وہ حسرت ناک لہجے میں بولی۔" کاش عادل اللہ تعالیٰ اس ناچیز کی ہر دعا، ہر آرزو جو تم سے وابستہ ہے، سن لے۔"

" ممی! کیا آپ مجھے پاگل سمجھتی ہیں؟" وہ رو جانے والا ہو کر بولا۔" کیسی عجیب باتیں کرتی ہیں آپ...... پاگل پن اس وقت مجھ پر مسلط تھا جب میں آپ کے زیر سایہ تھا۔ اب تو ممی مجھے لگتا ہے کہ ذہن کی گرہیں کھلنے لگی ہیں۔ دل پر جمی ہوئی سیاہی دھلنے لگی ہے۔ اور میرے بدن کی قوت، جرأت، ہمت پر خوفزدگی کی چھاپ کافور ہونے لگی ہے۔" وہ احتجاجاً زمی سے بولا۔

" پاگل نہیں سمجھتی میری جان...... بیمار ہو تم ذہنی طور پر...... خدا کے لیے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ بیس سیڑھیاں چڑھنے کے لیے کم از کم بیس مہینے تو لگاؤ۔ تم اتنی اونچائی تک بیس منٹوں میں پہنچنے کی تگ و دو میں نڈھال ہو کر آدھے رستے میں ہی کھو جاؤ گے۔ بیٹے دھیرے، دھیرے قدم اٹھاؤ۔ سوچ سمجھ کر خود میں مثبت تبدیلی محسوس کرو گے اور وہ سطحی یا وقتی نہیں ہوگی بلکہ ابدی ہوگی۔"

" فار گاڈ سیک ممی! حقائق سے پردہ کشائی بیماری نہیں...... آپ اپنی سوچ کو بدل لیں۔ میری باتوں میں سچائی ڈھونڈنے کی کوشش کریں...... میں آپ کو نارمل نظر آنے لگوں گا۔ ایسے ہی جیسے ہمارے خاندان کے نوجوان ہیں، جنہیں ماؤں نے صنفِ قوی سمجھ کر پروان چڑھایا ہے نہ کہ ایک شرمیلی چھوئی موئی بیٹی سمجھ کر پھونک، پھونک کر قدم اٹھانے کی ترغیب دیتی رہیں۔" وہ طنزیہ نشتر چلاتے ہوئے بولا۔

" ڈاکٹر سے مشورہ کرنے میں کیا قباحت ہے؟ میری تسلی کے لیے سہی۔" وہ اس کے طنزیہ لہجے اور کاٹ دار الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے خوش اخلاقی سے بولی۔" ماں کا تجربہ تم سے زیادہ ہے...... میں نے تم سے دور رہ کر تمہاری زندگی کے خلا کو محسوس کیا ہے، پاس ہوتے تو دن رات کی قربت میں سب کچھ ہمیشہ کی طرح نارمل ہی لگتا۔" وہ فکرمندی سے بولی۔

''میں نے آپ کی خوشی اور تسلی کی خاطر زندگی کا پرائم ٹائم ضائع کر دیا ممی، اب مجھے پریشرائز مت کیجیے۔ اب میں دوسروں کے لیے نہیں اپنے لیے جیتا ہوں۔ اور اپنے لیے وہی فیصلہ کرنے کی ہمت بھی مجھ میں عود کر آئی ہے نتائج فائدہ مند ہوں یا نقصان دہ...... مجھے اس کی پروا نہیں...... اگر انسان فیصلے کرتے وقت اونچائی و گہرائی کے ناپ تول میں لگا رہے تو دنیا کا نظام ساکت و جامد ہو کر رہ جائے۔''

''عادل تم ایسے خود سر اور نافرمان تو ہرگز نہیں تھے۔ تمہاری پرسنالٹی کی یہی تبدیلیاں تو خطرناک ہیں۔'' وہ دکھ سے اس کے بارے میں سوچتی اس کے آفس سے باہر نکل آئی تھی۔

☆☆☆

''عالیہ! کیسی ہیں آپ؟'' سائرہ نے اپنائیت سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ٹھاک خوش باش ہوں...... آپ سنائیں بھائی صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' عالیہ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''اس غائبانہ تعارف پر کب تک گزارہ ہوگا۔ میرا خیال ہے بالمشافہ ملاقات بھی ہو ہی جانی چاہیے۔''

''ان کی طبیعت قدرے سنبھلی تو ہے لیکن میری غیر موجودگی کا وہ فائدہ اور ہم نقصان اٹھا رہے ہیں کیونکہ حسنات صاحب ہر وقت بد پرہیزی کے داؤ میں بیٹھے ہوتے ہیں اس لیے میں سوچ رہی ہوں کہ فی الحال فل ٹائم جاب کے بجائے وزیٹنگ جاب پر آ جاؤں۔ کم از کم گھر رہ کر ان کی بے پروائیوں کا پہرہ تو دے سکتی ہوں۔'' لہجے میں ایک دم سے پریشانی عود کر آئی تھی۔

''آپ نے بالکل درست سوچا ہے، سر کا سائیں سلامت ہو تو یہی ہمارا سائبان، ہماری عزت ہے ورنہ تو اولاد بھی اپنی نہیں رہتی۔ میں تو رحمان جی کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکوں۔'' عالیہ نے سنجیدگی سے کہا تو سائرہ نے اپنی دکھی آہ کو اندر ہی دبا لیا۔

''میرے اندر ایسی فیلنگز کہاں؟'' دل میں ہوک سی اٹھ گئی۔ اسے عالیہ کی زندگی پر رشک آنے لگا۔ اپنی جان لیوا تنہائی اور اکیلے پن کا کربناک احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

''عالیہ آپ کی باتیں مجھے خاصی فیسی نیٹ کرتی ہیں، یقین کریں مجھے آپ کے جیسی خوبیوں والی بہو چاہیے تھی، جو ہو بہو آپ جیسی بیوی ثابت ہو، میں اس سلسلے کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتی ہوں...... لیکن جناب آپ کی طرف سے بہت ٹھنڈ ہے، کیا ابھی تک سوچ بچار کا سلسلہ جاری ہے۔ اب تو کافی وقت مل گیا ہوگا سوچنے کا۔ اب تو عادل بھی ہر وقت پریشان رہنے لگا ہے۔'' وہ فکرمندی سے بولی۔

''بیٹی کی زندگی کا فیصلہ کرنا دنیا کے ہر فیصلے سے مشکل ترین فیصلہ ہے۔ رحمان جی اسی کشمکش میں مبتلا ہیں۔'' وہ تسلی دینے کے انداز میں بولی۔ ''بس دعا کریں ان کا دل مطمئن ہو جائے۔ مجھے تو آپ کی طرف سے کسی قسم کا ڈر اور خدشہ نہیں۔''

''عالیہ......! آپ ان کا حوصلہ بڑھائیں۔ میں آپ کو ہر طرح کی ضمانت دے سکتی ہوں۔ عادل کو تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ سادہ طبع انسان ہے، اس میں کوئی ہیر پھیر، مکاری و فریب نہیں۔ سچا اور کھرا ایسا کہ دل کی بات کہنے سے چوکتا نہیں۔'' وہ شگفتہ لہجے میں بولی۔ ''آپ بتائیں کہ میرے گھر کب تشریف آوری ہو رہی ہے۔ بات تو چلتی رہے گی، فیصلہ بھی ہوتا رہے گا۔ ملنے جلنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔''

''جی ہاں، رحمان جی کے فیصلے کے بعد آپ کی خواہش پوری بھی ہو جائے گی کیونکہ آپ نے سوچ سمجھ کر ہی نمرا کو منتخب کیا ہوگا لیکن ہمیں ذرا فیصلہ کرنے کے لیے کچھ وقت چاہیے سارا شہر آپ کو جانتا ہے پھر رحمان جی مجھ سے

میں ہیں۔" وہ نہایت ملائمت سے کہہ رہی تھی۔ "اور سائرہ بہتر یہی ہے کہ پہلے وہ اپنے ذہن کو تیار کر لیں، دل کو آپ کی طرح مکمل طور پر آمادہ کرنے کے بعد ہم آپ کو ننگ کرنے کی گستاخی ضرور کریں گے...... آپ مطمئن رہیں...... اور عادل بیٹے کو سمجھا دیں۔ ہمارے گھر کے کچھ اصول بہت پکے ہیں، جلد بازی پر ہمیں قطعاً بھروسا نہیں۔"

"مجھے اس مبارک دن کا انتظار بہت بے چینی و بے قراری سے ہے، عادل کا حال تو میں جانتی ہی ہوں، میرا حال بھی درست نہیں رہا، نمرا کو دیکھ کر، پرکھ کر، اس دور میں نمرا جیسی لڑکیوں کا فقدان ہو گیا ہے۔ وہ شادی کو ذمے داری کے بجائے گلیمر تصور کرنے لگی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ نہ تو سسرال میں اور نہ ہی اپنے شوہر کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ فوراً کنارہ کشی کا اعلان کر ڈالتی ہیں اور وہی ماں جس کی اپنی زندگی انتھک محنتوں اور بے حساب قربانیاں دیتے گزری ہوتی ہے۔ وہ ایسی بے باک، بے شرم اور دیدہ دلیر بچی کی ڈھال بن جاتی ہے۔ نہ جانے آج کل کی ماؤں کو کیا ہو گیا ہے، بچی کو گھر بسانے کی نہیں گھر اجاڑنے کی تربیت دینے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔" سائرہ نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

"آپ بالکل درست فرما رہی ہیں۔ خدا تعالیٰ کا لاکھ، لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ ابھی تک اس تیز طرار ماحول کے گھناؤنے اثرات سے ہمارا خاندان بچا ہوا ہے۔" عالیہ فخریہ انداز میں بولی۔

"یہی خوبی تو ہمیں آپ کا مطیع بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ پلیز عالیہ، بھائی صاحب تک میری عرضداشت پہنچا دیں کہ کم از کم آپ اپنی شرائط سے تو مطلع کریں تاکہ بات آگے بڑھ سکے۔" اس کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"آپ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔ انسان فیصلے کرنے والا ہرگز نہیں...... وہ تو اوپر کی طرف سے ہمارے دلوں میں وحی کے مانند اترتے ہیں۔ اس دن کا انتظار کریں۔" وہ مسکرا کر بولی تو سائرہ اور بے قرار ہو اٹھی۔

"عالیہ نہ جانے اس وحی کی آمد میں کتنے دن، مہینے اور سال بیت جائیں...... یہ تو بات نہ ہوئی ناں...... ہمیں بھی تو کچھ حد تک اختیارات و استحقاق سونپ رکھا ہے پروردگار نے۔" سائرہ نے خوش بیانی سے کہا۔ "کیوں نہ استخارہ کر لیں؟ دیکھیے گا پروردگار کی رضامندی ظاہر ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔" سائرہ نے جیسے اس کے دل کی بات پکڑ لی ہو۔ اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر عالیہ جھوم اٹھی۔

پھر ہر رات استخارہ ہونے لگا۔ بار بار استخارہ کرنے کے باوجود ان کا دل مطمئن نہ ہوا۔ اتنے عرصے میں نمرا بھی آخری سمسٹر میں فور جی پی اے لے کر شاندار کامیابی کے ساتھ یونیورسٹی سے فارغ ہوگئی۔

عادل کلاس میں بلاناغہ اس کا شرفِ دیدار حاصل کیا کرتا تھا۔ وہ بھی ختم ہو گیا اس کی یاد سے نکلنے کے لیے اس کی پھر وہی غیر مہذب سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔

اسے احساس ہوا کہ اسے پاس کرنے کی غلطی اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی اور نادانی تھی۔ اس نے خود کو لعنت ملامت کرتے ہوئے فون کا سہارا لیا مگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ نمرا نے فون اٹینڈ ہی نہیں کیا تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر حمیرا کے ذریعے اسے پیغام پہنچانا چاہا، کامیابی ندارد کیونکہ نمرا نے بے دردی سے انکار کر دیا تھا۔ فیصلہ ہونے کے بعد بات کرنے کا وعدہ کر کے اس نے جان چھڑائی تھی اور حمیرا سے اس نے ریکوئسٹ کی کہ کسی طرح عادل کو نمرا کے خلاف کر کے اس کے دل سے اسے نکال پھینکے اس نے عادل کو تمسخرانہ انداز میں غیرت و انا کا احساس دلایا اور ایسا للکارا کہ وہ وحشیانہ انداز میں فون پر چیخنے لگا۔

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مجھے بے وقوف بنایا اور مجھے دھوکے میں رکھ کر ڈگری حاصل کر لی۔ اگر اس نے میرے ساتھ اتنا بڑا ڈراما کھیلا ہے تو میں بھی اس سے ڈراما کھیلنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ تم میرا

پیغام اس تک پہنچا دو کہ والدین سے اقرار کرنے کا سگنل دے ڈالے۔ ورنہ بہت برا ہو گا۔''

''سر آپ ہمت سے کام لیں، یہ دنیا ایک سے بڑھ کر ایک حسینہ سے بھری ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ انکار کر کے آپ کو تا حیات شعلوں کے سپرد کر دے۔ آپ اس ضمن میں پہل کر دیں۔ سر وہ آپ کے قابل ہی نہیں ہے۔ اس کے خیالات اور آپ کے خیالات میں لامتناہی فاصلہ ہے۔ وہ مڈل کلاس کی لڑکی آپ کے ساتھ دو گام بھی چل نہیں سکے گی۔'' حمیرا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''حمیرا میں اسے اسی پیسے کا محتاج بنا ڈالوں گا۔ وہ میری مطیع ہوئے بغیر سانس لینا بھول جائے گی۔ پیسے میں بہت طاقت ہے جو انسان کو کمزور و لاغر کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتی۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

''بدقسمتی سے وہ دولت کی پجاری نہیں ہے۔ اپنے ماحول میں مطمئن اور پُرسکون رہنے والی لڑکی ہے۔ ایسی لڑکیاں اس دور میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ ورنہ مڈل کلاس کا تو بہت بڑا مسئلہ ہے کہ لڑکی اپنا اسٹیٹس ہائی کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے پر تلی ہوئی ہے۔ اور والدین بھی آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ نہ جانے یہ لڑکی کس سیّارے کی مخلوق ہے۔'' حمیرا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لیکن دوسرے کو بے وقوف بنانے میں خوب ماہر ہے۔ مثال تو آپ کے سامنے ہے۔''

''حمیرا تم مجھے بار، بار یہ طعنہ مت دو۔ میری غیرت بھڑک اٹھتی ہے۔ مجھے پہلے ہی اپنی غلطی کا احساس جس شدت سے ہونے لگا ہے کیا بتاؤں..... حمیرا تم مجھ پر ایک احسانِ عظیم اور کر دو۔'' وہ التجائیہ انداز میں بولا۔

''فرمائیے سر......!'' وہ مختصراً بولی حالانکہ اگلا مدعا سمجھ چکی تھی۔

''اس سے ایک بار ملوا دو، پہلی اور آخری بار پھر وہ انکار نہیں کرے گی۔'' وہ خود اعتمادی سے بولا۔

''سر! اسے دل سے نکالنے کی سعی کریں۔ اس کے خیالات بہت ہی گھٹیا اور پنچ ہیں۔ وہ اپنے باپ پر پڑ گئی ہے۔ انہوں نے بھی اپنی زندگی میں انا کی تسکین کی خاطر دولت کو دھتکارے رکھا۔ ورنہ وہ آج آپ اور مجھ سے بیسیوں ہاتھ آگے ہوتے۔ ہمیں اپنی دولت کے ترازو میں تول کر خرید چکے ہوتے.. مگر وہ نکلے عاقبت نااندیش اور ناقابلِ فہم جو آج بالکل بے حیثیت ' بے وقعت و بے قیمت ہو کر آئی 9 کے چھوٹے سے گھر میں مقیم ہیں۔ ایسے ہی خیالات آپ کی لیلیٰ کے ہیں۔ وہ آپ کی کامیابیوں کے رستے کا روڑا بن جائے گی۔ سر میری تمام ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ حالانکہ نمرا میری فرینڈ ہے۔ ایسی باتیں کرنا مجھے زیب تو نہیں دیتا...... مگر میری ہمدردی آپ سے بھی تو ہے۔ سر! میں نے بھی اسے بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اسے اس کی خوش بختی کا یقین دلایا ہے۔ مگر وہ پاگل محبت پر بھروسا نہیں رکھتی۔ ویسے سر محبت کو ہوس کا نام دینے والی لڑکی میں آپ کو ایسا کیا نظر آ گیا ہے کہ آپ پیچھے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔'' وہ مسلسل بولے جا رہی تھی اور عادل کے خون میں جنونیت کی آمیزش بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے ٹھکرائے جانے کی توہین اور اسے بے وقوف بنا کر ڈگری حاصل کرنے کی ہتک نے ہوش و حواس کو سلب کر لیا تھا۔ احساسِ ناکامی ، بردرد ، اذیت سے سوا تھی۔ اس نے فون بند کر دیا اور وحشی، جنگلی، خونخوار درندے کی طرح اتنی زور سے چیخا کہ فلیٹ کے در و دیوار تک ہل گئے۔ ملازم خوفزدہ ہو کر باہر نکل گیا اور سائرہ کو فون کرنے لگا۔

جب تک سائرہ پہنچی کچن میں ٹوٹے ہوئے برتنوں کا فرش پر ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اور گھر کے باقی کمروں میں بھی جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ وہ ماں کو دیکھ کر ڈیڈی کو برا بھلا کہتا ہوا حمیرا پر حملہ آور ہوا۔ اور پھر نمرا کے والدین شکنجے میں آ گئے۔

تھوڑے توقف کے بعد وہ وہیں ڈھے گیا۔ سائرہ خاموشی سے کھڑی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ تو بہت دھیمے

مزاج کا لڑکا تھا۔ اس کی ہر بات پر سرِ تسلیم خم کرنے والا۔ روز بروز اسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ سائرہ حیرت و افسوس سے اس کے قریب کارپٹ پر ہی بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''عادل جانی کچھ تو بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟ نمرا کی طرف سے کہیں انکار تو نہیں ہو گیا؟'' وہ بڑبڑاتی رہی اس کے لیے یہ معاملہ حل کرنا مشکل تھا کہ عادل کا اتنا وحشیانہ اور جابرانہ ردِ عمل کیوں تھا؟

''اُف میرا سات بیٹوں جیسا ایک بیٹا ایسا تو کبھی نہ تھا۔ ایسے لگتا ہے عصمت آپا نے اس پر جادو کر ڈالا ہے۔'' آج وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

سائرہ کے بار، بار نرماہٹ اور لگاوٹ سے احتجاج کرنے پر رحمان نے بیٹی کا فیصلہ کرنے میں ہی عافیت سمجھی اور عالیہ کو فون پر بات کرنے کے لیے یہ مشکل تیار کر لیا۔

''ہیلو سائرہ! کیسی ہیں آپ؟'' عالیہ نے اپنا لہجہ خوشگوار بنانا چاہا مگر وہ اس میں ناکام رہی۔ سائرہ بھی ایک جہان دیدہ خاتون تھی۔ اس کے لب و لہجے کو فوراً سمجھ گئی۔

''عالیہ کیا بات ہے؟ آپ کا لہجہ بہت افسردہ ہے۔'' وہ اچنبھے سے بولی۔ ''کیا کوئی پریشانی ہے؟''

''بات تو پریشانی کی ہے سائرہ...... مجھے تو عادل اپنے سعود کی طرح لگتا ہے مگر کیاں کروں؟ سائرہ دراصل میں آپ کو بتانا چاہ رہی تھی کہ رحمان جی نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ انکار میں کیا ہے، مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے بہت شرمندگی ہو رہی ہے کہ اگر یہی فیصلہ کرنا تھا رحمان صاحب نے تو بہت پہلے کر چکے ہوتے تو بہتر تھا۔ آپ کو بھی انتظار میں مضطرب رکھا۔ سائرہ ہمیں معاف کر دیجیے گا۔''

''کیوں؟ کوئی وجہ تو ہو گی ناں...... جاننا چاہوں گی کیونکہ اتنے عرصے بعد کیا جانے والا فیصلہ تو اقرار میں ہونا چاہیے تھا ناں...... مجھے تو اسی کی امید تھی۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''وجہ تو کوئی خاص نہیں...... بس استخارہ ہی ٹھیک نہیں آ رہا۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''رحمان صاحب نے ہر رات استخارہ کیا ہے مگر......''

''یعنی وحی نازل نہیں ہوئی۔'' وہ طنزیہ بولی۔ ''ہم کن بکھیڑوں میں پھنس گئے ہیں، ہماری اپنی منافقانہ سوچیں، باغیانہ کردار اور تذبذب والی کیفیت میں مقید دل و دماغ جسے ہم جادو کا نام دے کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

''وحی تو بہت اچھا پیغام لے کر نازل ہوئی تھی۔ دل مطمئن تھا۔ ایک دم سے ہی رحمان اپنی بات پر اڑ گئے۔'' وہ منمناتے ہوئے بولی۔

''عالیہ ایک بار پھر سوچ لیں، عادل کو نمرا بہت پسند ہے۔ وہ اس کے بغیر خوش نہیں رہے گا اور یہ پسندیدگی یک طرفہ نہیں ہو گی۔ آخر اس میں نمرا کی رضامندی تو شامل ہے ناں...... اس نے دو سال عادل سے پڑھتے اور ملتے جلتے گزارے ہیں۔ ورنہ عادل یہ فیصلہ نہ کرتا۔'' وہ حسرت بھرے لہجے میں بولی۔

''معصوم بچیوں کو نشیب و فراز کی تمیز کہاں ہوتی ہے؟ اگر اس کی رضا شامل ہے پھر بھی یہ رشتہ رحمان کو قابلِ قبول نہیں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''عالیہ میرا اکلوتا بچہ پاگل ہو جائے گا۔ پلیز عالیہ، کچھ کرو...... وہ آپ کی طرف سے طویل خاموشی کو برداشت نہیں کر سکا۔ بہت رنجیدہ اور خاموش رہنے لگا ہے۔ انکار پر کہیں جان ہی نہ دے ڈالے۔'' وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔

''سائرہ آپ میری بہنوں کی طرح ہیں، آپ کو بتاتے ہوئے مجھے بہت دکھ اور افسوس ہو رہا ہے۔ درحقیقت

ہیپی برتھ ڈے ٹو می

بچپن سے لے کر اب تک میری ہر سالگرہ بہت محبت سے منائی گئی ہے۔ یہ نہیں کہ ہر سالگرہ کوئی بے حد دھوم دھڑ کے سے منائی جاتی تھی یا ڈھیروں مہمان بلائے جاتے تھے۔ بس گھر کے افراد مل کر اس خوشی کو سیلیبریٹ کر لیتے تھے۔ کیک اور دیگر لوازمات جن میں خاص الخاص دو چیزیں ضرور شامل ہوتی تھیں...... فروٹ چاٹ اور آلو کے کٹلس جن میں ابلا انڈا بھی ہوتا تھا اور یہ دونوں چیزیں میری پیاری نانی اماں جب تک اپنی زندگی میں کام کاج کے قابل رہیں، اپنے ہاتھوں سے بنایا کرتی تھیں۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ پھر اس کے بعد سب گھر والوں کی طرف سے پیارے، پیارے گفٹ ملتے تھے جنہیں کھول لینے کے بعد بار، بار دیکھنے کا مزہ آتا تھا۔ اور بس اس مختصری کارروائی میں جو مزہ اور یادیں تھیں وہ آج ابھی تک میرے دل میں ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ شادی سے پہلے اپنے گھر میں یہ چونچلے کرنے والے والدین اور بھائی (بہن نہیں ہے میری) موجود ہوتے ہیں لیکن اگر شادی کے بعد شوہر بھی یہ سب خوشی، خوشی کرنے والا ہو تو یقیناً خوش قسمتی ہوتی ہے۔ اور الحمد للہ میں بے حد خوش قسمت ہوں، شادی کے بعد پچھلے سال جو سالگرہ میں نے اپنے میاں کے ساتھ منائی، وہ تھوڑی مختلف تھی کہ میرے امی ابو اور بھائی میرے ساتھ نہیں لیکن 13 اپریل کی صبح، صبح جب پہلے ان کے محبت بھرے فون، مبارک باد کے پیغامات ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اور پھر ان کی طرف سے گفٹ پارسل مجھے موصول ہوئے تو آنکھیں بے

جو اتنی ملاقاتوں کے بعد ہم نے محسوس کیا ہے۔ بتاتے ہوئے مجھے شدید کوفت ہو رہی ہے۔ عادل کی شخصیت میں ادھورا پن ہے، نہ جانے کیوں......؟ جبکہ وہ ایک ویل ایجوکیٹڈ اور ویل گرومڈ خاندان کا پروردہ ہے، دولت کی بھی بہتات ہے اور رزقِ حلال سے آپ نے اس کی اٹھان بھی کی ہے، ہم سب جانتے ہیں بھائی صاحب کی ریپوٹیشن کو...... لاجواب انسان ہیں۔ نہ کبھی کسی سے دنگا فساد نہ لینا دینا۔ بس اپنی ہی صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی میں مگن اور مست ہیں آپ اور عادل ہی ان کے لیے سب کچھ ہیں۔ باقی دنیا تو ان کے لیے بیکار ہے۔ پھر ایسا کیوں ہوا کہ عادل کے رویے نارمل نہیں ہیں۔"

عالیہ نے اسے اپنائیت و لگاوٹ سے کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ مسئلہ سمجھتے ہوئے انجان بننے کی کوشش کرنے لگی۔ ماں ہونے کے ناتے وہ کیسے اعتراف کر سکتی تھی۔ بے پروائی سے قہقہہ لگا کر گویا ہوئی۔

"بعض بچے شادی کے معاملات کو خاصا انہونا اور عجیب سمجھ کر شائے بھی ہوتے ہیں۔ مضطرب و ہراساں بھی...... اگر وہ نارمل نہ ہوتا تو پی ایچ ڈی کیسے کر سکتا تھا، آپ یونیورسٹی سے اس کی ریپوٹیشن پتا کر سکتے ہیں۔ بہت ڈیڈیکیٹڈ پروفیسر مانا جاتا ہے اور بچپن سے آئی کیو لیول اپنے والد سے لیا ہے۔ اس کی ذہانت کا جواب نہیں۔ اور پھر وہ بہت شریف النفس انسان ہے۔ لاکھوں لڑکیوں میں سے اس کا انتخاب ہمیں چونکا گیا کہ اس نے ثمرا کو اس نظر سے دیکھا کیسے ہوگا۔ اور پھر فیصلہ بھی خود اعتمادی سے کر کے ہمیں مطلع کیا...... آئی ایم ویری پراؤڈ آف ہم...... یہ تمام عمل نارمل انسان ہی کر سکتا ہے عالیہ...... آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایک بار پھر سوچ لیں۔ ہم انتظار کر سکتے ہیں۔ آخر آپ کی بیٹی ہے، سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا آپ کا حق ہے۔ ہمیں اس پر رتی بھر اعتراض نہیں...... ٹیک یور ٹائم......" سائرہ نے نہایت ملائمت و اپنائیت سے کہا۔

"آئی ایم سوری سائرہ...... اس معاملے میں، میں بالکل بے بس ہوں، رحمان جی کے سامنے...... آپ بھی تو شوہر والی ہیں۔ جب یہ ذات ایک بات پر اڑ جائے تو پھر بیوی کی چیخ و پکار اس کے کانوں کو چھو نہیں سکتی۔ بہرے ہو جاتے ہیں۔ یہ بچی کے فیوچر کی ذمے داری اور گارنٹی لیتے ہوئے مجھے خوف آتا ہے۔ میں زیادہ بحث مباحثہ نہیں کر سکتی۔" وہ ایک طویل آہ بھر کر بولی۔ "بی لیو می! مجھے آپ میں بہنوں جیسی اپنائیت محسوس ہوئی تھی۔ میں تو

اختیار نم ہوگئیں۔ امی نے سالگرہ پر پہننے کے لیے ڈریس تک بنوا کر بھیجا تھا۔ اور یہاں کافی دن پہلے سے میں نے شور مچا رکھا تھا کہ میری سالگرہ پر غبارے بھی لگیں گے اور کیک پر موم بتیاں بھی...... (بچپن اب بھی چل رہا ہے ناں) اور میرے پیارے سے شوہر ناشتے کے بعد مارکیٹ جا کر کیک کے ساتھ یہ سب سامان بھی لے کر آئے۔ اور منظر تو وہ دیکھنے والا تھا جب میں نے انہیں غبارے پھلانے کے کام پر لگایا ہوا تھا۔ وہ غبارے پھلاتے اور جب کوئی غبارہ زوردار آواز کے ساتھ پھٹتا تو اس سے بھی زیادہ زوردار میری چیخ نکلتی۔ کیونکہ مجھے غبارہ پھٹنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ خیر تمام غبارے پھلانے کے بعد انہوں نے لاؤنج کو سجایا۔ میری ہدایات جاری تھیں۔ کیک پر رنگ برنگی موم بتیاں، ہیپی برتھ ڈے کی شکل کی لگائی گئیں۔ میاں کے ساتھ مل کر موم بتیوں کو بجھایا۔ دونوں نے مل کر کیک کاٹا ایک دوسرے کو کھلایا۔ (کوئی بھی کیک ہو ہم ہمیشہ اکٹھے کاٹتے ہیں) تالیاں بجائیں، ہیپی برتھ ڈے ٹو یو لہک لہک کر گایا۔ خوب پوز مار، مار کر تصویریں کھینچیں اور تصویر مرضی کی نہ آنے پر میاں سے لڑائی تو لازمی ہے۔ ہاہاہا...... اس طرح ہنستے مسکراتے میری سالگرہ ہوئی۔ فیس بک پر بھی برتھ ڈے وشز میری منتظر تھیں۔ اور ہاں میرے میاں کی طرف سے بھی مجھے بہت خوب صورت گفٹ ملا تھا۔ میں اپنے ان جان سے پیارے رشتوں کو ہمیشہ اپنی زندگی میں اپنے ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں۔ اللہ یہ محبتیں سدا میرے اردگرد قائم رکھے، آمین۔

از: ہالہ احمد، کراچی

بہت مطمئن تھی۔ آپ کو چھوڑنے کو دل نہیں مانتا۔ چلیں سمدھن نہ سہی بہن کے خوب صورت رشتے کو تو چلا دے سکتے ہیں ہم آپس میں مراسم تو رکھ سکتے ہیں ناں......"

"یعنی یہ آخری اور حتمی فیصلہ ہے۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "مجھے یقین نہیں آرہا کیونکہ ہم میں دنیاوی لحاظ سے کسی مادی چیز کی کمی نہیں...... اور عادل تو ہے ہی دلوں میں بس جانے والا بچہ......" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"سائرہ، میں مجبور ہوں۔" اس نے ترحم انگیز لہجے میں کہا۔ "کاش میں کچھ کر سکتی۔"

"او کے عالیہ......" سائرہ نے لرزش زدہ آواز میں کہا۔ "مجھے تو عادل کی وارفتگی اور سچائی نے حیران کر دیا ہے۔ اسے کیسے سمجھاؤں گی۔ کیسے مطمئن کروں گی۔" اس نے بے بسی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ عالیہ تاسف بھری نظروں سے دیر تک اپنے موبائل کی طرف دیکھتی رہی۔

"ہمیں اتنے قدر دان لوگ نہیں ملیں گے۔ باپ بیٹی ڈھونڈ کر دکھائیں...... سارا قصور رحمان جی کا ہے۔ بیٹی کو سمجھاتے تو وہ ہٹ دماغ تو ہے نہیں کہ نہ سمجھ پاتی۔ باپ بیٹی یعنی دونوں کی ملی بھگت ہے، بیچ میں ذلیل مجھے کر دیا۔ ہر جگہ بری خبریں سنانے کو میری زبان کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اپنے منہ میں خوشخبریاں اور لڈو پیڑے بھر رکھے ہیں، رحمان جی... انہیں ایک سال لٹکانے کے بعد خود تو بآسانی اس معاملے سے فرار ہوگئے۔ ان کی باتیں سننے کو صرف میں ہی نظر آئی تھی۔ بیچاری سائرہ اور عادل کیا سوچیں گے۔ ہمارے بارے میں شکر ہی کریں گے کہ ہم جیسے لوگوں سے جان چھوٹ گئی۔" وہ تلملا کر خود کلامی کرتی ہوئی لاؤنج کے صوفے پر ہی لیٹ کر دونوں کو کوستی رہی اندر ہی اندر اس بہترین رشتے کے ضائع ہو جانے پر کھولتی رہی اور آنسو اپنے من میں گراتی رہی۔

☆☆☆

"سر! میں حمیرا عرض کر رہی ہوں، حمیرا نے عادل کو یونیورسٹی میں ہی فون کیا۔ آپ کی میرے موبائل پر مسڈ کالز دیکھ کر تو میں فکر مند ہوگئی کہ اللہ خیر کرے کہ آپ خیریت سے ہوں۔ کیونکہ چند دن پہلے کی پریشانی، ناامیدی اور مایوسی مجھے ابھی تک چین نہیں لینے دے رہی۔" وہ زبان کو مصری کی ڈلی بناتے ہوئے نہایت اپنائیت اور لگاوٹ سے بولی۔

"پلیز مجھ پر ایک احسانِ عظیم کر دو، یہ جو تم نے موبائل صرف شو پیس بنا رکھا ہے، اسے ڈسٹ بن میں ڈال دو۔" وہ نصیحت کے انداز میں بولا۔

''سر...... سوری، دراصل میں مارکیٹ کے لیے بہت تیزی سے نکلی اور موبائل اپنے کمرے میں ہی بھول گئی۔''
وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

''چلو کیا یاد کرو گی؟ تمہیں معاف کیا۔'' لہجے میں عجلت تھی۔

''سر مسئلہ کیا ہے؟ کیا نمرا کی طرف سے پیش رفت ہوئی۔ آپ خواہ مخواہ منتظر ہیں، ریجیکٹ کرنے کے بعد آپ کو ذہنی سکون اور نمرا کو احساسِ ندامت وردِ زیاں مار ڈالے گا۔ اپنی ہمدرد اسٹوڈنٹ کا مشورہ مان کر تو دیکھیں۔ راوی چین ہی چین لکھے گا۔'' وہ تنک کر بولی۔ ''وہ خود کو بہت اعلیٰ سمجھنے لگی ہے۔ دفع کریں اس کو۔''

''حمیرا وہ وقت ہاتھ سے نکل گیا ہے، انہوں نے انکار کردیا ہے۔ اب تو ہلکی سی امید و آس بھی نہیں رہی۔ ایک نقطے پر سوچ اٹک کر رہ گئی ہے کہ ایسا فیصلہ انہوں نے کیوں کیا...... کیا نمرا انہیں چاہ رہی تھی...... اسے منانے کی کوشش میں دیری ہو رہی تھی۔ حمیرا اگر تو اس نے مجھے بے وقوف بنا کر ڈگری حاصل کی ہے تو اس کا انتقام ضرور لوں گا۔'' لہجہ مستحکم تھا۔ ''دل چاہتا ہے اسے اٹھا کر لے آؤں اور پھر کبھی جانے نہ دوں۔ دنیا اسے تلاشتی رہے مگر اسے ڈھونڈ نہ پائے۔ اسے بھلانا میرے بس میں نہیں رہا۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

یہ سن کر حمیرا چونک گئی۔

''سر! اس کی محبت سے باہر نکل کر تو دیکھیں۔ دنیا بہت حسین اور بہت وسیع ہے۔ آپ خود کو جلد از جلد اس کیفیت سے نکالنے کے لیے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں۔ نمرا سے حسین، ذہین و فطین لڑکی کا حصول ممکن ہو جائے گا۔ نمرا نے آپ کو ریجیکٹ کرنے کی جو نادانی دکھائی ہے اسے احساس دلانا آپ کا نصب العین ہونا چاہیے۔''

''اس وسیع و عریض دنیا میں نمرا جیسی ایک لڑکی بھی نہیں ہے۔ میں اسے اٹھالاؤں گا۔ زبردستی اور دھاندلی سے نکاح پڑھوا کر اسے ہمیشہ کے لیے اپنا پابند بنالوں گا پھر وہ میری قید سے رہائی حاصل نہیں کر سکے گی۔'' وہ تقریباً چیختے ہوئے بول رہا تھا۔

''سر غصہ تھوک دیجیے، غصے کا ردِعمل نارمل نہیں ہوتا۔ آپ قانون کو اپنے ہاتھ میں مت لیں۔ ایک بار اس سے ملنے کی کوشش تو کریں۔ اور اس نامراد سے کھل کر بات کریں۔ شاید اس کے بھیجے میں آپ کی سو باتوں میں سے ایک آدھ بات سما جائے۔'' وہ اپنائیت و رازدارانہ لہجے میں بولی۔

''تم ہی ملاقات کی کوئی سبیل نکالو۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ انڈر گراؤنڈ چلی گئی ہو۔ یونیورسٹی سے کیا گئی جیسے اس کارِ جہاں سے کوچ کر گئی۔ حمیرا اب تو میرا یونیورسٹی جانا ہی بے مقصد ہو گیا ہے۔ نہ کلاس میں دل لگتا ہے نہ ہی وہاں کے ماحول میں جان ہے۔'' وہ ایک دکھ بھری لمبی آہ بھر کر بولا۔

''مجھے خود آپ پر رحم آتا ہے اور آپ کی سادگی پر افسوس بھی ہوتا ہے۔ اس نے کس شاطرانہ اور چالباز طریقے سے آپ کو اپنے گھر والوں کی طرف مائل کیا اور رعنا نے کو ڈھیل دیتی رہی۔ مطلب پورا ہوا اور صفحۂ ہستی سے ہی مٹ گئی۔'' وہ اسے طیش دلانے کے سے انداز میں بولی تاکہ وہ نمرا کی محبت کو دل سے نکال کر اپنی زندگی کو نیا پن دینے کے بارے میں سوچ سکے اور نمرا کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اسے بھلا کر کسی اور کی طرف دھیان کرے۔ اسی میں اس کی بہتری تھی۔

حمیرا کی قیاس آرائی سن کر وہ پھر سے غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ اور بری طرح کانپتے ہوئے فون بند کر دیا۔ میز پر پڑی ہوئی تمام فائلوں کو غصے سے ہاتھ مارا اور فرش پر گرا دیا۔ ٹائی کی گرہ کو ڈھیلا کر کے ایک من بھاری گالی نمرا کو دی اور اپنا سر میز پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بے بسی، لاچارگی اور مایوسی کی انتہا میں قہر و جلال عروج پر تھا۔

جاری ہے

سرپرائز

قرۃالعین خرم



وہ نہایت سرد ترین رات تھی۔ ہر سو خاموشی کا عالم تھا۔ رات کے بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ سردیوں کی طویل راتوں میں سب اپنے ، اپنے بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ اس بڑے گھر میں تین نفوس رہتے تھے جن کی خدمت پر مامور کم از کم پانچ تو نوکر ضرور تھے جو اس وقت اپنے ، اپنے سرونٹ کوارٹر میں بستر نشین تھے۔ دو نفوس میں سے ایک ذی نفس رات کے اس

پھر بہت خاموشی سے اپنے کمرے سے نکلا.....اس نے بڑی سی چادر اپنے گرد لپیٹی ہوئی تھی۔ جس کا ایک کونا زمین کو چھو رہا تھا۔ اس کا انداز بہت چوکنا تھا۔ چادر میں موجود اس کے ہاتھوں میں کچھ تھا جسے چھپانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

دھیرے دھیرے چلتا وہ وجود سیڑھیوں کی طرف جانے لگا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر دائیں طرف ایک بہت بڑا کمرا تھا جو گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا جبکہ سیڑھیوں کے دوسری طرف ایک دروازہ اور تھا جو چھت پر جانے والے زینے کی گزرگاہ کا آغاز تھا۔ اس ذی نفس نے دائیں بائیں دیکھا اور خاموشی سے سیڑھی پر قدم رکھا۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ وجود دل کی دھڑکن کو قابو کرتے ہوئے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

☆☆☆

وہ دونوں ریسٹورنٹ کے نیم تاریک گوشے میں بیٹھے تھے۔ اذان سختی سے لب بھینچے اپنے سامنے بیٹھی روتی ہوئی فرح کو دیکھ رہا تھا اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سچویشن میں کیا کرے۔

''پلیز فرح! چپ کر جاؤ، لوگ ہماری طرف متوجہ ہونے لگے ہیں۔'' اذان نے کچھ لوگوں کے متوجہ ہونے پر اپنی پوزیشن آکورڈ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''اذان! میں کیا کروں..... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی اور بابا جان نے میرا رشتہ اپنے دوست کے پوتے سے طے کر دیا ہے۔ کچھ دنوں میں وہ لوگ باقاعدہ رسم کرنے کے لیے آنے والے ہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ اب میں کیا کروں؟'' فرح نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو خود سمجھ نہیں آرہی۔ تمہارے کہنے پر دوبار میں اپنی ماما کو بھیج چکا ہوں اور دونوں بار ہی تمہارے بابا جان نے سختی سے انکار کر دیا.....اور کوئی معقول وجہ بھی نہیں بتا رہے۔ میں بار بار اپنی بیوہ ماں کی بے عزتی تو نہیں کروا سکتا ناں!'' اذان نے تلخی سے کہا۔

''پلیز میرے کہنے سے صرف ایک بار اور اگر تم اپنی ماما کو.....'' فرح نے التجا کرتے ہوئے کہا مگر اذان کے چہرے پر پھیلی سختی کو دیکھتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''دیکھو فرح، تمہاری محبت اپنی جگہ مگر میری بیوہ ماں نے ساری زندگی میری خاطر بہت کچھ سہا اور برداشت کیا ہے، میں انہیں یوں بار بار شرمندہ نہیں کروا سکتا۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارے بابا جان کتنے ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔''

اذان نے ناگواری سے کہا تو فرح بے بسی سے لب کچلنے لگی۔

دونوں کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھے رہے جیسے اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر اس خاموشی کو اذان کی آواز نے توڑا۔

''اگر تم سچ میں مجھ سے محبت کرتی ہو اور میرے ساتھ ہی زندگی گزارنا چاہتی ہو تو تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا.....اور میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' اذان نے سنجیدگی سے فرح کو مخاطب کر کے کہا۔

''ہاں تو میں نے پہلے کب منع کیا ہے، گھر جا کر میں دوبارہ بابا جان سے .....'' فرح نے اذان کی بات سمجھے بغیر کہا تو اذان نے میز پر رکھے فرح کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اسے بات مکمل کرنے سے روکا۔ اپنے ہاتھ پر اس کا لمس محسوس کرتے ہی فرح چونک گئی اور گھبرا کر اس نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا مگر اذان کی گرفت مضبوط تھی۔ فرح کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا اور آنکھیں حیا سے جھک گئیں۔

اذان ایک لمحے کے لیے ٹھٹک ہی گیا۔ فرح کا اتنا دلکش روپ دیکھ کر۔ وہ یکسر بھول گیا کہ وہ کیا کہنے والا تھا مگر اس نے خود کو سنبھالا اور گہری سانس

لیتے ہوئے فرح کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ فرح نے جلدی سے اپنا ہاتھ میز سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا کہ کہیں اذان دوبارہ نہ پکڑ لے۔

اذان نے مسکراتے ہوئے اس کی اس معصوم حرکت کو دیکھا۔ وہ فرح کی اسی سادگی اور معصومیت پہ تو فدا تھا۔ ورنہ حسن تو بہت دیکھا تھا اس نے۔ مگر بے پناہ حسن اور معصومیت کا ایسا ملاپ کم، کم ہی نظر آتا ہے۔ اس کا وجود، سورج کی پہلی، پہلی کرنوں کی طرح...... بہت پاکیزہ اور پُرنور سا لگتا تھا اور اپنے لائف پارٹنر کا ایسا خاکہ ہی اذان کے ذہن میں تھا۔

''فرح......!'' اذان نے ٹیبل پر آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔ ''اب باتوں کا وقت نہیں رہا ہے۔ اگر ہم اسی طرح باتوں میں وقت ضائع کرتے رہے تو تمہارے بابا جان، تمہیں رخصت کردیں گے، اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ۔''

''تو پھر؟'' فرح نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تو پھر یہ کہ ہم لوگوں کو کوئی بڑا قدم اٹھانا پڑے گا۔ آئی مین...'' وہ ذرا جھجکا پھر ایک دم بولا۔ ''ہم کورٹ میرج کرلیتے ہیں۔'' اذان نے گویا دھماکا کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کورٹ میرج......؟'' فرح کے لب دھیرے سے پھڑپھڑائے۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔ اس نے کبھی اس حد تک جانے کا نہیں سوچا تھا۔

''ہاں فرح...... ایک بار تم میری ہوجاؤ۔ پھر کوئی ہمیں جدا نہیں کرسکے گا۔ تمہارے گھر والوں کو ماننا ہی پڑے گا، تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے تم اچھی طرح سوچ لو ورنہ......''

''ورنہ کیا......؟'' فرح نے پلکیں اٹھا کر معصومانہ انداز میں سوال کیا۔

''ورنہ...... بھول جاؤ کہ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی اذان فاروقی بھی آیا تھا۔'' اذان نے سرد مہری سے اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ اس کی بات پر فرح ساکت وجامد بیٹھی رہ گئی۔ جیسے سنگ مرمر کی مورتی ہو۔

☆☆☆

''میں کیا کروں رشنا...... میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی اور......'' فرح نے روتے ہوئے اپنی کزن اور بچپن کی دوست رشنا سے کہا جس کا گھر ان کے گھر سے ملا ہوا تھا کہ کوئی بھی آسانی سے ایک دوسرے کی چھت ٹاپ کرآجا سکتا تھا۔

فرح کے کمرے کے باہر سے گزرتے، معظم علی کے قدم بے اختیار رک گئے۔ وہ ابھی ابھی نمازِ مغرب پڑھ کر مسجد سے لوٹے تھے۔ فرح کے کمرے کے برابر میں ان کا کمرا تھا۔ فرح سمجھ رہی تھی کہ بابا جان گھر پر نہیں ہیں۔ اور ماما جان تو اپنے کمرے میں ہی ہوتی ہیں اسی لیے وہ اتنی آزادانہ طور پر باتیں کررہی تھی۔

''اور کیا؟'' رشنا نے فرح کو کچھ دیر چپ ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

''اور...... میں اس کی بات بھی نہیں مان سکتی۔'' فرح نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر کہا۔

''کون سی بات بھلا......؟'' رشنا نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''کورٹ میرج! وہ کہتا ہے کہ اب آخری حل یہی ہے کہ ہم گھر سے بھاگ کر کورٹ میرج کریں۔'' فرح نے آہستگی سے اپنی بات مکمل کی۔ باہر کھڑے معظم علی خان کو لگا کہ جیسے وہ کھڑے، کھڑے گر جائیں گے۔ ان کا سارا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔

''تو تم نے کیا جواب دیا؟'' رشنا پریشان ہوگئی کہ کہیں اس کی یہ سادہ، معصوم سی کزن اپنے آپ کو کسی مشکل میں تو نہیں ڈال آئی۔ وہ حیرت میں مبتلا تھی۔

''میں نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے بلکہ اس نے مجھے سوچنے کے لیے ایک ہفتے کا ٹائم دیا

ہے۔" فرح نے روئے، روئے لہجے میں اسے آگاہ کیا۔ "ایک بات تو طے ہے کہ میں اذان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" فرح نے مضبوطی سے کہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اس کی بات ماننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" رشنا نے اس کی بات سے بھی مطلب لیا۔ "کیا تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ تم بابا جان اور ماما جان کے بغیر ساری زندگی رہ لوگی؟ جن کی صبح تمہیں دیکھے بغیر ہوتی ہی نہیں ہے؟" رشنا نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

فرح کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس پر ٹھنڈا پانی پھینکا ہو، اسے ہوش میں لانے کے لیے۔ وہ خاموش سی، گم صم رشنا کی شکل دیکھے جارہی تھی۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھا چکی تھی اور ایسی ہی خاموشی معظم علی خان کے اندر بھی چھا چکی تھی۔

انہیں فرح کا جواب، اس کی خاموشی کی صورت سمجھ آچکا تھا۔ وہ تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں آکر کرسی پر ڈھے سے گئے۔ راکنگ چیئر پر آگے پیچھے جھولتے ہوئے معظم علی خان حال کا دروازہ کھول بند کر کے ماضی کی گلیوں میں بھٹکنے لگے۔

☆☆☆

معظم علی خان، کی دو اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا، حشمت اور چھوٹا اور لاڈلا بیٹا انعر...... معظم علی خان نے اپنی زندگی ہی میں دو گھر ساتھ ساتھ بنوا کر دونوں بیٹوں کے نام کردیے تھے یوں دونوں ساتھ بھی تھے اور الگ بھی مگر وہ خود اپنی بیوی کے ساتھ چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔

دونوں گھر چونکہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اس لیے کبھی کسی کو دوری کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔ حشمت کی شادی انہوں نے اپنی بھتیجی سے کی جبکہ انعر کی شادی اس کی اپنی پسند سے ہوئی تھی۔ عروج بہت پیاری اور شوخ سی لڑکی تھی۔ جس کی مسکراہٹوں اور قہقہوں سے اس گھر میں زندگی محسوس ہوتی تھی۔

فرح کی آمد نے ان کی زندگی کو اور بھی خوب صورت بنا دیا۔ اس گھر کی رونقوں میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ حشمت کے دو بیٹے اور ایک بیٹی رشنا تھی۔ دونوں بیٹے حسن اور علی، فرح سے کچھ سال ہی بڑے تھے۔ رشنا، فرح سے ایک سال چھوٹی تھی۔ فرح کو اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے خوب لاڈ پیار ملا تھا سب ہی اسے اٹھائے، اٹھائے پھرتے۔ کچھ وہ خوب صورت بھی بہت تھی۔ اپنے دادا، دادی کی آنکھ کا تو وہ تارہ تھی۔

زندگی اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ، اس گھر میں مہکتی اور چہکتی تھی۔ مگر وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ بہت خوشی کے بعد، کبھی کبھی بہت گہرا غم بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اس دن انعر اور عروج اپنے کسی فرینڈ کی شادی میں گئے تھے۔ فرح کی طبیعت خراب تھی اور وہ کافی چڑچڑی ہورہی تھی۔

زہرہ بیگم نے پوتی کی طبیعت کے پیش نظر اسے گھر پر اپنے پاس ہی روک لیا۔ چار سالہ فرح ویسے بھی دادا، دادی سے زیادہ مانوس تھی۔

بہر حال انعر اور عروج دونوں خوب تیار ہو کر خوشی، خوشی شادی میں چلے گئے۔ دونوں ماشاء اللہ بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ زہرہ بیگم نے دل ہی دل میں آیت الکرسی پڑھ کر دونوں پر دم کیا۔ دونوں ہنستے ہوئے مسکراتے ہوئے بیٹی کو پیار کر کے چلے گئے۔

جب رات گئے تک ان کی واپسی نہ ہوئی تو معظم علی بہت پریشان ہوئے۔ ابھی وہ سوچ رہے تھے کہ حشمت کو فون کر کے بلالیں۔ اسی وقت حشمت دوڑے، دوڑے ان کے پاس چلے آئے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ معظم علی کی چھٹی حس نے کچھ غلط ہونے کا اشارہ دیا تھا۔

"کیا ہوا حشمت علی......؟" معظم علی نے ڈرتے، ڈرتے پوچھا۔

"بابا جان...... ! پلیز حوصلے سے میری بات

سنیں...... ابھی مجھے اسپتال سے فون آیا ہے بس آپ میرے ساتھ چلیں۔'' حشمت نے جلدی سے کہا۔

'' ہمارا دل بہت گھبرا رہا ہے، سب ٹھیک ہے ناں......؟'' معظم علی نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ مگر راستے بھر حشمت خاموش ہی رہا۔

اسپتال پہنچ کر ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ شادی سے واپسی پہ کسی نے ان سے گاڑی چھیننے کی کوشش کی...... اور انصر کے مزاحمت کرنے پر وہ دونوں کو گولیاں مار کر بھاگ گئے۔ انصر اور عروج نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ ایک قیامت تھی جو اُن لوگوں پر گزری۔ دو، دو جوان موتیں ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ان کے خاندان پر تو گویا قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ ننھی بچی کا معصوم چہرہ دیکھ، دیکھ کر یہ دکھ اور بڑھ جاتا تھا۔

معظم علی نے اللہ کی رضا میں، خود کو راضی رکھتے ہوئے بہت ہمت اور حوصلے سے خود کو بھی سنبھالا اور ساتھ ہی باقی سب کو بھی...... اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ غم دیتا ہے تو صبر بھی عطا کرتا ہے اور وقت کے ساتھ، ساتھ صبر آ ہی جاتا ہے۔ معظم علی اور زہرہ بیگم نے اپنے ہر دکھ کا مداوا، فرح کی معصوم ذات سے کر لیا۔ انہوں نے فرح کو بہت محبت اور توجہ سے پالا تھا۔ وہ سب کی آنکھوں کا تارہ تھی۔ ان کے بے جا لاڈ پیار نے بھی اسے بگڑنے نہیں دیا تھا کیونکہ اس کی تربیت بہت مضبوط ہاتھوں میں ہو رہی تھی۔ فرح، سب کی دیکھا دیکھی، اپنے دادا اور دادی کو بابا جان اور ماما جان ہی کہتی تھی۔

فرح اور رشنا دونوں کزن ہونے کے ساتھ ساتھ بہت گہری دوستیں بھی تھیں۔ ان دونوں کا زیادہ تر وقت ایک دوسرے کی سنگت میں گزرتا تھا۔ پڑھائی بھی دونوں نے ساتھ، ساتھ ہی کی اور کھیل بھی...... گرمیوں کی طویل دوپہروں میں وہ چھت پھلانگ کر ہی ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی تھیں۔ خاص کر جب کوئی کام بڑوں سے چھپ کر کرنا ہوتا تو وہ یہی راستہ اختیار کرتیں۔ اس چھت سے ایک سیڑھی پچھلے صحن کی طرف جاتی تھی۔ جہاں پچھلی گلی میں جانے کے لیے ایک دروازہ تھا جو زیادہ تر بند ہی رہتا تھا۔ گھر کا یہ حصہ زیادہ تر نوکروں کے استعمال میں رہتا تھا مگر رات کو یہاں مکمل خاموشی رہتی تھی۔

فرح ایک بہت فرمانبردار اور بھولی بھالی سی لڑکی تھی۔ جس کی دادا، دادی میں جان تھی۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ نہ جانے کیسے فرح کو محبت نے اپنے شکنجے میں کس لیا۔ اذان، فرح کا کلاس فیلو تھا۔ دونوں یونیورسٹی میں ساتھ، ساتھ ہوتے۔ یوں دونوں کی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تھی اور بات پروپوزل تک پہنچ گئی تھی۔

فرح کے کہنے پر اذان، دوبار اپنی ماں کے ساتھ فرح کا ہاتھ مانگنے آیا تھا مگر معظم علی کو نہ جانے سب کچھ ٹھیک ہوتے ہوئے بھی کوئی بات کھٹکی تھی۔

فرح بہت ناز و نعم سے پلی بڑھی تھی جبکہ اذان نے باپ کے مرنے کے بعد بہت مشکلات دیکھی تھیں۔ وہ لوگ کسی بھی طرح، ان کے ہم پلّہ نہیں تھے۔ معظم علی نے فرح کے لیے اپنے دوست کے پوتے ارحم کا سوچ رکھا تھا۔ وہ کئی بار اشاروں ہی اشاروں میں اپنی خواہش کا اظہار کر چکے تھے۔

معظم علی کی خواہش تھی کہ ان کی لاڈلی پوتی کو زندگی میں بہتر سے بہتر ساتھی ملے۔ وہ بہت حساس اور سادہ سی تھی جبکہ اذان انہیں کسی حد تک خود پسند اور خود غرض سا لگا تھا۔

'' تو میرا اندازہ درست تھا، تمہارے بارے میں اذان فاروقی......'' معظم علی اِک گہری سانس لیتے ہوئے ماضی سے حال میں واپس پہنچ گئے۔

'' جو شخص عزت کے مرتبے و مقام کو نہ سمجھتا ہو وہ اچھا اور خاندانی کیسے ہو سکتا ہے؟ اپنی محبت کے جال میں ایک معصوم لڑکی کو پھانس کر گھر سے بھاگنے کا مشورہ دینے والا، کبھی کسی بھی رشتے کو جائز مقام

نہیں دے سکتا۔ ایسے لوگ صرف وقتی خوشی چاہتے ہیں۔ اپنی انا کی تسکین اور بس......'' اسی وقت فضا میں عشا کی اذانیں، بلند ہونا شروع ہوگئیں۔ معظم علی نے وضو کیا اور مسجد کی طرف چل پڑے۔

☆☆☆

''پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟'' زہرہ بیگم ان کی زبانی ساری صورتِ حال کے بارے میں جان کر ایک دم پریشان اور خوفزدہ ہوگئیں۔

''ایک بات تو طے ہے، میں کسی بھی صورت فرح کی شادی اس شخص سے ہرگز نہیں کروں گا۔ جس نے اسے گھر سے بھاگنے کا مشورہ دے ڈالا۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی...... وہ ہماری بچی کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔'' معظم علی نے غصے سے کہا۔

''مگر آپ...... ایک بار ٹھنڈے دل سے......'' زہرہ بیگم نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... آپ نہیں سمجھیں گی۔ وہ شخص کسی بھی طور پر ہماری فرح کے قابل نہیں ہے۔'' معظم علی نے زہرہ بیگم کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں فرح کا دشمن نہیں ہوں اور نہ ہی میں اسے اندھے کنویں میں چھلانگ لگانے کی اجازت دوں گا۔ اتوار کو صدیقی نے آنا ہے، اپنی فیملی کو لے کر...... وہ کوئی چھوٹی سی رسم کرنا چاہ رہے ہیں۔ اسی دن میں انہیں شادی کی تاریخ بھی دے دوں گا۔ اب جتنی جلدی فرح کی شادی ہوجائے بہتر ہے۔'' معظم علی نے قطعیت بھرے لہجے میں بیوی سے کہا۔

''اور اگر اس سے پہلے......'' زہرہ بیگم نے بات ادھوری چھوڑ دی مگر اس ادھوری بات کا مفہوم معظم علی کی بھی سمجھ میں آگیا تھا۔

''نہیں، میرا دل نہیں مانتا کہ فرح ایسا کچھ کرے گی۔ مگر میں دل سے زیادہ عقل کی سنتا ہوں۔ فرح اپنی نادانی کے ہاتھوں کمزور پڑ سکتی ہے اسی لیے اب آپ کو اور مجھے اپنی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھنی ہیں۔ بس ایک بار عزت سے وہ اس گھر سے رخصت ہوجائے۔'' معظم علی نے سنجیدگی سے کہا تو زہرہ بیگم نے اثبات میں سر ہلا دیا مگر وہ دونوں جانتے تھے کہ آنے والا یہ ہفتہ قیامت کا ہے۔

☆☆☆

ایک ہفتہ ایک صدی کے برابر ہوگیا تھا۔ معظم علی اور زہرہ شدید قسم کے اعصابی دباؤ کا شکار تھے۔ کسی بھی لمحے کچھ ہوجانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔

ان تینوں کے درمیان ایک اَن دیکھا سا کھچاؤ محسوس ہوتا۔ تینوں اب ایک دوسرے سے بہت کم، کم مخاطب ہوتے تھے۔ معظم علی کے ذہن میں ایسے کتنے ہی قصے کہانیاں گھوم گئے تھے۔ جن میں گھروں سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کی باتیں ہوتی تھیں۔ اخبارات ایسے واقعات سے بھرے ہوتے تھے۔

ان کا دل کہتا تھا کہ فرح ایسی نہیں ہے مگر دوسری طرف ان کی عقل اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ جمعرات کی رات تھی سردیوں کی راتیں ویسے بھی بہت طویل اور خاموش ہوتی ہیں۔ فرح نے آرام سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا...... وہ دائیں بائیں دیکھتی ہوئی چوکنا سی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔

معظم علی، کئی راتوں سے ویسے بھی سو نہیں پائے تھے۔ انہوں نے فرح کو بڑی سی شال میں لپٹے، سیڑھیوں کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا۔ اس کا انداز بہت مشکوک اور پُراسرار سا لگا۔ اسے سیڑھیوں کی طرف جاتا دیکھ کر معظم علی دھک سے رہ گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ فرح بھاگنے کے لیے پیچھے والا زینہ استعمال کرے گی جو چھت سے ہوکر پچھلے صحن کی راہداری کے کونے پر تھا اور وہیں پر باہر گلی میں کھلنے والا دروازہ، اگر وہ مین گیٹ استعمال کرتی تو کوئی بھی اسے دیکھ سکتا تھا۔ فرح...... کے دونوں ہاتھ چادر کے اندر تھے۔

''ضرور اس نے کوئی بیگ یا شاپر پکڑا ہوا

ہوگا۔'' معظم علی نے بے اختیار سوچا۔ آج انہیں اپنے اعتبار کے ٹوٹنے پر بہت دکھ اور رنج محسوس ہو رہا تھا۔ اشتعال کی ایک شدید لہر اُن کے اندر اٹھی اور انہوں نے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ کر لائٹس آن کر دیں۔

''فرح......!'' معظم علی غصے سے دہاڑے......

فرح جو سیڑھیوں کے درمیان میں پہنچ گئی تھی۔ ایک دم سے لائٹس آن ہوتی دیکھ کر اور اپنے پیچھے بابا جان کی کڑک دار آواز سن کر رک گئی۔ وہ گھبرا کر پیچھے مڑی۔

''بابا جان...... آپ......؟'' فرح کی آنکھوں میں حیرت لہرائی۔

''مر گئے تمہارے بابا جان......'' معظم علی نے دہاڑ کر کہا۔ اسی وقت زہرہ بیگم بھی بھاگی، بھاگی آئیں ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا......؟'' انہوں نے معظم علی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

سامنے ہی فرح بھی حیران سی کھڑی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''پوچھو اپنی اس لاڈلی سے...... جو رات کے اس پہر ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر، ہماری عزت نیلام کرنے گھر سے فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ کاش اس دن انعم اور عروج کے ساتھ یہ بھی مر گئی ہوتی۔ کم از کم کسی اپنے کے مرنے کا دکھ ایک بار ہی برداشت کر کے رو، پیٹ کر چپ کر جاتا' یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا ہمیں آج۔'' معظم علی نے نفرت بھرے لہجے میں فرح کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہائے میرے اللہ......'' زہرہ بیگم اس انکشاف پر دل تھام کر رہ گئیں۔

اور فرح، بابا جان کے ان سخت اور نفرت انگیز لہجے اور جملوں پر پتھر کی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی چیزیں نیچے گر پڑیں۔ اور اس کے لب دھیرے سے پھڑپھڑائے۔

''بابا جان......'' اسی وقت سیڑھیوں کے اختتام پر موجود کمرے کا (جو گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا) دروازہ کھلا اور رشنا، اس کے پیچھے احسن اور علی کے چہرے نمودار ہوئے۔

''کہا بھی تھا اس لڑکی سے کہ بغیر کوئی شور شرابہ کیے آرام سے آنا کہ کہیں دادا جان اور دادی جان کی آنکھ نہ کھل جائے مگر کوئی کام بھی اس سے ٹھیک سے نہیں ہوتا۔ سارے سرپرائز کا ستیاناس کر دیا۔'' احسن نے خفگی سے بولتے ہوئے فرح کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ جو بت بنی کھڑی سامنے دیکھ رہی تھی۔

بابا جان اور ماما جان ان سب کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''سرپرائز......! کیسا سرپرائز......؟'' معظم علی نے اچنبھے سے پوچھا۔

''ایک منٹ...... ابھی بتاتے ہیں......'' احسن اور علی نے کہا۔

''پانچ، چار، تین، دو، ایک' ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' بارہ بجتے ہی لاؤنج ان تینوں کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ معظم علی اور زہرہ بیگم ایک ساتھ چونکے۔ آج 5 فروری تھی۔ ان کی سالگرہ...... جو ہر سال ان کے سب بچے انہیں وش کرنا نہیں بھولتے تھے۔ وہ تینوں دادا کے گلے لگ گئے۔

''فرح کی بچی...... تمہیں کارڈ بنا کر لانا تھا اور دادا جان کا گفٹ کہاں ہے جو تمہیں اس دن پیک کرنے کے لیے دیا تھا۔'' رشنا نے دانت پیستے ہوئے فرح کو گھورا تو وہ چونکی۔ اس کے چہرے کے تاثرات ناقابلِ فہم تھے۔

''کیا ہوا......؟'' اب ان تینوں نے فرح کی مسلسل خاموشی کو محسوس کر کے چونکتے ہوئے پوچھا۔ جبکہ معظم علی کی نظریں فرح کے پاؤں کے پاس گری چیزوں پر تھیں جن میں کارڈز اور چمکیلے ریپر میں کچھ پیک تھا۔

وہ پچھلے ایک ہفتے سے جس وہم میں مبتلا تھے۔

آج اسے حقیقت کے لبادے میں خود ہی لپیٹ کر سچ بتانا چاہ رہے تھے۔

معظم علی اس سال پورے 70 سال کے ہوگئے تھے۔ ہر سال ہی سب مل کر انہیں کوئی نہ کوئی سرپرائز گفٹ ضرور دیتے تھے۔

اس بار فرح نے سوچا کہ بابا جان کو اپنے ہاتھوں سے بنا کر کارڈ زدوں گی اور ساتھ ہی ان سے اپنی بے جا ضد کی معافی بھی مانگ لوں گی۔ پچھلے کافی دنوں سے جو سرد مہری اور خاموشی کی فضا اس گھر میں قائم تھی وہ ختم ہوجائے گی۔ زندگی پہلے کی طرح ان کے آنگن میں مسکرانے لگے گی۔

رشنا سے اس دن بات کرتے ہوئے جب رشنا نے یہ کہا تھا کہ......

”کیا تم بابا جان اور ماما جان کے بغیر ساری زندگی رہ لوگی، جن کی صبح تمہیں دیکھے بغیر نہیں ہوتی ہے؟“

فرح کو ایسا لگا تھا جیسے کسی نے اس کے بھڑکتے جذبات پر ٹھنڈا برف پانی ڈال دیا تھا۔ اس پہلو پہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ ان دونوں کے بغیر زندگی کیسے گزارے گی۔

اس نے کچھ دیر خاموش رہ کر سوچا تو اسے لگا کہ وہ اذان فاروقی جیسی کئی محبتیں اپنے بابا جان، ماما جان پر وار سکتی ہے۔ ان کی عزت سے بڑھ کر اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔

اسی خاموشی کے طویل وقفے کو بابا جان نے فرح کی ہاں سمجھا تھا۔ فرح، رشنا سے بات کرنے کے اگلے دن ہی اذان فاروقی کو سختی سے منع کرچکی تھی۔ اور یہ کہ اسے اذان فاروقی سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ اسے ایسا گھٹیا اور ذلت آمیز مشورہ دے گا یعنی کورٹ میرج کرنے کا......

فرح معصوم اور سادہ ضرور تھی مگر بے وقوف یا نادان نہیں...... اور نہ ہی خود غرض...... وہ جانتی تھی کہ اس کے والدین کے مرنے کے بعد دادا، دادی نے کتنی محبت اور محنت سے اسے پالا تھا کہ اسے کبھی اپنے والدین کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ مگر آج......

فرح دھیرے، دھیرے کر کے ایک، ایک سیڑھی اترتی بابا جان کے سامنے آ کھڑی ہوئی وہ جب بولی تو اس کی آواز بہت سرد اور بیگانی تھی۔

”آپ نے ہمیشہ مجھ سے بہت محبت کی...... مجھے ہر آسائش دی، ہر خواہش میرے منہ سے نکلنے سے پہلے پوری کردی۔ کاش آپ یہ سب نہ کرتے، بس ایک کام کرتے، اپنی تربیت پر، اپنی فرح پر اعتبار کرتے۔“ وہ سسک اٹھی تھی۔

”آج مجھے سچ میں ایسا لگا کہ میں یتیم ہوں...... آج میرے والدین حیات ہوتے تو، یہ سب کچھ نہ ہوتا جو آج ہوا ہے۔“ فرح نے روتے ہوئے کہا اور بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پیچھے کھڑے سارے نفوس، اپنی، اپنی جگہ کھڑے سوالوں کے لامتناہی سلسلے میں کھو چکے تھے۔ مگر ان سب میں سب سے بری حالت معظم علی کی تھی۔ جنہوں نے اپنے شک اور بے اعتباری کی وجہ سے اپنی زندگی کا سب سے پیارا رشتہ کھو دیا تھا۔

اس دم انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے انصر کی موت آج ہی ہوئی ہے۔ ان کا پیارا اور چھوٹا بیٹا ان سے آج روٹھ گیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے انصر کے جگر گوشے کو بے اعتباری کے شک کا زہر پلا دیا تھا کہ وہ اپنی ہی نظروں میں گر کر مر چکا تھا۔

بابا جان کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ وہیں سیڑھیوں پر ڈھے سے گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دل میں سخت پچھتاوا...... اپنے لفظوں اور سوچ کی سنگینی پر......

کبھی کبھی عقل کو ایک طرف رکھ کر دل کی بھی مان لینی چاہیے۔ دل کا راستہ اعتبار سے ہو کر جاتا ہے۔ وہ اعتبار جو ہمیں اپنے ہر رشتے پر کرنا چاہیے۔ وہ اعتبار جو ہر رشتے کا حق بھی ہے۔

ناولٹ

سودا ہو تو ایسا ہو

عظمیٰ افتخار



"یہ دیکھیں ماما، اس شرٹ کی فٹنگ کتنی لوز ہے۔ میں کیا اپنے نکاح میں یہ تھیلا سی قمیص پہنوں گی؟" رمشہ نے جھنجلا کر خود کو آئینے میں دیکھا اور کمرے میں داخل ہوتی کلثوم سے کہا۔ جنہوں نے ہاتھ میں دھلے ہوئے خشک کپڑے پکڑ رکھے تھے۔ شام میں رمشہ کا نکاح تھا اور ماسی چار دن سے غائب تھی۔ ملاحت نے کپڑے تو دھو دیے تھے لیکن بہر حال سمیٹ کر رکھنا بھی ایک کام تھا۔

کنزیٰ نے ذرا کی ذرا سر اٹھا کر اپنے سے ڈیڑھ سال بڑی بہن کو دیکھا اور ہونٹوں تلے آئی مسکراہٹ کو چھپا کر دوبارہ اپنے ناخن فائل کرنے لگی۔

"ہاں تو ملاحت مشین لیے بیٹھی تو ہے۔ جا کر دے دو، ابھی فٹنگ کر دے گی۔" کلثوم نے قمیص کی طرف دیکھا اور کپڑوں کا ڈھیر بیڈ پر رکھا۔

"ظاہر ہے، ان ہی کو دوں گی۔ اب وقت تھوڑی ہے کہ ٹیلرز سے جا کر مغز ماری کروں۔ پہلے ہی آپ نے دودھ جلیبی کھلا، کھلا کر میرا وزن بڑھا دیا۔ اسے پہن کر تو میں مزید بھدی لگوں گی۔" رمشہ کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔

"جی نہیں، ملاحت پہلے میرا سوٹ سئیں گی۔ اور ویسے بھی یہ وزن دودھ جلیبی سے نہیں بڑھا۔ بہت سونے اور مہینے بھر سے کوئی کام نہ کرنے سے بڑھا ہے اور فکر نہ کرو۔ تم موٹی بھی ہو جاؤ گی تو رضا بھائی کی فیملی میں پھر بھی سب سے اچھی ہی لگو گی۔" کنزیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ یہ طنز نہیں تھا لیکن رمشہ کو جا کر سیدھا دل پر لگا تھا۔

"ہاں تو میری شادی ہے، اتنا آرام کرنے کا تو حق بنتا ہے میرا اور رضا کی فیملی اتنی بھی بری نہیں ہے، بس تھوڑا رنگ کم ہے اور بھرا، بھرا جسم ہے سب کا۔ اور شکر کرو، پھپھو کو کہہ کر ماما نے ملاحت کو بلوا لیا۔ ورنہ تو ماسی کے نہ آنے سے سارا لوڈ تم پر ہی ہوتا۔ تب تمہیں میری قدر آتی... اور تمہاری عقل بھی ٹھکانے آتی۔"

"پھر بھی تم اتنا کام ہرگز نہیں کرتیں۔ جتنا ملاحت منٹوں میں کر لیتی ہیں اور تھوڑا کہہ کر کسر نفسی سے کام نہ لو، اچھے خاصے موٹے ہیں تمہاری سسرال والے۔" کنزیٰ نے دوبدو جواب دیا.... رمشہ اور کنزیٰ کی جہاں بہت بنتی تھی، وہیں تو، تو میں، میں بھی چلتی تھی۔ رمشہ مہنگی سے مہنگی چیز خریدتی تھی۔ ہمیشہ مہنگے ٹیلرز سے کپڑے سلواتی۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی کسر رہ جاتی اور وہی مثال بنتی۔ نام بڑے اور درشن چھوٹے۔ کنزیٰ پرفیکشنسٹ تھی، سوچ بچار کر چیزیں خریدتی۔ اچھی چیز سستے داموں لیتی۔ پھر میگزین سے ڈیزائن دیکھتی اور مزے سے ملاحت سے سلواتی۔ چاہے کتنی بار بھی سی کر ادھیڑا جائے۔ اسے پتا ہوتا تھا کہ چیز اس کے مزاج کے مطابق ہی بنے گی۔ اور ہوتا بھی یہی تھا، اس کا ہر کام وقت سے پہلے مکمل اور ہر چیز پرفیکٹ ہوتی تھی۔ وہ اس معاملے میں آنکھ بند کر کے ملاحت پر یقین رکھتی تھی۔

"ماما دیکھ رہی ہیں آپ اسے۔ میرے ہی سامنے میرے سسرال والوں کی برائی کر رہی ہے۔ اور ملاحت کی کیسے بڑھ چڑھ کر تعریف کر رہی ہے۔ اگر وہ یہاں آ کر دو چار کام کر لیتی ہیں تو کوئی احسان نہیں کرتیں۔ آخر اس گھر کی ہونے والی اکلوتی بہو ہیں۔ اپنی اچھی صورت سے ہمارے بھائی کو تو بہت پہلے ہی ہتھیا لیا، اب یہ گھر بھی سنبھالیں۔ ہمارے بعد تو وہی اس گھر پر اور بھائی کی کمائی پر عیش کریں گی۔" رمشہ نے تنفر سے کہا۔ اس کا منگیتر تھوڑا کم صورت تھا۔ وہ جب، جب ملاحت اور اپنے بھائی فرجاد کا کپل سوچتی یا کنزیٰ اور ولی کا تو اسے اپنا اور رضا کا کپل بہت عام سا لگتا تھا۔ اور یہ واحد اعتراض تھا جسے کلثوم نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ ورنہ تو شادی کی ہر طرح کی تیاری رمشہ کی مرضی ومنشا کے مطابق ہوئی تھی۔ اور ابا میاں تو ہمیشہ سے ہی کردار کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک صورت شکل ثانوی چیز تھی۔

"جی نہیں، ملاحت بہت اچھی ہیں۔ انہوں نے ہمارے بھائی کو نہیں ہتھیایا۔ بھائی نے ہی انہیں پسند کیا تھا۔" کنزیٰ ملاحت کے بارے میں کچھ نہیں سن سکتی تھی۔ کلثوم اور رمشہ کے مقابلے میں اس کے دل میں ملاحت کے لیے بہت جگہ تھی۔

"بس بھی کرو، جب دیکھو چونچیں لڑاتی رہتی ہو دونوں۔ کیا سوچے گی ملاحت کہ بہنیں ہو کر تم

دونوں میں اتفاق نہیں ہے، کل کو اس نے بھی بیاہ کر اس گھر میں آنا ہے۔ جاؤ رمشہ، تم ملاحت کو اپنی قمیص دے کر آؤ۔"

"لیکن ماما، میرا سوٹ۔" کنزیٰ اٹھکی۔

"یہاں آؤ اور یہ سارے کپڑے تہہ کر کے الماری میں رکھو۔ شام میں مہمان آئیں گے۔ فکر نہ کرو۔ سل جائے گا تمہارا سوٹ بھی۔ مایوں پرسوں ہے، آج نہیں۔ کس نے کہا تھا، اتنا مشکل ڈیزائن منتخب کرو؟" کلثوم نے ڈپٹتے ہوئے کہا، رمشہ چڑانے والی مسکراہٹ سے کنزیٰ کو دیکھتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

"بس میری مرضی ماما، اب بندہ بہن بھائیوں کی شادی میں بھی انجوائے نہ کرے تو کب کرے۔ اور میں بتا رہی ہوں، ابھی کچھ دیر میں میری فرینڈز آئیں گی۔ اور ہم گانے بھی گائیں گے۔ ابا میاں سے کہہ دیں، منع نہ کریں۔ ورنہ تو شریعت اور مذہب کی باتیں شروع کر دیں گے۔ یہ گناہ ہے وہ، ثواب ہے۔" وہ کپڑے تہہ کرنے بیڈ پر آ تو گئی تھی لیکن سوئی اپنی فرمائشوں پر ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے، کہہ دوں گی کہ بچیوں کو تھوڑا ہلا گلا کرنے دیں۔ لیکن تم بھی ذرا دھیان رکھنا۔ گلا پھاڑ، پھاڑ کر محلے بھر کو اکٹھا نہ کر لینا۔ بس کمرا بند کر کے تھوڑا بہت گا بجا لینا۔" کلثوم نے ہاتھ اٹھا کر اپنی دانست میں تسلی دی اور کمرے سے باہر نکل گئیں لیکن بھلا کنزیٰ کی اس تسلی سے کیا تشفی ہونی تھی۔ وہ منہ بنا کر رہ گئی۔

"میں ولی سے ہی بات کروں گی۔ ایک وہ ہی ہے جو ابا میاں سے ڈھنگ سے اجازت دلوا سکتا ہے۔ ہونہہ کمرا بند کر کے گا بجا لینا، جیسے شادی نہ ہوئی بیمار کی مزاج پرسی ہو گئی، حد ہوتی ہے۔ یعنی کہ وہی بات ہو گئی......

سرہانے میر کے آہستہ بولو

ابھی ٹک روتے، روتے سو گیا ہے"

جھنجلاہٹ کا شکار ہو کر وہ کپڑے بس جلدی، جلدی تہہ کرنے لگی۔

"کیا بات ہے کزن، اکیلے کمرے میں شاعری...... یعنی کہ پورے، پورے عشق کے آثار ہیں۔"

کنزیٰ نے چونک کر آواز پر سر اٹھایا۔ ولی دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، دروازے کی چوکھٹ میں کھڑا تھا۔

"عشق کے نہیں، جھنجلاہٹ کے آثار ہیں۔" تہہ کی ہوئی قمیص کا گولا بنا کر اس نے بیڈ کراؤن پر مارا۔

"اگر عشق کے آثار ہوتے تو میں طبیب بن کر کوئی دوا ضرور تجویز کرتا۔" اس کے انداز میں شرارت اور نظروں میں کنزیٰ کے لیے احترام آمیز محبت تھی۔ وہ مسکراتا ہوا بیڈ تک آیا اور اسی قمیص کو کھول کر پھر سے تہہ کرنے لگا۔

کنزیٰ اس کے انداز پر جھینپ گئی۔ وہ جانتی تھی، ولی کو ذو معنی جملے بولنے میں ملکہ حاصل تھا۔ اور کنزیٰ کی اردو دانی بھی، ولی کی صحبت کا اثر تھی۔ کبھی کبھی جب وہ بہت موڈ میں ہوتا اور ہر بات پر شعر کہتا تو کنزیٰ ہنستے ہوئے کہتی۔ "تم پہلے ڈاکٹر ہو گے جو اپنے مریضوں کا علاج، دوا سے نہیں شاعری سے کرو گے۔"

"تم کیا جانو، عشق بھی روگ بلا ہوتا ہے اور شاعر تو بنتا ہی عشق سے ہے۔ چاہے عشق حقیقی ہو یا مجازی۔" وہ بہت مزے سے کہتا۔ "لیکن خیر۔ تم اپنی جھنجلاہٹ مجھ پر اتار سکتی ہو۔ آخر مستقبل قریب میں بھی تو یہی کام کرو گی۔" وہ اب اس کے سامنے تھوڑا جھکا تھا۔

"ولی۔ی...... ی ی ی۔" اس نے ولی کے نام کو لمبا کھینچا۔ وہ پاس ہو اور دل کی بات بھی کہے تو کنزیٰ کے اندر کی بولڈ لڑکی چپکے سے میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی تھی۔

"اگر تم اس طرح بات کرو گے تو میں کیسے

بتاؤں گی کہ مجھے کیا مسئلہ ہے۔''

''او کے، او کے، بولو کیا بات ہے؟'' جوتی خریدنے کی فرمائش ہے یا فرجاد بھائی سے نیا موبائل منگوانا ہے...... یا پھر ابا میاں سے اجازت لینی ہے دوستوں کے ساتھ شاپنگ کرنے کی۔'' ولی کو اندازہ تھا۔ بات کچھ ایسی ہی ہوگی۔

''مجھے رمشہ کے نکاح سے پہلے ڈھولکی رکھنی ہے، تم ابا میاں سے کہو ناں کہ مجھے اور میری سہیلیوں کو صحن میں زور، زور سے گانا گانے کی اجازت دے دیں۔'' کیا مان بھرا انداز تھا۔ ولی دیکھتا رہ گیا۔

''ہاں تاکہ سارا محلہ کہے کہ حکیم جمال الدین کے گھر، جہاں سے ہمیشہ قرأت کی آواز آتی ہے۔ نکاح جیسی بابرکت تقریب سعید کے بجائے، گانے بجانے کا شغل ہو رہا ہے۔''

''پلیز ولی...... ولا دو ناں اجازت۔ خوشی کا موقع ہے۔ تم میرے لیے اتنا نہیں کر سکتے۔ آخر میری بہن کی شادی ہے۔''

ولی پر اس کے سارے حقوق تھے۔ اور بقول ولی محبت میں تو محبوب کے حقوق بن کہے، واجب نہیں فرض ہو جاتے ہیں۔ اور وہ محبت جو بچپن سے ساتھ ساتھ دونوں کے درمیان چلی ہو۔ وہ تو فرض سے بھی کچھ بڑھ کر تھی، شاید، آسمانی دنیا میں اس کا شمار عبادت میں ہوتا ہو۔ لیکن ایسی پاکیزہ محبت کہ آج تک ولی نے اس پر کبھی عامیانہ نگاہ نہ ڈالی تھی۔ فاصلے پر رہ کر بات کرتا تھا۔ دل کا حال یا تو شاعری میں کہتا یا ذومعنی جملوں میں۔ دونوں کے دل کا حال بس رمشہ جانتی تھی۔ ایک کمرے میں سونا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ بہت چھپانے پر بھی رمشہ کو کنزیٰ کے دل کا حال پتا چل ہی گیا تھا۔ جوانی کی سیڑھیوں پر قدم دھرتے ہوئے ایک بار کنزیٰ نے ابا میاں کے منہ سے سنا تھا وہ کلثوم جہاں سے کہہ رہے تھے۔

''اگر ولی کی مرضی ہوگی تو کنزیٰ کی شادی، ولی سے ہی کروں گا۔'' پھر یہ جملہ ہمیشہ اس کے آس پاس گونجتا رہا۔ کب ساتھ ساتھ کھیلتے ہوئے دل اور نظر دونوں بدل گئے، کنزیٰ کو پتا بھی نہ چلا۔ اور وہ شاید کبھی ولی کو اپنے دل کا حال نہ بتاتی اگر جو خود ولی بھی اس کے ساتھ کے خواب نہ دیکھنے لگتا۔

''ہاہا...... ہاہا۔'' وہ زور سے ہنسا۔ ''اچھا وہ بہن.. جس سے تم ہر وقت لڑتی ہو۔'' وہ اس کے ساتھ کپڑے تہہ کروانے میں مشغول ہو چکا تھا۔

''میں نہیں وہ لڑتی ہے مجھ سے۔ ملاحت کی تعریف کیا کر دی۔ برا مان گئی۔ اور اب بھی دیکھو، ملاحت میرا سوٹ سی رہی ہیں، وہ اپنی نکاح کی شرٹ لے کر پہنچ گئی۔ اب میرا کام تو ادھورا رہ جائے گا ناں!'' روٹھا انداز تھا۔

''ریلیکس!'' ولی نے اس کی پھولی ہوئی ناک کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ''کبھی ایسا ہوا ہے کہ ملاحت کو کوئی کام دیا ہو اور وہ ادھورا رہ جائے۔ اور ملاحت کا نام نہیں لیا کرو بھابی کہا کرو۔ آخر وہ فرجاد بھائی کی منکوحہ ہیں۔'' وہ ایسا ہی تھا۔ کبھی بچپن کا ساتھی بن جاتا، کبھی اچانک بزرگ۔

''میں تو تمہارا بھی نام لیتی ہوں۔ تب تو نہیں ٹوکتے۔''

''تم مجھے جو چاہے کہہ سکتی ہو لیکن وہ تو تمہاری بھابی ہیں ناں۔''

''تم بھی تو ان کا نام لیتے ہو۔''

''مجھ سے تو صرف چھ ماہ بڑی ہیں لیکن تم سے تو دو سال بڑی ہیں۔''

''میری بات تو ادھوری رہ گئی۔ ابا میاں سے اجازت لو گے یا نہیں؟'' اس کی سوئی اپنی ہی بات میں اٹکی تھی۔

اس نے کنزیٰ کے چہرے کی طرف دیکھا، کنزیٰ اسی کی شکل دیکھ رہی تھی، ولی کے چہرے پر وہی ازلی اطمینان اور سکون تھا، جو ولی کی ذات کا خاصہ تھا۔

"سمجھو اجازت مل گئی۔" ولی کے لہجے میں یقین تھا۔ اور کنزیٰ کو پتا تھا کہ اب کام ہو جائے گا۔

"تم بہت اچھے ہو ولی۔" کنزیٰ مسکرا دی۔

"سو تو ہوں...... لیکن دھیان رکھنا۔ ایسے گانے مت سلیکٹ کرنا کہ میں بھی پچھتاؤں کہ تمہیں اجازت کیوں دلوائی' اوکے؟"

"اوکے۔" اس نے مزے سے زور، زور سے سر ہلایا۔ ولی اس کی حرکت پر کھل کر مسکرا دیا اور زیرِ لب پڑھنے لگا۔

"وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر، جو دھری تھی سو وہ دھری رہی"

☆☆☆

اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ گھٹنے کے نیچے مشین کی موٹر دبی تھی اور دونوں ہاتھوں نے کنزیٰ کی قمیص کے دامن کے سروں کو تھام رکھا تھا۔ ہم رنگ دھاگے کی سیدھی، لمبی سی لکیر بغیر کسی فیتے کے درست سمت میں دامن کو موڑتی چلی آ رہی تھی۔ سامنے رکھی چائے پڑی، پڑی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اور اس پر تہ سی آ گئی تھی۔ لیکن ملاحت کا سارا دھیان کنزیٰ کا سوٹ جلد سے جلد مکمل کرنے پر تھا۔ وہ نکاح کے بعد اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ اور باقی تقاریب وقت کے وقت ہی اٹینڈ کرنے کا ارادہ تھا اس کا۔ جس کے آنے کی آس میں، وہ چار دن پہلے ممانی کے محبت کم اور تحکم بھرے انداز پر یہاں آئی تھی، وہ آس کل رات ہی ٹوٹ چکی تھی۔

"ملاحت، یہ میری شرٹ کی فٹنگ کر دیں۔ پھر پلیز استری بھی کر دینا۔ شام میں نکاح میں پہننا ہے۔" رمشہ ہاتھ میں قمیص لیے چلی آئی۔ اب رمشہ اور کنزیٰ کے جملوں میں بس ملاحت کے لیے "ہے سے ہیں" کا فرق ہوتا تھا، کنزیٰ تو ادب بھی کرتی تھی۔ لیکن رمشہ کے جملوں میں فرق آ گیا تھا۔ حالانکہ یہ ناخوشی اس وقت نہیں تھی جب فرجاد نے خود ابا میاں کے سامنے ملاحت کا نام لیا تھا۔ بس کلثوم ایسا نہیں چاہتی تھیں، ان کا ارادہ تو بہن کی بیٹی فروا کو لانے کا تھا لیکن کنزیٰ، رمشہ اور ابا میاں خوش تھے کہ اتنی اچھی اور سگھڑ بہو اور بھابی، پورے خاندان میں کسی کی نہیں تھی۔ لیکن اب جبکہ رمشہ اور کنزیٰ خود کو امریکا پلٹ بھائی کی بہنیں سمجھتی تھیں تو عادات ہی نہیں، رشتے نبھانے کے انداز بھی بدل گئے تھے۔

"لیکن رمشہ...... ابھی تو کنزیٰ کا سوٹ بھی مکمل نہیں ہوا۔ اور مجھے تو یہ سوٹ پورا کر کے ابھی اپنی پیکنگ بھی کرنی ہے۔ میں نکاح کے بعد گھر جاؤں گی۔ پھر مایوں والے دن آ جاؤں گی۔"

"خود ہی خود سارا پروگرام بنا لیا۔ ماما سے اجازت لینے یا بتانے کی زحمت بھی نہیں کی آپ نے۔ گھر میں اتنے سارے کام ہیں، ماسی بھی نہیں آ رہی، امی ویسے ہی جلد ہی تھک جاتی ہیں، اب کنزیٰ کیا، کیا کرے گی۔ اس گھر کی بہو ہونے کے ناتے آپ کا ہی حق ہے کہ سب سنبھالیں۔ کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی۔ بس اب ولیمہ کر کے ہی جایئے گا۔" انداز میں نہ مان تھا نہ اپنائیت۔ بس تحکم۔ وہ اپنی کہہ کر اور قمیص بیڈ کی سائڈ پر رکھ کر واپس مڑ گئی تھی۔

چپ رہا جائے یا بولا جائے۔ جب بھی ایسی چویشن ہوتی، ملاحت چپ ہی کر جاتی تھی۔ بہت پہلے، نکاح کے بعد ایک بار فرجاد نے اس سے کہا تھا۔

"یار تم خالصتاً میری پسند ہو۔ اس لیے امی اور رمشہ بھی کچھ کہیں تو چپ ہو جایا کرو۔ میں ہوں ناں...... سارے گلے شکوے مجھ سے کر لیا کرو۔"

گلے شکوے تو اپنی جگہ تھے۔ بس فرجاد کی جگہ بدل گئی تھی۔ پردیس میں رہنے والے سے، دل کی بات کہنے میں ہی کال کا وقت ختم ہو جاتا تھا۔ وہ گلے شکوے کیا کرتی۔

انسان کی توقعات بھی صحرا میں اگنے والے

ناگ پھنی کے پودوں کی طرح ہوتی ہیں، جو پانی کے بغیر بھی بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور پھر ان کے نوکیلے کانٹے تکلیف بھی دیتے ہیں۔ فرجاد، رمشہ کے نکاح سے دو دن پہلے آنے والا تھا، خبر درست تھی یا افواہ۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ دل منتظر ہو تو آنکھیں بھی راہ تکتی ہیں، سب کی طرح اسے بھی فرجاد کے اس بار آنے کا شدت سے انتظار تھا۔ سو وہ بھی ممانی اور رمشہ کے رویے سے قطع نظر ماموں کے گھر چلی آئی تھی، جو راستہ محبوب کے آنے کا پتا دیتا تھا، وہ وہاں پہلے سے موجود رہنا چاہتی تھی۔ لیکن چار سالوں کی طرح، اس بار بھی عین وقت پر اس نے آنے سے منع کر دیا تھا۔ اور بہت سارے ڈالرز بھیج کر ہمیشہ کی طرح، اس نے دلی کو اپنا متبادل بنا کر سب کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ سب اس کی کمی بھول کر، اب سے تھوڑی دیر بعد ہونے والی رمشہ کے نکاح کی تقریب کے لیے مصروف تھے۔ لیکن ملاحت حسن...... وہ اپنے دل کا کیا کرتی۔ جسے پردیس سے آنے والے ڈالرز کی نہیں، فرجاد کی چاہ تھی۔ وہ چار سال سے اس کے نکاح میں تھی، جہاں نام جڑا تھا، دل بھی وہیں جڑ گیا تھا۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں، خون جگر ہونے تک

کتنے ہی موسم آئے۔ خوشی اور غم کے پل بیتے۔ رت بدلی...... لیکن وہ نہ آیا۔ یہ نہیں تھا کہ دونوں کے درمیان محبت نہیں تھی۔ بہت محبت تھی، بچپن کے ساتھی تھے، فرجاد جمال کو من موہنی سی ملاحت حسن بہت عزیز تھی۔ لیکن وہ اپنا لائف اسٹائل بھی بہتر بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے تو امریکا جانے سے پہلے ملاحت حسن کو اپنا بنا کر چلا گیا تھا۔ شروع میں اس کے کثرت سے فون آتے تھے۔ اور ہر کال میں ایک ہی بات کہتا تھا۔

”تنہائی ڈستی ہے، ملاحت تمہاری بہت یاد آتی ہے۔ کہاں تو صبح شام کا ملنا تھا اور اب سات سمندر کی دوری حائل ہے۔“ پھر وقت گزرنے لگا۔ فرجاد کو وہاں اچھی جاب مل گئی۔ اور کالز کی جگہ ماموں کے گھر ڈالرز آنے لگے۔ متواتر بجتی فون کی گھنٹی کو آرام آ گیا تھا۔ ملاحت شکوہ کرتی تو فرجاد کے پاس بات نہ کرنے کے بہت سارے جواز ہوتے تھے۔

”کام کا پریشر ہے۔“

”یہاں کمپٹیشن بہت ہے۔“

”گھنٹوں کے حساب سے سیلری بنتی ہے اور میں زیادہ سے زیادہ کمانا چاہتا ہوں، رمشہ اور کنزیٰ کی جلد سے جلد اور اچھی طرح شادی ہو گی تو ہی تو میں اپنے اور تمہارے لیے گھر بنا سکوں گا۔“ وہ محبت سے چند جملے کہتا اور ملاحت کا معصوم سا دل اس کی محبت پر پھر سے ایمان لے آتا۔ تھوڑی دیر پہلے بے وفا لگنے والا، یک دم ہی ذمے دار بھائی اور خیال رکھنے والے محبوب میں ڈھل کر پھر سے ملاحت کے دل کے فریم میں جا کر بیٹھ جاتا۔

وقت کسی کے لیے نہیں رکتا، ملاحت کے لیے بھی نہیں رکا۔ لیکن وقت نے رفتہ رفتہ بہت سارے چہرے بدل دیے تھے۔ ڈالرز نے انداز ہی نہیں عادات بھی بدل دی تھیں۔ گھر کی نئے سرے سے تزئین و آرائش ہوئی۔ رمشہ اور کنزیٰ کی نئی دوستیاں بننے لگیں، کنزیٰ کو ابا میاں سے یونی ورسٹی جانے کی اجازت مل گئی۔ کیونکہ وہ مخلوط تعلیم کے خلاف تھے۔ سونے اٹھنے کے اوقات بدلنے لگے۔ وہ جو صبح ابا میاں کے مسجد جانے کے وقت ہی اٹھ جاتی تھیں، اب رات گئے تک کمپیوٹر اور ٹی وی کی اسکرین کے آگے بیٹھے رہنے سے، صبح بدقت اٹھنے لگیں۔ بڑی سی چادر اوڑھنے کا تکلف چھوڑ کر ہم رنگ دوپٹوں سے ہی کام چلنے لگا۔ کلثوم امی سے ماما بن گئیں۔ بیٹیوں کی دیکھا دیکھی، کلثوم جہاں میں بھی فرق آتا گیا۔

دل کے قریب رہنے والی نند اور نند کی بیٹی

ملاحت آؤٹ ڈیٹڈ لگنے لگیں۔ ہر فن مولا ہونا، کنجوسی کے زمرے میں آنے لگا۔

رمشہ اور کنزیٰ کے پارلرز اور مارکیٹوں کے چکر بڑھ گئے۔ گھر کی صفائی اور کچن کے کام کرنے سے اسکن خراب ہونے کا خدشہ اس حد تک بڑھا کہ جز وقتی ملازمہ بھی آ گئی۔ آمدنی کا تفاوت...اور طرز زندگی کا فرق اب پوری طرح جمال الدین اور حسن مرزا کے گھروں کے بیچ نظر آنے لگا تھا لیکن ملاحت کی زندگی ابھی تک چادر اور چار دیواری میں گزر رہی تھی۔ نہ اس نے رمشہ اور کنزیٰ کی طرح ہوٹل اور ریسٹورانوں میں کھانا کھایا تھا اور نہ ہی دوپٹا گلے میں ڈال کر مارکیٹوں کے چکر لگائے تھے۔

اس کے ابو حسن مرزا، ایک درمیانے درجے کے جنرل اسٹور کے مالک تھے۔ سارا دن ناپ تول اور لین دین میں گزر جاتا۔ گھر آ کر بیوی اور بیٹی کے ساتھ کچھ وقت گزارتے اور کھانے کے بعد سونے کی فکر کرتے۔ ایک واحد چھٹی کا دن ہوتا، جب وہ اور ملاحت ایک ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ کتابوں کی، پودوں کی، اپنے پرندوں کی۔ یہی ان کے شوق تھے اور یہی ملاحت کے۔ مہر النسا ایک سیدھی سادی خاتون تھیں، زندگی شوہر کی اطاعت میں گزار دی تھی۔ اور خود ملاحت بھی ماں باپ کے پیچھے ناک کی سیدھ میں چلنے کی عادی تھی۔ گھر کا سودا سلف حسن مرزا کی دکان سے آ جاتا، سبزی، گوشت اور کپڑوں وغیرہ کی خریداری مہر النسا کر لیتیں۔ جو ماں نے لا کر دے دیا۔ ملاحت سی کر پہن لیتی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا حسن، آرائشی چیزوں اور فیشن کا محتاج نہیں تھا۔ رنگ اور کپڑا کیسا ہی کیوں نہ ہوتا۔ اس کا چاند چہرہ دمکتا رہتا۔ اس کی زندگی پسند ناپسند کے دائرے سے باہر تھی، وہ سمجھتی تھی، جو حاضر اور موجود ہے۔ وہ ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ ورنہ اللہ یقیناً اسے، اس سے بہتر چیز سے نوازتا۔ اس کی زندگی اپنے گھر، ماموں کے

یادگار سالگرہ کا حال

8 جنوری 2014ء جنوری کو رات 10 بجے میں نے خانیوال اپنی امی سے بات کی اور امی نے کہا صبح 9 جنوری کو تمہاری سالگرہ ہے۔ دعائیں دینے لگیں میں نے کہا کل میں خود کال کر کے آپ سے دعائیں لے لوں گی۔ امی نے کہا کہ صبح 3 بجے کال کرنا میں اٹھ جاؤں گی (کہ میرے موبائل کا الارم آج نہیں بجا تھا) اور دعائیں لے لینا۔ صبح 3 بجے میرے چاچو کی ڈیتھ ہو گئی اور میں نے امی کو فون کیا تو امی ٹیون میں (ہیپی برتھ ڈے) وش کرنے لگیں اور میں رونے لگی کہ امی، ابو جی کو بھی بتا دیں، ان کے بھائی کی ڈیتھ ہو گئی۔ ابو جی نے کہا مجھے ابھی 3 بج کے 2 منٹ پہ، میرے ابو نے خواب میں آ کر بتا دیا ہے۔ ٹھیک 3 ماہ بعد میری شادی کی سالگرہ تھی۔ 15 اپریل کو تو 22 کو ابو کی ڈیتھ ہو گئی اور میری دوست کا فون آیا۔ ہیپی انورسری کہ 15 کو میں بھول گئی تھی۔ یہ ہے 2014ء کی سالگرہ کا حال۔

تحریر: مصباح رضا سعید۔ فیصل آباد

گھر اور فرجاد کے گرد ہی گھومتی رہتی تھی۔ یہی تین مرکز اس کی دنیا تھے۔ اسے اپنی دنیا بہت اچھی لگتی تھی اور حسن مرزا اور مہر النسا خوش تھے کہ اللہ نے بانصیب اور سعادت مند بیٹی دی تھی، وہ اس کے لیے رشتوں کی چھان بین اور اگلے گھر جانے کے اندیشے سے بے فکر تھے۔ لیکن اب چار سالوں میں انہیں کسی قدر تشویش ہونے لگی تھی۔ ملاحت پچیس کی ہونے والی تھی، اس سے دو سال چھوٹی کزن رمشہ کی شادی ہو رہی تھی۔ اور فرجاد تھا کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ حسن مرزا کا پورا ارادہ تھا کہ رمشہ کی شادی ہو جائے پھر وہ جمال الدین سے ملاحت کی رخصتی کی بات بھی کریں گے۔

اگر ماموں میاں کے گھر کوئی نہیں بدلا تھا تو وہ

تھے خود اس کے ماموں، حکیم جمال الدین۔ ان کے روز وشب اول روز کی طرح تھے، پردیس کی کمائی نے ان پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ ہی ذکر واذکار کے اوقات، نماز وقرآن کی پابندی، مطب کے اوقات اور ان کا حسنِ اخلاق۔ وہ آج بھی ابا میاں ہی تھے۔ اور ان کی زندگی کے وہ ہی پانچ اصول تھے، جو انہوں نے اپنے بچوں کو بھی سکھائے تھے۔

"دنیا کے لیے اتنی محنت کرجتنا تجھے یہاں رہنا ہے۔

آخرت کے لیے اتنی محنت کرجتنا تجھے وہاں رہنا ہے۔

اللہ کی رضا کے لیے اتنی ہی کوشش کرجتنا تو اس کا محتاج ہے۔

گناہ اتنا ہی کرجتنا تجھے عذاب سہنے کی طاقت ہے۔

اور صرف اسی ذات سے مانگ، جو دوسروں کی محتاج نہیں ہے۔"

لیکن جب اولاد بڑی ہوجائے تو انسان کے اصول منڈیر پر بیٹھے پرندے کی طرح ہوجاتے ہیں۔ جو دانہ چگتے ہی اڑ جاتا ہے اور وجہ یہ تھی کہ انہیں بیوی دنیا دار ملی۔ کلثوم جہاں بظاہر نماز روزے کی پابند تھیں لیکن دین کو دنیا سے الگ رکھتی تھیں۔ اس لیے اولاد بھی ان کے سکھائے سبق بھولتی جارہی تھی۔ وہ فرجاد کے بھی باہر جانے پر ناخوش تھے۔ ان کا یہ ماننا تھا کہ جب اپنے ملک میں ہی عزت سے روزی مل رہی ہو تو پردیس میں خاک چھاننے کی کیا ضرورت ہے۔ بس ایک ولی ہی تھا جو اُن کا پرتو تھا۔ وہ اس گھر کا حصہ تو بے شک نہیں تھا۔ لیکن بچپن سے اسی گھر کا مکین تھا۔ ولی، حکیم جمال الدین کے چھوٹے بھائی، فصیح الدین کا بیٹا تھا۔ فصیح الدین اور ان کی بیگم، ایک کار حادثے میں انتقال کرگئے تھے۔ تب سے وہ جمال الدین کی ذمے داری بن گیا تھا، انہوں نے ہی اس کی تعلیم وتربیت پر توجہ دی۔ بچپن کا ساتھ کب محبت میں ڈھلا اور وہ اور کنزیٰ کب ایک دوسرے کے قریب آئے، دونوں کو ہی خبر نہ ہوئی، ولی ابھی ہاؤس جاب کررہا تھا اور پارٹ ٹائم ایک کلینک میں جاب کررہا تھا۔ فیوچر میں اس کا ارادہ اپنا ذاتی کلینک کھولنے کا تھا۔

☆☆☆

ہال کمرے میں کنزیٰ اور اس کی سہیلیوں نے رنگ جمایا ہوا تھا۔ ولی نے جانے کیسے ابا میاں کو راضی کیا تھا کہ نہ انہوں نے گانا گانے پر اعتراض کیا تھا اور نہ ہی ڈھولک بجانے پر۔ ورنہ انہیں اس طرح کی شغلیات سے بیر تھا۔

ملاحت ہرے رنگ کی خوب صورت سی شرٹ اور گولڈن پاجامہ پہنے، کچن میں کنزیٰ کی سہیلیوں کے لیے چائے بنارہی تھی۔

"یہ لیں ملاحت، آپ کا فون بج رہا تھا۔ بند ہوگیا"۔ کف کے بٹن بند کرتے ہوئے، ولی کا خوب صورت اور وجیہہ سراپا کچن کے دروازے میں نمودار ہوا تھا۔

"تھینک یو۔" ملاحت نے مسکراتے ہوئے پلٹ کر فون لیا۔

"اگر چائے بنارہی ہیں تو ایک کپ میرے لیے بھی نکال دیجیے گا۔" ولی نے مسکراتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں نکال دیتی ہوں۔" مسکراتے ہوئے کہہ تو ولی واپس پلٹ گیا۔

چائے کی کیتلی دھیمی آنچ پر تھی۔ ملاحت موبائل کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ "شاید فرجاد کی کال تھی، انہیں یہ احساس ہوگیا ہو کہ اس خوشی کے موقع پر میں انہیں کتنا مس کررہی ہوں۔" گیلے ہاتھ ڈسٹر سے صاف کرتی ہوئی ملاحت کے اندر کی عورت بیدار ہوئی جو ہمیشہ سے چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش رکھتی ہے۔ موبائل کے کال لاگ (call log) میں چیک کیا تو کوئی انجان اور لوکل نمبر تھا۔ نمبر

دیکھتے ہی اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ اس نے بے دلی سے موبائل سلیب پر رکھ دیا۔

''گھنٹے بھر سے تم سے چائے کا کہا تھا۔ ابھی تک بنائی ہی نہیں، کہا بھی تھا کنزیٰ کی سہیلیاں اور مہمانوں کے لیے پہلے سے چائے کا انتظام کر لینا۔'' کلثوم جہاں نے ناراضی سے کہا۔

''چائے تیار ہے، میں بس نکال ہی رہی تھی۔'' جلدی سے ٹرے میں کپ سیٹ کرتے ہوئے، اٹکتے ہوئے کہنے لگی، اسی وقت ملاحت کا موبائل پھر سے بجنے لگا۔

''رہنے دیں، میں نکال لوں گی، آپ فون ریسیو کر لیں۔'' اسی وقت کنزیٰ بھی چلی آئی، اسے دیکھ کلثوم واپس پلٹ گئیں، کنزیٰ نے کہتے ہوئے اپنا آرگنزا کا دوپٹا سنبھالا اور کچن میں آئی۔

ملاحت نے کنزیٰ کو شکر گزار نظروں سے دیکھتے ہوئے، فون کان سے لگایا۔ جانے کون تھا جو تنگ کر رہا تھا۔ نمبر انجان تھا تو بات کرنے والا بھی یقیناً انجان ہی ہوگا۔

''ہیلو۔'' ملاحت نے دھیرے سے بس ایک لفظ کہا تھا اور دوسری طرف سے کہنے والے نے جو کہا تھا، ملاحت کو لگا کہ پوری ریل گاڑی، پٹری سے اتر گئی تھی اور ڈبے دھماکے سے الگ ہو گئے تھے۔ موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔ چائے نکالتی کنزیٰ ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔

''کیا ہوا ملاحت۔ سب خیریت ہے ناں؟ کس کا فون تھا؟'' ملاحت بنا پلکیں جھپکائے، زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

''میرے ابو...... میرے ابوجی۔'' حلق سے نکلنے والی مدھم آواز، اب چیخوں میں ڈھل گئی تھی۔

''اماں......اماں، میرے ابوجی چلے گئے۔'' غم کی شدت سے آواز پھٹ گئی تھی۔ آنسو تیزی سے اس کے گال پر بہہ رہے تھے۔

ڈھولک کی تھاپ یکلخت رک گئی تھی۔ جو جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ مہر النساء بے یقینی سے بیٹی کو دیکھے جا رہی تھیں۔ آنکھوں میں حیرانی اور شاک کی کیفیت تھی، ولی تیزی سے آگے بڑھا۔

''ملاحت کیا ہوا پھوپا جان کو؟ کس کا فون تھا؟ کیا کسی اسپتال سے تھا؟'' سوال پر سوال تھے۔ اور سب کی آنکھوں میں بھی یہی سوال تھے۔ لیکن ملاحت کی روتے ہوئے ایک ہی گردان تھی۔

''میرے ابوجی...... میرے ابوجی۔'' وہ کیا بتاتی۔ فون کرنے والا کون تھا، اسپتال کا کوئی رکن یا اجل کا فرشتہ۔

وہ تو چار دن سے ابوجی سے نہیں ملی تھی۔ جو بھی بات ہو رہی تھی، فون پر ہی ہو رہی تھی۔ صبح ہی اس نے اسٹور پر فون کر کے ابوجی کو بتایا تھا کہ ''سفید شلوار قمیص اور پشاوری چپل پہن کر آئیں۔ اور شام میں اسٹور جلدی بند کر دیجیے گا اور گھر آ کر تھوڑا آرام بھی کر لیجیے گا تاکہ شام میں فریش رہیں''۔ وہ ماموں کے گھر آتے ہوئے، امی اور ابوجی کے سارے کپڑے پریس کر کے آئی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں امی کو پریشانی نہ ہو۔ اسے کیا پتا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے دکان بند کر کے، ایک ہی بار غسل کر کے، سفید کپڑوں میں ملبوس ہمیشہ کے لیے اپنی آرام گاہ کی طرف چلے جائیں گے۔

کنزیٰ نے تیزی سے نیچے جھک کر فون اور اس کی بیٹری کو اٹھایا اور بیٹری موبائل میں لگا کر ولی کی طرف بڑھایا۔ ولی نے آئے ہوئے نمبر پر کال کی۔ فون اسپتال سے تھا اور حسن مرزا کے دوست نے کیا تھا۔ وہ اسٹور بند کر کے مین روڈ پر آئے ہی تھے کہ ایک تیز رفتار گاڑی نے مخالف سمت سے آتے ہوئے ٹکر ماری تھی۔ آس پڑوس کے دکاندار انہیں فوری طور پر اسپتال لے کر بھی گئے تھے لیکن خون بہت بہہ جانے کی وجہ سے انہوں نے راستے میں ہی

دم توڑ دیا۔

جس گھر میں تھوڑی دیر پہلے خوشی کا سماں تھا، اب وہاں جنازہ رکھا تھا، رمشہ کے نکاح کی تقریب ملتوی ہو گئی تھی۔ اور صرف نکاح ہی نہیں، مایوں اور مہندی کی تقاریب بھی۔ اب رخصتی والے دن ہی نکاح کی تقریب تھی۔ مہرالنسا سکتے کی کیفیت میں تھیں۔ ملاحت اپنے آنسوؤں پر جبر کر کے ماں کو سنبھالنے میں لگی تھی۔ انسانی زندگی کتنی ارزاں تھی۔ صرف ایک تیز رفتار تصادم اس کے پیارے ابو جی کو اس سے دور لے گیا تھا۔ بہت دور......

مُہر میرے نام کی ہر شے پر ہے
میرے گھر میں میرا کیا ہے، کچھ نہیں

☆☆☆

کلثوم ممانی، رمشہ اور کنزئی کے سارے ارمان دم توڑ گئے تھے۔ جتنی سادگی سے نکاح اور رخصتی ہوئی تھی، اتنی ہی سادگی سے ولیمے کی تقریب بھی ہو گئی تھی۔ مہرالنسا عدت میں تھیں، بیمار اور رغمزدہ...اور ملاحت یا تو آنسو سنبھالتی تھی یا ماں کو۔ فرجاد کا بس ایک فون آیا تھا۔ بس ایک فون......اور وہ ایک فون اس خلا کو پُر نہیں کر سکتا تھا، جو ملاحت کی زندگی میں آ گیا تھا۔

جمال الدین چاہتے تھے، مہرالنسا اور ملاحت کو اپنے گھر لے آئیں۔ بیوہ بہن اور بھانجی اب ان کی ہی ذمے داری تھے۔ اور وہ اپنی ذمے داری نبھانا خوب اچھی طرح جانتے تھے۔

''دماغ تو ٹھیک ہے آپ کا......گھر کو گھر رہنے دیں۔ یتیم خانہ نہیں بنائیں۔ پہلے مرحوم بھائی کے بیٹے کو اٹھا لائے اور اب بیوہ بہن اور بھانجی کی محبت جوش مار رہی ہے۔ مل تو آتے ہیں آپ اور ولی ہر دوسرے دن۔ پھر کیا ضرورت ہے، انہیں یہاں لانے کی۔ پہلے ہی میری بیٹی کی شادی یوں ہوئی ہے جیسے مانو اسی گھر سے جنازہ اٹھا ہو۔ اتنی خاموشی اور سادگی کہ دم گھٹ رہا تھا اور اب مستقل انہیں یہاں لے آئیں گے۔ بیٹی داماد کا آنا جانا لگا ہے، دعوتیں ہو رہی ہیں اور ان دونوں کے آنے سے پھر وہی سوگ کی کیفیت۔''

کلثوم جہاں جتنا بھی گڑ ھتیں کم تھا جو ادارمشہ کی شادی سے دبا تھا، سب باہر نکل آیا تھا۔

''اللہ کا خوف کرو کلثوم۔ اتنی بڑی، بڑی باتیں اور جملے نہ بولو۔ اگر تم ان کے غم میں شریک رہی ہو تو کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ ان لوگوں نے بھی تمہاری خوشی کو اپنی خوشی جانا ہے۔ کیا چاہتی ہو دو اکیلی عورتوں کو بے آسرا چھوڑ دوں۔ قیامت میں اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اور یہ جو ولی کی پرورش کا طعنہ دیتی آئی ہو ناں۔ تو ہم نے اسے صرف رہنے کی جگہ دی اور انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ ورنہ اس کے باپ کا ترکہ بہت تھا، اس کے اخراجات پورے کرنے کے لیے۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آج حسن بھائی گئے ہیں، کل میری باری ہو سکتی ہے۔ تب بھی کیا تم یہی باتیں کرو گی؟'' ہمیشہ پُرسکون رہنے والے جمال الدین پھٹ پڑے تھے۔

''ٹھیک ہے، پھر ان کی خبر گیری ہی کرنی ہے تو ولی کو وہاں بھیج دیں۔ لیکن میں یہاں انہیں نہیں آنے دوں گی۔'' کلثوم بھی ضد میں آ گئی تھیں، جب سے بیٹا باہر گیا تھا، اس کی شادی کے کیا، کیا ارمان تھے، جو ملاحت کی شکل دیکھ کر بھک سے اڑ جاتے تھے اور اب رہی سہی کسر رمشہ کی شادی پر پوری ہو گئی تھی۔ جمال الدین بیوی کو ٹھنڈی سانس بھر کر دیکھتے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

''نہیں ولی، تم نہیں جاؤ گے پلیز......میں کیسے رہوں گی تمہارے بغیر۔'' کنزئی رو دینے کو تھی۔ ولی کے سوٹ کیس میں کپڑے رکھتے ہاتھ ایک لمحے کو رکے۔ اگلے ہی پل وہ ڈریسنگ سے اپنی استعمال کی چیزیں سمیٹنے لگا۔

''کوئی اپنی جان سے چلا گیا۔ میں تو صرف اس گھر سے جا رہا ہوں۔'' اس کا اشارہ حسن پھوپا کی موت کی طرف تھا

''جو بھی ہے، میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔''

کنزیٰ نے گالوں پر آئے آنسو بے دردی سے صاف کیے اور ولی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''دو بے بس عورتوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا بھی تو مناسب نہیں۔ پھپو اور ملاحت کو ہماری ضرورت ہے۔'' ولی نے نرمی سے کنزیٰ کا ہاتھ ہٹایا۔

''لیکن تم ہی کیوں؟'' اس کی محبت ضد کا روپ دھار بیٹھی تھی، وہ سراپا سوال تھی۔

''تم یہاں نہیں ہو گے تو میں کس کو اپنے ناز دکھاؤں گی؟ کس سے فرمائشیں کروں گی؟ میری صبح، دوپہر، شام، رات ہر پہر، تمہاری موجودگی سے سجا رہتا ہے۔ میری نیند مجھ سے روٹھ جائے گی ولی۔ میرے دن رات مجھ سے روٹھ جائیں گے۔'' بھرایا ہوا لہجہ ولی کو رکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ لیکن اس وقت محبت کا نہیں مصلحت کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے جذبوں پر بند باندھے رہے۔

''تو پھر فرجاد بھائی کو بلا لو۔ ان کا تو دُہرا رشتہ بھی ہے اور حق بھی۔ وہ نہیں آئیں گے تو کسی کو تو دیا جلانا ہی ہو گا۔ ہر شخص اگر یہی سوچے گا کہ ''میں ہی کیوں'' تو روشنی کیسے ہو گی؟'' وہ نرمی سے وضاحت دے رہا تھا۔

''پھپو عدت میں ہیں اور ملاحت کہیں باہر آتی جاتی نہیں ہیں۔ اور آج کل کے جو حالات ہیں، تم اچھی طرح جانتی ہو۔ ایسے میں دونوں کو اکیلا کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔'' وہ قائل کرنا جانتا تھا۔ لیکن مقابل بھی کنزیٰ تھی۔

''پلیز ولی... مت جاؤ میری خاطر۔'' ضد، منت بھرے لہجے میں سمٹ آئی تھی۔

''بچوں کی طرح بی ہیو مت کرو کنزیٰ۔ میں تم سے ملنے آتا رہوں گا۔ یہ وقت کا تقاضا ہے سمجھنے کی کوشش کرو۔'' وہ ہلکا سا جھنجلایا۔

''کیوں سمجھوں؟ تم نے ہی تو کہا تھا کہ محبت میں محبوب کے حقوق، واجب نہیں فرض ہو جاتے ہیں اور جب میں تم پر حق رکھتے ہوئے روکنے کی کوشش کر رہی ہوں تو مان کیوں نہیں جاتے۔ میں ماما سے بات کروں گی۔ وہ پھپو اور ملاحت کو یہاں لے آئیں گی۔''

''جب تم بات کر لو... اور وہ مان جائیں۔ تو مجھے بتا دینا، میں بھی واپس آ جاؤں گا۔ فی الحال تو چچا جان کا حکم ہے اور مجھے جانا ہے کنزیٰ۔'' اس نے بیگ کی زپ بند کی، وہ جانے کے لیے تیار تھا۔ اور یہ پہلی بار تھا کہ وہ کنزیٰ کو نہ کہہ کر جا رہا تھا۔

وہ سلسلۂ ہجر کا ابہام کیا ہوا
کوئی خبر کہ عشق کا الہام کیا ہوا
وہ جو گئے تھے دشت کی جانب با چشم نم
ان تشنگانِ عشق کا انجام کیا ہوا

☆☆☆

اور پھر ولی نے پھپو کے گھر آتے ہی اپنی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں، وہ کلینک کی جاب چھوڑ کر جنرل اسٹور کو وقت نہیں دے سکتا تھا، اس لیے جمال الدین کے مشورے سے اسٹور کو مرحوم پھوپا کے ایک قابلِ اعتبار دوست کو کرائے پر دے دیا تھا۔ اور کرایہ اتنا معقول تھا کہ پھپو اور ملاحت کے لیے کافی تھا۔ گھر کا سودا سلف اور راشن لانے کی ذمے داری وہ بحسن و خوبی پوری کر رہا تھا۔ پھپو کی دوائیں بھی خود ہی لے آتا تھا، وہ عدت میں تھیں، اس لیے چیک اپ کے لیے لیڈی ڈاکٹر کو لے آتا تھا۔ مہر النساء دمہ کی مریضہ تھیں۔ اور حسن مرزا کے انتقال کے بعد تو جیسے مرض نے شدت سی اختیار کر لی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کا دل گھبرانے لگتا تھا۔

ملاحت عشا کی نماز اکثر دیر میں ادا کرتی تھی،

سارے کاموں سے فارغ ہو کر اللہ سے راز و نیاز میں اسے عجب ہی سکون ملتا تھا۔ اور جب سے ابو گئے تھے، یہ راز و نیاز اور بھی بڑھ گئے تھے۔ لیکن کوئی آواز تھی، جو مسلسل، عابد و معبود میں رکاوٹ تھی۔ سلام پھیر کر اس نے نگاہ دوڑائی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا موبائل وائبریشن پر تھا اور مسلسل بجے جا رہا تھا۔ زیر لب دعا پڑھ کر اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور فون کی طرف بڑھی۔

''ارے کنزیٰ گڑیا..... تم، اس وقت کیسے فون کیا؟'' آواز میں حیرانی تھی۔ لیکن یہ حیرانی فون کرنے پر نہیں تھی کیونکہ ماموں میاں کے گھر میں ایک کنزیٰ ہی تو تھی جو اسے کثرت سے فون کرتی تھی، یہ حیرانی تو دراصل اس کے اتنی رات تک جاگتے رہنے پر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کنزیٰ کو نیند بہت پیاری تھی اور وہ گھر میں سب سے پہلے سوتی تھی۔

''وہ..... ملاحت، ولی کہاں ہے۔ وہ میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہا۔'' لہجے میں بے تابی تھی، جو چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

''وہ تو آج جلدی سو گیا اور موبائل چارج نہیں تھا، اس لیے لاؤنج میں ہی چارجنگ پر لگا چھوڑ کر کمرے میں چلا گیا۔ لیکن تمہیں اس سے اس وقت کیا بات کرنی ہے۔''

''وہ..... مجھے بہت کھانسی ہو رہی تھی۔ سوچا اس سے پوچھ لوں کہ کیا دوا لوں۔'' کنزیٰ گڑبڑا گئی۔ دل کی بے اختیاری پر غصہ بھی آیا۔ ملاحت کو مطمئن کرنے کے لیے مصنوعی طور پر کھانسنے لگی۔

''ایک کام کرو، نیم گرم دودھ میں ہلدی ڈال کر پی لو۔ انشاء اللہ، بہت افاقہ ہوگا۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اور وہ ٹھیک سے کھانا کھاتا ہے؟ جو یاد آئے۔ اس کی پھر ہر عادت یاد آتی ہے۔''

''ہاں..... بہت ہوا تو ڈیڑھ روٹی، ورنہ ایک ہی کھاتا ہے۔'' ملاحت نے سوچتے ہوئے جواب دیا

''کیا؟ بس ایک......!'' اس کی چیخ نما آواز نکلی۔

''یہاں تو وہ تین روٹیاں کھا جاتا تھا۔'' وہ شاکڈ تھی۔

''کیا تم اس کی روٹیاں گنتی تھیں؟'' ملاحت ہنس پڑی۔ کبھی کبھی بالکل بچوں کی طرح بی ہیو کرتی تھی کنزیٰ بھی۔

''ایکچوئیلی، وہ ٹیبل پر بیٹھ کر لیتا ہی ہر چیز میرے ہاتھ سے تھا۔ سامنے ہاٹ پاٹ رکھا بھی ہوتا تب بھی مجھے ہی کہتا کہ کنزیٰ روٹی دو۔ اس لیے اب اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا۔'' ڈھیلے پڑتے ہوئے اس نے وضاحت دی۔ اب دل کا حال کیا بیان کرتی۔ جب سے وہ گیا تھا۔ پیٹ بھر کر تو خود کنزیٰ نے بھی روٹی نہیں کھائی تھی۔

''ہاں یہ تو ہے، تم اسے مس کر رہی ہو ناں؟'' عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ اور محبت کی کشتی میں سفر کرنے والے، اکثر مخاطب کے جملوں سے دل کا حال کسی قدر جان ہی جاتے ہیں، ملاحت نے بھی کنزیٰ کے دل کا چور پکڑ ہی لیا تھا۔

''ہاں۔'' ایک تھکا ہارا سا اعتراف تھا، جو کنزیٰ کے لبوں سے ادا ہوا تھا۔ ''دراصل وہ کبھی اس طرح گھر سے گیا نہیں ناں۔ اور رمشہ بھی نہیں ہے، تو اکیلا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے مجھے۔ آپ اور پھپو، یہاں آجائیں ناں ملاحت۔ آپ لوگ یہاں رہنے آئیں گے تو کوئی منع تو نہیں کرے گا۔''

ولی کی محبت میں ملاحت کو اپنے گھر بلانے والی یہ بھول گئی تھی کہ کلثوم جہاں نے سختی سے اسے ڈانٹ دیا تھا، جب کنزیٰ نے ان سے یہ بات کی تھی۔ بقول ان کے ''گھر کو گھر رہنے دو۔ یتیم خانہ نہ بناؤ۔ اچھا ہے، ولی کا کمرا گیسٹ روم کے طور پر سیٹ کر دوں گی۔ اب رمشہ اور اس کا شوہر یہاں رہنے آئیں گے تو کوئی مناسب انتظام تو ہو۔'' اور وہ اس بات پر ماں سے بہت لڑی تھی۔ وہ نہیں تھا تو کیا ہوا۔ کمرے میں اس کی خوشبو تو تھی۔ بالآخر انہیں ولی کے روم کو

گیسٹ روم بنانے والی بات پر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ لیکن پھپھو اور ملاحت کو گھر نہ لانے کی بات پر مصر تھیں، سو بضد رہیں۔

''نہیں، بھلا منع کون کرے گا، بس اماں نہیں جانا چاہتیں۔ اس گھر سے ابو کی یادیں جو جڑی ہیں۔'' وہ اتنا ہی کہہ سکی، جواباً یہ نہیں کہا کہ کس حق سے وہاں آئے۔ ماموں میاں یا کلثوم ممانی نے تو نہیں کہا کہ وہاں چل کر رہا جائے۔ ہمیشہ کی طرح ذمے داری ولی کے سر پر ہی آکر ٹھہر گئی تھی۔ اور ولی کے یہاں چلے آنے کا یہی مطلب تھا کہ اب زندگی کی گاڑی ایسے ہی چلے گی۔ کنزیٰ نے ایک دو رسمی باتوں کے بعد فون بند کر دیا تھا۔ لیکن ملاحت کو ابھی کچھ لمحوں میں شدت سے احساس ہوا تھا کہ کیا واقعی اب ایسے ہی زندگی کی گاڑی چلے گی۔ سرک، سرک کر...... کیا ماموں میاں ہر بار، ولی کو ہی اس کی اور اس کے گھر کی ذمے داری اٹھانے بھیج دیں گے اور وہ، جس پر اس کے سارے حقوق تھے، وہ ہر ذمے داری سے نظریں چرا کر سات سمندر پار بیٹھا ہوا تھا۔ اس احساسِ چبھن نے ملاحت کے دل پر ایسا چابک مارا کہ وہ بے اختیار ہی فرجاد جمال کا نمبر ملا بیٹھی۔ دوسری طرف ریکارڈنگ لگی تھی۔ ہمیشہ کی طرح، وہ میسر نہیں تھا، ملاحت نے تھک کر فون بند کر دیا۔ لیکن دل کے احساس کو نہ دبا سکی۔

بے مہر کو بھی بے نیاز کہوں
کتنا اچھا گمان ہے میرا

اور اگلے دن وہ پھر سے فرجاد کا نمبر ملا رہی تھی، شکر تھا کہ بیل جا رہی تھی۔

''اس وقت کیوں فون کیا ملاحت؟'' انداز میں مصروفیت تھی۔

''تو میں کس وقت فون کروں؟ جب بات کروں تم میسر ہی نہیں ہوتے۔'' ملاحت کو اچھا نہیں لگا۔

''ایک کلائنٹ سے میٹنگ ہے، پلیز جو بات کرنی ہے جلدی کرو۔'' انداز میں عجلت تھی یا بیزاری۔ اسے احساس ہوا۔

''جلدی...... یہ جلدی ہے۔ چار سال ہو گئے ہیں ہمارے نکاح کو۔ اب بھی تم کہتے ہو کہ یہ جلدی ہے۔ تمہیں مجھ سے اظہارِ محبت کرنے کی جلدی تھی۔ نکاح کرنے کی جلدی تھی، باہر جا کر خوب سارا کمانے کی جلدی تھی۔ اب واپس آنے کی جلدی کیوں نہیں ہے فرجاد؟ میں اور امی یہاں اکیلے ہیں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔'' سارا زور ملاحت کا ضرورت پر تھا۔ ضرورت کبھی کبھی محبت کو باحیا سے بے حیا بنا دیتی ہے۔ آج ملاحت بھی اکیلے پن اور اتنے سالوں کی دوری سے گھبرا کر کہہ بیٹھی تھی۔

''ولی تو ہے ناں، وہاں پر...... پھر کیا مسئلہ ہے، اکیلے کیسے ہو تم اور پھپھو؟''

''ولی... ولی...... ولی۔'' وہ چیخ پڑی تھی۔ ''میں ولی کی ذمے داری نہیں ہوں فرجاد۔ میں نے تم سے نکاح کیا تھا۔'' ماموں میاں نے اسے پالا تھا، اس کا یہ مطلب یہ نہیں تھا کہ ہر ذمے داری وہ ہی اٹھاتا۔

''میں ابھی نہیں آ سکتا ملاحت، سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''لیکن کیوں؟'' آخر وہ مقام آ ہی گیا تھا، جب محبت جرح کرنے لگتی ہے، ہر بار وہ فرجاد کی طفل تسلیوں سے بہل جاتی تھی لیکن آخر کب تک۔

''میں نے جاب کے لیے یہاں چھ سال کا کنٹریکٹ سائن کیا ہے۔ اور ابھی تو صرف ساڑھے تین سال ہوئے ہیں۔ میں کیسے آ سکتا ہوں؟'' دھماکے کی گونج کیسی ہوتی ہے، بس ابھی فرجاد کی بات سے ہی ملاحت کو پتا چلا تھا۔ دکھ سکھ کی ہر بات بتانے والا، ساڑھے تین سال سے اتنی بڑی بات چھپائے ہوئے تھا۔ صرف وہ بے خبر تھی یا ماموں میاں اور باقی گھر والے بھی۔ فرجاد فون بند کر.... چکا تھا۔ لیکن اس کا فون ہوا میں ہی معلق تھا۔ شاک، بے یقینی، دکھ اور افسوس.. ساری کیفیات

ایک ساتھ ہی وارد ہوئی تھی۔ اور آنسو.... گال پر بہتے چلے گئے۔

"ملاحت کیا ہوا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہیں۔" ولی ابھی ابھی کلینک سے آیا تھا۔ ولی کی آواز پر اس نے خود کو جلدی سے کمپوزڈ کرنا چاہا۔ لیکن آنسو انکاری ہی رہے۔

"آپ رو رہی ہیں؟ کیا بات ہے ملاحت؟" وہ ملاحت کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا

"ابو یاد آ رہے ہیں۔" کچھ تو کہنا ہی تھا۔ ولی نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"آپ جھوٹ بولتی اچھی نہیں لگتیں۔ میں جانتا ہوں آپ بہت صبر والی ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھتی ہیں کہ دنیا فانی ہے، جو یہاں آیا ہے، اسے جانا ہے۔ بس کوئی جلدی جاتا ہے، کوئی بعد میں۔" ولی، ملاحت کا چہرہ بغور دیکھنے لگا۔

"کیا فرجاد بھائی کا فون آیا تھا؟" بات کرتے، کرتے اس نے آدھا چور پکڑ ہی لیا تھا، شاید ہاتھ میں دبے فون کو دیکھ کر۔ ایک دو تین...... کتنے ہی پل گزر گئے۔

"میں نے کیا تھا انہیں فون۔" یاسیت سے کہتے ہوئے اس نے بے دلی سے فون ٹیبل پر رکھ دیا۔

"پھر کب آ رہے ہیں فرجاد بھائی؟" ولی نے خوشگوار انداز میں ملاحت کو چھیڑا۔

"وہ نہیں آ سکتے۔ جب تک چھ سال پورے نہیں ہو جاتے۔" اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔

"کیا؟" ولی شاکڈ سا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ ملاحت بھی اس کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔

"تم کیوں اتنا حیران ہو رہے ہو۔ فرجاد تو تم سے اپنے دل کی ہر بات کہتے ہیں۔ ہر بار، ہر ذمے داری تم پر ڈال دیتے ہیں۔ کبھی یہ نہیں بتایا؟" ملاحت کو طنز کرنے کی عادت نہ تھی لیکن زور اس پر ہی چلتا ہے۔ جو ہمیشہ اپنے پن کا مان رکھ لیتا ہے۔

"یقین کریں ملاحت، میں واقعی نہیں جانتا...... بلکہ یہ بات تو شاید چچا میاں کو بھی پتا نہ ہو۔"

"تو کہہ دے ناں ماموں میاں کو...... کہ چھ سال سے پہلے اس کی راہ نہ دیکھیں۔" ملاحت نے بے دردی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے، جب آنسو پونچھنے والا ہی پاس نہیں تھا تو وہ کس کے لیے روتی۔ لیکن کوئی اور بھی تھا، جو یہ غم سہہ نہیں پایا تھا۔ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی مہرالنسا، پورے قد سے گری تھیں، شوہر کی موت، خود ان کی بیماری اور اب بیٹی کا دکھ۔ گرنے کی آواز پر ولی اور ملاحت دونوں چونکے تھے اور بھاگ کر مہرالنسا کی طرف آئے تھے۔

"اماں۔" ملاحت ان کو بازوؤں میں بھرے روئے جا رہی تھی اور وہ بے ہوش ہو چکی تھیں، ولی نے فوراً ایمبولینس کو کال کی۔ انہیں ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھیں۔

حکیم جمال الدین نے اس بار کسی کی بھی نہ سنی اور اسپتال سے ڈسچارج کے بعد، مہرالنسا اور ملاحت کو اپنے گھر لے آئے۔ کنزیٰ بہت خوش تھی کہ اس کا ولی واپس آ چکا تھا۔ پچھلا پورا مہینہ اس نے کیسے گزارا تھا وہ ہی جانتی تھی۔ حالانکہ ولی ہر روز اسے کال کرتا تھا۔ پورے ایک گھنٹے کی کال۔ یعنی ساٹھ منٹ۔ لیکن جس کے ساتھ وہ اپنی پوری زندگی گزارنے کا پیمان کیے بیٹھی تھی اس کے ساتھ بتائے ساٹھ منٹ بھلا کیا معنی رکھتے۔ روح اور محبت کی دنیا میں کوئی گھنٹا گھر نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر نے مہرالنسا کو غذا اور دوا کی پابندی اور کسی بھی قسم کا اسٹریس نہ لینے کی ہدایت کی تھی۔ لیکن دل تو اندر کی بات سنتا ہے، باہر سے آنے والی ہدایتوں کا کب پابند ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بھی ملاحت کے بارے میں سوچے جا رہی تھیں اور بے سکون تھیں۔ وہ ملاحت اور ولی کی ساری باتیں سن چکی تھیں اور اب جمال الدین کے گھر آ کر ان کی

ایک ہی رٹ تھی کہ فرجاد کو واپس بلائیں، میں اپنی بیٹی کو اپنی زندگی میں رخصت کرنا چاہتی ہوں۔

''جمال بھائی، فرجاد سے کہیں، ملاحت اس کی امانت ہے، وہ اپنی امانت آ کر لے جائے۔'' ''میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔'' وہ روتے ہوئے بس ایک ہی بات کہے جاتیں۔

وہ بہن کا دکھ سمجھتے تھے اور ولی کی زبانی یہ عقدہ ان پر بھی کھلا تھا کہ اس نے وہاں چھ سال کا کانٹریکٹ سائن کیا ہوا ہے۔

کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

یہاں اگلے پل کی خبر نہیں تھی اور فرجاد ایک جیتی جاگتی ہستی کو چھ سال جیسی لمبی مدت تک کے لیے اپنا پابند بنا کر چلا گیا تھا۔ اور ابھی تو فقط اس کی جاب کے ساڑھے تین سال گزرے تھے۔ پہلے وہ بیٹے کو غائبانہ ملامت کرتے تھے۔ اب زور شور سے کرنے لگے اور اس سے زیادہ خود کو مجرم سمجھتے تھے۔ حقوق اللہ سے زیادہ، حقوق العباد کی فکر کرنے والے کے خود اپنے گھر کی دیواروں کو دیمک چاٹ رہی تھی اور وہ بے خبر تھے۔ انہوں نے گھڑی کی چوتھائی میں فرجاد کو فون کیا اور حکمیہ طور پر واپس آنے کا کہا۔

وہ تو نہیں آیا۔ لیکن ملاحت کے نام طلاق کی رجسٹری آ گئی۔ وہ گیا تو پردیس معاش کی فکر لے کر تھا۔ لیکن جب چہار سمت نت نئی کشش کے انبار ہوں تو قدم بہک ہی جاتے ہیں۔ لیکن فرجاد کے قدم نہیں بہکے تھے بلکہ پردیس میں اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کے لیے اس نے بھرپور پلاننگ کی تھی اور اپنی لینڈ لیڈی کی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔ یہ چھ سال کا کانٹریکٹ، جاب کی نہیں، لینڈ لیڈی اور ان کی بیٹی کی ڈیمانڈ تھے۔ یہاں بے شک قانون اندھا ہو سکتا تھا۔ لیکن وہاں کا لا اینڈ آرڈر سیدھا جیل ہی لے جاتا تھا۔ سو فرہاد چاہ کر بھی واپس نہیں آ سکتا تھا۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ملاحت کو آزاد کر دیا تھا۔ ہر رشتے ہر زنجیر سے۔ اور ہمیشہ کے لیے ملاحت کی محبت کو لحد میں اتار دیا تھا۔

☆☆☆

یہ خبر تھی یا دھما کا...... اسے لگا وہ ریزہ، ریزہ ہو کر بکھر جائے گی۔ ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ کنزیٰ نے ابا میاں کے ادھ کھلے دروازے کے پٹ کو تھامنے کی کوشش کی۔ اگلے جمعے ولی کے ساتھ ملاحت کا نکاح تھا۔ کتنی آسانی سے ابا میاں نے اس کے ولی کو ملاحت کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ اور فرجاد کے کیے کی سزا ان جانے میں اسے سونپ دی تھی۔

جمال الدین کسی کی بھی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے، نہ کلثوم جہاں کی اور نہ رمشہ کی۔ اور دروازے سے کان لگائے کنزیٰ کا رو، رو کر برا حال تھا، اسے ولی کی چپ سے ڈر لگ رہا تھا۔

''وہ ناخلف، چار سال تک ملاحت کو اپنے ساتھ باندھے رہا اور اب طلاق بھیج دی۔ کیا ساری زندگی میں نے اسے یہی سکھایا تھا، اگر پردیس میں ہی شادی کرنی تھی تو یہاں سے کیوں نکاح کر کے گیا تھا۔ اب کون ملاحت کو قبول کرے گا؟ یہاں کنواری بیٹیاں اچھے نصیب کو روتی ہیں، اس طلاق یافتہ کا کیا مقام ہوگا؟''

''لیکن اتنا اچانک......؟ ابھی تو طلاق ہوئی ہے۔؟ اور پھر ولی ہی کیوں؟ رمشہ بتا تو رہی ہے کہ اس کے جیٹھانی کے بھائی کا رشتہ موجود ہے۔ لڑکا اچھا ہے، اپنا کھاتا کماتا ہے اور سب سے بڑھ کر وہ خود دستِ سوال ہیں' ہاں بس رنڈوا ہے۔ لیکن ملاحت کے جوڑ کا تو ہے ناں۔'' جمال الدین کے غیظ وغضب کے آگے بولنا بہت بھاری تھا۔ لیکن بیٹی کے مستقبل کا سوال سامنے تھا کیسے چپ رہتیں۔ بیٹے کی شکل تو اب ساری زندگی کے لیے چھوٹ گئی تھی۔ مزید بیٹی کا دکھ کیسے برداشت کرتیں۔ کنزیٰ کے دل کا حال رمشہ کی زبانی انہیں پتا چل ہی گیا تھا۔

"چپ کر جاؤ کلثوم جہاں...... اگر تم نے اولاد کی تربیت ڈھنگ سے کی ہوتی تو آج اپنی بیوہ بہن اور بھتیجی کے آگے یوں میرا سر نہ جھکا ہوتا۔ اور کون سا حقِ زوجیت ادا کر دیا تھا فرجاد نے کہ عدت واجب ہو۔ جب وہ اپنی زندگی میں مگن ہے تو ملاحت کیوں سوگ منائے اور شاباش ہے تم پر، ملاحت کا رشتہ اس رنڈوے سے کردوں، جس کی ایک سال کی بیٹی بھی ہے۔ قیامت کے دن کیا منہ دکھاؤں گا حسن مرزا کو اور اپنے اللہ کو کہ یتیم کی ڈھنگ سے کفالت نہ کر سکا۔" وہ اٹل تھے۔

"کسی کا نہیں تو اپنی بیٹی کا ہی خیال کریں۔ اگر ملاحت، فرجاد کے نکاح میں تھی تو آپ کا ارادہ بھی تو ولی کو کنزیٰ سے منسوب کرنے کا تھا ناں؟"

"ہاں ارادہ تھا لیکن اب ولی کی شادی ملاحت سے ہی ہوگی۔ میرے لیے جیسے کنزیٰ، ویسے ہی ملاحت۔ اور ویسے بھی کنزیٰ کے لیے پریشان مت ہو۔ میرے دوست اشفاق نے اسے رمشہ کی شادی پر اپنے انجینئر بیٹے کے لیے پسند کیا تھا۔ سوچ رہا ہوں ملاحت کی شادی سے فارغ ہو کر ان کو ہاں کہہ دوں۔" جمال الدین سب طے کیے بیٹھے تھے، وقت نے ایسی چوٹ پہنچائی تھی کہ ہر سوچ فیصلہ کن ہو گئی تھی۔ کلثوم جہاں اور رمشہ نے پریشانی سے جمال الدین کا چہرہ دیکھا۔

"اور اگر ولی ہی انکار کر دے۔ تب کیا کریں گے آپ؟" کلثوم سراپا سوال تھیں۔ اگر وہ ہی ملاحت سے شادی سے انکار کر دیتا تو بات ہی ختم ہو جاتی تھی۔

"تو فرجاد کی طرح، اس گھر میں اس کی بھی جگہ نہیں ہوگی۔" جمال الدین کے حتمی لہجے پر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا اور دروازے کے باہر کھڑی کنزیٰ بھربھری مٹی کی طرح زمین پر بیٹھتی چلی گئی، اسے اپنے دل پر زور نہ تھا تو آنسوؤں پر کیا زور ہوتا۔ اس کا دل چاہا کہ اندر بھاگ کر جائے اور ابا میاں کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دے۔ وہ کیسے بار، بار ولی کا نام ملاحت کے ساتھ لے رہے تھے۔ ولی صرف کنزیٰ کا تھا اور کنزیٰ صرف ولی کی۔ دونوں نے تو بہت پہلے اپنے حقوق ایک دوسرے کے پاس رہن رکھ دیے تھے۔ تو اب کیسے وہ ملاحت سے شادی کر سکتا تھا۔ دوپٹے سے چہرہ رگڑتے ہوئے وہ تیزی سے ولی کے کمرے کی طرف بھاگی تھی، اسے یقین تھا کہ وہ لاعلم ہوگا۔ اور باخبر ہوتے ہی حشر بپا کر دے گا۔

"ولی۔ کچھ کرو...... ابا میاں ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتے، وہ کیسے مجھے تم سے الگ کر سکتے ہیں۔" پہلی بار شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر وہ اس کے بازو سے لگی زاروقطار رو رہی تھی۔ ولی کی آستین میں آنسوؤں کی نمی جذب ہوتی جا رہی تھی۔

"وہ تمہاری بات کبھی نہیں ٹالتے ولی۔ تم بتا دو ناں کہ تم صرف مجھ سے محبت کرتے ہو...... پلیز۔" وہ بکھر رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو بچوں کی طرح زمین پر پیر مار، مار کر اپنا من پسند کھلونا لے لیتی۔

"میں وہی چاہتا ہوں کنزیٰ جو چچا میاں چاہتے ہیں۔" شدتِ ضبط سے خود ولی کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کی محبت اس کے سامنے نوحہ کناں تھی۔ ولی کا اپنا دل کیسے بین نہ کرتا۔ لیکن جب بولا تو سمندر جیسا سکون آواز میں تھا۔ کنزیٰ نے بے یقینی سے اس کے چہرے کو کھوجا۔

"میں...... ان کی بات نہیں ٹال سکتا کنزیٰ۔ پیدا کرنے والے سے پالنے والے کا حق بہت ہوتا ہے۔ یہ ایسا احسان ہوتا ہے، جو کبھی سر اٹھانے نہیں دیتا۔ جس مان سے، انہوں نے اپنے فرض کی سبکدوشی کے لیے میرا نام لیا ہے۔ میں وہ...... مان نہیں توڑ سکتا، میں فرجاد نہیں ہوں۔ نہ بن سکتا ہوں۔" اپنے بازو سے لگی سسکیاں بھرتی کنزیٰ کے بالوں میں نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے، خود سے الگ

کیا۔ ایسی زندگی جس میں آگے صرف سمجھوتا ہی سمجھوتا تھا اور محبت کہیں نہیں تھی، ولی کی ترجیح نہیں تھی۔ لیکن اب زندگی کچھ ایسے ہی گزر رہی تھی۔

''تو تم بھی وہ ہی کرو گے۔ جو فرجاد بھائی نے کیا ہے، جس طرح وہ ملاحت سے کیے وعدہ بھلا گئے، تم بھی مکر جاؤ گے۔'' کنزیٰ نے جھٹکے سے ولی کا گریبان پکڑ لیا۔

''میں اپنے وعدے سے نہیں مکرا کنزیٰ، میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔ میں تو تمہارے بھائی کی غلطی کا تاوان ادا کر رہا ہوں۔ گریبان میرا نہیں، اپنے بھائی کا پکڑو، اس نے ایک نہیں۔ تین زندگیاں برباد کی ہیں۔'' حقیقت کے آئینے نے لمحوں میں کنزیٰ کی گرفت ڈھیلی کر دی تھی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا، قصور تو خود اس کے بھائی کا تھا۔ زندگی میں آج پہلی بار اسے اپنے بھائی سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ پہلی بار کثرت سے آنے والے ڈالرز سے کراہیت محسوس ہوئی تھی۔ وہ اس لیے ملک سے باہر نہیں گیا تھا کہ گھر کے حالات اچھے ہو جائیں یا بہنوں کی شادیاں اچھی طرح ہو جائیں، وہ تو صرف اپنی غرض سے باہر گیا تھا۔ ایک مفاد پرست اس کا بھائی کیسے ہو سکتا تھا۔

''لیکن بھائی کے کیے کی سزا مجھے ہی کیوں ولی؟'' آنسو ایک بار پھر اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے، اس کا بھیگتا ہوا چہرہ دیکھ کر... ولی کا دل کٹنے لگا، جن آنکھوں میں ہمیشہ مسکراہٹ کے جگنو چمکتے تھے، آج مایوسی کے آنسو تھے۔

''مت روؤ کنزیٰ۔ محبت میں سزا نہیں، صرف آزمائش ہوتی ہے۔'' وہ نرمی سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

''میں نہیں سہہ سکتی یہ آزمائش۔'' آنسوؤں میں مزید تیزی آ گئی۔

''آزمائش اپنی مرضی سے نہیں، رب کی منشا سے آتی ہے اور انسان کے ظرف کے مطابق آتی ہے۔ نہ ماننے سے بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن سر جھکا دینے سے سہنے کی طاقت آ جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم سہہ جاؤ گی۔'' ولی کا ضبط کرتا ہوا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔ آخری بار اس کے نازک سے ہاتھ کو اپنے لبوں تک لے جا کر ہلکے سے مس کیا اور چھوڑ دیا۔ اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

خالی ہاتھ پر ولی کے ہونٹوں کا لمس۔ محبت کی آخری نشانی...... محبوب کا دیا پہلا تحفہ۔ کنزیٰ نے اس مہرِ محبت کو اپنی آنکھوں سے چوم لیا۔

☆☆☆

''ولی منع نہیں کر سکتا تو کیا ہوا، ملاحت خود تو منع کر سکتی ہے۔'' تو، تو میں، میں کرنے والی رمشہ بہن کے دکھ پر دکھی تھی۔ ملاحت کے لیے جو ''ہیں'' کا تکلف تھا، اب وہ ''ہے'' میں سمٹ آیا تھا۔ بھائی سے رشتہ ختم ہوا تو آداب کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ کنزیٰ سر نیہوڑائے بیٹھی رہی۔

''لیکن وہ کیوں منع کرے گی بھلا۔ اور پھوپی جان کو دیکھا ہے کتنی خوش تھیں سن کر۔ اتنا اچھا رشتہ بیٹھے بٹھائے مل گیا اور کیا چاہیے انہیں۔ اور کرو ملاحت سے محبت۔ اس کے آگے پیچھے پھرو۔ کرتی رہو، اس سے ہمدردیاں۔ کر دیا ناں اس نے اوچھا وار۔'' رمشہ کا غصہ عروج پر تھا۔

''کیا فائدہ، جب ولی ہی ہتھیار ڈال چکا ہے۔ اور ملاحت کو تو خود چپ لگی ہوئی ہے، یہ ان کی مرضی بھی تو نہیں ہے۔'' کنزیٰ نے گہری سانس بھری۔

''مرضی نہیں ہے تو انکار کیوں نہیں کر دیتی وہ۔ شادی ہی کرنی ہے تو رہبر بھائی کا رشتہ برا ہے کیا۔ تم بھلے ملاحت کو آئینہ نہ دکھاؤ۔ لیکن میں چپ نہیں رہوں گی.... اس کی شادی ختم ہو گئی تو کیا وہ سب کی زندگی سے کھیلے گی۔ اسے کوئی حق نہیں کہ وہ تمہاری اور ولی کی محبت کے بیچ آئے۔'' ہمیشہ کنزیٰ سے لڑنے

والی رمشہ، آج اس کے لیے کسی اور سے لڑنے کے لیے تیار تھی۔

''تم کوئی بات نہیں کرو گی رمشہ۔'' کنزیٰ نے رمشہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں کروں گی، شادی ہو گی تو صرف تمہاری اور ولی کی۔'' رمشہ نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔

''پلیز تمہیں میری قسم......تم ملاحت سے کوئی بات نہیں کرو گی۔'' کنزیٰ نے اس کے ہاتھ پر اور گرفت مضبوط کر دی۔

''تم نے ہار مان لی کنزیٰ؟'' رمشہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''تمہیں کسی سوٹ کی سلائی پسند نہیں آتی تھی تو تم دوبارہ سلواتی تھیں۔ کبھی کمپرومائز نہیں کرتی تھیں۔ اب پوری زندگی کمپرومائز کرو گی؟''

''ہاں۔'' ضبط کڑا تھا۔ ''یہ ولی کا فیصلہ ہے۔ اور مجھے اس کا ہر فیصلہ قبول ہے۔ وہ کہتا ہے محبت میں سزا نہیں صرف آزمائش ہوتی ہے۔ میں نے اپنی آزمائش کو مان لیا ہے۔'' وہ رمشہ سے زیادہ خود کو سمجھا رہی تھی۔ رمشہ نے جھپٹ کر بہن کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

دونوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک سایہ کمرے کے دروازے کے پاس سے ہٹ کر دور چلا گیا ہے۔

☆☆☆

''میں راضی ہوں اماں۔'' ملاحت ماں کے سامنے موجود تھی۔ جمال الدین نے مہر النسا سے ولی کے لیے ملاحت کا عندیہ لینے کا کہا تھا، مہر النسا بہت خوش تھیں۔ لیکن ملاحت، فرجاد سے رشتہ ختم ہونے پر جس کرب سے گزری تھی، وہ ہی جانتی تھی۔ کاغذی تعلق ختم ہو گیا تھا لیکن دل کا تعلق تو ختم نہیں ہوا تھا۔ محبت نہیں مری تھی۔ بس ملاحت مر گئی تھی۔

''ماں صدقے، ماں واری۔ جیتی رہو بیٹا۔ ولی بہت اچھا لڑکا ہے۔ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ دیکھو، جمال بھائی نے تمہارے لیے ہیرا چنا ہے، فرجاد سے زیادہ اچھا اور ذمے دار ہے، میں تو اپنے رب کی بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے بہتر سے بہترین رشتہ بھیج دیا۔'' خوشی مہر النسا کے چہرے سے امڈی پڑ رہی تھی، ورنہ تو ملاحت کی طلاق نے ان کے جسم سے جان ہی کھینچ لی تھی۔ وہ ہفتہ بھر بستر پر پڑی رہی تھیں۔

''ولی سے نہیں، رہبر سے...... میں رہبر سے شادی کے لیے راضی ہوں، ولی تو میرے لیے بالکل بھائیوں جیسا ہے اور مجھ سے تو چھ مہینے چھوٹا ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو ملاحت، تمہارے ماموں نے ولی سے بات کر لی ہے، وہ راضی ہے اور پھر چھ مہینے کی کیا چھوٹائی بڑائی، مرد کی عمر نہیں اس کا کردار دیکھا جاتا ہے۔''

''آپ ماموں میاں سے بات کر لیں اماں، پلیز...... میں رہبر سے ہی شادی کروں گی۔'' ملاحت کا لہجہ پُرسکون تھا۔

''لیکن ملاحت بیٹا، مجھے سمجھ نہیں آ رہا، ولی کے لیے نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟'' وہ یک دم ہی پریشان ہو گئی تھیں۔ جب سب اچھا ہو رہا تھا تو اب ملاحت خود اپنی خوشیوں کی راہ میں دیوار بن گئی تھی۔

''وہ کنزیٰ کو پسند کرتا ہے اماں۔ لیکن ماموں کے احسانوں کی وجہ سے کبھی یہ بات نہیں کہے گا۔ ماموں نے آپ سے میری رائے پوچھی تھی ناں۔ آپ انہیں بتا دیں، میری مرضی ولی نہیں رہبر ہے۔''

ہفتے بھر میں اسے اپنا آپ سنبھالنا آ گیا تھا۔ اس کے دل کا مکین تو مکان چھوڑ کر چلا ہی گیا تھا۔ اب وہ رہبر سے شادی کرتی یا کسی اور سے کیا فرق پڑتا۔ ہاں لیکن ولی سے شادی سے بہت کچھ بدل جاتا تھا۔ اور وہ چلتے، چلتے تھک چکی تھی، اب صرف پڑاؤ چاہیے تھا۔

☆☆☆

حکیم جمال الدین کا سارا گھر بقعۂ نور بنا ہوا

تھا۔ وہ کمرا جہاں مہرالنسا اور ملاحت مقیم تھیں، ملاحت دلہن کے روپ میں بیڈ پر بیٹھی تھی، تھوڑی دیر میں نکاح ہونے والا تھا۔

''ہم اندر آجائیں۔'' آواز پر ملاحت نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

چاند کی سپیدی کی طرح اجلی کنزیٰ، سورج جیسی آن بان والے ولی کے پہلو میں سجی سنوری کھڑی تھی۔ چاند سورج کی جوڑی شاید ایسی ہی ہوتی ہوگی۔ ملاحت نے دل ہی دل میں دونوں کی نظر اتاری۔ گزرے ہوئے کل میں ولی اور کنزیٰ کی شادی ہوئی تھی اور اب آنے والے کل میں ولی کے ولیمے کے ساتھ ملاحت کی رخصتی تھی۔

فرجاد، اکثر ملاحت سے کہا کرتا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ پیسہ اس لیے کمانا چاہتا ہوں کیونکہ میری بہنوں کی شادی بہت اچھی جگہ ہو۔ اسے پہلی بات یاد تھی۔ اور دوسری بات بھول گیا تھا۔ لیکن ملاحت نہیں بھولی تھی۔ اور فرجاد کے حصے کا فرض بخوبی نبھادیا تھا۔ جمال الدین جو کسی کی بات نہیں سن رہے تھے، ملاحت کے آگے ہار گئے تھے۔ آج اس کے نکاح کے دن ہر آنکھ اشک بار تھی۔ یہاں تک کہ کلثوم جہاں اور رمشہ بھی رو رہی تھیں۔ اپنے اور پرائے کا فرق تو آج ہی سمجھ آیا تھا۔ ملاحت نے اس گھر میں ہمیشہ بہو بن کر آنے کے خواب دیکھے تھے۔ لیکن آج وہ بہت ساری دعاؤں کے ساتھ بیٹی بن کر رخصت ہونے والی تھی۔

''آؤ ناں۔'' ملاحت نے دونوں کو محبت سے دیکھا، وہ دونوں چلتے ہوئے قریب آئے۔

''آپ نے یہ قربانی ہمارے لیے دی ہے ناں ملاحت آپی، آپ نے میری اور رمشہ کی باتیں سن لی تھیں ناں؟'' ولی ہمیشہ کہتا تھا اور وہ کبھی ملاحت کے آگے بھابی کا رشتہ نہیں لگاتی تھی کیونکہ وہ بھابی تھی ہی نہیں۔ قسمت تو اسے کنزیٰ کی بہن بنانا چاہتی تھی سو آج وہ بنادی گئی تھی۔

''میں نے تم دونوں کی باتیں بے شک ضرور سنی تھیں۔ لیکن قربانی نہیں دی قربانی تو تم دونوں دے رہے تھے، میرے لیے۔ فرجاد نہیں تو کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔''

''لیکن جو محبت آپ کو فرجاد بھائی سے تھی وہ رہبر بھائی سے تو نہیں ہوگی۔'' وہ کتنی عظیم تھی۔ دار پر بھی چڑھ رہی تھی اور شہید بھی نہیں کہلانا چاہتی تھی۔ کنزیٰ اس سے لپٹ گئی۔

''ارے پگلی روکیوں رہی ہو۔ ہاں مجھے رہبر سے محبت نہیں ہے۔ لیکن میں اس وقت کا انتظار ضرور کروں گی، جب مجھے ان سے محبت ہو جائے۔ کیونکہ نکاح کے بولوں میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ رہبر ایک اچھے شوہر ثابت ہوں گے۔'' ملاحت نے محبت سے اس کا سر تھپکا۔

''میں نے ٹھیک سوچا تھا۔ آپ واقعی بہت صبر والی ہیں۔'' ولی نے آگے بڑھ کر ملاحت کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''نہیں ولی...... بلکہ تم نے جو کہا تھا وہ ٹھیک تھا۔ محبت سزا نہیں صرف آزمائش ہوتی ہے۔ جب تک ہم اَڑے رہتے ہیں، آزمائش باقی رہتی ہے، جب رب کے آگے سر جھکا دیتے ہیں تو راہ آپ ہی آپ بن جاتی ہے...... آج تم دونوں خوش ہو۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے کل میں، میں بھی خوش رہوں گی۔'' ملاحت کے چہرے پر محبت اور لہجے میں سکون تھا۔

''آمین۔'' ولی اور کنزیٰ نے بے ساختہ کہا۔

محبت مَن و تُو کے فرق سے نکل جائے تو انسانیت اور عشق کی معراج پالیتی ہے۔ ملاحت نے بھی فرجاد کو کھو کر باقی سب کو پالیا تھا۔ زندگی کا یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔

دل عشق میں بے پایاں، سودا ہو تو ایسا ہو



میں حسن اور میری پڑوسن

شیریں حیدر

عمران کی شادی ہوئی تو مجھے جھجک آنے لگی اپنے اُس کمرے میں سونے سے جہاں میں ستائیس برس سے سو رہی تھی، کبھی لاؤنج میں پڑ جاتی اور کبھی بچیوں کے کمرے میں...... حسن کو مجھ پر بہت غصہ آتا مگر مجھے بیٹے بہو کا سوچ کر شرم ہی اس قدر محسوس ہوتی کہ ان کی ایک نہ سنتی۔ انہیں اور کچھ نہ سوجھا تو میری اماں سے میری شکایت کر ڈالی کہ ان کی بیٹی نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی ہے...... اماں نے

ان کی شکایت پر میری کلاس لے لی۔

''اماں!'' میں سٹپٹائی۔ ''اس بڑھاپے میں ہم ایک کمرے میں نہ بھی سوئیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟''

''کس بڑھاپے کی بات کرتی ہو؟'' اماں نے گھرکا۔ ''پچاس، اکاون برس حسن کی عمر ہے...... اس عمر میں تو کئی مرد بیاہ بھی رچا لیتے ہیں اور تم نے خود کو چھیالیس، سینتالیس برس ہی میں بوڑھا سمجھنا شروع کر دیا ہے...... دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہے کیا تمہارا؟''

''بس اماں مجھے عجیب لگتا ہے...... گھر میں بیٹا اور بہو ہیں، وہ کیا سوچتے ہوں گے؟'' میں نے تاویل پیش کی، اس کے سوا میرے پاس اور کوئی جواب نہ تھا۔

''میاں بیوی ایک دوسرے کے سانجھی ساتھی ہیں، آپس کی سو باتیں ہوتی ہیں، جب تک زندگی ہے ایک دوسرے کے ساتھ اور قربت کی ضرورت ہوتی ہے......''

''بہت ہو گیا اماں...... ستائیس برس ہو گئے شادی کو، اب رات کو نہ بھی باتیں کریں تو کیا فرق پڑتا ہے؟'' میں نے بحث کی۔ ''دن کو ہم دونوں گھر پر اکیلے ہی ہوتے ہیں ناں...... جو بات کرنا ہوتی ہے بندہ دن کو بھی کر سکتا ہے۔'' میں نے دلیل دی۔ ''اور حسن کو شرم تو نہیں آئی آپ کو ایسی بات کہتے ہوئے......'' میں نے دل میں سوچا جیسے اماں نے میری کلاس لی ہے، اس کے بعد اب میں حسن کی کلاس لوں گی۔

''اپنے اس رویے سے تم اپنا کوئی نقصان کروا بیٹھیں تو پچھتاؤ گی...... وقت کی طنابیں ہاتھ سے چھوٹ جائیں تو دوبارہ پکڑی نہیں جا سکتیں ملیحہ......'' اماں نے مجھے وارننگ دی۔ ''شوہر کی بات ماننا بیوی پر فرض ہے، ایسا نہ ہو کہ تم اپنی ضد پر ایک دن بیٹھ کر سر پکڑ کر رو دو......''

☆☆☆

چند ماہ کے بعد عائلہ نے الٹیاں، متلیاں شروع کیں تو مجھے ایک اور جھجک نے آ لیا۔ مریم اور انعم کیا سوچتی ہوں گی، فرقان اور عرفان کیا...کیا سوچتے ہوں گے...... میں نے عمران سے کہہ کر چند دنوں کے لیے عائلہ کو میکے بھجوا دیا، وہ تو خوشی، خوشی چلی گئی مگر عمران مجھے سٹپٹایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ غالباً خوشیوں کے یہ دن اپنی بیوی کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا...... کئی بار مجھے علم ہوا کہ وہ دفتر سے سسرال چلا جاتا تھا اور چند گھنٹے وہاں گزار کر واپس آتا تھا۔ دو ہفتے ہی مشکل سے اسے میکے ٹکنے دیا اور خود ہی جا کر لے آیا۔ مجھے اس کا اسے واپس لانے پر کوئی اعتراض تھا نہ بیٹے بہو سے کسی قسم کا بغض مگر میرے اپنے تحفظات تھے، اس دن بھی میں سبزی کاٹتے ہوئے ساتھ، ساتھ بڑبڑا رہی تھی کہ حسن نے پوچھ لیا کہ مسئلہ کیا ہے تمہیں۔

''عائلہ کو میکے بھیجا تھا کہ مہینہ بھر رہ آتی، اس کا یہ الٹی، متلی کا وقت گزر جاتا...... گھر میں جوان بچے ہیں، وہ کیا سوچتے ہوں گے؟'' میں نے ہولے سے کہا کہ کہیں آواز عائلہ تک نہ پہنچ جائے حالانکہ اس کا کمرا کافی دور تھا۔

''کیا سوچیں گے بچے اور کس بارے میں؟'' حسن نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ عائلہ......'' میں رکی۔ ''ماں بننے والی ہے۔''

''ملیحہ......'' حسن ہنسے۔ ''تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے کوئی لڑکی بغیر شادی کیے ماں بننے والی ہو، بھئی شادی ہوئی ہے ان کی اور اولاد عموماً شادی کا نتیجہ ہوتی ہے......''

''پھر بھی بچوں کو علم ہونا ضروری ہے کہ...... میرا مطلب ہے کہ آج کل تو چھوٹے، چھوٹے بچوں کو بھی اس کا علم ہے......'' میں چڑ گئی کہ حسن کو وہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی جو میں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''اگر بچوں کو پتہ علم ہے پھر تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں، اچھا ہے کہ انہوں نے کوئی سوال نہیں پوچھا تم سے یا عائلہ سے...... کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کی حالت کی وجہ کیا ہے، بچے اب جوان ہو چکے ہیں ملیحہ...... مریم کے لیے رشتے آرہے ہیں، کل کو اس کی بھی شادی ہونی ہے، اس سے برس ڈیڑھ چھوٹی انعم ہے...... میں بالکل اس بات کو نہیں سمجھ پا رہا ہوں جو تمہارے دماغ میں ہے......''

''یہی تو مسئلہ ہے...... نہ آپ نے کبھی میرا دماغ پڑھنے کی کوشش کی نہ مجھے سمجھ سکے......'' میں نے شکوے کا موقع ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

''اصل میں میرے ابا مجھے کہتے تھے کہ عام فہم کتابیں پڑھا کرو، مشکل کتابوں کو پڑھنے میں انسان کا ذہن ضائع ہوتا ہے...... سمجھ میں کچھ آتا نہیں اور وقت الگ ضائع ہوتا ہے......'' حسن نے ہنس کر کہا۔

''آپ کی انہی باتوں اور حرکتوں کی وجہ سے میں نے اس کمرے سے کوچ کر لیا ہے......'' میں نے جل کر کہا۔ ''آپ کے ابا اور اماں میرے بارے میں جتنی نصیحتیں آپ کو کر کے گئے ہیں ان پر عمل کرتے رہیں۔''

''میں سمجھا کہ تم اس لیے ... کمرے میں نہیں سوتیں کہ کہیں ہمارے بچوں کا ایک اور ننھا بہن، بھائی نہ آجائے۔'' وہ کھل کر ہنسے...... '' اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے ابا اور اماں تو مجھے یہ نصیحت کر کے گئے تھے کہ مرتے دم تک تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں۔ ابا تو کہتے تھے بیٹا جنت ماں کے قدموں تلے ہے، اپنی نہیں، بچوں کی ماں کے قدموں تلے...... یہی نصیحت آپ کی والدہ نے بھی آپ کو کی ہے کہ میاں، بیوی ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں......'' وہ اور بھی کھل کر ہنسے۔

''حیا کریں حسن......'' مجھے یاد آگیا کہ میں تو ان سے پوچھ ہی نہ سکی تھی کہ انہیں اماں سے ایسی بات کرتے ہوئے شرم نہ آئی تھی۔

''بڑا اچھا موسم ہو رہا ہے آج تو ہمارے گھر میں...... عاشقانہ سا!'' سونے پہ سہاگا...... عائلہ ہنستی ہوئی داخل ہوئی، اس نے ہاتھ میں پلیٹ پکڑ رکھی تھی، دو ٹکڑوں میں کٹا ہوا لیموں اور اس پر لال مرچوں کا چھڑکاؤ...... میں تو شرم سے لال ہو گئی۔

''موسم عاشقانہ نہیں ...... ظالمانہ ہو رہا ہے بیٹا...... ڈانٹ کھا رہا ہوں تمہاری ساسو ماں سے......'' حسن نے ہنس کر اس پر انکشاف کیا تو میرا غصہ انتہا کو پہنچ گیا مگر بہو کے سامنے ضبط کر گئی۔

''یہ کیا کھا رہی ہو تم عائلہ......؟'' میں نے حسن کی بات کا تاثر زائل کرنے کی کوشش کی۔

''اور کچھ کھٹا نہیں ملا امی تو لیموں ہی چاٹ رہی ہوں......'' اس نے یوں کہا جیسے سامنے اس کی دو ہجولیاں بیٹھی ہوئی ہوں، حسن زیر لب مسکرائے، جانتے تھے کہ میرے دل کی کیا کیفیت ہو گی اس وقت۔

''ابو...... آپ جا کر مجھے دہی بڑے لا دیں گے...... یا گاڑی کی چابی دیں، میں خود ہی لے آتی ہوں۔''

''میں لا دیتا ہوں بیٹا......'' حسن نے جواباً کہا۔

''زیادہ کھٹا نہ کھایا کرو بیٹا......'' میں نے کوشش کی کہ اسے میری خفت محسوس نہ ہو۔

''کیا کروں امی......'' اس نے لہجے میں زمانے بھر کی معصومیت سمو کر کہا۔ ''آپ کے پوتے یا پوتی نے تو میری مت ہی ماردی ہے...... الٹیاں کر کر کے میری تو پسلیاں بھی دکھنے لگی ہیں...... اوپر سے الٹیاں روکنے کی کوئی دوا بھی اثر نہیں کرتی۔'' حسن کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''آپ یہاں باتیں سننے کے بجائے جا کر بیٹی کو دہی بڑے لا دیں۔'' اپنی جھنجلاہٹ میں نے حسن پر ہی اتاری...... بہو سے بحث کرنی ہے نہ اس پر غصہ، اس بات کا عہد میں نے عمران کی شادی سے

پہلے کرلیا تھا۔ مجھے بری ساس نہیں کہلانا تھا، حسن کا بھی کہنا تھا کہ نئی بہو گھر میں بھی خوشی اور سہولت سے رہ سکتی ہے جب اسے ان رشتوں سے بھی پیارے رشتے ملیں جو وہ اپنے میکے میں چھوڑ کر آتی ہے...... میں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ بیٹے بہو کو اول روز سے علیحدہ کردیتے ہیں مگر حسن کا خیال تھا کہ کچھ عرصہ وہ ہمارے ساتھ رہیں، ہمارے طور طریقے سیکھیں، پڑھائی سے چھوٹتے ہی بچی کا بیاہ ہو جاتا ہے...... گھر داری سیکھ نہیں پاتی کہ نئے بوجھ پڑ جاتے ہیں، ہم اپنی بہو کو اچھا رکھیں گے تو کل کو اپنی بیٹی کے لیے اچھے کی امید رکھ سکیں گے ناں......!

☆☆☆

ایک حسن پر ہی کیا موقوف...... گھر بھر عائلہ کے لیے.. کھٹالانے میں مصروف تھا، مریم اور انعم اپنے کالج اور یونیورسٹی سے اور فرقان، عرفان اپنے کام سے واپسی پر کچھ نہ کچھ عائلہ کے لیے لا رہے ہوتے...... ابھی تین ماہ بھی نہیں ہوئے تھے اور بچے جب بھی اکٹھے بیٹھتے...... اسی کی باتیں کرتے جسے ابھی سات ماہ بعد دنیا میں آنا تھا، جب معلوم ہوا کہ صاحبزادے تشریف لا رہے ہیں تو گھر میں کھلم کھلا اس کے نام پر بحثیں ہوتیں، ہر کوئی نام تجویز کرتا اور باقی لوگ اسے کسی نہ کسی بنا پر رد کردیتے۔

''امی! آپ بھی کوئی نام بتائیں ناں!'' عائلہ نے مجھ سے پوچھا تو میرے ماتھے پر بل آگئے۔

''ابھی بہت وقت پڑا ہے بیٹا اس میں......'' میں نے مختصراً کہا۔

''پھر بھی امی ہم نے ناموں کی لسٹ بنانی ہے۔ پھر اس میں سے چھانٹی کرنی ہے......''

''میں نے کہا ناں کہ ابھی بہت وقت ہے، میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔'' میں نے کوشش کرکے لہجہ نرم کیا۔ ''میں نماز پڑھنے جارہی ہوں، آپ سب لوگ بھی نماز پڑھ لیں۔''

میں نے اپنے کمرے کے ساتھ والا کمرا جو کسی زمانے میں میری ساس محترمہ کا ہوتا تھا، اب عرصے سے کبھی نماز کا کمرا بن جاتا، کبھی ورزش کا، کبھی کسی بچے کی اسٹڈی اور کبھی کمپیوٹر روم اور کبھی لائبریری...... میں نے اس کمرے میں سے چھانٹی کر کے کافی کتابیں محلے کی لائبریری میں بھجوادیں، کمپیوٹر کو اوپر کے لاؤنج میں رکھا اور بچوں کا ورزش کا سامان اوپر میرس کے ساتھ برآمدے میں رکھوا دیا، بچوں کے کمرے اوپر ہی تھے، اس کمرے کو خواہ مخواہ کباڑ خانہ بنا رکھا تھا۔ میں نے کمرے میں ایک پلنگ بچھا لیا تھا اور اپنا نماز کا سارا اہتمام بھی یہیں کرلیا تھا...... سلام پھیرا تو حسن بیٹھے نظر آئے۔

''نماز پڑھنی ہے آپ نے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں میں نماز پڑھ چکا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ ''تم سے کوئی بات کرنی ہے......'' ان کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''باہر چلیں آپ لاؤنج میں......'' میں نے فوراً کہا۔ ''میں وہیں آکر سنتی ہوں آپ کی بات۔''

''وہاں بچے بیٹھے ہیں ملیحہ......'' انہوں نے کہا۔ ''مجھے تم سے تنہائی میں بات کرنی ہے......''

''کیا ہوگیا ہے آپ کو......'' میں نے چڑ کر کہا۔ ''بچے کیا سوچتے ہوں گے۔''

''کیا سوچیں گے بچے......'' وہ کرسی سے اٹھ کر میرے پاس مصلے پر بیٹھ گئے، اپنا بازو میرے گرد حمائل کیا، میرے اندر کرنٹ سا دوڑ گیا، خوف سے......

''کیا کر رہے ہیں حسن، کوئی آ جائے گا ناں۔'' میں نے انہیں ہٹانے کی کوشش کی۔

''ویسے تو کوئی آئے نہ آئے، تم چیخ کر بلالو انہیں......'' حسن نے غصے سے کہا۔ ''ہمارے بچے ہیں باہر، سب نے مجھے اس کمرے میں آتے دیکھا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ کسی کے کمرے میں بلا دستک نہیں جاتے خصوصاً میاں بیوی کے کمرے میں۔''

''ہم ان کے ماں باپ ہیں حسن، وہ ہم سے ایسی توقع نہیں کرتے ہوں گے......'' میں نے کہا۔ ''انہیں معلوم ہے کہ اب ہم عمر کے اس حصے میں ہیں......''

''بند کرو یہ فضولیات......'' حسن نے مزید چڑ کر کہا۔ ''کیا تم نے عمر، عمر لگا رکھی ہے...... باقی سب کچھ کیا ہم چھوڑ دیتے ہیں عمر کے ساتھ، ساتھ، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا...... کمرے کا دروازہ لاک ہے ویسے بھی۔'' انہوں نے آہستگی سے کہا۔

''لو اور سنو......'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اٹھ کر دروازہ کھولیں، میں سنتی ہوں آپ کی بات پھر۔''

''دروازہ تو نہیں کھل رہا......'' انہوں نے ضد سے کہا۔ ''تم نے خود کو مجھ سے دور کر کے اچھا نہیں کیا ملیحہ......'' انہوں نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی۔ ''میں کہیں بہک گیا تو پھر مجھے الزام نہ دینا......''

''یہی بات کہنے کے لیے آئے تھے آپ؟'' میں نے ان سے سوال کیا۔

''نہیں...... صرف یہ کہنے آیا تھا کہ وقت کے ساتھ چیزیں بہت بدل چکی ہیں، ہمیں تبدیلی کے ساتھ اپنی سوچ کو بدلنا ہوگا! ہم نے اپنے بچوں کو ان چیزوں کی بابت نہیں بتایا مگر انہوں نے اپنے ماحول اور ذرائع سے سب چیزوں سے واقفیت حاصل کر لی ہے...... ان کے لیے یہ معمول کی چیزیں ہیں، اب اگر ہم انہیں کہیں کہ آنے والے بچے کی بات کرنا ممنوعہ موضوع ہے تو وہ ہم سے پوچھیں گے کہ کیوں...... تو ہم کیا کہیں گے؟'' حسن نے سوال کیا۔

''انہیں بتانا چاہیے کہ یہ سراسر بے حیائی ہے......'' میں نے حسن کو فوراً کہا۔

''اچھا وہ کہیں گے کہ کیوں بے حیائی ہے...... ایک شادی شدہ جوڑے کی زندگی میں بچے کا آنا خوشی کی بات ہے بے حیائی کی نہیں تو پھر......؟''

''خوشی کی بات ہے مگر اس کی پیدائش سے پہلے اس کا وقت بے وقت تذکرہ کرنا...... بہو کا سب کے سامنے کھٹا کھانا...... یہ سب واہیات اور فضول ہے۔'' میں قائل نہیں ہو رہی تھی۔

''ملیحہ...... بچے بہت آگے جا چکے ہیں، اب ہم انہیں لاعلمی کے دور میں نہیں لے جا سکتے...... عائلہ نے تم سے نام پوچھا، سب کچھ نہ کچھ تجویز کر رہے تھے، تم بھی کچھ نہ کچھ بتا دیتیں، یوں تمہارا ماتھے پر بل ڈالنا اور اٹھ کر چلے آنا...... اچھا نہیں لگا مجھے...... عائلہ کا بھی دل ٹوٹا ہوگا، تم سے کہا تھا کہ بیاہ کر نئے گھر میں آنے والی بچیاں کمزور پودوں کی طرح ہوتی ہیں...... سسرال والوں کے رویوں کی گرمی، سردی سے جلد کملا جاتی ہیں......'' حسن کی باتوں سے مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے رویے کو منتقل کر کے بچوں کو کچھ نہیں سمجھا سکوں گی، اتنا ہی کر سکتی ہوں کہ اپنی بیٹیوں سے کہوں کہ کل کلاں کو وہ اپنی سسرالوں میں ایسا نہ کریں......

''چلو اب اٹھو، باہر چلو۔'' میں اٹھی تو حسن نے بھر وارفتگی سے مجھے ساتھ لگا لیا، ان کا انداز تو یوں تھا جیسے انہیں کوئی کھوئی ہوئی بیوی مل گئی ہو...... تھا تو ایسا ہی۔

کمرے سے حسن کے ساتھ نکلی تو مجھے عجیب سی شرمندگی کا احساس تھا جیسے بچے کمرے کی دیواروں کے آر پار دیکھ رہے تھے، کسی نے ہمیں اکٹھے باہر نکلتے ہوئے غور سے دیکھا تک نہیں، شکر کیا کہ سب اپنے، اپنے دھیان میں تھے۔ مریم چائے بنا رہی تھی۔

''ویسے ابو!'' عمران نے کہا۔ ''آپ اور امی نے مل کر نماز کافی لمبی پڑھی ہے۔'' اس نے تو بات برائے بات کی تھی مگر میرا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔

''نماز تو نہیں...... البتہ دعا ذرا زیادہ لمبی ہو گئی تھی......'' حسن نے فلک شگاف قہقہہ لگایا، میں کھسیا کر رہ گئی، چائے پی کر میں کچن میں چلی گئی، بچوں کی محفل حسن کے ساتھ جاری تھی۔

☆☆☆

سعدیہ...... میری نئی پڑوسن تھی، چار دن پہلے ہی آئی تھی پڑوس میں، انہوں نے یہ گھر خریدا تھا، جس روز اس گھر میں سامان اترا تھا، میں نے سات آٹھ بندوں کے حساب سے کھانا پکوا کر بھجوا دیا تھا...... اس کے بعد وہ اس روز آئی تھی، ہمارے برتن لوٹانے بھی اور ملاقات کرنے بھی۔

''اصل میں پلمبر گھر پر کام کرنے آیا تھا تو میں پوچھنے آئی تھی کہ اگر آپ کے گھر میں کوئی ملازم ہو تو......'' وہ جھجک کر بولی۔ ''میرے ابا کافی بوڑھے ہیں، بیمار بھی، ایک بھانجا ہے جو کہ یونیورسٹی گیا ہوا ہے، باقی ہم گھر پر دونوں عورتیں ہی ہیں، میں اور امی!''

''آپ کے شوہر؟ آپ اپنی امی، ابا کے ساتھ رہتی ہیں یا ساس، سسر کو امی، ابا کہتی ہیں؟'' میں نے اسے دیکھا۔ چالیس بیتالیس کے پیٹے میں ہوگی، اسمارٹ اور پرکشش، سادہ سے کپڑوں میں ملبوس تھی مگر سادگی میں بھی حسن تھا۔

''میں نے شادی نہیں کی......'' اس نے مختصراً کہا۔

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا، اچھی خاصی شکل صورت تھی، جانے کیوں شادی نہیں ہوئی بیچاری کی۔

''ہم چار بہنیں ہی تھیں، ماں باپ کو اس عمر میں سہارے کی ضرورت ہوتی ہے...... تینوں چھوٹی بہنوں کی شادی کر دی مگر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں شادی نہیں کروں گی...... ایک بہن نے اپنا بیٹا یہاں بھجوا دیا ہے تاکہ کہیں آنے جانے، ابا کو اسپتال لے جانے اور گھر کے باہر کے کام کاج میں مدد مل سکے۔'' اس نے چند فقروں میں وضاحت کی۔

''ملازم تو نہیں ہے ہمارے ہاں...... تم چلو سعدیہ، میں اپنے شوہر کو لے کر آتی ہوں۔'' تھوڑی دیر میں، میں اور حسن ان کے گھر کو چلے، لاؤنج میں ابھی تک سامان قدرے بے ترتیبی سے پڑا تھا تاہم ایک گوشہ ایسا تھا جس میں پانچ نشستوں والا ایک صوفہ اور اس کے سامنے سینٹر ٹیبل رکھی تھی۔ وہاں ایک برف جیسے سفید بالوں والے بزرگ بیٹھے تھے۔ حسن نے ان سے مصافحہ کیا اور میں نے زبانی سلام، حسن نے استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ پلمبر اوپر چھت پر کام کر رہا تھا، گھر ہمارا دیکھا بھالا تھا اس لیے حسن اوپر چلے گئے، اسی وقت باورچی خانے سے ایک ٹرے اٹھائے ہوئے ایک خاتون نکلیں، یقیناً وہ سعدیہ کی امی تھیں...... میں نے اٹھ کر انہیں سلام کیا اور ان سے معانقہ کیا۔ وہ ٹرے پکڑے ان بزرگ کے قریب ہی بیٹھ گئیں، میں بھی بیٹھ گئی...... وہ اپنے ہاتھوں سے سوپ ان بزرگ کو پلانے لگیں۔

''سعدیہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اوپر تھی پلمبر کے ساتھ، میں بلاتی ہوں اسے......'' کہہ کر وہ اٹھیں اور سیڑھیوں کے قریب جا کر سعدیہ کو آواز دی، چند لمحوں میں سعدیہ نیچے تھی، آ کر مجھے سلام کیا اور شکریہ ادا کیا۔

''میں چائے بناتی ہوں آپ کے لیے......'' میں منع کرتی رہ گئی مگر وہ پھر بھی چلی گئی، پلمبر کا کام ختم ہوا تو حسن بھی چلے آئے اور وہیں بیٹھ گئے۔ سعدیہ کی والدہ اس کے والد کو ابھی تک سوپ پلا رہی تھیں، اس دوران وہ رک، رک کر ٹشو پیپر سے ان کا منہ صاف کرتیں...... مجھے کچھ عجیب سا لگا، کم از کم ہمارے سامنے تو انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، سعدیہ چائے لے آئی تھی۔

''سعدیہ تم آنٹی کی مدد کر دو، تھک گئی ہوں گی، اپنے ابو کو سوپ پلا دو......'' میں رہ نہ سکی۔

''میں!'' وہ ہنس کر بولی۔ ''امی تو ابو کا کوئی کام ہمیں نہیں کرنے دیتیں...... انہیں ابو سے بہت پیار ہے، ان کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں، انہیں نہلانا، ہاتھ منہ دھلانا، وضو کرانا، کھلانا پلانا، مالش کرنا...... امی کو ابو سے بہت پیار ہے...... مجھے تو

لگتا ہے کہ بچپن میں ابو کی امی نے ان کا اتنا خیال نہیں رکھا ہوگا جتنا میری امی ان کا رکھتی ہیں...... امی تو جیسے ابو کی امی بن گئی ہیں......''

''ماشاء اللہ......'' حسن نے بے ساختہ کہا۔

''اللہ انہیں اجر دے۔''

''میں خوش قسمت ہوں بیٹا، ایسی بیویاں نصیب والوں کو ملتی ہیں......'' انکل یوں تو ٹھیک ٹھاک لگتے تھے مگر ان کا نچلا دھڑ مفلوج تھا اور وہ وہیل چیئر پر تھے۔

''امی کو میں نے کبھی ایک رات کے لیے بھی ابو کو تنہا چھوڑتے نہیں دیکھا، ہمیشہ سے...... اب تو اٹھ، اٹھ کر رات کو ابو کا خیال رکھتی ہیں، ان کا کمبل نہ سرک گیا ہو، انہیں پیاس نہ لگی ہو، انہیں غسل خانے نہ جانا ہو...... جانے ان کی اپنی نیند کیسے پوری ہو جاتی ہے......'' سعدیہ کہے جا رہی تھی اور مجھے غصہ بھی آ رہا تھا کہ ایسا کیا ضروری تھا بتا نا کہ انہیں غسل خانے بھی اس کی امی ہی لے کر جاتی ہیں۔

''آپ کوئی لڑکا ملازم کیوں نہیں رکھ لیتیں انکل کا خیال رکھنے کے لیے......'' میں نے تجویز دی۔

''اللہ مجھے ہمت دے...... ملازم کی ضرورت ہی نہیں ہے......''

''مگر آپ کے لیے بھی آرام اور بھرپور نیند ضروری ہے......'' میں نے ہمدردی سے کہا۔

''سعدیہ تو خواہ مخواہ میری تعریفوں میں رطب اللسان رہتی ہے......'' انہوں نے عاجزی سے کہا۔ ''شام کو سعد آتا ہے تو میں اس وقت دو گھنٹے الارم لگا کر نیند پوری کر لیتی ہوں۔''

''بلکہ آپ کو چاہیے کہ رات کو اسے نانا کے پاس سلائیں تاکہ اس کا یہاں رہنے کا مقصد بھی پورا ہو۔'' میں نے ایک تجویز دی۔

''ارے' یہ کہاں میرے بغیر سوتے ہیں اور سعد تو پھر بچہ ہی ہے ناں ......'' وہ لہجے میں تو اسے کے لیے پیار لیے ہوئے تھیں۔ ''دن کو پڑھنے جاتا ہے، کوئی نہ کوئی امتحان اور ٹیسٹ چلتے رہتے ہیں...... جب تک میں ہوں، میں خود ہی ان کی خدمت کرنا چاہوں گی، میرے بعد اللہ وارث ہے ان کا۔''

''لو جی...... ہائے، بابی کو اس عمر میں بھی عشق لگا ہے......'' میں نے دل ہی دل میں سوچا اور اجازت لے کر ہم اُٹھ گئے۔

''کبھی کبھار آ جایا کرو حسن میاں...... اچھا لگا تم سے ملنا بیٹا، شطرنج سے شغف ہے تو کبھی بازی لگا لیا کریں گے......'' سعدیہ کے والد نے حسن سے مصافحہ لیتے ہوئے کہا۔ ''جانتا ہوں کہ تم نوجوانوں کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں مگر چلو کبھی......''

''کیوں نہیں انکل......'' حسن تابعداری سے بولے۔ ''آؤں گا ضرور!''

☆☆☆

شام میں سعدیہ نے اپنے بھانجے سعد کے ہاتھ کڑھی بھیجی تھی، میرے برتنوں میں سے ایک ڈونگا اس نے رکھ لیا تھا، اسی میں کڑھی آئی تھی......''بندہ ہمسایوں سے ہی کچھ سیکھ لیتا ہے......'' حسن نے کہا۔

''جی...... میں نے ہی انہیں پہلے کھانا بھیجا تھا......'' میں نے اترا کر کہا۔ ''انہوں نے مجھ سے ہی سیکھا ہے ..بلکہ میں نے تین ڈونگے بھیجے تھے جن میں سے دو تو وہ کل خالی واپس کر گئی تھیں۔''

''میں کھانے کی بات نہیں کر رہا......'' حسن زیر لب مسکرائے۔

''اور کیا سیکھنا ہے......؟'' میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''بزرگوں کی باتیں سنیں، ان کی محبت دیکھی؟'' حسن نے وضاحت کی۔ ''مگر تم سے کیا کہیں...... تم تو' مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ' کی تفسیر بن گئی ہو......''

''میرا خیال ہے کہ آپ اپنے کام خود ہی کر لیا

کریں اب......'' میں حسن کے کمرے میں ان کی الماری صاف کر رہی تھی، میں نے بے نیازی سے کہا۔

'' تمہارے ہوتے ہوئے مجھے اپنے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے!'' حسن میرے قریب آ کھڑے ہوئے۔'' تم نے جانے کیوں خود کو میری ذمے داریوں سے بری کر لیا ہے؟''

'' اور بھی بہت سے کام ہیں مجھے......'' میں نے انہیں کہنی سے دور ہٹایا، حسن کے ایک فقرے نے مجھے ماضی کی یاد میں دھکیل دیا تھا، فیض کی یہ خوب صورت نظم حسن کو بہت پسند تھی اور اکثر اچھے موڈ میں ہوتے تو گنگناتے تھے، میں جواباً انہیں چڑانے کو کہتی تھی۔'' ہم تو مانگیں گے...... جو مانگے سے نہ دے گا، اس سے چھین لیں گے......''

'' اپنا حق مانگتے ہیں، جو مانگے سے نہ دے، اس سے چھین لیں گے ہم!'' حسن شرارت بھری آواز میں بولے۔

'' ہمسایوں کا آپ کو زیادہ اثر نہیں ہو گیا؟'' میں نے بھی ہنس کر کہا، دل میں یہ اطمینان تو تھا کہ گھر پر اور کوئی نہ تھا، اپنی چھوٹی سی جنت میں، میں اور حسن اکیلے تھے۔ عمران اور عائلہ لوٹنے تو میں نے عائلہ کو کچھ پکانے کا کہہ دیا کہ میں تھک گئی تھی اور آرام کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

لاؤنج میں، میں اور حسن بیٹھے تھے کہ انکل کی کال آئی، انہوں نے حسن کو بلایا تھا۔'' چلتی ہو؟'' حسن نے مجھ سے پوچھا۔

'' آپ جائیں، میرا دل نہیں چاہ رہا......'' میں نے کسلمندی سے کہا۔ حسن کمرے میں گئے اور لباس تبدیل کر کے چلے گئے، میں وہیں بیٹھی ٹی وی دیکھتی رہی...... کبھی کبھار اس طرح کا مزاج ہو جاتا تھا ورنہ میں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری تھی، دوست، احباب اور رشتے دار...... مہمان داری کرنا اور مہمان بن کر جانا مجھے بہت پسند ہوتا تھا مگر اب کبھی کبھار تو فقط اپنا حلیہ ٹھیک کرنے کی سستی ہو جاتی تھی۔ دو دن حسن چکر نہ لگاتے تو انکل کی کال آ جاتی، میرا حلیہ درست ہوتا تو چلی جاتی اور جب ایسا ہوتا کہ منہ دھونا پڑے گا، کپڑے تبدیل کرنا پڑیں گے...... تو میں سست ہو جاتی۔ ایسا نہ تھا کہ میں سر جھاڑ منہ پھاڑ حلیے میں ہوتی تھی مگر سعدیہ ہمیشہ بہت نفیس لباس پہنتی اور سادہ سا جوڑا اس کے بالوں کا اس کی گردن پر ہوتا تھا، مجھے اس کے مقابلے میں کم مایہ لگنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہمارے جاتے ہی وہ عموماً دائیں بائیں ہو جاتی تھی، کوئی نہ کوئی کام ایسا ہوتا جس میں مصروف رہتی تھی، اسے معلوم ہوتا تھا کہ ہم اس کے والدین کے پاس گھنٹا دو تو بیٹھیں گے، اس وقت کو وہ اپنے کسی اہم کام کے لیے استعمال کر لیتی تھی، ہمیں چائے بنا کر دیتی، تھوڑی دیر کو ہمارے ساتھ بھی بیٹھ جاتی...... اس لیے حسن کے جانے سے مجھے کبھی کسی قسم کی فکر نہ ہوتی تھی، مجھے حسن پر بھی بھروسا تھا اور خود اپنی محبت پر اعتماد تو تھا ہی۔

کافی دیر ہو گئی تھی، میں نے عصر کی نماز پڑھ کر حیرت سے وقت دیکھا، حسن ابھی تک نہیں آئے تھے، میں نے عائلہ کو بتایا اور پڑوس کی طرف چل دی، گھنٹی بجانے پر سعد نے دروازہ کھولا، میں سیدھی اندر چلی گئی، لاؤنج میں انکل کے سامنے میز پر شطرنج کی بساط تھی، انکل کے ساتھ سعدیہ کی امی بیٹھی تھیں اور خود سعدیہ...... انکل کے سامنے والے صوفے پر حسن کے ساتھ، میرے دماغ میں جیسے آگ کی لپک پہنچی تھی، حسد! میں نے خود سے پوچھا۔ میرے جاتے ہی وہ فوراً اٹھی اور مجھے وہاں بیٹھنے کو کہا۔

'' تم بیٹھی رہو سعدیہ......'' میں نے لہجے پر قابو

پاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو شطرنج بالکل نہیں آتی۔“

”مجھے کب آتی ہے آپی!“ وہ جواباً بولی۔

”میں بھی تو بیٹھی دیکھ ہی رہی تھی۔“ اور شطرنج دیکھنے کے لیے اس کا جُز کر حسن کے ساتھ بیٹھنا جانے کتنا ضروری تھا......

”اور یوں بھی میں رات کا کھانا بنانے کے لیے اٹھنے ہی والی تھی۔“ وہ اٹھ گئی اور میں مجبوراً بیٹھ گئی، دو سیٹوں والا صوفہ تھا، اس پر بیٹھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس پر بیٹھنے والے ایک دوسرے کے کس قدر قریب ہو سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں انکل نے حسن کو چھٹی دے دی، میچ ابھی ختم نہ ہوا تھا، حسن انہیں مل کر اٹھے اور ہم باہر نکلنے لگے تو سعدیہ باورچی خانے سے نکلی...... ”میں چائے بنا رہی ہوں آپی!“

”نہیں اب چلتے ہیں......“ میں نے فوراً کہا۔ ”میں تو یونہی تھوڑی دیر کو آئی تھی۔“

”ارے نہیں پلیز بیٹھیں......“ اس نے اصرار کیا۔ ”حسن بھائی جب سے آئے ہیں ہم بیٹھے ہی تھے انہیں چائے بھی نہیں پلائی......“ وہ سادگی سے میرے سر پر بم پھوڑ رہی تھی، گویا پچھلے تین گھنٹے سے وہ اس صوفے پر جُڑے بیٹھے تھے، میں نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گئی کیونکہ حسن ایک لفظ اعتراض کا کہے بغیر بیٹھ گئے تھے۔

☆☆☆

گھر میں مریم کی شادی کی مصروفیت اور عمران کے ہاں ننھے علی کی آمد ساتھ، ساتھ ہی ہوئی تھی، میں حد سے زیادہ مصروف ہو گئی تھی...... سر کھجانے کی فرصت ملتی نہ یہ دیکھنے کی کہ کون کس مقام پر تھا، گھر پر ہوتی تو علی کی مصروفیت...... مگر گھر پر میں ہوتی ہی کب تھی، بازار کھلتے ہی ہم بازاروں میں موجود ہوتیں اور اس وقت نکلتیں جب آدھی دکانیں بند ہو چکی ہوتیں، فقط وہ دکانیں کھلی ہوتیں جن میں پہلے سے گاہک موجود ہوتے تھے...... حسن اور عمران گھر پر

مصروف تھے، شادی کے کارڈ چھپوانا، دعوت نامے بھجوانا، مہمانوں کی فہرستیں بنانا، ان کے ٹھہرنے کے انتظامات، شادی ہال کی بکنگ، کھانے کے انتظامات اوراس طرح کے دیگر کام...... کئی دن سے ہم دونوں میاں بیوی کو لمحے بھر کی تنہائی بھی میسر نہ آئی تھی...... حسن جو پہلے پہل تنہائی .... کے لمحات ڈھونڈنے میں مصروف رہتے تھے، اب انہیں بھی غالباً فرصت نہ تھی۔

علی کو پیٹ میں درد اٹھا تھا، گھر پر گاڑی نہ تھی، غالباً عمران اور حسن کسی کام سے گئے ہوئے تھے، عائلہ نے کال کی تھی تاکہ عرفان گاڑی لے کر گھر پہنچے اور وہ اس کے ساتھ علی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلی جائے...... میں اس کا سن کر اتنا پریشان ہوئی کہ خود بھی واپس چلی آئی، علی اور عائلہ کو ساتھ لیا اور قریبی اسپتال چلے گئے...... عمران کو معلوم ہوا تو وہ بھی وہیں چلا آیا۔

''ابو کو کہاں چھوڑ آئے ہو بیٹا...... انہیں بھی ساتھ ہی لے آتے......'' میں نے اس سے کہا۔

''ابو تو گھر پر تھے...... میں شادی ہال کے انتظامات دیکھنے اکیلا ہی گیا تھا امی۔'' عمران نے بتایا۔

''ہائیں...... '' میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا......

''ابو گھر پر تھے تو ہمیں نظر کیوں نہیں آئے؟''

''ابو تو گیارہ بجے سے ساتھ والے انکل کی طرف گئے ہوئے تھے امی۔'' عائلہ نے بتایا۔

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ٹھیک تو ہیں وہ!'' بہو کے سامنے اپنے تجسس کا بھرم تو رکھنا تھا۔

''ہر روز تو جاتے ہیں امی!'' عائلہ نے سادگی سے کہا۔''میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا......اور پھر گاڑیاں تو ایک عمران کے پاس تھی اور دوسری آپ لوگوں کے پاس!''

میرے تو دماغ میں دھواں سا بھر گیا بے پروائی سی بے پروائی تھی حسن کی...... شادی والا گھر ہے، سو کام ہوتے ہیں اور پھر گھر پر بہو اکیلی، علی کو ڈاکٹر نے ڈرپ لگا دی تھی کیونکہ اسے الٹیاں شروع ہوگئی تھیں، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچوں اور پھر سعدیہ کے گھر...... مگر اس حال میں علی کو چھوڑ کر جانا مجھے مناسب نہ لگا، ویسے بھی اس میں ہم سب کی جان تھی۔

''بیٹا جا کر ابو کو لے آؤ......'' میں نے عرفان سے کہا۔''انہیں بتانا کہ علی اسپتال میں داخل ہے......''

''آپ بھی گھر چلی جائیں امی!'' عائلہ نے اصرار کیا۔''مارکیٹ میں گھوم گھوم کر تھک گئی ہوں گی، گھر سے چکر بھی لگا آئیں اور فریش ہو جائیں گی۔'' عمران نے کچھ دواؤں کی پرچی عرفان کو دی کہ واپسی پر لیتا ہوا آئے...... عرفان نے مجھے گھر پر اتارا اور خود دوائیں لینے چلا گیا، گھر ابھی تک بند تھا کیونکہ حسن گھر پر نہیں آئے تھے۔'غضب خدا کا...... اس بندے کو کچھ احساس ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ...' میں نے دل ہی دل میں سوچا، اپنے گھر جانے کے بجائے میں نے سوچا کہ پہلے پڑوس سے حسن کو بلا لاؤں...... مڑی تو گھر کے سامنے سے ان کی گاڑی گزری، غالباً وہ سب کہیں جا رہے تھے، اب حسن لوٹ آئیں گے...... میں نے گہری سانس لی اور تالا کھولا، عرفان بھی کسی لمحے لوٹ آتا اس لیے دروازہ کھلا ہی چھوڑ کر میں نے غسل خانے کی راہ لی، جلدی سے نہا کر نماز پڑھی اور علی کی صحت کے لیے حاجت کے دو نوافل بھی پڑھے، باہر نکلی تو نہ حسن آئے تھے نہ عرفان، میں نے کمرے میں جا کر بال سمیٹے اور چادر سر پر اوڑھتی ہوئی باہر نکلی...... ساتھ والے گھر کا گیٹ کھلا ہی تھا، میں چلتی ہوئی دروازے تک گئی، چیک کیا تو دروازہ اندر سے لاکڈ تھا، کھٹکھٹاتے ہوئے رک گئی...... جانے کیوں، کئی خیال

دماغ کی سرحدوں تک آ کر لوٹ گئے، بالآخر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، کافی دیر تک دروازہ نہ کھلا...... ممکن ہے کہ کوئی گھر پر نہ ہو، لوٹنے ہی والی تھی کہ اندر دور سے قدموں کی آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟'' سعدیہ کی آواز آئی۔ میں خاموش رہی، دروازہ تھوڑا سا وا کر کے اس نے باہر جھانکا۔ ''اوہ آپ ہیں!'' وہ دروازے کے سامنے سے ہٹی۔ ''خیریت تو ہے ناں؟''

''ہاں، ہاں سب خیریت ہے......'' میں نے اپنا قدم اندر کی طرف بڑھایا۔

''وہ امی ابو تو اسپتال گئے ہیں......'' اس نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''ابو کا معمول کا چیک اپ تھا آج، شام دیر تک لوٹیں گے......'' وہ دروازے کے سامنے سے ہٹی نہ تھی۔

''تم نہیں انہیں لے کر گئیں تو کس کے ساتھ گئے ہیں؟'' میرا اندازہ تھا کہ حسن ان کی گاڑی چلا کر گئے ہوں گے۔

''وہ سعد کے ساتھ گئے ہیں......'' اس نے جواب دیا۔ ''میرے سر میں شدید درد تھا۔''

''حسن کہاں ہیں پھر؟'' میں نے اندر قدم رکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''وہ......وہ...... حسن بھائی......'' وہ ہکلائی۔

''کون ہے سعدی؟'' اوپر سے حسن کی خمار آلود آواز آئی اور ساتھ ہی ان کا جلوہ بھی سامنے آیا، وہ یوں کھڑے تھے جیسے اپنے بیڈ روم میں میرے سامنے کھڑے ہوں...... حسن چونک گئے تھے دونوں مجسموں کی طرح کھڑے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ حسن اوپر کیا کر رہے تھے۔

''کم از کم لفظ بھائی کی شرم ہی کر لیتیں تم بے غیرت......'' میں نے کانپتے لہجے میں کہا، میرا پورا وجود آندھیوں کی زد میں تھا۔

''اور آپ......'' جب اپنے اس ''ضروری کام'' سے فارغ ہو جائیں تو گھر پر آ جایئے گا، آپ کا پوتا اسپتال میں داخل ہے اور آپ کی بہو نے آپ کو اس لیے ڈسٹرب نہیں کیا کہ آپ کی رنگ رلیوں میں کوئی فرق نہ پڑ جائے......'' دونوں گنگ تھے، ان کے پاس کہنے کو کیا بچا تھا، میں نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔

''بہتر تو یہی تھا کہ تم محلے، محلے جا کر دوسروں کے خاوند پھانسنے کے بجائے خود شادی کر لیتیں......''

میں اسے ہی کوسے جا رہی تھی، حسن کو کیا کہتی .. یں تو جانتی تھی کہ کون سا وہ چل کر ہمارے گھر آتی تھی، حسن ہی وہاں گھسے رہتے تھے اور جانے بہانوں، بہانوں سے کب سے یہ سلسلہ چل رہا تھا، میں تو ماں کے بعد ساس اور پھر دادی بن کر جیسے حسن کو بھلا ہی بیٹھی تھی، حسن پلٹ کر واپس چلے گئے، میں نکلتے ہوئے بھی نفرت کی ایک بھرپور نگاہ سعدیہ پر ڈال کر نکلی جیسے اس کے وجود کو ٹکڑوں میں توڑنا چاہتی ہوں۔

اگلے ہی منٹ حسن گھر پر تھے اور اسپتال جانے کے لیے تیار ہونے چلے گئے۔ ہم دونوں کے بیچ ایک حرف کی گفتگو نہ ہوئی تھی، عرفان کے واپس آتے ہی ہم اس کے ساتھ اسپتال روانہ ہوئے۔ میرے اندر باہر بھانبھڑ جل رہے تھے، اتنی نفرت محسوس ہو رہی تھی مجھے حسن سے کہ بیان کرنا ممکن نہیں...... میں نے ان سے مکمل قطع تعلق کر لیا، علی گھر لوٹ آیا تندرست ہو کر تو میں اسی کے ساتھ ہر وقت رہتی، عائلہ اور لڑکیاں ہی باقی خریداری مکمل کر رہی تھیں، میرا دل ہی اندر سے مر گیا تھا۔ مریم کی شادی بھی ہو گئی، میرا دل اس کے جانے سے زیادہ اس بات پر رنجیدہ تھا کہ میری عمر بھر کی محبت کا حسن نے کیا مول لگایا تھا۔

☆☆☆

میرے پیروں پر غالباً پانی گرا تھا میں چونک کر جاگ گئی، بیڈ کے سرہانے رکھا لیمپ جلایا اور جھک کر دیکھا

کر اٹھ بیٹھی، حسن میرے پیروں کے پاس بیٹھے تھے......

''معاف کر دو مجھے ملیحہ......'' ان کے آنسو میرے پیروں پر گر رہے تھے، میں نے فوراً اپنے پیر کھینچ کر ان کی گرفت سے آزاد کروائے۔ ''یقین کرو ملیحہ...... وہ پہلا اور آخری وقت تھا، اس سے پہلے ہم کبھی یوں تنہا نہ ہوئے تھے...... اس کے والدین کی موجودگی میں ہی ہم اکٹھے بیٹھتے تھے، وہ مجھے اچھی لگنے لگی تھی مگر میں نے اس سے زیادہ کبھی سوچا تھا نہ ہی کبھی ایسا موقع آیا تھا، اس کے والدین آزاد خیال تھے اور انہیں اپنی بیٹی پر اعتماد بھی تھا اس لیے انہیں ہم دونوں کی دوستی یا بات چیت کے تعلق میں کوئی قباحت نظر نہ آئی۔'' میں ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھ رہی تھی۔

''اس روز اس کے والدین کو اسپتال جانا تھا، اس کے سر میں درد تھا، میں اس کے ابا کو لے کر اسپتال کے لیے نکلنے لگا تو سعد آ گیا، اس نے کہا کہ وہ لے جاتا ہے...... مجھے اس نے کہا کہ گھر چلا جاؤں...... وہ گیٹ سے نکلے، میں گھر کی طرف چلا ہی تھا کہ جانے کس شیطانی قوت کے بل پر میرے قدم واپس لوٹ گئے اور میں نے ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا دیا، سعدیہ ابھی دروازہ بند کر کے پلٹی ہی تھی، اس نے دروازہ کھولا اور میں واپس اس کے ساتھ گھر کے اندر چلا گیا...... اس کے سر میں درد تھا، میں نے اسے جا کر آرام کرنے کا کہا اور خود اس کے لیے چائے بنا کر اس کے کمرے میں لے کر گیا...... مجھے معاف کر دو ملیحہ...... انسان ہی ہوں ناں، شیطان تو بڑے بڑوں کو بہکاتا رہا ہے...... میں قصور وار ضرور ہوں مگر تم بھی بے قصور نہیں ہو...... یقین کرو میں ایک بار کے لیے بہک گیا تھا مگر میں اب بھی تم سے ویسا ہی پیار کرتا ہوں...... تمہاری بے رخی اور گریز نے ہی مجھ پر شیطان کو وارد ہونے دیا...... وہ ایسی نہیں ہے جیسی تم اس کو سمجھ رہی ہو، اس کی بھی پہلی ہی بھول ہے یہ...... تم معاف کر دو مجھے، میں بہت شرمندہ ہوں...... اگر تم مجھے معاف نہیں کرو گی تو میں کچھ کھا کے سو رہوں گا۔'' حسن نے معافی مانگ کر آخر میں مجھے دھمکی دی۔

''مجھے نیند آ رہی ہے......'' میں نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''آپ اپنے کمرے میں جا کر سو جائیں...... میں نے آپ سے کوئی گلہ کیا ہے نہ شکوہ، مجھے صفائیوں کی بھی ضرورت نہیں ہے......'' کروٹ بدل کر میں پرے منہ کر کے لیٹ گئی۔ ''ایک بار جو کچھ کر لیا ہے وہ آپ کو میری نظر سے گرانے کے لیے کافی ہے...... میری طرف سے آپ سو بار کریں اور ہزار بار کریں۔''

''تم معاف نہیں کرو گی تو عمر بھر یہیں بیٹھا رہوں گا ملیحہ......'' وہ ہٹ دھرمی سے بولے، میں خاموشی سے دوسری طرف منہ کیے پڑی رہی۔

''امی یہ سونے نہیں دے رہا...... اسے سنبھالیں ذرا!'' ننگے پاؤں آنے کی وجہ سے عمران کے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہ دی تھی اور وہ علی کو پکڑے حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی حسن کو دیکھ رہا تھا، حسن ذرا سنبھل گئے تھے مگر ان کی آنکھیں کچھ نہ کچھ داستان کہہ رہی تھیں...... ''سب خیریت تو ہے؟'' میں نے علی کو عمران کے ہاتھ سے لے لیا، اس قدر شرم آ رہی تھی مجھے کہ میں بالکل خاموش تھی، حسن خود ہی بات کو سنبھالتے، مجھے تو کوئی بہانہ نہ سوجھ رہا تھا۔

''یار تمہاری امی سے معافی مانگ رہا ہوں مگر یہ معاف ہی نہیں کر رہیں......'' حسن نے صاف کہہ دیا۔

''کس بات کی معافی؟'' عمران نے حیرت سے پوچھا۔

''پوچھو ان سے......'' حسن نے مدعا میرے سر ڈال دیا۔

''جی امی......'' وہ پلٹا۔ ''کیا قصور سرزد ہوا

ہے میرے پیارے ابو جی سے کہ آپ معافی دینے کو تیار نہیں......'' میں خاموش رہی۔'' چلیں میری خاطر...... اچھا نہیں، آپ کو علی کے سر کی قسم، ابو کو معاف کردیں، جتنا بھی بڑا قصور کیا ہو انہوں نے......'' لاعلمی میں عمران نے مجھے پل صراط پر کھڑا کردیا تھا۔

'' تم جاؤ......'' میں نے اس سے کہا۔'' یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے، ہم خود بات کرلیں گے۔'' جو بھی کچھ ہوا تھا میں حسن کی وقعت، عزت اور احترام ان کی اولاد کی نظروں میں کم نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ عمران چلا گیا، حسن پھر میرے پیر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

'' آپ کا قصور قطعی قابل معافی نہیں ہے حسن...... نہ ہی میں اسے فراموش کرسکتی ہوں کہ آپ نے میرے اعتبار اور محبت کی دھجیاں اڑادی ہیں...... مگر میں صرف اس بچے کے باپ کی دی گئی قسم کی خاطر...... خاموشی سے اپنا وقت اس گھر میں گزارنے کی کوشش کروں گی...... آپ اٹھ کر اپنے کمرے میں جائیں۔'' وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

☆☆☆

'' لگتا ہے کہ امی کی سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھی ہے......'' عمران شرارت سے کہہ رہا تھا۔

''شرم کرو عمران ......'' میں نے اسے گھرکا۔'' ایک تو آج کل کے بچوں میں شرم اور لحاظ ہے ہی نہیں۔''

'' کیوں امی، کیا ہوا......؟'' عمران معصومیت سے بولا۔'' میاں بیوی کے درمیان کوئی خونی رشتہ تو ہوتا نہیں، محبت کا ہی تو رشتہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کے دل میں ابو کی محبت جاگ گئی ہے اور آپ نے اپنے کمرے میں واپس منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے تو ہمیں خوشی ہے اس بات کی۔''

'' میں نے کمرا اس لیے خالی کیا ہے کہ اسے تم لوگ علی کے لیے سیٹ کرلو......'' میں نے بہانہ گھڑا۔

'' اوہ تھینک یو امی!'' عائلہ نے چٹا چٹ میرے گالوں کے کئی بوسے لے ڈالے۔'' میں تو سوچ رہی تھی کہ خود اوپر منتقل ہوجاؤں اور انعم سے کہوں کہ وہ نیچے آجائے تاکہ ہم مریم والا کمرا علی کے لیے سیٹ کرلیں...... آپ نے تو میرا اتنا بڑا مسئلہ حل کردیا......'' اس نے میرا کئی بار شکریہ ادا کیا......'' اور ابو اب آپ نے امی کو تنگ نہیں کرنا، ورنہ ہمارا علی پھر کمرے سے محروم ہوجائے گا۔'' اس پر سب کا بھرپور قہقہہ پڑا، میں کھسیانی ہوگئی۔

' مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ......' علی کو سلا کر عائلہ کے حوالے کرکے میں واپس اپنے کمرے میں آئی تو کمرے میں دھیمے سُروں میں گانا بج رہا تھا، میرے دل میں گدگدی سی ہوئی۔ میں نے نماز پڑھ کر اللہ سے مدد مانگی تھی۔ مجھے حوصلہ دے کہ میں حسن کی اس غلطی کو معاف کرسکوں، ان کی عمر بھر کی اس محبت کے صلے میں جو انہوں نے مجھ سے کی تھی۔ سچ کہا تھا امی نے...... کوئی وقت آئے گا کہ میں خود پچھتاؤں گی، حسن نے بھی مجھے خبردار کیا تھا مگر میں نے کس کی سنی تھی...... وقت نے مجھ پر ثابت کردیا تھا کہ مرد کو پڑوس کا راستہ اس کی اپنی بیوی ہی دکھاتی ہے، اپنی بے پروائی سے، کج ادائی سے، بے اعتنائی سے...... میں نے اپنا احتساب کیا تھا تو اندازہ ہوا تھا کہ میں تو حسن کی محبت میں پور، پور ڈوبی ہوئی تھی، جانے کیسے بے جا خوف میں نے خود پر طاری کرکے انہیں خود سے دور کردیا تھا...... پیروں میں پڑی جوان اولاد کی زنجیروں نے مجھے کوئی بھی کڑا فیصلہ کرنے سے روک دیا تھا میں نے بیڈ پر لیٹ کر حسن کو شب بخیر کہا۔

'' تھینک یو میری جان!'' حسن نے میرے کان کے پاس سرگوشی کی۔

مکمل ناول

اسیرِ وفا

زمر نعیم

دوسرا حصہ



وانیہ کو سوئے ہوئے ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ اس کے سرہانے رکھا موبائل بج اٹھا۔ اس کی پلکیں ہنوز نم تھیں۔ مندی بھیگی پلکیں کھول کر اس نے قدرے گھبرا کر موبائل اٹھا کر دیکھا تو اس کے بابا کریم احمد کی کال آرہی تھی۔ رات کے ایک بجے وہ یقیناً بڑی امی کے سونے کے بعد اسے فون کر رہے تھے۔

''السلام علیکم بابا......''

''سوگئی تھیں......وہ دراصل میں......'' دوسری



طرف سے اسے اپنے بابا کی شرمندگی میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

''بابا جان، پلیز کوئی وضاحت مت دیا کریں۔ مجھے آپ کی شرمندگی تکلیف دیتی ہے۔'' وہ قدرے دکھ محسوس کر کے بولی۔ دوسری طرف کچھ لمحے کی خاموشی چھا گئی۔

''کیا بات ہے بابا...... آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

''ت...... م...... تم خوش ہو اس فیصلے سے؟''

''پھپھو نے میرے لیے جو بھی سوچا ہے، اچھا ہی سوچا ہے۔ بابا جان...... آخر میں کسی کے گھر میں کب تک مہمان بن کر رہ سکتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں کہیں ہلکا سا شکوہ بھی پوشیدہ تھا۔

''آپا تو تمہیں اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہیں، بیٹا تم ایسا کیوں سوچتی ہو، آخر بیٹیوں کو رخصت تو کرنا ہوتا ہے۔'' کریم احمد نے اس کا شکوہ محسوس کر لیا تھا۔

''جی...... مجھے معلوم ہے بابا...... آپ بالکل بھی فکر نہیں کریں...... میں آپ کو اور پھپھو کو کبھی شرمندہ نہیں ہونے دوں گی، میرا اعتبار کریں۔'' وہ ایک دم سنبھل گئی تھی۔ بابا کو پریشان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کی فطرت و تربیت میں صبر و قناعت خاص عنصر کی طرح شامل تھے۔

''مجھے اعتبار ہے اپنے بیٹے پر...... اچھا......! جس ضروری بات کے لیے ...نے فون کیا تھا وہ تو رہ گئی......'' کریم احمد بھی نارمل ہو کر بولے۔

''جی......! کہیے بابا......'' ٹھنڈی آہ کے ساتھ جیسے اس نے اندر بھی ٹھنڈک اتاری۔

''میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرا دی ہے۔ اپنی پسند سے شاپنگ کر لینا اور تمہاری امی کے زیورات بھی صبح لاکر سے نکلوا کر آپا کی طرف بھیج دوں گا۔ سنبھال لینا۔'' کریم احمد کی شفقت نے اس کی آنکھیں پھر سے نم کر دیں۔

''بابا...... جا...... ن میں کیسے سنبھال...... سکتی ہوں۔''

''بیٹا......! وہ تمہاری امانت ہے، اب تمہیں ہی سنبھالنی ہے۔ اچھا میری پیاری بیٹی اب رونا نہیں...... بابا کی جان ہے تم میں...... یہ ہمیشہ یاد رکھنا۔'' بہت عرصے کے بعد بابا اس سے اس طرح بات کر رہے تھے۔ شاید پھپھو نے انہیں احساس دلایا تھا یا پھر وہ رخصت ہو کر دور جا رہی تھی اس لیے وہ بھی آزردہ تھے۔ وانیہ اسی بات پر مطمئن تھی کہ اس کے سارے خدشے غلط تھے۔ بابا جان پہلے کی طرح آج بھی اسی کی محبت میں جیتے تھے۔

☆☆☆

اگلی شام آفس سے آنے کے بعد نانو اسے نہ صرف سمجھا رہی تھیں بلکہ صبحی آپی کے گھر اسلام آباد جانے کے لیے راضی کرنے کی کوشش بھی کر رہی تھیں۔

''میرے بچے، تم وہاں جا کر دیکھو تو...... ایک بار لو تو سہی...... صبحی نے سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہے، وہ لڑکی ہمارے مطابق ہو گی۔ جبھی تو اس نے اصرار کیا ہے۔'' وہ منہ بناتا رہا۔

''ان کا اصرار ہی تو مجھے کھٹک رہا ہے نانو...... آپا فائنل لڑکی پسند کر کے معاملات بھی طے کر لیے...... اور مجھے آرڈر کر دیا کہ آ جاؤ...... اب وہاں جاؤں تو نکاح پڑھوا کر ساتھ نہ کر دیں۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''ہاں...... ایسے ہی ننھے ہو تم جو انگلی پکڑ کر لے آؤ گے۔ خاندانی لوگ ہیں، چار لوگوں میں تو ضرور بیٹی رخصت کریں گے خوامخواہ کے قصے نہ گھڑو...... اور جانے کی تیاری کرو...... بہن کو سسرال میں شرمندہ نہ کروانا۔'' نانو نے اسے خفگی سے تنبیہہ کی تو وہ منہ بناتا رہ گیا۔

وہ ویک اینڈ کی شام جانے کی تیاری کرنے کے ساتھ اپنے کمرے میں موجود صبحی اور بچوں کو وارننگ بھی دے رہا تھا۔

''خبردار......! جو کسی نے آپی کو میری فلائٹ کی ٹائمنگ بتائیں۔ فضول کا تماشا مجھے پسند نہیں ہے۔'' اس کی خفگی و بیزاری ہنوز قائم تھی۔ ''میں جس طرح پہلے کیب سے جاتا تھا، اب بھی چلا جاؤں گا۔''

''بھائی آپ بھی عجیب ہیں، اپنی ہونے والی سسرال سے تھوڑا پروٹوکول مل جائے گا تو اچھی بات نہیں۔''

"نہیں چاہیے مجھے کسی کا پروٹوکول ......" اس نے شرٹ پر کوٹ پہنتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔ عصمی نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھا۔

"بھائی...... جب آپ کا دل ہی نہیں چاہ رہا تو آپ خود پر جبر کیوں کر رہے ہیں؟" وہ عصمی کی بات پر کف لنکس بند کرتا، کرتا چونک اٹھا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

"اس لیے کہ یہ معاملہ جب بھی طے ہوگا، دل پر جبر کر کے ہی ہوگا۔ اینی وے...... تم سب کا خیال رکھنا اور ذرا ہوشیار ہو کر رہنا، اوکے......" ثعلب نے آگے بڑھ کر اس کا سر تھپتھپایا۔ "میں کل دوپہر تک آجاؤں گا انشاءاللہ......"

"چاچو...... مجھے بھی ساتھ جانا ہے، دلہن چاچی دیکھنے۔" گولڈی معصومیت سے بولتی آئی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ ممی خفگی سے پہلے عصمی کو گھورے گیا پھر اسے گود میں اٹھا کر بہلانے لگا۔

"آپ سے کس نے کہا ہے کہ میں دلہن دیکھنے جارہا ہوں۔"

"مجھے پتا ہے، پھپھو نے فوٹو بھی دکھائی ہے مجھے۔" ممی کی حیرت سوا تھی۔ سنی بھی تائیداً قریب آکر بولا۔ اس وقت اسے چاچو کے موبائل فون پر گیم کھیلنا بھی بھول گیا تھا۔

"ہا...... ں...... ہاں چاچو، بڑی پھپھو نے نانو جی کے فون پر فوٹو بھیجی ہے آپ کی دلہن کی۔ بہت پیا...... ری ہیں وہ......" سنی نے چالاکی سے آنکھیں گھمائیں۔

"بھائی آپ تو جا کر دیکھ لیں گے۔ نانو کی مجبوری تھی اس لیے...... سنی کی بات سچ ہے، وہ واقعی بہت پیاری ہیں۔" عصمی نے کہنے کے ساتھ ہی باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ اپنی شامت سے بچنے کے لیے۔

☆☆☆

"ممی...... کیب میں کیوں آئے ہو؟" میں خود آجاتی ائرپورٹ...... میں سمجھ رہی تھی کہ تم بائی روڈ آؤ گے۔" ان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ وضاحتیں بھی دے رہی تھیں۔ شکوہ بھی کر رہی تھیں۔

"اپنی تھکن اور آپ کا ٹائم بچانے کے لیے میں بائی روڈ نہیں آیا۔ اب تو آپ خوش ہیں ناں...... میں آپ کے اشارے پر بھاگا چلا آیا ہوں۔" وہ کچھ دیر آرام دہ حالت میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اس احسان کا بہت شکریہ، نوازش میرے بھائی......!" وہ بھی اسی کے انداز میں بولیں۔

"ایک بات کہوں...... اگر مجھے آپ کی نند پسند نہیں آئی تو......؟" اس نے گویا ان کا امتحان لیا۔

"تمہاری پسند کے فریم میں رومانہ فٹ ہے ممی! تم تو خوب صورت سے خوب صورت لڑکی بھی ریجیکٹ کر سکتے ہو، تمہیں اس فریم سے رومی کی فوٹو نکال کر پھاڑنا پڑے گی۔ تبھی تمہیں کوئی دوسری پسند آئے گی۔" آپی ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

"اوکے...... بابا...... اتنا سیریس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، جو بھی ہے جیسی بھی ہے، گوری، کالی، خوب صورت، بدصورت آپ لوگوں کی خوشی کی خاطر مجھے کوئی چڑیل بھی قبول ہے۔" ممی نے گہری سانس لے کر اپنے ساتھ اسے بھی بہلایا تو خفگی کے باوجود عصمی آپی ہنسیں۔

"دشمن نہیں ہیں ہم تمہارے...... ساری زندگی دعائیں دو گے مجھے۔"

"اچھا......! جلد ہی دیکھتے ہیں مگر پہلے چائے پلوا دیں۔ اور ہاں آپ کے لاڈلے دلارے کہاں ہیں؟" ممی نے عصمی کے دونوں بیٹوں کے بارے میں پوچھا۔

"تمہیں پتا تو ہے جنونی ہیں کرکٹ کے...... چھٹی کا دن ہو تو تینوں باپ، بیٹے گراؤنڈ میں نکل جاتے ہیں یا پھر گھر کو ہی گراؤنڈ بنا لیتے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے۔ تب تک تم فریش ہو جاؤ۔" آپی اسے لاؤنج سے اٹھا کر گیسٹ روم میں دھکیل گئیں۔ وہ کمرے میں تنہا کھڑا اپنے احساسات کے ساتھ سوچ رہا تھا۔

"نئی زندگی کے آغاز کے لیے قدم تو اٹھ ہی چکا

ہے۔ اب پلٹ کر جاؤں تو کہاں اور کس کے لیے..... اب تو کسی کے آنے کا امکان بھی باقی نہیں ہے اور اس طرح چھوڑ کر جانے والے پلٹ کر آتے ہی کب ہیں۔ آ بھی جائیں تو گردِ مسافت سے اٹی روح محبتوں کی مسلسل بارشوں سے بھی کہاں نکھر پائے گی۔ تو اے دل.....! سامنے جو رستہ ہے اسے ہی منزل سمجھ لے.....'' دروازے پر دستک ہوئی تھی، وہ چونک کر متوجہ ہوا۔ ملازم لڑکا اسے بلانے آیا تھا۔

☆☆☆

وہ لاؤنج میں داخل ہوا تو شہود بھائی اسے دیکھتے ہی خوش دلی سے بولے۔ ''کیا کسی عید کا چاند نکلا ہے، یہ صاحبزادے، یہاں نظر آ رہے ہیں۔'' سعیدہ خانم، صبیحہ، بچے اور شہود بھائی کے سوا کوئی نیا اضافہ نہیں تھا۔ وہ طائرانہ نگاہ ڈال کر سلام کرتا صوفے پر بیٹھ کر بولا۔

''اس کا جواب تو آپ کو آپی دیں گی کیونکہ یہ تیسرا موقع ان کا خود ساختہ ہے۔''

''اچھی بات ہے بیٹا..... تم آ گئے ہو، یہ بھی تمہارا اپنا ہی گھر ہے، موقع کیوں دیکھتے ہو، جب دل چاہے آیا کرو۔'' سعیدہ خانم نے شفقت کا مظاہرہ کیا۔

''ماموں جانی آپ چائے پی لیں..... پھر ہمیں آپ سے بہت ساری باتیں ڈسکس کرنی ہیں۔'' دونوں بھانجے بلال اور طلال اس کے ارد گرد آ بیٹھے تھے۔ چائے کے دوران رسمی، غیر رسمی باتیں چلتی رہیں۔ البتہ وہ ہستی موضوع ہی نہیں بنی جس کی خاطر وہ آیا تھا یا پھر وہ لوگ دانستہ اس کا ضبط آزما رہے تھے۔ چائے کے بعد وہ بچوں کے روم میں آ گیا۔

☆☆☆

بلال اور طلال اس کے ساتھ اپنی انفارمیشن ڈسکس کر رہے تھے۔ بچوں کی دانست میں کمپیوٹر سے حاصل شدہ معلومات کا علم انہیں زیادہ ہے، وہ ماموں کی قابلیت آزما رہے تھے۔ بچوں کے ساتھ کوئی گیم کھیلتے ہوئے وہ اپنے یہاں آنے کا مقصد بالکل ہی فراموش کر بیٹھا اور وقت گزرنے کا احساس بھی..... وہ

تو آپی نے رات کے کھانے سے پہلے آ کر تینوں کو متوجہ کر کے احساس دلایا۔ بلال اور طلال تو رات کے کھانے کو گول کر کے دودھ پینے پر راضی تھے۔ آج صبیحہ نے بھی اصرار نہ کیا..... کیونکہ سنجیدہ معاملات وہ بچوں کے سامنے طے کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہتی تھی۔ کھانے میں کچھ دیر تھی، وہ ممی کو لیے ہوئے لان میں چلی آئی۔ جہاں پہلے ہی وانیہ، شام سے پناہ گزین تھی۔ بھابی صبیحہ کے ساتھ کسی اجنبی فرد کو دیکھ کر وہ سمجھنے کے باوجود بوکھلا کر کھڑی ہوگئی۔ سفید گھیر دار ٹخنوں کو چھوتے ملبوس پر بڑا سا دوپٹا سر اور بدن پر اوڑھے وہ اپنی بھرپور جاذبیت سے متوجہ کرنے کے باوجود کسی اور ہی دنیا کی بھٹکی ہوئی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔

''اس..... لا..... م..... علیکم.....'' اس کے لرزتے لہجے کے باوجود اس کی آواز کا لوچ دترنم سماعت کو بھلا لگا۔

''وعلیکم السلام..... بیٹھو وانیہ تم کہاں جا رہی ہو۔'' صبیحہ آپی نے بھی سلام کا جواب دے کر اس کے ارادے بھانپے۔

''وہ بھابی..... میں کچن.....''

''سب کھانا تیار ہے، امی جان نماز پڑھ لیں پھر مل کر کھانا چن دیں گے۔ ممی..... یہ وانیہ ہے اور وانیہ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے ممی..... ثعلب۔''

''جسے یہ زبردستی بڑا کرنا چاہتی ہیں۔'' ممی نے بلاوجہ درمیان میں لقمہ دیا۔ آپی حیران ہوئیں اور وانیہ خجل.....

''میں نے تم دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں آگاہ کر دیا ہے پھر بھی..... اگر.....''

''مجھے کب انفارمیشن دی ہیں آپ نے؟'' ممی نے اپنی بے ساختگی سے انہیں شرمندہ سا کر دیا۔ وانیہ نے پہلی بار نگاہ اٹھا کر دیکھا..... اچھا خاصا وجیہہ و پُرکشش مرد اس کے سامنے تھا۔ اور اس کا انداز بیاں بھی دلکش تھا۔ دل ایک دم تیزی سے دھڑکا..... بھابی اسے گھور رہی تھیں۔

''شرافت سے چپ کر کے بیٹھ جاؤ۔ اور کر لو اپنی تسلی..... لے لو خود ہی ساری انفارمیشن.....'' ہنس کر بولی

کر بولیں۔

"چپ بیٹھنے کی شرط کے ساتھ...... کوئی اتنی تسلی کیسے کر سکتا ہے آپی؟" وہ انہیں ستا رہا تھا۔ وہ بھی جانتی تھیں۔

"وانیہ...... یہ ایسا ہی ہے، پلیز مائنڈ مت کرنا۔"

"آپ کا مطلب کیا ہے آپی...... آپ میری ریپوٹیشن خراب کر رہی ہیں۔" وہ بچوں کی طرح روٹھا تو وانیہ بے ساختہ مسکرادی۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی جھلملاہٹ اور بیضوی چہرے کے گالوں میں پڑنے والے ڈمپل بھی اس کی مسکراہٹ عیاں کرتے ثمی کو مبہوت سے کر گئے، دل نے اسے سرگوشی کرتے ہوئے جیسے چھیڑا۔ "حسیناؤں کی اسی ادا پر فدا ہوتے ہیں دل والے، ذرا سنبھل کے......" اگلے ہی لمحے اس نے دل کی مچلتی دھڑکنوں کو قابو کرتے ہوئے توجہ ہٹا کر آپی کو دیکھا۔ وہ وانیہ کو جیسے سمجھا رہی تھیں۔

"وانیہ اس کی باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا، پلیز تم مائنڈ مت کرنا۔" وہ یک دم جیسے چیخا۔

"مطلب کیا ہے آپ کا......؟ آپی آپ میرا مسلسل امیج خراب کر رہی ہیں۔ آپ کا مطلب ہے میں فضول باتیں کرتا ہوں۔" وہ بچوں کی طرح ٹھنک کر بول رہا تھا۔ وانیہ نے سر جھکا کر بے ساختہ آنے والی مسکراہٹ دبائی جبکہ صبیحہ آپی نے اسے زچ ہو کر گھورا۔

"تم کچھ دیر کے لیے سنجیدہ رہ کر بات چیت نہیں کر سکتے۔"

"میں تو سنجیدہ ہی ہوں...... آپ کا پتا نہیں کیا پروگرام ہے۔" وہ یک دم بے نیاز ہوا تو آپی بھی ہنس دیں۔

"میرے پروگرام کا بھی تمہیں پتا چل ہی جائے گا۔ تم اپنی رائے بتادو بس۔" وانیہ ان کی بات سن کر جواب سے پہلے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھابی...... جان میں کھانا لگواتی ہوں۔" پھر وہ رکی نہیں، یقیناً وہ شرما گئی تھی۔ ثعلب نے لمحے بھر کو اسے جاتے دیکھا پھر قدرے جزبز ہو کر بولا۔

"میری رائے کی...... گنجائش آپ نے چھوڑی ہے؟"

"تم نے دیکھ لیا ناں...... میں نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔ وانیہ صورت ہی نہیں سیرت کے لحاظ سے بھی تمہارے قابل ہے اور یہ تم جلد ہی مان جاؤ گے۔" آپی نے اٹھ کر اس کا کندھا اس طرح سہلایا جیسے اسے سمجھا رہی ہوں۔ اس کا حوصلہ بڑھا رہی ہوں۔

"کاش ایسا ہی ہو۔" نہ چاہتے ہوئے بھی ثمی نے مایوسی سے کہا۔

"اللہ سے اچھی امید رکھو...... بس اٹھو...... آؤ کھانا لگ چکا ہوگا۔" آپی نے اس بار اپنی بات پُرزور انداز میں کہی تو وہ بھی ناچار سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

کھانے کے بعد آپی کچن سمیٹتی وانیہ سے اس کی رائے پوچھ رہی تھیں۔ وہ دانستہ ان سب کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے وانیہ...... تم نے ہم سب کے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھایا؟" صبیحہ بھابی نے یک دم مخاطب کیا تو وہ گڑبڑا اٹھی۔

"وہ...... بس بھابی! ایسے ہی...... آپ تو جانتی ہیں، میں کسی کے سامنے گھبرا جاتی ہوں۔"

"میری چندا...... اب اس کسی کے ساتھ ساری زندگی گزارنی پڑے گی۔ پھر کیا کرو گی۔" بھابی نے اسے چھیڑا تو وہ جھینپ گئی۔

"وہ تو ٹھیک ہے بھابی، پھپو اور بھائی جان کے سامنے پہلی بار......"

"اچھا بھئی جانتی ہوں تم ہماری شرمیلی بہن ہو...... مگر مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دل کی بات بتاؤ، ثمی تمہیں کیسا لگا؟" صبیحہ نے اسے بولنے پر اکسایا تو وہ مزید شپٹائی۔

"بھابی جا...... ن...... پھپو نے میرے لیے اچھا ہی سوچا ہوگا۔ اور پھر مجھے یقین ہے آپ اچھی ہیں تو آپ کے بھائی بھی بہت اچھے ہوں گے۔"

"بھائی تو میرا واقعی بہت اچھا، بہت پیار، محبت کرنے والا ہے۔ بس حالات نے اسے کچھ بے یقین سا کر رکھا ہے۔ مجھے امید ہے وانیہ کہ تمہاری رفاقت میں وہ

اپنا یقین دوبارہ پالے گا۔" وانیہ نے خاموشی سے سر جھکالیا۔ صبحی سمجھ سکتی تھیں کہ اس مقام پر وانیہ کھل کر اظہار نہیں کر پائے گی وہ اسے تھپتھپا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

اگلی صبح صبحی آپی بھی کے لیے خود چائے لے کر آئیں۔ وہ نئی جگہ کی وجہ سے ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا تھا۔ ان کی آمد پر فوراً ہی اٹھ بیٹھا۔ انہیں دیکھتے ہوئے منہ بسور کر بولا۔ "اب تو آپ کا مشن کامیاب ہو گیا ہے، اب مجھے اجازت ہے واپس جانے کی؟"

"ابھی...... جاؤ گے...؟ کیا ہمارے ماموں کریم سے نہیں ملو گے؟ وہ سہ پہر تک آئیں گے۔" آپی سامنے بیٹھتے ہوئے اطلاعی انداز میں بولیں تو وہ چائے کا گھونٹ بھرتے، بھرتے رہ گیا۔

"میں ان سے کبھی ملا نہیں......؟ اب کسی فارمیلیٹی کی ضرورت نہیں ہے، پلیز آپی...... مجھے......"

"جب فیصلہ کر چکے ہو تو اب کیوں گھبرا رہے ہو...... بس آج سارے معاملات طے ہو جائیں...... میرا مطلب ہے تاریخ کے بارے میں تم اپنی رائے دے دو، میں اور نانو جلد از جلد اس ذمے داری سے فارغ ہونا چاہتے ہیں۔" انہوں نے ثعلب کی پھٹی آنکھوں میں بسے سوالات سے گھبرا کر وضاحت دی تو وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"صاف کہیں، اپنی نند سے جان چھڑانا چاہتی ہیں، سچ کہتے ہیں، بھابیاں، بیچاری نندوں کو برداشت ہی نہیں کر سکتیں۔"

"بکواس نہیں کرو، وہ ایسی نند نہیں ہے جس سے جان چھڑائی جائے۔ اس کی وجہ سے تو مجھے بہت آرام ہے، تمہارے گھر کے سکون کے لیے جلدی کر رہی ہوں۔" آپی کی بے ساختہ وضاحت پر وہ بھی ہنس دیا۔

"اللہ رے...... آپ کی خوش فہمیاں۔" انہوں نے اسے خفگی سے دیکھا تو وہ فوراً بات پلٹ گیا۔

"سلامت رہیں۔" آپی پہلے تو اسے گھورتی رہیں پھر ہنس دیں۔

"کچھ دیر بعد ناشتے کے لیے آجانا...... پھر نہ سو جانا......" وہ اسے تنبیہ کر کے نکلیں تو وہ پھر سے اسی احساس میں گھر گیا جو گزشتہ کئی دنوں سے اسے گھیرے ہوئے تھا۔ وہ خود کو مسلسل سمجھا رہا تھا اور اب کافی حد تک ذہن کے ساتھ، ساتھ دل بھی مائل کر ہی لیا تھا کہ نئی زندگی میں پرانے احساسات کا عمل دخل نہ رہے۔ وانیہ اپنی شخصیت وذات کے لحاظ سے مقابل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کا نرم لہجہ مترنم آواز، صاف رنگت، لمبے بال، قد کاٹھ وہ ہر زاویے سے رومانہ سے بڑھ کر تھی۔ اس کا اعتراف بڑی مشکل سے کیا تھا اس کے دل نے...... دونوں کے فریقین تو پہلے ہی دل و جان سے راضی تھے۔ بس رسم دنیا نبھانے کو ملنے ملانے کا سلسلہ رکھا تھا۔ کریم احمد آئے بھی تو معمول کی گفتگو ہی کرتے رہے۔ ثعلب بھی ہلکا پھلکا ہو گیا۔ کسی نے بھی زیادہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنے بارے میں کسی اہم فیصلے کے لیے وہاں آیا ہے۔ وہ تو جب واپسی کی تیاری کر رہا تھا تو آپی نے آکر اسے مطلع کیا۔

"نانو کے مشورے سے دو ہفتے بعد کی تاریخ مقرر کی ہے۔ میں دو تین دن میں آؤں گی تاکہ کچھ خریداری کرلوں ٹھیک؟" آپی خوشی سے بتا رہی تھیں۔

"آپ کو جو مناسب لگتا ہے کریں۔" پہلے تو وہ حیرت سے دیکھے گیا پھر سر جھٹک کر بولا۔

"ہاں بھئی، مجھے تو یہی مناسب لگا ہے، تم خوش ہو ناں......؟" آپی نے اس کے ہاتھ سے شرٹ لے کر خود اس کے سفری بیگ میں رکھی۔

"پلیز آپی...... بار، بار مجھ سے یہ سوال نہ کریں...... اس وقت میرے لیے خود بھی یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ میں کس کیفیت میں ہوں۔ میرے لیے بس آپ سب کا خوش ہونا معنی رکھتا ہے۔"

"ہم تو خوش ہیں اور انشاء اللہ تم بھی خوش رہو گے۔ بس اپنی خوشیوں کی خاطر اپنی پچھلی زندگی اور رومی کی یادوں کو دل سے نکال دینا...... اسی میں

تمہارے گھر اور اس نئے بندھن کی بقا ہوگی۔ یہ بات یاد رکھنا۔'' آپی نے ناصحانہ انداز میں اسے سمجھایا۔
''کوشش تو کروں گا آپی، باقی میرا مقدر......''
وہ جیسے بے بس ہوگیا تھا۔ آپی نے آگے بڑھ کر اس کا حوصلہ بڑھانے کو گلے سے لگالیا۔

☆☆☆

ثعلب چلا گیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد صبحی آپی، سعیدہ خانم، شہود اور وانیہ قہوہ پینے میں مصروف تھے۔ سعیدہ خانم نے موقع کی مناسبت سے موضوع چھیڑا۔
''کریم سے میں نے کہہ دیا ہے کہ اسے تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہم لوگ خود سارے انتظامات کرلیں گے۔'' انہوں نے رائے طلب نظروں سے سب کو دیکھا۔ وانیہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔
''ٹھیک ہے امی جان...... ہم کرلیں گے انتظامات...... ویسے بھی...نانو اور شمی کہہ رہے تھے جہیز کے نام پر انہیں کچھ بھی نہیں چاہیے۔ وانیہ بس اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں کپڑے وغیرہ اپنی مرضی سے بنالے۔ یہی کافی ہوگا۔'' صبحی نے رسانیت سے کہا تو سعیدہ خانم کافی متاثر ہوگئیں۔
''وہ کچھ بھی کہیں، ہم اپنی بیٹی کو بالکل خالی ہاتھ تو نہیں رخصت کرسکتے ناں...... تم جانے سے پہلے وانیہ کو ساتھ لے جاکر شاپنگ کرلو...... باقی کچھ خریداری میں کرلوں گی، تمہیں بھی تو جاکر بھائی کی بری بنانی ہوگی۔''
''آپ بالکل فکر نہ کریں، دو دن میں ہو جائے گی شاپنگ، ادھر کی بھی اور ادھر کی بھی......'' صبحی کے تسلی آمیز رویے سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی اس معاملے میں کس قدر پرجوش ہے۔

☆☆☆

شمی واپس لوٹا تو نانو جان نے بے ساختہ خوشی کے اظہار کے طور پر اس کا منہ میٹھا کروایا۔
''شکر ہے تم نے بروقت عقلمندی دکھائی ہے۔ میں تو ڈر رہی تھی کہیں بدک کے انکار ہی نہ کر آؤ۔'' وہ لاؤنج میں ان کے ساتھ لگا بیٹھا ان سے لاڈ اٹھوانے کے موڈ میں نظر آرہا تھا۔ وہ ان کے کندھے سے سر اٹھا کر قدرے سنجیدگی سے بولا۔
''میرے انکار سے آپ سب کا تقاضا تو نہ بدلتا ناں۔ آخر تو شادی کرنی ہی تھی۔ سوچا جلدی سے جان چھڑالوں۔'' بچے سوچکے تھے۔ عصمی اس کے لیے کافی بنا کر لائی تھی۔ اس کی بات سنتے ہی شرارت سے چھیڑنے لگی۔
''اتنی جلدی آپ کی جان چھوڑنے والے نہیں ہیں ہم...... دو دن بعد آرہی ہیں آپی، یاد رکھیں۔ بھاری شاپنگ کروانی ہے آپ نے ورنہ......''
''ورنہ کیا......؟ نانو پلیز...... ان سب سے کہہ دیں۔ مجھے اب کسی سلسلے میں تنگ نہ کریں۔ اپنی مرضی سے جو بھی خریدنا ہے خریدلیں بلکہ میری ایک بات اور آپی تک پہنچادیں۔ یہاں کسی بھی رسم کے نام پر کوئی ہنگامہ نہیں ہونا چاہیے...... سادگی سے نکاح ہوجائے تو یہی غنیمت سمجھیں۔'' نہ جانے ایک دم اسے کیا ہوا تھا۔ دل کی دنیا میں احساسات نے پھر سے انتشار پھیلایا تھا۔ نانو نے رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ عصمی کو کچھ نہ کہنے کا اشارہ کرتے ہوئے رسانیت سے بولیں۔
''میرے بچے، پریشان کیوں ہوتے ہو، تم جیسا چاہتے ہو، ویسا ہی ہوگا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے سعیدہ بھی غیر ضروری رسموں کی قائل نہیں ہیں۔ تم بے فکر ہوجاؤ۔'' وہ تو مطمئن ہوگیا تھا یا نہیں البتہ عصمی کا منہ بن گیا تھا۔ بھائی کی شادی کے سلسلے کی ساری رسومات کو انجوائے کرنے کا پروگرام ٹھپ ہوتا نظر آرہا تھا۔ ڈھولک، مایوں، مہندی، وہ تو سہیلیوں کے ساتھ اپنے کپڑوں کے سلسلے میں بھی بات چیت کرچکی تھی۔
وہ نانو کو ان کے کمرے میں لٹانے آئی تو شکایتاً بولی۔
''نانو...... آپ نے کہا کیوں نہیں...... ہم ساری رسمیں کریں گے۔ کتنے عرصے بعد تو کوئی خوشی ہمارے گھر آئی ہے، اسے بھی روکھے پھیکے انداز میں منائیں۔'' عصمی بھی بچوں کی سی خفگی کے ساتھ بولی۔

''میری بچی! اس وقت بھائی کی حالت سمجھو...... اس نے کس مجبوری سے ہامی بھری ہے۔ اور ابھی کچھ دن ہیں، صبحی آئے گی تو شاید اس کی مان جائے۔'' نانو نے اسے آس دلائی۔

''اللہ کرے وہ مان جائیں۔'' وہ بھی جانتی تھی، بھائی نے جبراً یہ قدم اٹھایا ہے دعائیہ انداز میں بولی۔

☆☆☆

سعیدہ خانم اور وانیہ ساری شاپنگ پھیلائے ان کی نئے سرے سے پیکنگ میں مصروف ہونے کے ساتھ، ساتھ باتوں میں بھی لگی ہوئی تھیں۔ صبحی بھائی کی بری کی تیاری اور خریداری کے لیے لاہور جا چکی تھیں۔ سعیدہ خانم بہو کی خریداری کو سراہتے ہوئے وانیہ کو اکسا رہی تھیں کہ اسے مزید کوئی خواہش ہو تو وہ بتادے۔

''ماشاء اللہ صبحی نے تو دو دن میں کافی زیادہ خریداری کروادی ہے۔ تم دیکھ لو بیٹا مزید کچھ رہ گیا ہے تو کل پھر چلتی ہوں میں تمہارے ساتھ۔''

''پھپو...... ! مجھے تو یہی بہت لگ رہا ہے، سمجھ نہیں آرہی اتنا کچھ میں کیسے سمیٹوں گی۔'' وہ کچھ جھجکی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

''بہت کیا ہے بیٹا..... صرف کپڑے اور ضرورت کی تمہاری ذاتی چیزیں ہی تو ہیں۔ وہ تو ثعلب نے منع کر دیا ورنہ ہم تو تمہیں پورے جہیز کے ساتھ رخصت کرتے، خیر سے بہت سلجھا ہوا بچہ ہے، تمہیں وہاں واقعی کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

''پھپو...... چیزوں کی کمی کے باوجود زندگی گزر جاتی ہے۔ آپ دعا کیجیے گا مجھے وہاں سب کی محبت، اعتماد اور دل میں جگہ مل جائے۔'' وانیہ گہرے احساس میں ڈوبی بولی تو پھپو نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا کر تھپتھپایا۔

''انشاء اللہ مل جائے گی...... میری بیٹی اپنی محبت سے سب کے دل جیت لے گی مجھے یقین ہے، بس ذرا صبر، حوصلے اور سمجھداری سے کام لینا۔ سارے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ بن ماں، باپ کے بچوں کو اپنی شفقت و اپنائیت دو گی تو دیکھنا سبھی تمہارے گن گائیں گے۔ شوہر کی توجہ حاصل کرنے کے معاملے میں بھی کوئی ایسی بے وقوفی نہ کرنا جو اسے تم سے بدظن کردے۔''

''پھپو..... آپ کو کبھی شکایت نہیں ملے گی۔'' پھپو کی نصیحتوں کے جواب میں اس نے سعادت مندی سے یقین دلایا۔

''مجھے امید ہے بیٹا پھر بھی سمجھانا تو میرا فرض تھا ناں...... اچھا یہ سب تو آج سٹ جائے گا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ کل جیولر کے پاس چل کر تمہارے زیورات بھی ڈھلوا دوں اور تمہاری نندوں کے لیے پہناؤنی میں کوئی زیور وغیرہ ہی خرید لیتے ہیں۔'' انہوں نے اٹھ کر بڑے، بڑے اٹیچی کیسوں میں سامان رکھنا شروع کیا۔

''پھپو آپ کو جو مناسب لگتا ہے کریں۔'' وانیہ نے تائیداً سر ہلایا۔

''بس اتنا تو ہم کر ہی سکتے ہیں۔ اور پھر تحفے تحائف سے بیٹی کی سسرال میں عزت بڑھتی ہے۔'' سعیدہ خانم کی اپنی رائے تھی۔ وانیہ بھی متفق تھی سو خاموشی سے سامان سمیٹتی رہی۔

☆☆☆

صبحی آپی نے آتے ہی سرگرمی دکھائی۔ عزیز و اقارب میں مٹھائی بانٹنے کے ساتھ ہی دعوت نامے بھی تقسیم کر دیے اور شادی کی خریداری بھی..... عرصے بعد گھر میں زندگی کا احساس دوڑ رہا تھا۔ نانو مطمئن و خوش تھیں۔ عصمی اور بچے پُر جوش، گولڈی کو تو خود ہی دلہن بننے کا معصوم شوق چڑھا رہتا تھا۔ اب بھی وہ عصمی کا گہرا عنابی دوپٹا سر پر گھونگٹ کی طرح اوڑھے ہوئے سب کے درمیان کھڑی گول، گول چکر کاٹتی ڈیک پر لگے شادی کے گیت پر جھوم، جھوم کر سبھی کو محظوظ کر رہی تھی۔ عصمی تالیاں بجا، بجا کر سنی کو بھی اکسا رہی تھی کہ وہ بھی گولڈی کی طرح ناچے مگر وہ کسی بات پر روٹھا ہوا تھا۔ ممی ابھی، ابھی آفس سے آیا تھا گھر میں مچا شور ہلا، گلا اس کی طبیعت پر گراں گزر رہا تھا۔ لاؤنج میں آتے

ہی اس نے سب سے پہلے میوزک سسٹم بند کیا۔
"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ گولڈی جو اپنی خوشی میں مگن کسی گانے پر جھوم رہی تھی، وہ بھی میوزک بند ہونے پر یک دم رک کر دوپٹا اتارنے کی کوشش کرنے لگی جو کہ مزید اس سے الجھ گیا تھا۔ "میں نے منع بھی کیا تھا۔ مجھے گھر میں شور شرابا نہیں چاہیے۔ مگر آپ لوگ......"

"ممی ......کیا ہو گیا ہے، بچے ذرا سا خوش ہو رہے ہیں۔ گھر میں شادی کا موقع ہے، اتنا حق تو ہے ناں ہمیں۔" آپی نے جواباً اسے خاموش کروانے کی کوشش کی۔

"ضروری ہے، اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کرنا...... بچے بھی آؤٹ آف کنٹرول ہو رہے ہیں۔ انہیں اپنی روٹین ہی بھول گئی ہے۔" لہجہ دھیما ہو گیا تھا مگر رویے سے ناراضی جھلک رہی تھی۔

"ہو جائے گی۔ دوبارہ روٹین سیٹ...... تم خواہ مخواہ حواسوں پر سوار مت کرو...... زیادہ ہی برا لگتا ہے ہمارا خوش ہونا تو جاؤ جا کر اپنا کمرا بند کر کے بیٹھ جاؤ۔"

آپی نے جواباً خفگی سے جھاڑا تو بے بسی سے وہ چپ تو ہو گیا پھر یک دم جھنجلا کر مڑا۔ وہاں سے نکلتے نکلتے اس کی بڑبڑاہٹ سبھی نے سنی۔

"اوکے......اب مجھے کمرے سے باہر نکلنے کے لیے کوئی نہ کہے......" اس کے جاتے ہی نانو نے حمایت کی۔

"بچہ بھی صحیح پریشان ہے، اپنی خوشی میں ہمیں اس کا دھیان ہی نہیں رہتا۔ اس کی ضرورت کا کسی کو خیال ہی نہیں...... شمنی بوا...... دیکھو اسے چائے کا تو پوچھ لو...... کھانا تو جب بنے گا تب بنے گا......" نانو بھی فکر مند ہوئیں۔ شمنی بوا جلدی سے کچن کی طرف چل دیں۔

"نانو......! آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ وہ تو بس ایسے ہی...... جوؤں سے بھی لڑنے کا ارادہ ہے اس کا...... آ جائے گی چند دن میں اس کے نخرے اٹھانے والی۔" آپی نے بے پروائی سے کہا۔ نانو نے سر ہلاتے ہوئے اسے منانے کے لیے اپنی وہیل چیئر کا رخ لاؤنج

سے باہر کی طرف موڑا۔

☆☆☆

کریم احمد نہ جانے کس احساس میں گھرے بڑے دنوں بعد کچھ فرصت سے بیٹی سے ملنے آئے تھے۔ وانیہ نمازِ عشا سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی۔ اپنے بابا کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔

''بابا...... آپ......؟'' اس کی پلکوں پر ٹھہری نمی پلکوں پر ہی ٹھہری رہ گئی۔

''ہاں بھئی......! میں نے سوچا کہ میں اپنی بیٹی کے ساتھ کچھ ٹائم گزاروں۔'' جواباً وہ خاموشی سے انہیں دیکھے گئی۔ جیسے جانچ رہی ہو۔

''کیا ہوا؟ اداس ہو، اپنی ماں یاد آرہی ہے۔'' کریم احمد نے پاس بیٹھ کر اس کا سر تھپکا تو وہ بے اختیار ہو کر اُن کے کندھے سے لگ کر رونے لگی۔

''ارے...... بیٹا...... کیا ہوا...... میرے بچے...... میری جان......''

''بابا...... امی ہی نہیں...... مجھے تو آپ بھی بے حد یاد آتے ہیں۔ امی تو مجھے چھوڑ ہی گئی تھیں...... آپ بھی مجھ سے دور ہو گئے۔ کیوں بابا جان...... کیوں آپ نے مجھے بھلا دیا۔ آ...... پ نے مجھے خود سے دور کیوں کر دیا بابا جان......'' وہ سسک کر اپنے دل کا حال کہے جا رہی تھی۔ کریم احمد کو بیٹی کی کیفیت اور شکوے تکلیف دے رہے تھے۔

''بابا کی جان...... میرے بچے...... ایسا کیوں سوچ رہی ہو۔'' انہوں نے فرطِ محبت سے اس کے سر پر بوسہ دے کر اس کا سر کندھے سے اٹھا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''میں تم سے کبھی دور نہیں تھا اور اب بھی تم میرے دل کے قریب ہو بیٹا...... یہ وہم تمہارے ذہن میں کیوں آیا؟'' اس نے لبریز آنکھوں سے انہیں دیکھ کر کہا۔

''بابا...... بابا جان یہ...... وہم نہیں ہے، میرا احساس ہے، مجھے جب آپ کی بے حد ضرورت تھی...... آپ نے تبھی مجھے تنہا کر دیا...... آپ اس طرح

تو مجھے خود سے الگ نہ کرتے۔'' بڑے دنوں کا غبار جمع تھا، آج ضبط ٹوٹا تھا۔ اسی لیے وہ بے اختیار ہو گئی تھی۔ شادی کا موقع تھا، ماں کی ابدی جدائی تو مقدر تھا ہی باپ کی جدائی کا دکھ بھی سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ کریم احمد نے خاصی بیچارگی سے بیٹی کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ درست تھی جبکہ کریم احمد کی مجبوری بھی مسلم تھی۔

''وانیہ...... بیٹا خدانخواستہ تم تنہا نہیں ہو، یہ تمہاری پھپھو کا گھر ہے، میں تمہاری شناخت ہوں اور اب تو ماشاء اللہ تمہارا اپنا گھر اپنی حیثیت و مقام بننے جا رہا ہے۔ تم نے ایسا کیوں سوچ لیا...... کیا...... تمہیں ہمارا فیصلہ غلط لگ رہا ہے؟'' کریم احمد کی تشویش چہرے و لہجے میں بھی بھر گئی تھی۔ ''بولو...... وانیہ...... اگر تم اس فیصلے سے خوش نہیں ہو تو...... میں آپا سے معذرت کر لوں گا...... مگر بیٹا......''

''م...... یں...... خوش ہوں بابا...... بس آپ سے دور جانے کے خیال سے......'' باپ کی کشمکش و پریشانی اسے یک دم سنبھلنے پر مجبور کر گئی۔ کریم احمد کو بھی اس کی دلی کیفیات کا اندازہ ہو رہا تھا۔

''بیٹا...... اسلام آباد سے لاہور کا فاصلہ ہی کتنا ہے؟ تم جب چاہے ملنے آسکتی ہو...... بلکہ جب کہو گی میں آجاؤں گا۔ بالکل بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بھی سنبھل گئی تھی۔ اپنے آنسو پونچھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ ''خدیجہ کی خواہش تھی کہ تم جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جاؤ۔ اللہ نے اس کی خواہش کو بروقت پورا کر دیا۔ مجھے اسی بات کا اطمینان ہے تم پھر بھی مت سوچنا کہ میں تمہیں بوجھ سمجھ کر اتار رہا ہوں۔''

''نہیں بابا جان...... میں ایسا تو نہیں سوچ رہی...... بس امی یاد آرہی تھیں تو...... سوری...... بابا جان......''

''اٹس اوکے بیٹا......'' انہوں نے شفقت سے اس کا سر تھپکا تو عرصے بعد وانیہ کے دل کا بوجھ ہٹا تھا اور چہرے پر اطمینان نظر آرہا تھا۔

☆☆☆

نانو تو پہلے ہی اسے منانے، سمجھانے آئی تھیں۔

وہ اپنے رویے پر نادم بھی تھا اور انہیں وجہ بھی بتا چکا تھا کہ اس موقع پر وہ عاقب بھائی اور تمکین بھابی کی کمی شدت سے محسوس کر رہا ہے۔

''نانو میں چاہ کر بھی خود پر کنٹرول نہیں رکھ پا رہا۔ میری وجہ سے...... میری خاطر عاقب بھائی اور تمکین بھابی کی جان چلی گئی اور میں خوشیاں منا رہا ہوں۔'' اس کی درد میں ڈوبی آواز نانو کو بھی تڑپا گئی تھی۔

''میرے بچے...... میرے چاند...... ہم اللہ کے نظام کے تابع ہیں، اس کے قانون کے مطابق ہی چل کر جینا ہمارے مذہب وایمان کا حصہ ہے جو دنیا میں آیا ہے، اسے واپس بھی لوٹنا ہے اور واپس جانے والوں کے لیے زندہ انسانوں کا زندگی کے معمولات سے کٹ جانا اللہ کے قانون سے منحرف ہونا ہے، تم کیوں خود بھی اذیت میں ہو اور بچوں کو بھی محروم کر رہے ہو۔'' نانو نے کافی رسانیت سے اسے سمجھایا تو وہ مان کر بھی بے بس ہوا۔

''نانو...... میں کوشش کر تو رہا ہوں...... مگر...... ٹھیک ہے، میں اب کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر پلیز آپ سب بھی تو میرا خیال کریں۔''

''ہمیں تمہارا خیال ہے تو سب خوش ہیں ناں...... بس چند دن کی بات ہے، بچیاں اپنا شوق پورا کریں گی تو انہیں بھی سکون مل جائے گا۔'' وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں عرصے بعد گھر میں زندگی کی لہر دوڑی تھی، اداسیوں کی فضا میں خوشی کے جلترنگ بجے تھے، عصمیٰ اور گولڈی، سنی اپنے، اپنے سہم سے نکلے تھے۔ ماحول میں وارد ہوتی تبدیلی خوش آئند تھی۔ وہ بھی تو چاہتا تھا۔

☆☆☆

''ممی...... بس اب قسم توڑ دو اور، میری کچھ ہیلپ...... کروادو...... میں اکیلی کیا، کیا کروں......''

وہ ابھی آفس سے آکر بیٹھا ہی تھا کہ آپی نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے دہائی دی۔

''میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ I can't help you اب آپ اپنے شوق خود ہی پورے کریں۔'' اس نے بے پروائی سے دامن چھڑایا۔

''میرے شوق...... برخوردار میں اپنے شوق پورے نہیں کر رہی، تمہاری دلہن کے لیے شاپنگ کرتے میں ہلکان ہو چکی ہوں۔ ابھی کتنے کام پڑے ہیں۔ پرسوں مجھے واپس جانا ہے۔'' آپی نے مصنوعی خفگی سے اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

''تو آپ کو کون کہہ رہا ہے ہلکان ہوں...... آپ کی نند صاحبہ اپنی مرضی سے خود ہی شاپنگ کرلے گی۔'' اس نے مزے سے مشورہ دیا۔

''بہت اچھے...... اب ہم اس کے لیے چار چیزیں بھی نہیں خرید سکتے۔ وہ آتے ہی بازاروں میں خوار ہوگی۔''

''تو پھر میں کیا کروں......؟'' وہ زچ ہوا...... شبنی بوا اس کے لیے چائے لے کر آئی تھیں وہ چائے کی چسکیاں لینے لگا تو آپی اسے دیکھے گئیں۔

''تم ایک دن میرے ساتھ چل نہیں سکتے؟'' وہ بھی توقف سے بولیں انداز زچ کرنے والا تھا۔

''میرا جانا اتنا ضروری کیوں ہے، میں کیا کروں گا۔ یو نو مجھے لیڈیز شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

''تو تجربہ حاصل کرو...... شادی کے بعد اس کے لیے شاپنگ نہیں کرو گے؟'' آپی مسلسل اسے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''نو نیور......'' اس نے قطعیت سے کہہ کر اپنی جگہ چھوڑ...... دی تو آپی نے اسے دھمکایا۔

''دیکھوں گی...... کتنے عرصے تک اپنی بات پر ڈٹے رہو گے۔''

''مجھے چیلنج نہ کریں...... بعد میں آپ کو ہی بھگتنا پڑے گا۔ آخر آپ کی نند صاحبہ آرہی ہیں یہاں......'' ممی، آپی کو زچ کر کے محظوظ ہو رہا تھا۔ آپی اسے بے بسی سے گھور کر رہ گئیں۔ وہ اپنی مسکراہٹ ضبط کرتا گنگناتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

''تم سے تو شادی کے بعد نمٹتی ہوں بچو......!'' صبحی آپی تھکن وکوفت کے مارے جھنجلا رہی تھیں......

کئی کپڑے ٹیلر کے پاس پڑے تھے۔ شادی اور ویسے کا ڈریس بوتیک سے لینا تھا۔ جیولری میچ کرنا رہتی تھی..... اور بھی کئی ضرورت کی چیزیں تھیں اور انہیں واپس بھی جانا تھا۔ ممی نے اپنی جان چھڑالی تھی۔ اب انہیں ہی سب کچھ کرنا تھا۔

☆☆☆

سنی، گولڈی حسبِ معمول سونے سے پہلے اس کے ساتھ سارے دن کی باتیں کر رہے تھے کہ دونوں نے کیا، کیا شرارتیں کیں..... دونوں ایک دوسرے کی شکایتیں بھی کر رہے تھے۔

''چاچو.....! اس گولڈی، تمیز نے آج میری بک پر کلر پینسل سے لائن لگادی ہے۔ اب ٹیچر مجھے ماریں گی۔'' چاچو کے دائیں، بائیں دونوں لیٹے ہوئے تھے۔

''گولڈی، یہ کیا.....؟ اپنے بھائی کی بک خراب کیوں کی؟''

ممی نے نرمی سے سرزنش کی۔ گولڈی کا منہ پھول گیا تھا۔

''وہ بھائی نے بھی تو میری ڈول کا ہاتھ توڑا تھا۔'' وہ تتلا کر بات کر رہی تھی۔ ممی کو بے تحاشا پیار آیا۔

''چاچو یہ اپنی ڈول کو کہہ رہی تھی، یہ چاچو کی دلہن ہیں۔ چاچو پتا ہے اس کی ڈول تو بہت کالی ہے اور آپ کی دلہن تو بہت کیوٹ ہیں۔'' سنی نے وجہ بتائی۔ ممی دونوں کی لڑائی کی وجہ سن کر حیرت سے اٹھ بیٹھا۔

''چاچو میری ڈول بی تو پیاری ہے ناں.....'' گولڈی نے تائید مانگی۔

''گندی ہے، کالی ہے تمہاری ڈول..... چاچو کی دلہن کتنی پیاری ہیں اور کمپیوٹر پر بات بھی کی تھی ہم نے..... بلال اور طلال بھائی بھی تھے ان کے ساتھ۔'' سنی نے کچھ غصے میں جیسے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''اچھا.....'' ممی کو حیرت بھی تھی۔ کسی نے اسے بتایا ہی نہیں تھا۔

''تو آپ دونوں نے بات کی ہے اپنی آنٹی سے؟ ہوں..... کیسی ہیں وہ؟'' وہ بھی متجسس ہوا، چلو اچھا تھا وہ بچوں کے دلوں میں خود ہی جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''چاچو..... وہ بہت سوئٹ ہیں، مجھے انہوں نے بتایا ہے وہ اب ہمارے ساتھ رہیں گی۔'' سنی اپنی دانست میں اسے نئی معلومات دے رہا تھا۔ ممی کو ان کی معصومیت پر بے ساختہ پیار آیا۔

''ہاں، اب وہ یہیں رہیں گی..... اب آپ دونوں نے لڑنا نہیں ہے، بس اب آپ جا کر سو جائیں۔ باقی باتیں صبح کریں گے، اوکے.....'' ممی نے سنی اور گولڈی کو اٹھایا اور کمرے میں لے جا کر ٹھیک کر سلا دیا۔ ممی آ کر بستر پر لیٹا تو پہلی بار وانیہ کے لیے دل میں خوشگوار احساسات پیدا ہوئے تھے۔ وہ جن کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دینے کا ارادہ کر چکا تھا اور سوچتا تھا کہ اس کی زندگی میں آنے والی ہستی کہیں اسے اس کے ارادوں میں کمزور نہ کر دے۔ اب گولڈی، سنی سے اپنائیت و محبت بھری باتیں سن کر دل و ذہن میں اٹھتے وسوسے دم توڑ گئے تھے۔ دل بے اختیار وانیہ سے بات کرنے کو مچلا تھا۔ گزشتہ روز آپی نے زبردستی اسے وانیہ کا سیل نمبر دیا تھا کہ اگر وہ چاہے تو وانیہ سے بات کر سکتا ہے۔ یقیناً اُدھر سے بھی اجازت تھی، ممی نے کچھ سوچ کر بیڈ سائڈ سے اپنا سیل فون اٹھایا اور وانیہ کا نمبر ملایا۔ بیل مسلسل بج رہی تھی۔

وانیہ، پھپھو اور بھابی کی اس کے لیے کی گئی شاپنگ کاٹن میں ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اس کے کمرے میں قالین پر کئی چیزیں بکھری ہوئی۔ ان میں کئی قیمتی کرسٹل کے گلدان بھی تھے جو اس کی ماں خدیجہ نے اس کے لیے خریدے تھے۔ انہیں پکڑ کر کاٹن میں رکھتے ہوئے وہ اپنی امی کے اس لمس کو محسوس کر رہی تھی جس کی کمی اب اسے شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے احساسات اس کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ امی جان تو اس کی کل کائنات تھیں، اس کی ہر خواہش ہر تمنا بنا کہے سمجھنے والی ایک ہی ہستی، جنہوں نے صرف

اس کی خاطر زندگی کو گزارنے کا حوصلہ دکھایا تھا۔ ان کی زندگی اتنی مختصر ہوگی...... اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ امی کی کئی باتیں، کئی یادیں اس کی آنکھوں میں نمی بن کر چمک رہی تھیں۔ اسی اثنا میں اس کے سیل فون پر گھنٹی بجنے لگی۔ وہ قدرے چونک کر متوجہ ہوئی اس وقت سوائے بابا کے کسی اور کے فون کی توقع نہیں تھی اسے مگر سیل فون پر ناشناسا نمبر دیکھ کر وہ کچھ الجھ سی گئی۔ وہ ایسے میں فون سننے کی غلطی نہیں کرسکتی تھی، بجتے فون کو اس نے فوراً بند کر کے رکھ دیا۔ اس معاملے میں وہ بے حد محتاط تھی۔ اس نے آج تک اپنی کلاس فیلو تک کو اپنا نمبر نہیں دیا تھا۔ نہ ہی زیادہ دوستیاں نبھانے کی اسے اجازت تھی۔ امی کی نصیحتوں کے زیرِ اثر اس نے بھی احتیاط کا دامن تھامے رکھا تھا۔ اس کی امی نہیں چاہتی تھیں کہ وہ کبھی اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح بے پروا نازنخرے والی لڑکی بنے سو انہوں نے اس کی تربیت بھی اپنے انداز میں کی تھی بھی وہ بے حد سنجیدہ اور احساسِ ذمے داری سے بھرپور لڑکی تھی اور یہ اسی کے لیے اچھا ثابت ہورہا تھا۔ وقت کی کروٹ نے جلد ہی اسے سنبھلنے کا حوصلہ جو دیا تھا یہ اس کی امی کی پرورش و تربیت کا ہی نتیجہ تھا۔ صبر، برداشت، تحمل ایثار و وفا اس کی گھٹی میں شامل تھے۔ وہ انہی باتوں کو سوچتی، سوچتی بستر پر آکر لیٹی تو پھر اسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

اِدھر ثعلب فون پر رابطہ نہ ہونے پر خاصا حیران تھا، بنا کہے سنے فون کا رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ اسے یہ بات بڑی عجیب لگ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر آپی نے وانیہ کا نمبر اسے دیا ہے تو یقیناً ثعلب کا نمبر بھی اسے دیا ہوگا۔ جبکہ اصل میں ایسا نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں بھی ایک سوچ ابھری تھی اور اسی سوچ کے زیرِ اثر اس نے بڑی پلاننگ سے آپی کا سیل فون لاؤنج کی کارنر ٹیبل سے اٹھایا تھا اور آفس کے لیے نکل آیا تھا۔ نانو اور آپی ناشتے کے بعد نانو کے کمرے میں زیورات وغیرہ دیکھنے میں مصروف تھیں۔ گھر سے کچھ فاصلے پر جا کر اس نے گاڑی ایک طرف روکی اور آپی کے سیل فون سے مطلوبہ نمبر ملایا، وانیہ اس وقت کچن میں کھڑی ناشتے کے بعد ملازمہ کے ساتھ کچن سمیٹ رہی تھی۔ لاؤنج کی میز پر اس کا سیل فون پڑا تھا۔ کچن تک گھنٹی کی آواز آرہی تھی۔ وہ ہاتھ میں پکڑی جیم کی بوتل کو کچن کاؤنٹر پر رکھ کر لاؤنج میں آکر اپنے سیل فون کی طرف لپکی اور اسکرین پر بھابی صبحیٰ کا نام دیکھتے ہی اس نے کال ریسیو کی۔

"السلام علیکم...... ! بھابی، جی کیسی ہیں؟" انداز و لہجے میں عجلت تھی۔

"وعلیکم السلام...... میں بھابی کا بھائی بات کررہا ہوں۔" گاڑی میں بیٹھا ثعلب تصور میں ہی اس کا ردِ عمل سوچ کر محظوظ ہورہا تھا۔ وانیہ نے نہ سمجھ میں آنے والے تاثرات کے ساتھ ہی فوراً رابطہ منقطع کیا۔

ثمی نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ پھر سے رابطہ بحال کرنا چاہا۔ بیل مسلسل جارہی تھی، لاؤنج میں تنہا کھڑی وانیہ حیران پریشان سی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ثعلب نے اسے کال کیوں کی اور وہ بھی صبحیٰ بھابی کے نمبر سے...... مسلسل بجتی گھنٹی پر ملازمہ کچن سے نکل کر آئی اور اسے ٹوک کر متوجہ کیا۔

"بی بی...... کس کا فون ہے؟ اٹھا کیوں نہیں رہی ہو۔" ملازمہ کا مشکوک رویہ وانیہ کو سنبھلنے پر مجبور کرگیا۔ اس نے بجتی گھنٹی سے گھبرا کر یس کا بٹن پُش کیا۔

"تھینکس گاڈ...... آپ نے کال تو ریسیو کی......؟ پلیز میری بات سنے بغیر بندمت کیجیے گا۔" ثمی نے گاڑی کی نشست پر کچھ سہولت سے بیٹھ کر پُراصرار لہجے میں کہا۔ وانیہ بہت محتاط انداز میں لاؤنج سے نکل کر اپنے کمرے میں آگئی۔ "آپ لائن پر ہیں؟" ثمی اس کی خاموشی محسوس کر کے پوچھ رہا تھا۔

"جی...... آپ کہیں......" وانیہ کا اعتماد بحال ہوچکا تھا۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھ کر اسی اعتماد سے بولی...... تو ثمی کو بھی کچھ کہنے کا حوصلہ ملا۔

"میں رات کو بھی آپ سے بات کرنے کے لیے

کال کر رہا تھا مگر آپ نے سوئچ ہی آف کر دیا؟'' شکوہ تھا یا اطلاع وانیہ بھی سمجھ نہ پائی۔

''میں اجنبی نمبرز ریسیو نہیں کرتی۔ آئی ایم سوری...... مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ آپ کی کال ہوگی۔'' اس کے محتاط انداز پر ممی کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''ڈونٹ وری...... مجھے آپ کی احتیاط اچھی لگی۔ اسی لیے میں نے آپی کا سیل فون اڑایا ہے۔'' ممی نے بے ساختہ ہی دل میں آئی بات کہی۔ دوسری طرف وانیہ بھی زیر لب مسکرائی تھی۔

''مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔''

''جی...... کس بات کے لیے؟'' وانیہ نے واضح حیرت سے پوچھا۔

''آپ سنی، گولڈی کے ساتھ انجمنٹ بڑھا رہی ہیں، اس کے لیے...... سچ پوچھیں تو میں اس حوالے سے کچھ اپ سیٹ تھا۔ تھینکس اگین......''

''آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں، میں آپ ہی کی زندگی میں شامل ہونے جا رہی ہوں، اس لیے سب سے ہی انجمنٹ ضروری ہے۔'' وانیہ کا جواب بہت جامع تھا۔ ایک سکون و اطمینان ثعلب کے دل میں اترا تھا۔

''ان سب میں میں بھی شامل ہوں؟'' انداز چھیڑنے کا سا تھا، ممی کا استفسار وانیہ کے چہرے پر گلرنگ بکھیر گیا۔ اس کا جواب اس کے پاس بہت واضح لفظوں میں تھا مگر وہ اپنی فطری نسوانی شرم و حیا کے باعث فقط اتنا ہی بولی۔

''اس کا جواب آپ کو آنے والے دنوں میں مل جائے گا، اللہ حافظ......'' اس کی طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ ممی پہلے تو اس کے لفظوں کے معنی سمجھ کر محظوظ ہوا پھر گاڑی واپسی کے لیے موڑی۔ آخر آپی کا سیل فون بھی تو واپس پہنچانا تھا۔ وانیہ کچھ دیر تک بیٹھی ثعلب کی باتیں سوچ کر محظوظ ہوتی رہی۔ زندگی نئے زاویے سے دیکھنے کا احساس خوشگوار لگنے لگا تھا۔ خوش امیدی کے خواب اس کی پلکوں پر سج کر تعبیر کے پیرہن بدلتے

اس کی دھڑکنوں میں دھڑکنے لگے تھے۔ ممی کی اپنائیت اسے پہلی بار نئی انوکھی سرشاری دے گئی تھی۔

ثعلب کا سارا دن بہت خوشگوار گزرا تھا اور وہ اسی خوشگواری کے ساتھ واپس آیا تھا۔ آپی بھی ابھی بازار سے وانیہ کے عروسی اور ولیمے کے ملبوسات لے کر آئی تھیں۔ لاؤنج کے کارپٹ پر ڈبے پڑے تھے، نانو اپنے کمرے میں مغرب کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ عصمیٰ اور بچے ٹیوٹر سے ٹیوشن لے رہے تھے، وہ دروازے سے ہی بولتا ہوا اندر آیا۔

''کہاں ہیں سب...... اتنی خاموشی...... خیریت ہے؟'' دوسری طرف سے آپی اپنے لیے چائے کا مگ لے کر برآمد ہو رہی تھیں۔

''شکر ہے کچھ خاموشی ہوئی، بھلا ہو ٹیوٹر کا...... ورنہ تو یہاں ایک طوفانِ بدتمیزی اٹھا ہوا تھا۔ میری ساری شاپنگ منٹوں میں بکھیر کے رکھ دی تھی ان شیطانوں نے۔'' ممی نے ان کی شکایت پر طائرانہ نگاہ بکھرے سامان پر ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ تو معمولی سی افراتفری ہے...... توبہ جو کچھ پچھلے دنوں میں، میں نے بھگتا ہے الامان الحفیظ......'' وہ بولتے، بولتے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''سمجھ ہی نہیں آتی تھی انہیں کیسے ہینڈل کروں۔''

''آ رہی ہے تمہارے ساتھ مل کر انہیں ہینڈل کرنے والی۔ اس سے پہلے کہ وہ پڑھ کر پھر آ جائیں۔ تم یہ برائیڈل ڈریسز دیکھو۔'' آپی نے چائے کا مگ اس کے قریب سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ جسے اس نے بلا توقف اٹھا لیا۔ آپی بھاری زرتار عروسی جوڑے کا سرخ دوپٹا پھیلائے اسے دکھا رہی تھیں اور ساتھ، ساتھ ان کی تعریفی کمنٹری بھی جاری تھی۔ بلاشبہ بہت خوب صورت کام سے مزین لہنگا سیٹ اپنی شان خود بتا رہا تھا۔ ایک نظر دیکھتے ہی وہ کہیں دور پہنچ گیا۔ ایک خوب صورت یاد ذہن کی اسکرین پر ابھری تھی۔ کسی مشترکہ دوست کی شادی میں روبی بھی اس کے ساتھ گئی تھی۔ سرخ رنگ میں دلہن کو ملبوس دیکھ کر ممی نے بے اختیار ہی

اسے چھیڑا تھا۔

''رومی...... ہماری شادی پر تم ریڈ کلر کا ویڈنگ ڈریس مت پہننا...... میں اپنی پسند کا ویڈنگ ڈریس بنواؤں گا۔'' بات کرتے ہوئے ممی کی آنکھوں میں خواہش بھی تھی اور جذبوں کی حرارت بھی۔

''کیوں......؟ میں تو ریڈ کلر ہی پہننا پسند کروں گی۔ تمہیں پتا ہے، ریڈ کلر میرا فیورٹ ہے اور شادی والے دن لڑکیاں ریڈ کلر ہی پہنتی ہیں۔''

''پہنتی ہوں گی مگر تم میرا فیورٹ کلر اسکائی بلیو پہنو گی۔''

''جی نہیں......'' دونوں میں بحث چھڑ گئی تھی۔

''جی ہاں...... سمجھیں۔'' ممی نے بڑے استحقاق سے رائے مسلط کرنا چاہی۔

''ممی...... یہ کیا بات ہوئی۔''

''یار...... رومی میں چاہتا ہوں کہ تم دنیا کی ہر دلہن سے مختلف لگو...... آخر ثعلب فاران کی دلہن بنو گی تم، کوئی مذاق تو نہیں ہے۔'' ممی نے اس کے آگے رکھی کولڈ ڈرنک اٹھا کر اسے مزید تپ چڑھائی۔

''بات سنو......! عجوبہ لگنے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ یاد رکھنا میں ریڈ کلر ہی پہنوں گی، ہاں......'' رومی نے قدرے ناراضی سے کہتے ہوئے اپنے مشروب کا گلاس زبردستی اس سے چھینا۔

''اور تم بھی یاد رکھنا۔ میں بھی تمہیں رخصت کروا کر نہیں لاؤں گا۔ بیٹھی رہنا اپنے لال جوڑے کو پہن کر۔'' ممی کا بھی منہ پھول گیا تھا۔

''مجھے دیکھ کر ہوش میں رہو گے تو......'' وہ شرارت سے بولی تو۔

''او کے...... دیکھی جائے گی۔'' ممی بھی اس کی پوری شرارت سے کھینچتے ہوئے جواباً بولا تھا۔ آپی نے بھی اسے چونکا دیا۔

''ممی...... کہاں گم ہو...... کیا بات ہے ڈریس پسند نہیں آیا؟'' وہ ایک دم سنبھل گیا تھا۔

''پلیز آپی...... اگر کلر چینج ہو سکے تو......'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنی رائے دے گیا۔

''کیوں، تمہیں پسند نہیں آیا؟'' آپی قدرے حیران ہوئیں۔

''آج کل ریڈ کلر فیشن میں بھی ہے اور ہماری روایت بھی بن چکا ہے۔'' آپی نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ ان سے نظریں چرا گیا۔ ''ٹھیک ہے چینج تو ہو جائے گا۔ تم کلر بتا دو یا پھر میرے ساتھ ہی چلنا۔''

''میرے پاس ٹائم نہیں ہے، آپ اپنی نند صاحبہ سے پوچھ لیں اگر انہیں یہ کلر پسند ہے تو رہنے دیں۔''

''کہاں بھئی...... وہ تو دنیا کی انوکھی لڑکی ہے، پہلے اسی سے مشورہ کیا تھا۔ اس نے اسکائی بلیو کلر کے لیے کہا تھا مگر مجھے تو یہی خوب صورت لگ رہا تھا۔'' آپی نے سہولت سے سامنے بیٹھ کر کپڑوں کی تہ لگانا شروع کر دی۔

''اسکائی بلیو......!'' وہ زیرِ لب بولا۔ یک دم آنکھوں میں انوکھی سی چمک لہرائی۔

''اسکائی بلیو ہی ٹھیک ہے آپی۔'' ان دونوں کا پسندیدہ رنگ اور خیال ایک تھا۔ ثعلب کے دل میں اِک کسک ابھری۔ وہ ایک دم ہی کھڑا ہو گیا۔

''یہ تم کہاں چل دیے، بیٹھو ابھی میری بات سنو......'' انہوں نے سلیقے سے دوپٹا ڈبے میں لگایا۔

''آپی فریش ہو کر کچھ دیر آرام کروں گا...... پھر تو عصمیٰ کی سہیلیاں آجائیں گی اور ان کی دھم دھما دھم شروع ہو جائے گی۔'' اس کے چہرے پر تھکن اور لہجے میں شکوہ تھا۔

''بس دو چار دن کی تو بات ہے، بچیوں کے لیے یہی خوشی کا تو موقع ہوتا ہے، تم بتاؤ، تم نے اپنے لیے شادی کی شاپنگ کر لی......؟'' آپی نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''نہیں...... مجھے ضرورت نہیں...... بہت سے کپڑے ہیں میرے پاس۔''

''دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا، اپنی شادی پر پرانے کپڑے پہنو گے؟''

"تو کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے بے نیازی سے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ آپی نے بطورِ خاص اس کی جانب دیکھا کہ آیا وہ سنجیدہ ہے یا ان سے مذاق کہہ رہا ہے۔

"فرق...... کیوں نہیں پڑتا۔ زندگی میں ایک ہی بار تو شادی ہوتی ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ......"

"میں تو چار کا ارادہ رکھتا ہوں، ڈونٹ وری...... میں نیکسٹ ٹائم پوری تیاری کروں گا۔" وہ ان کی حیرانی سے خاصا محظوظ ہو کر شرارت سے بولا تو آپی نے قریب پڑا کشن اس پر اچھالا جسے اس نے کیچ کر لیا۔

"بکواس مت کرو...... اور شرافت سے اپنے کپڑوں کا آرڈر دے کر آؤ، پرانے کپڑے پہن کر کیا ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ زبردستی دولھا بنائے گئے ہو۔"

"تو اس میں شک بھی کیا ہے۔" وہ بے ساختہ ہنسا۔ مطلب انہیں چڑانا تھا۔

"اچھا...... تو پھر ٹھیک ہے بچو! اب ہم بھی اپنی ساری باتیں تم سے زبردستی ہی منوائیں گے۔ اب دیکھنا ہم ساری رسمیں کریں گے، ورنہ...... خواہ مخواہ اپنے دل کو ماریں ہم۔" آپی نے بھی اسے دھمکایا۔ "ہمارے ارمان تو کم از کم پورے ہوں۔" ان کی بات سن کر وہ پلٹ آیا، چہرے پر یک دم سنجیدگی در آئی تھی۔

"آپی آپ اپنے اور اپنی نند صاحبہ کے دل کے ارمان ضرور پورے کریں مگر مجھے کسی بھی فضول رسم کا حصہ بننے پر مجبور مت کیجیے گا۔" اور صبحی اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

عصمی اپنی محلے کی سہیلیوں کے ساتھ مل کر ڈھولک پر الٹے سیدھے گانے گاتے ہوئے ہلا گلا مچائے ہوئے تھی۔ سنی، گولڈی بھی اسی کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد آپی بھی کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھی رہیں پھر اٹھ کر شمی کے کمرے میں آ گئیں جو کھانا کھاتے ہی کمرے میں پناہ گزین تھا اور بستر پر بیٹھا لیپ ٹاپ پر اپنے دوستوں کے ساتھ چیٹ چیٹ کر رہا تھا۔ آپی نے اسے بیٹھا دیکھ کر شکر کا کلمہ پڑھا۔

"شکر ہے تم جاگ رہے ہو......"

"اتنے شور اور ہلے گلے میں کوئی سو سکتا ہے، آپ کو کوئی کام تھا؟" اپنی مصروفیت ترک کر کے وہ بہن کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں تمہیں یاد دلانے آئی تھی کہ صبح آفس جانے سے پہلے تم مجھے ائرپورٹ چھوڑنے جاؤ گے۔ وہاں بھی جا کر مجھے کتنے کام دیکھنے ہیں۔" صبحی اس کے بیڈ پر سامنے ہی ٹک گئیں۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہ اسے کچھ سمجھانے بتانے آئی ہیں۔

"مجھے یاد تھا آپی اب اتنا غیر ذمے دار تو نہ سمجھیں۔" وہ ذرا سا مسکرایا۔

"مجھے معلوم ہے میرا بھائی بہت سمجھ دار اور ذمے دار ہے۔ پھر بھی ایک بات سمجھانا چاہتی ہوں۔"

"اب بھی کوئی نصیحت رہ گئی ہے؟" وہ جیسے زچ ہوا۔ "بابا کہہ تو چکا ہوں، آپ کی ناک بچی رہے گی، آپ کی نند کو بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا...... وہ جو کہیں گی آنکھیں بند کر کے مان لوں گا۔ خوش......"

"یہ کیا......؟ آپ کی نند، آپ کی نند لگا رکھی ہے اب وہ تمہاری بھی کچھ ہونے جا رہی ہے۔ اس دن بھی تم میرا مذاق اڑا رہے تھے، میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں وہ عام لڑکیوں سے مختلف ہے، وہ پیار و محبت والی لڑکی ہے...... صبر، قناعت، برداشت اس کی خصوصیات ہیں۔ تم خود بھی ایک دن مان لو گے کہ میں نے تمہارے لیے ہیرا چنا ہے۔" وہ قدرے برا مان کر اسے احساس دلانے کی کوشش کر گئیں۔ شمی نے آپی کی جذباتیت پر انہیں مسکرا کر دیکھا۔

"آپ تو جذباتی ہو رہی ہیں آپی...... آپ محترمہ کے گن بھی تو اس قدر گاتی ہیں۔ میں سمجھا آپ مجھے امپریس کرنا چاہتی ہیں۔"

"اور جو نہ ہونا چاہے وہ خوبیوں کو بھی خامیاں بنا سکتا ہے۔" آپی کی ناراضی لہجے سے بھی عیاں تھی۔

''استغفراللہ..... آپ مجھ سے اتنی بدگمان ہیں..... اپنے بھائی پر بھروسا رکھیں۔'' آپی نے اسے ایک نظر دیکھ کر لمبی سانس لی.....

''اپنے بھائی پر بھروسا ہے، بس کبھی کبھی تمہارا رویہ پریشان کرتا ہے، تمہاری رومی سے وابستگی۔''

''پلیز آپی.....!'' وہ انہیں درمیان میں ہی ٹوک گیا۔'' میں بہت مشکل سے خود کو سنبھال پایا ہوں آپ.....'' وہ بولتے، بولتے خاموش ہو گیا۔ دونوں کے درمیان چند لمحے خاموشی کا وقفہ رہا..... دونوں ہی کشمکش میں تھے، چند لمحوں بعد مُعی نے ہی خاموشی کو ختم کیا۔

''آپی کیا آپ نے اسے رومی کے بارے میں بتا دیا ہے؟'' مُعی کے تاثرات یک دم بدلے تھے۔ اسے خود ہی اپنی آواز دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ صبحی آپی نے بھی خود کو سنبھال لیا تھا۔

''ہاں..... یہی بہتر تھا، بعد میں کوئی بڑھا چڑھا کر بتاتا، خواہ مخواہ گھر کا سکون برباد ہوتا، بے شک وہ ایسی نہیں ہے۔ پھر بھی عورت کی فطرت کب اور کس بات پر اسے بہکا دے، اس کی تو کوئی گارنٹی نہیں ہے ناں..... ہر عورت چاہتی ہے کہ اس کا شوہر صرف اسی کو سوچے، سراہے، اسی سے وفادار رہے، میں نے بھی اسے یقین دلا دیا ہے کہ تم رومی کو بھول چکے ہو، وہ تمہارے لیے عہدِ رفتہ کی ایک تلخ یاد سے زیادہ کچھ نہیں اور تمہیں بھی یہ ثابت کرنا ہوگا۔'' وہ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سوال ضرور تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ''یہ اتنا آسان ہے کیا.....؟''

''ایسا ہی ہوگا آپی.....'' نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کہنا پڑا..... صبحی آپی کے لیے اس کا اقرار ہی کافی تھا۔

☆☆☆

اس نے اقرار تو کر لیا تھا مگر خود کو سنبھالنا اتنا آسان نہیں تھا۔ دل میں درد بھی تھا اور دردناک یادوں کا ہجوم بھی..... آخر وہ دن، وہ لمحے، وہ ساعتیں، وہ گھڑیاں آ پہنچی تھیں۔ جن کے ٹلنے کی وہ دعائیں مانگ رہا تھا رات بھر رومی کی تصویر و تصور سے باتیں کرتے ہوئے وہ اسے باور کرا رہا تھا کہ اپنی محبت کا رخ بدلنے پر وہ اسی کے ہاتھوں مجبور ہوا ہے..... اگر وہ اس کا ساتھ دیتی تو وانیہ کی جگہ پر آج وہ ہوتی۔

''کاش..... کاش رومی تم ایک بار تو میرا ساتھ دیتیں تو میری زندگی میں زبردستی یا جبر والا عنصر شامل نہ ہوتا۔ میں بھی اپنے پیاروں کے ساتھ دل سے ہنستا، دل سے ہر رسم، ہر بات میں شامل ہوتا..... یہ خوشیاں، یہ رنگ مجھے مصنوعی نہ لگتے..... میں اپنے پیاروں کو دھوکا نہ دیتا..... کاش! تم میرے ساتھ ہوتیں.....'' خود کو لاکھ سمجھانے بجھانے کے بعد بھی وہ اندر سے نئی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا۔

چند مخصوص رشتے داروں اور احباب کو باراتی بنا کر وہ اپنے ہمراہ اسلام آباد صبحی آپی کے گھر پہنچا تو وہاں ان کا استقبال بالکل روایتی گرمجوشی کے ساتھ ہوا تھا۔ صبحی آپی نے تمام رسوم کی ادائیگی اسی اہتمام سے کی تھی جو شادی کے حوالے سے منسوب تھیں۔ نانو کا اطمینان ان کے چہرے سے جھلکتا ان کے اندرونی سکون و قرار کا پتا دے رہا تھا۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی نکاح کے ایجاب و قبول کے بعد بھی اس کے دل کی کیفیت میں خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ اسٹیج پر اس کے پہلو میں آکر بیٹھی وانیہ اس کے دل کی دھڑکن نہ بڑھا سکی تھی۔ وہ خود کو اس وقت کوئی مشینی انسان سمجھ رہا تھا۔ جس کے احساسات و جذبات کا ریموٹ کہیں گم ہو گیا تھا یا چارج ہونے سے رہ گیا تھا۔ ذہن و دل کی اسکرین پر ایک ہی منظر ریوائنڈ ہو کر بے چین کر رہا تھا۔ بار، بار رومی اس کے تصور میں آ رہی تھی۔ سرخ جھلمل کرتے لباس میں، شرگیں مسکراہٹ، پلکوں کی چلمن گرائے، اسی لیے تو وانیہ کو نظر اٹھا کر بھی دیکھنے کے لیے دل نہ مچلا تھا، نہ ہی نظروں میں شوق دید نے ضد دکھائی تھی۔ دل میں جذبوں میں آتش بنا جلے، بجھی، بجھی سی تھی۔ اپنوں کے آسودہ اور مطمئن چہرے بھی اسے متوجہ نہیں کر پائے تھے۔

سب مطمئن تھے، خوش تھے اسی لیے کسی نے اس

کے سرد وسپاٹ رویے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ یقیناً اس کی سنجیدگی کسی کے لیے بھی قابلِ اعتراض نہیں تھی۔ وانیہ اس کے ساتھ رخصت ہو کر اس کے گھر آ گئی تھی۔ اس گھر میں جسے تمکین بھابی نے اپنی محبتوں وفاؤں اور قربانیوں سے سنوارا سجایا تھا اور پھر اسی گھر کی بقا کے لیے وہ خود کو فنا کر گئی تھیں۔ سبھی مہمان جا چکے تھے۔ صبحی آپی ان کے ساتھ ہی آئی تھیں...... ولیمے کی تقریب ایک دن بعد طے تھی، اس لیے آتے ہی عصمی تو تمکین کی وجہ سے نانو کے ساتھ ہی ان کے برابر میں لیٹ گئی تھی۔ صبحی آپی بھی شمسی بوا کے ساتھ پھیلاوا سمیٹتی پھر رہی تھیں۔ بچے اپنی خوشی میں دوڑے بھاگے پھر رہے تھے۔ انہیں دلہن کے روپ میں جیسے اپنی پسندیدہ ہستی مل گئی تھی۔ ممی سبھی سے نظریں بچا کر اپنے کمرے میں جانے کے بجائے گھر کے پچھلے حصے میں آ بیٹھا تھا۔ اس کے اندر سرد سی جنگ چھڑی تھی۔ آپی نے گھر آتے ہی اس کی سرد مہری کا اسے احساس دلایا تھا۔

''کیا کر رہے ہو ممی تم...... دلہن کو ساتھ لے کر چلو...... اتنی جلدی کیا ہے تمہیں۔'' ان کے مسکراتے ہوئے چہرے پر اُن کی سنجیدہ نظروں کی سرزنش ثعلب کو پل بھر میں احساس دلا گئی تھی کہ وہ کتنا غلط رویہ اپنائے ہوئے ہے، دلہن بنی وانیہ کو تو اس نے قابلِ اعتنا بھی نہ سمجھا تھا۔ بچے، عصمی اور آپی ہی اسے اہمیت دے رہے تھے اور وہ خود اس سے تو کیا اپنے آپ سے بھی بیگانہ بس آگے بڑھتے جا رہا تھا۔ اب آ کر تنہا بیٹھا تھا تو اپنا محاسبہ خود ہی کر رہا تھا۔

''ثعلب فاران...... یہ تم کیا کر رہے ہو؟ زندگی کی حقیقتوں کو تسلیم کرو یار...... پاگل نہ بنو...... اب تمہاری زندگی، تمہارے جذبوں پر صرف اور صرف وانیہ کا حق ہے، جسے تم کئی لوگوں کی موجودگی میں اللہ کو گواہ بنا کر لائے ہو...... تم اس بے وفا کی خاطر اپنے جذبے، اپنے احساسات وقف کر دینا چاہتے ہو، جس نے پلٹ کر تمہیں دو حرف تسلی بھی نہ دی تھی۔ آج اسی کی خاطر ایک معصوم لڑکی کے جذبوں سے کھیلنے کی کوشش کر رہے ہو...... یہ غلط ہے...... آج عہد کرو کہ وانیہ کو وہ خوشیاں، وہ محبت، وہ جذبے اور وفائیں پوری ایمانداری کے ساتھ دو گے جو اس کا حق ہے۔'' ضمیر کی خلش نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ وہ خود بھی ایسا ہی چاہتا تھا بس کچھ بے بس سا ہو گیا تھا۔ انگلیوں میں دبے سگریٹ کے گہرے اور لمبے کش لے کر اس نے جلدی سے ایش ٹرے میں سگریٹ ملا...... کسی کے آنے کی آہٹ نے اسے متوجہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

وانیہ نئے جذبوں کے کیف و سرور کے ساتھ ثعلب کے سادگی سے سجے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی اس کی منتظر تھی۔ صبحی بھابی کچھ دیر پہلے اس سے کھانے پینے کے بارے میں پوچھنے آئی تھیں اور پھر اس کے انکار پر اسے آرام سے بیٹھنے کا مشورہ دے گئی تھیں۔ وانیہ نے قدرے سکون سے بیٹھتے ہوئے اطراف کا جائزہ لیا۔ روایتی سجاوٹ سے عاری کمرا کافی سلیقے سے سجا تھا۔ کمرے میں موجود کتابوں اور میوزک البم کی الماریوں سے ثعلب کے ذوق شوق کا بھی اندازہ ہو رہا تھا۔ بچوں اور بھائی، بھابی سے وابستگی کی گہرائی کا اندازہ دیوار پر آویزاں فریم میں جڑی تصویروں سے بھی ہو رہا تھا۔ وانیہ خود رشتوں کو ترسی ہوئی تھی، ممی کی اپنے گھر والوں سے وابستگی اسے رشک میں مبتلا کر گئی۔ وہ اٹھ کر تصویریں دیکھنے میں محو تھی کہ اسی لمحے دروازہ کھلا اور سنی، گولڈی دبے، دبے قدموں اندر آئے تھے۔ وانیہ کو وہاں موجود نہ پا کر دونوں کے چہروں پر الجھن سی نظر آنے لگی تھی۔

''گولڈ...... ی...... دلہن بھی نہیں ہے اور چا...... چو بھی نہیں......'' وانیہ کو دونوں کی معصوم حرکتیں محظوظ کر رہی تھیں۔

''سنی...... گولڈی میں تو یہیں ہوں...... البتہ آپ کے چاچو نہیں ہیں یہاں......'' وانیہ ان کے سامنے آئی تو دونوں کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ دونوں ہی اس سے متاثر تھے۔

"ارے، آپ اکیلی ہیں...... آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا۔" سنی نے بڑے پن سے پوچھا تو وانیہ کے چہرے پر ہنسی سی آگئی۔ جسے وہ خوب صورتی سے چھپا کر قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

"ہاں...... پہلے لگ رہا تھا اب تم دونوں آ گئے ہو تو نہیں لگ رہا۔"

"آپ کو پتا ہے چاچی...... مجھے بھی پہلے ڈر لگتا تھا۔"

"اچھا کیوں...... کس سے ڈر لگتا تھا؟" سنی کے بتانے پر وہ بیڈ کے سرے پر ٹک کر انہیں بازوؤں میں سمیٹ کر قریب کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"مجھے نائٹ میئرز آتے تھے۔"

"ہا...... ں مجھے بی......" گولڈی نے بھی فوراً تائید کی۔

"ارے...... بہادر بچے نائٹ میئرز سے تھوڑی ڈرتے ہیں۔" وانیہ نے انہیں باری، باری دیکھ کر حوصلہ دیا۔

"چاچو بھی یہی کہتے ہیں۔" سنی کی تائید و معصومیت پر اس نے بے اختیار اس کا گال کھینچا۔

"بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ ویسے بھی جو بچے سونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے سوتے ہیں انہیں ڈراؤنے خواب تنگ نہیں کرتے۔" وہ دونوں اس سے باتیں کرتے، کرتے اسے اپنے کمرے میں زبردستی کھینچ کر لے آئے تھے۔ وہ اسے اپنے کھلونے، گیمز، اسٹوری بکس دکھاتے ہوئے بے حد خوش تھے۔

"ثمی...... !تم یہاں بیٹھے ہو؟ تمہیں پتا ہے وانیہ کو بچے اپنے کمرے میں لے گئے ہیں۔" آپی نے اچانک آکر اسے نہ صرف چونکا دیا تھا بلکہ اپنی سرزنش سے اسے شرمندہ بھی کر دیا تھا۔ "معصوم بچوں تک کو احساس ہے کہ دلہن کو اتنی دیر تک تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔" وہ ان سے کیا کہتا۔ اپنی کشمکش سے نکلتا تو کچھ سوچتا۔

"وہ بس...... جا ہی رہا تھا آپی......" اس نے جانے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ آپی نے بے یقینی سے اسے پکارا۔

"ثمی...... تم اسموکنگ کرنے لگے ہو......؟" ان کے استفسار میں دکھ، افسوس، ملامت سبھی کچھ شامل تھا۔ وہ نظریں جھکا گیا۔ آپی کی نظریں ایش ٹرے پر تھیں۔

"آپی ٹینشن میں...... کبھی، کبھی......" وہ مزید نہ بول سکا۔

"اچھا جاؤ...... وانیہ بھی انتظار کر رہی ہے، بچوں کو بھی سونا ہوگا...... ان کی عادتیں بھی تم نے بگاڑی ہوئی ہیں اور اپنی بھی......" آپی کی بڑبڑاہٹ اسے اپنے پیچھے سنائی دی تھی۔

وانیہ بچوں کے ساتھ کسی بات پر ہنس رہی تھی جب ثعلب کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بچوں کے بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ چہرے پر دوپٹے کا ہالہ سا بنا تھا۔ اسکائی بلیو جدید طرز کے لہنگا سیٹ میں وہ واقعی آسمانی حور دکھائی دے رہی تھی۔ جس کے چہرے پر نور بھی تھا اور ملاحت بھی...... ثعلب کی آہٹ پر وہ یک دم بوکھلا کر کھڑی ہوئی تھی اس پر بچے تو حیران تھے ہی ثمی بھی متوجہ ہو گیا۔

"پلیز...... بیٹھو...... بیٹھو...... تم کھڑی کیوں ہو گئیں۔" ثمی کی بے تکلفی اس بات کی غماز تھی کہ وہ اپنے دل و ذہن کو کنٹرول کر چکا ہے۔

"چاچو...... چاچی کو ڈر لگ رہا تھا۔ ہم چاچی کو اس لیے اپنے روم میں لے آئے۔" ثمی کو دیکھتے ہی دونوں بچے اس کی طرف لپکے تھے اور پھر اسے کھینچتے ہوئے وانیہ کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

"اچھا...... انہیں کیوں ڈر لگ رہا تھا۔ کوئی بھوت دیکھ لیا تمہارا روم میں؟" ثمی نے شرارت سے کہتے ہوئے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ لرزتی پلکیں لیے سر جھکائے کھڑی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیوں کو مروڑنے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس کی موجودگی میں پزل ہو گئی ہے۔

"نہیں ناں چا...... چو، یہ فرسٹ ٹائم ہمارے گھر آئی ہیں اس لیے نروس ہو رہی تھیں۔" سنی نے سمجھداری کا

ثبوت دے کر وانیہ کو بھی حیران کر دیا۔ وہ اسے دیکھنے لگی وہ کس، کس محبت سے اس کا دفاع کر رہا تھا۔

"وسنی، گولڈی مائی سوئٹ ہارٹ اب سونے کی تیاری کرو..... صبح ٹائم سے نہ اٹھے تو پھپو ناراض ہوں گی۔" ثعلب نے کہنے کے ساتھ انہیں پکڑ کر بستر پر لٹایا بھی۔

"پر چاچو ابھی تو چاچی سے اسٹوری بھی سنی ہے۔" دونوں مچلے۔

"یہ بات تو کر نہیں رہیں۔ تمہیں اسٹوری کیسے سنائیں گی۔ دیکھو یہ کل سے اسٹوری سنائیں گی آج چاچو سے سن لو....." ثمی نے بہ مشکل انہیں قائل کیا..... وہ بچوں کو بہلا رہا تھا۔ اور وانیہ پھر سے اپنے احساسات میں الجھی ہوئی تھی۔ ثمی کی میٹھی نظریں اور دل آویز باتیں گو کہ اس کے اندر بھی ہلچل مچا چکی تھیں۔ اس کے اندر نئے، نئے جذبے جگا چکی تھیں۔ محبت کی دھیمی آنچ اس کے دل میں جل اٹھی تھی مگر وہ خوفزدہ تھی، ثعلب کی گزشتہ محبت سے..... اسے خود پر اپنی وفا پر بھروسا تو تھا کہ وہ ثعلب کی زندگی میں ہی نہیں اس کے دل میں بھی مقام پالے گی مگر ثعلب کے بارے میں وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنی محبت کو اس کی خاطر بھلاتا بھی ہے یا نہیں..... اس کی وفا پر اپنی وفا نثار کرتا ہے یا نہیں۔

"اے..... چلو اپنے روم میں....." کانوں کے قریب گرم سانسوں کے ساتھ ثعلب کی سرگوشی کے احساس نے اسے یک دم چونکا دیا تھا۔ اسے ایک دم یاد آیا تھا کہ وہ دلہن بنی وہاں موجود ہے۔

"کیا..... سوگئی تھیں.....؟" ثمی نے اس کی بوکھلاہٹ پر پوچھا۔

"نہ..... نہیں تو....." وہ یک دم کھڑی بھی ہوگئی تھی۔

"اوکے..... تم روم میں چلو..... میں لائٹ آف کر کے آرہا ہوں۔" وانیہ ہولے سے سر ہلا کر بھاری لہنگا سنبھالتی پہلے دروازے تک گئی اور پھر مڑ کر بچوں کے بیڈ کے قریب آگئی۔ ثعلب اس کی حرکت پر حیران سا سوئچ بورڈ کے پاس کھڑا رہ گیا۔ وہ بچوں پر جھکی ان پر کمبل درست کرتی ان کی پیشانی کو نرمی سے چھوتی بالکل تمکین بھابی کا عکس لگ رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں نئے انداز میں دھڑکنے لگی تھیں۔ وانیہ درمیانی دروازے سے کمرے میں چلی گئی تھی اور وہیں ثمی کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

"شکر ہے بچی اپنے گھر کی ہوئی..... میرا دل بے حد مطمئن ہے، کریم....." کریم احمد بیٹی کی رخصتی کے بعد بہن کے گھر ہی رہ گئے تھے۔ دل مطمئن ہو کر بھی بے چین تھا۔ وانیہ کی سسکیاں کانوں میں اب تک گونج رہی تھیں۔ وقتِ رخصت وہ ان سے لپٹ کر روئی تھی اور ٹوٹ کر روئی تھی۔ دونوں بہن، بھائی دیر تک جاگ کر وانیہ کے بارے میں گفتگو کر کے ایک دوسرے کو تسلیاں دے رہے تھے۔

"ہاں، آپا..... سکون تو مجھے بھی ملا ہے مگر اس کا رونا پریشان بھی کر رہا ہے۔"

"افوہ..... اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے، بچیاں ماں، باپ کے گھر سے رخصت ہوتے وقت اسی طرح روتی ہیں، آخر برسوں کا ساتھ ہوتا ہے..... بعد میں سنبھل جاتی ہیں۔ یہی دستور ہے۔"

"پھر بھی آپا..... مجھ سے زیادتی تو بہرحال ہوئی ہے، خدیجہ کے بعد میں چار دن بھی اپنی بچی کی ذمے داری نہ اٹھا سکا۔ یہ بوجھ وہ دل پر لے کر گئی ہے۔ کاش، طاہرہ ہٹ دھرمی نہ دکھاتی تو میں اپنی بیٹی کو باقی اولادوں کی طرح اپنے گھر سے ہی رخصت کرتا۔" کریم احمد کو ملال رنجیدہ کیے ہوئے تھا۔ سعیدہ خانم نے چھوٹے بھائی کو رنجیدہ دیکھ کر حوصلہ دیا۔

"اب ان باتوں کو سوچ کر افسوس کرنے کا کیا فائدہ..... بچی اپنے ہی گھر سے رخصت ہوئی ہے، تمہیں کچھ کمی لگی ہے تو بتاؤ۔ صبیحہ نے کوئی کسر تو نہیں چھوڑی..... بس اب دعا کرو بیٹی اپنے گھر میں عزت اور سکون سے رہے۔"

"آپا کوئی کمی نہیں تھی..... میں تو آپ کا شکریہ بھی نہیں ادا کر سکا۔ آپ نے میری ذمے داری کو اپنے

کندھوں پر لے کر نبھایا ہے اور خوب نبھایا ہے، مجھے امید ہی نہیں یقین بھی ہے وانیہ وہاں خوش وخرم رہے گی۔''

''آمین! ایسا ہی ہوگا..... انشاء اللہ.....'' سعیدہ خانم نے تائیدی انداز میں بھائی کو مطمئن کیا۔

☆☆☆

وہ کمرے میں داخل ہوا تو وانیہ پانی کا گلاس لبوں سے لگا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ گلاس واپس رکھنے لگی تو ثمی نے اسے ٹوکا.....

''پانی پیو..... مجھے دیکھ کر پریشان کیوں ہوجاتی ہو۔''

''نہیں..... میں.....'' وہ کچھ نہ کہہ پائی تو ثمی نے بلا توقف اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے پانی پینے کا اشارہ کیا..... وانیہ نے دو تین گھونٹ پانی پیا اور پھر گلاس ہاتھوں میں تھام لیا۔ جسے ثمی نے اگلے ہی لمحے اس سے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اب ثمی کی نگاہ اس کے حنائی ہاتھوں پر تھی جو آپس میں الجھے ہوئے تھے۔

''وانیہ آر یو آل رائٹ.....؟ کیا بات ہے، پریشان ہو.....؟'' ثمی کی نرم بوجھل آواز، اس کے قرب کی حدت وانیہ کے لیے نئے کیف سے آشنائی تھی، وہ بس سر ہلا کر خود میں سمٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ چوڑیوں کی کھنک، آنچل کی سرسراہٹ، پازیب کی چھنک نے ماحول کی خاموشی میں سروں کا سا ارتعاش پھیلا دیا تھا۔ ثمی نے بے اختیار ہی اس کا حنائی ہاتھ تھام کر اپنی مٹھی میں قید کیا اور خود اس کے پاس کہنی کے بل نیم دراز ہوکر اس سے پوچھنے لگا۔

''مجھے معلوم ہے، تم میری وجہ سے پریشان ہو، تمہیں آپی نے رومی کے بارے میں بتایا ہوگا، تم اسی کے حوالے سے دل میں ہزار الجھنیں لیے ہوئے ہو، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں.....؟'' اس نے وانیہ کی مٹھی میں قید ہاتھ محبت آمیز دباؤ کے ساتھ مزید جکڑا..... وہ بالکل ٹھنڈی ہورہی تھی، دل کی دھڑکن مدھم ہوکر بھی کانوں میں بجتی سنائی دے رہی تھی۔ جانے وہ کیا کہنے جا رہا تھا۔

''سنو..... رومانہ اب میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے، ماضی کی ایک تلخ یاد کے سوا..... میرے لیے اب تم اہم ہو..... بحیثیت شوہر میری وفا، میری محبت پر صرف اور صرف تمہارا حق ہے اور رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہمیشہ میرا اعتبار کروگی۔'' ثمی نے دل کی گہرائی میں اپنے سابقہ عشق کو ابھی اسی لیے دفنا کر وانیہ سے عہد وفا داری نبھانے کا ارادہ کیا تھا۔ تبھی اس کے دل سے نکلی باتیں وانیہ کو بھی متاثر کر رہی تھیں۔

''کروگی ناں میرا اعتبار.....؟'' وہ بصد اصرار پوچھ رہا تھا۔ ''سنو شوہر اور بیوی کے درمیان تعلق اعتبار و اعتماد کی بنیاد پر ہی قائم رہتا ہے۔'' وانیہ بھی یک دم سنبھل گئی۔ وہ اس کی طرف سے یہی ایقان تو چاہتی تھی۔ سر ہلا کر بولی۔

''مجھے آپ پر اعتبار ہے اور میں ہمیشہ کروں گی، بس آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں۔'' ثعلب کو اس کا اس اعتماد سے بولنا خوشگوار حیرت میں مبتلا کر گیا۔

''کیسا وعدہ.....؟'' ثمی نے سیدھا ہوکر بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ بھی کچھ سہولت سے بیٹھ گئی۔

''یہی کہ آپ رومانہ کو بھول جائیں گے۔'' ثمی نے اسے ناسمجھی سے دیکھا۔

''میں اسے بھول چکا ہوں۔'' ثمی نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی تو وہ قطعیت سے بولی۔

''نہیں ابھی آپ اسے نہیں بھولے۔''

''یقین کرو..... میں اسے بھول چکا ہوں، میں نے کبھی اسے چاہا تھا مگر اب اس سے نفرت کرتا ہوں، اس کی میری زندگی میں کوئی اہمیت ہے نہ گنجائش..... تم مجھے آزما لو.....'' وانیہ اس کے الجھے حواسوں کو دیکھ رہی تھی۔ یقین دلاتا ثعلب فاران واقعی سچ بول رہا تھا۔

''میں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ آپ اسے نہیں بھولے..... انسان محبتیں تو آسانی سے فراموش کردیتا ہے یا کسی اور کی محبت پہلی محبتوں پر حاوی ہوکر زیر کر لیتی ہے مگر کسی کی نفرت دل میں بس جائے تو پھر اسے دبانا، مٹانا اختیار میں نہیں رہتا۔ ہم جتنی شدت

سے اس احساس سے نجات پانا چاہتے ہیں، وہ اسی شدت سے ہم پر حاوی رہتا ہے، ہمارے ذہن و دل پر وہی کرب مچلتا دھڑکتا ہے جو ہمارے مخالف نے ہمیں دیا ہوتا ہے۔'' وہ بول رہی تھی اور ممی یک ٹک حیران نظروں سے اسے تک رہا تھا۔

''میں چاہتی ہوں آپ اب رومانہ کو معاف کر دیں۔ اس کی خطا در گزر کر دیں۔ بھلا دیں کہ اس نے آپ کے ساتھ کچھ برا کیا تھا۔ اس کی مجبوری سمجھیں، اس طرح آپ مطمئن ہو جائیں گے اور دل و روح کو بھی قرار آ جائے گا..... اور پھر یقیناً آپ کو رومانہ کبھی یاد نہیں رہے گی۔ خواہ کسی بھی حوالے سے۔'' ثعلب نے اسے متاثر کن نظروں سے دیکھ کر گہری سانس لی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں، ایسا ہی ہوگا۔'' ممی نے اس کا ہاتھ پھر سے تھام کر عہدِ وفا کیا۔ ''میں ذہن و دل سے ہر تلخ یاد کو بھی مٹا دوں گا.....لیکن..... تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ ہمارے گھر میں پھیلی اداسیوں کو نئی خوشیوں کی فضا میں بدل کر اپنائیت و محبت کے رنگوں سے سجانا ہوگا۔ وفاؤں کے اجالوں سے ہماری زندگی میں پھیلے بے یقینی و ناامیدی کے اندھیروں کو دور کرنا ہوگا۔ تم بھی وعدہ کرو، وانیہ تمہارے لیے بھی اس گھر کا سکون، اس گھر کی خوشیاں اہم و مقدم ہوں گی۔''

''آپ نہ بھی کہتے، تب بھی میں ایسا ہی کرتی.....ایک عورت اپنی زندگی، اپنے گھر پر لٹا کر جو سکون حاصل کرتی ہے، اس کا اندازہ صرف ایک عورت ہی کر سکتی ہے، انشاء اللہ ہمارے گھر میں اب کسی غم کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آئے گی۔ میری محبت، میری وفا میں آپ کبھی کمی نہیں پائیں گے۔'' وانیہ کا تجدیدِ عہد ثعلب کو نئی سرشاری دے گیا۔ اپنی حیرت کو شوخی میں چھپا کر بولا۔

''یا.....ر.....تم واقعی اس صدی کی لڑکی ہو.....؟ میں تو تمہیں بالکل عام سی لڑکی سمجھ رہا تھا۔ اسی لیے تو کمرے میں آنے سے ڈر رہا تھا کہ تم سے جیسے ہی رومانہ کے حوالے سے بات کروں گا۔ تم ننانوے فیصد لڑکیوں کی طرح پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاؤ گی۔ مگر تم تو واقعی بہت خاص چیز نکلی ہو.....آپی صحیح پبلسٹی کرتی رہی ہیں تمہاری۔'' وانیہ نے اس کی شرارت پر ذرا پیچھے ہوتے ہوئے مصنوعی سنجیدگی سے اسے باور کرایا۔

''میں بالکل بھی خاص واص نہیں ہوں، یاد رکھیے گا، میں بھی عام سی لڑکی ہوں، اپنے گھر اور فیملی کے لیے بہت پوزیسو.....روز، روز رومانہ کا ذکر نہیں سن سکتی۔ اس لیے پہلے روز ہی قصہ ختم کرنا چاہتی ہوں تاکہ آئندہ ہمارے درمیان یہ ٹاپک ہی نہیں چھڑے...... وہ ماضی میں آپ کے لیے کیا تھی کیا نہیں..... وہ قصہ ختم ہو چکا.....اسی لیے میں ماضی کے قصوں سے اپنی زندگی اور اپنا گھر خراب نہیں کر سکتی..... آپ سے بھی چاہتی ہوں کہ آپ ماضی کے بجائے حال میں رہنا سیکھیں۔ مستقبل کی فکر کریں۔'' وانیہ بولی تو بولتی چلی گئی۔ ممی نے تالی بجا کر شرارتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''واہ.....واہ.....یار تم تو بہت اچھا بولتی ہو، کالج ڈیبیٹس میں کتنی ٹرافیاں جیتی ہیں؟'' وانیہ کو یک دم احساس ہوا وہ شادی کی پہلی رات میں ہی کیا کچھ بول گئی۔ خجالت سے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''کسی دلہن کو پہلی بار میں نے اتنا اچھا بولتے سنا ہے، ویل اچھا مشورہ ہے، عمل ہو سکتا ہے اور پھر جس کا حال اتنا خوب صورت ہو، وہ کافر ہوگا جو ماضی میں جھانکے۔'' ممی نے اسے مزید شرمندہ کرنے کے ساتھ شریری جسارت کرتے ہوئے قریب ہو کر سرگوشی کی تو وہ اسے شرمگیں انداز میں دھکیل کر رہ گئی۔

وانیہ نے چاہتوں کی سرزمین پر اپنی محبت کا بیج بو کر یقین و وفا سے آبیاری کی تھی۔ اسے اعتماد تھا آنے والے موسم میں یہی بیج مضبوط پیڑ کی طرح اس گھر کے ہر فرد کو زندگی کی وہ انمول خوشی دے گا جو اُن سے غم کے کسی موسم میں چھن گئی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی غم کے بعد خوشیاں گھر کے آنگن میں رقصاں ہیں اور ممی بھی ان کے ہم قدم ہے۔

(باقی آئندہ)

نفرت کے راستے

فرح حسین عثمان

''کون آیا ہے؟'' فہمیدہ بیگم کی سوالیہ کھوجتی نظریں زارا کے چہرے پر گڑی تھیں۔ کچھ تھا جو مختلف تھا، ان کی چھٹی حس انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی۔ ایسے رنگ اور خوشی کے یہ تاثرات جو اس وقت ان کو زارا کے چہرے پر دکھائی دے رہے تھے وہ ٹھٹک گئی تھیں۔

فہمیدہ بیگم اسٹور سے کچھ سامان نکالنے گئی تھیں۔ چھٹی کا دن تھا۔ اتنے میں لاؤنج سے آتی آوازوں کی طرف متوجہ ہوئیں یقیناً کوئی مہمان آیا تھا جس کے لیے زارا بڑے اہتمام سے جوس بنا رہی تھی۔

اور پھر سامنے اطہر کو بیٹھا دیکھ کر وہ چونک گئیں۔

''آئیں، آئیں فہمیدہ بیگم، اطہر آیا ہے اس کی جاب ہوگئی ہے مٹھائی کھلانے آیا ہے۔''

یہ دوسرا جھٹکا تھا جو فہمیدہ بیگم کو لگا۔ ایک تو ان کا دماغ زارا کے خوشی سے بھرپور چمکتے چہرے میں الجھا ہوا تھا۔ ''اگر اس خوشی کی وجہ اطہر تھا تو......'' فہمیدہ بیگم کچھ سوچ کر رہ گئیں۔ اور دوسرا شدید جھٹکا ''اطہر کی جاب...... کیسے......؟ اور کیوں؟ اور وہ بھی اتنی جلدی کیوں؟''

سوالات ان کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے وہ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ تو گئی تھیں لیکن وہاں پر جاری گفتگو میں شریک نہیں ہو پا رہی تھیں۔ دماغ جو بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ریاض صاحب بھتیجے کی خوشی میں خوش بیٹھے تھے اور ان کی بیگم سے یہ خوشی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

زارا... کینو کا فریش جوس بنا کر لے آئی تھی۔ اس کے چہرے پر شرم و حیا کے ساتھ خوشی کے رنگ بھی واضح تھے جبکہ اطہر کافی سنجیدہ رہا۔ اور اب اس کے یہاں سے ٹل جانے تک فہمیدہ بیگم یہاں سے ہلنے والی نہیں تھیں۔

اطہر، چچا کو حال احوال بتا رہا تھا اور فہمیدہ بیگم سوچے جا رہی تھیں کہ آخر ملی کیسے اس کو اتنی اچھی جاب اور وہ بھی بغیر کسی سفارش کے...... آج کل کے دور میں بغیر رشوت اور سفارش کے صرف اپنی قابلیت کی بنیاد پر جاب مل جانا حیرت کی بات تھی اور دیورانی، نایاب بھی کتنی خوش ہوگی۔

نایاب کا خیال آتے ہی فہمیدہ بیگم کا حلق تک کڑوا ہونے لگا۔ اس کے مشکل میں ہونے کی خبر آتی تو ان کو سکون بھی ملتا لیکن یہاں تو نایاب کامیاب ہو رہی تھی۔

''کیا ہوتا اگر پہلے منیب کو جاب مل جاتی آخر منیب بڑا ہے اطہر سے۔'' منیب، فہمیدہ بیگم کا بڑا لڑکا تھا۔ فہمیدہ بیگم جن کا میکا بہت مالدار تھا جبکہ نایاب، وہ تو بہت عام اور غریب سے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ انتہائی کم تر۔ اور معمولی سا جہیز آیا تھا اس کے ساتھ۔ ہائے لیکن آج کون گواہ تھا جو فہمیدہ بیگم کی اس بڑائی کا یقین اوروں کو دلاتا۔ وہ کڑھتی جا رہی تھیں۔

''اچھا، میں چلتا ہوں اب......'' اطہر اپنی بات مکمل کر کے جانے لگا۔ اجازت دینے لگے ''شخصیت میں کیسا نکھار آگیا ہے اچھی تعلیم اور اب اچھی جگہ نوکری ہے۔'' انہوں نے دل ہی دل میں بادل ناخواستہ سراہا مگر لبوں سے کچھ نہ نکلا۔ حتیٰ کہ فہمیدہ بیگم اس کو مبارک باد بھی نہ دے پائیں اس نے بھی شاید محسوس نہ کیا ہو کیونکہ پہلے کب وہ بات

کرتی تھیں اس سے جواب کرتیں۔ فہمیدہ بیگم کے اس رویے کا تو اطہر عادی تھا۔

''ارے بیٹا کھانا کھا کر جانا۔'' ریاض صاحب نے دل سے آفر کی۔

''نہیں چچا جی، چلتا ہوں، دیر ہو گئی ہے، امی، ابو انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''بہت سلجھے ہوئے طریقے سے بات کرنے لگا ہے، شاید پہلے سے ایسا تھا یا میں نے ہی کبھی غور نہیں کیا۔'' فہمیدہ بیگم کی سوچیں ان کو بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھیں۔

جاتے ہوئے وہ دونوں کو اللہ حافظ کہتا ہوا چلا گیا۔ فہمیدہ بیگم کے تنے ہوئے چہرے پر کچھ ٹھہراؤ آ گیا۔

''بڑا قابل بچہ ہے ماشاءاللہ، محنتی بھی ہے، سوبر بھی...... اور ایک ہمارا منیب ہے...... کوئی ذمے داری کا احساس ہی نہیں۔'' ریاض صاحب نے تبصرہ کیا۔



ہر دن میری سالگرہ کا

ٹرن.....ٹرن.....ٹرن...... مابدولت حاضری کی اجازت چاہتی ہیں۔ والد صاحب نے نام نصرت جبیں ملک رکھا۔ نک نیم کوئی نہیں تھا سو یہ حسرت لے کر ہی ہم دل میں جائیں گے۔ دو بھائیوں اور ایک بہن سے بڑی ہوں یعنی کل چار ہیں۔ سب سے بڑے ہونے کی سعادت حاصل ہے۔ تعلیم ڈبل ایم اے اور ایم ایڈ اسپیشل سیکنڈری ایجوکیشن ہے۔ آج کل ایک سرکاری اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہوں لیکن رعب نام کو نہیں کیونکہ اپنے سے سینئرز ٹیچر پر سربراہی کرنا بڑا جان جوکھوں کا کام ہے اور ہماری سخاوت دیکھیے کہ یہ سیٹ چھوڑنے کو ہمہ وقت تیار ہیں کیونکہ اتنی ذمے داریوں میں اپنے اندر کی لکھاری کا دم گھٹتا سا محسوس ہوتا ہے۔ لکھنے کا آغاز بہت بچپن میں پھول اور کلیاں، ملتان اور پھر ماہنامہ پھول لاہور سے کیا۔ اس کے ساتھ نوائے جوہر اور عوامی رائے، سرگودھا اور ڈیلی جناح، لاہور میں آرٹیکل بھی لکھے پھر ایک خاندانی جٹ سے شادی ہوگئی۔ یہ کسی فلم کا نام نہیں بس فرق یہ ہے کہ پہلے میاں جی کو طنزاً جٹ کہتے تھے پھر جب انہی سے شادی ہوگئی تو پیار سے جٹ کہتے ہیں مگر اس جٹ صاحب نے ہماری خواہش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خود کو کافی تبدیل کر دیا ہے۔ بھئی کان اِدھر لائیں...... یہاں بھی ہماری استادی کام آئی ہے۔ بس مار نہیں پیار والا تڑکا لگایا ہے۔ اور ابھی انہیں تبدیلی

''بس کردیں...... آپ کو تو موقع چاہیے اپنے بیٹے کی برائی کرنے کا۔ اب اطہر اتنا بھی قابل نہیں کہ اس کا مقابلہ میرے بیٹے سے کریں۔'' فہمیدہ بیگم کو بھڑاس نکالنے کا موقع مل ہی گیا۔ موڈ تو ان کا بہت ہی خراب تھا۔ اب مزید بگڑ گیا۔

''امی، بریانی بنالوں؟ ارے کیا اطہر چلا گیا؟'' زارا جو کھانے کا پوچھنے آئی تھی اطہر کے ایک دم چلے جانے پر بجھ سی گئی اور حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

''کیوں، نہ جاتا گھر اپنے؟ یہیں رہ جاتا کیا؟'' اب توپوں کا رخ زارا کی طرف تھا۔

''امی کھانے کا ٹائم ہے، کھا کے چلا جاتا میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی۔'' زارا گڑبڑا گئی۔ بولنا تو ریاض صاحب بھی چاہتے تھے لیکن مصلحتاً خاموش رہے کہ پہلے ہی بیگم کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

''ایک تو یہ دونوں بچے میرا سر شرم سے جھکا رہے ہیں، منیب کو تو کوئی ہوش نہیں ہے، تعلیم کی کوئی فکر نہیں...... جاب تو دور کی بات وہ بی اے میں ہی پاس ہوجائے تو میں شکرانے کے نوافل پڑھوں گی۔ کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتی چار سال میں ایف اے کیا۔ اب بی اے میں سالوں لگائے جا رہا ہے۔ نظر لگی ہے میرے شہزادے جیسے بیٹے کو۔ چھوٹا تھا تب سے ہی سب جلتے تھے۔ میری بھابیاں بھی اور یہ نایاب بھی جلتی تھی میرے بیٹے سے اسی لیے تو دور چلی گئی۔'' وہ خود کو تسلی دینے لگیں کہ وہ ہی سب سے اعلیٰ ہیں اور باقی سب ان سے جلتے ہیں ان کی خوب صورتی سے، ان کے اعلیٰ خاندان سے اور خوب صورت بیٹے سے۔

بیٹے کے معاملے میں بولنے کا حق تو انہوں نے شوہرِ نامدار کو بھی نہیں دیا تھا اور منیب نے شاید اسی لاڈ پیار سے خوب فائدہ بھی اٹھایا تھا۔

دوستوں کی محفلیں اور گھومنا پھرنا ہی اس کی زندگی کے اہم مقاصد تھے اور اس کے پیچھے امی کی ایسی مضبوط ڈھال موجود تھی تو اس کو کوئی کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا پھر اسے کوئی پروا ہو بھی تو کیوں...... اور فہمیدہ بیگم اب کھٹکنے لگی تھیں منیب کے پاس مہنگا ترین موبائل اور بائیک اب خود ان کو بھی کھٹکنے لگی تھی لیکن اب شاید پانی سر سے گزر چکا تھا۔ کاش وہ ریاض صاحب کو منیب کی تربیت کے معاملے میں ایسے بے دخل نہ کرتیں تو آج معاملہ مختلف ہوتا لیکن یہ ان کی اپنی سوچیں تھیں کسی اور کے سامنے شکست تسلیم کر لینے والی وہ ہرگز نہیں تھیں۔ سو

کے ایک اورا نجیکشن کی ضرورت ہے کیونکہ انہوں نے ہمیں اخبارات اور ڈائجسٹ میں لکھنے کی اجازت تو دے رکھی ہے مگر ہماری منتخب شدہ کالم اور ناول کی کتابی صورت میں اشاعت پر ان کو اعتراض ہے کہ اس طرح ہماری شخصیت نمایاں ہو جائے گی مگر دل تو بچہ ہے جی..... کے مصداق ہم ان کے بچہ نما دل کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں دو لوگ میرے مددگار ثابت ہو رہے ہیں ایک میرے پیارے چھ ماہ کے بیٹے محمد عبداللہ کی کلکاریاں اور دوسرے انجم باجی کے مجھے فون پر کہے گئے یہ جملے کہ عورت خواہ کتنی ہی کامیاب کیوں نہ ہو اس کے لیے سب سے بہتر اور معتبر رشتہ اس کا بیوی اور ماں کا ہوتا ہے اور میں روز تھوڑا تھوڑا میاں جی کے کانوں میں یہ الفاظ ڈالتی ہوں کہ بھروسا رکھیے ان دونوں رشتوں کا تقدس مجروح نہیں ہوگا۔ آپی اب آتے ہیں یادگار سالگرہ کی طرف تو وہ میری شادی کی پہلی سالگرہ تھی جو 5 دسمبر 2011ء کو منائی تھی میں نے ... اورنج اور براؤن کلر کا خوب صورت سوٹ پہنا تھا۔ اس میں ہم گھر والوں کے علاوہ میری کزنز نے بھی بھرپور شرکت کی تھی اور یہ خوب صورت تقریب رات گئے تک جاری رہی تھی مگر میں یہ بات ہر ممکن سے کہہ سکتی ہوں کہ خوشی اور محبت کے ساتھ گزرا ہوا ہر دن سالگرہ جیسا ہی لگا کرتا ہے۔

از: نصرت جبیں ملک، ضلع خوشاب

اب بھی اپنی پرانی ڈگر پر قائم تھیں۔

فہمیدہ بیگم ہمیشہ سے ہی بہت کمانڈنگ قسم کی خاتون تھیں۔ ہر وقت دوسروں پر حکم چلاتیں۔ انہیں اپنے حسب نسب، خاندان پر بہت ناز تھا۔ سامنے والے کو خاطر میں ہی نہ لاتی تھیں۔ شادی کے بعد ساس سسر اور ایک دیور پر مشتمل سسرال ملی۔ ساس نے بڑی بہو کی حیثیت سے ان کو گھر سونپ دیا۔ یوں بلا شرکتِ غیرے وہ اس سلطنت کی مالکن ٹھہریں۔ ہر کام ان کی مرضی اور منشا کے مطابق ہونے لگا۔ دو ڈھائی سال سکون کے گزرے اور پہلا طوفان تب آیا جب ان کے دیور کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ فیض کی آمدنی ان کے شوہر سے کم تھی اور ان کی دلہن بھی انہی کے مطابق ڈھونڈی گئی۔ شادی کے بعد نایاب نے ڈرتے، جھجکتے سسرال میں قدم رکھا۔ ہر لحاظ اور ادب، آداب کے باوجود وہ فہمیدہ بیگم کی نظروں میں قصور وار ٹھہریں۔ کوئی ایسی خار اُن کے دل میں سمائی جو بعد میں نفرت کی شکل میں باہر آنے لگی۔

نایاب کے چہرے کا سکون ان کو بے سکون کیے دیتا تھا۔ فہمیدہ بیگم سمجھ نہ پاتیں کہ ایسا کیا ہے نایاب کے پاس کہ وہ اتنی پُرسکون رہتی ہے۔ ہر معاملے میں انہوں نے نایاب کو نیچا دکھایا۔ ساس نے اپنے آخری ایام میں فہمیدہ بیگم کو سمجھایا کہ نایاب تمہاری چھوٹی بہن کی طرح ہے...... بہت لحاظ کرتی ہے، بہت عزت کرتی ہے لیکن فہمیدہ بیگم کی مغرور اور ضدی طبیعت نہ بدل سکی۔ وہ سگی دیورانی کو حد درجہ حقیر جانتیں۔ اس کے آٹھ ماہ بعد سسر بھی وفات پا گئے۔ اب دونوں خواتین اپنے، اپنے بچوں میں بزی ہو گئیں۔ فہمیدہ بیگم کا بیٹا شکل صورت اور مزاج میں بھی ماں پر ہی گیا تھا اس کے بعد زارا تھی اور نایاب کے دو بیٹے اطہر اور اظہر تھے۔

فہمیدہ بیگم گھریلو معاملات میں انصاف نہ کر پائیں۔ آئے دن کے لڑائی، جھگڑے گھر میں ہونے لگے اور ریاض بھی بیوی کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تو دونوں بھائیوں نے آپس میں سکون سے بیٹھ کر فیصلہ کیا اور گھر کے دو حصے کر لیے۔ یوں نایاب اور فیض میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے...... اور ایک نسبتاً سستے علاقے میں انہوں نے اپنا گھر خرید لیا۔ یوں دونوں خواتین کا سامنا کم، کم ہی ہوتا تھا۔ بھائی البتہ ملتے رہتے تھے۔

☆☆☆

''جی باجی، میں زین اور شکیل سے بات کر کے

آپ کو بتاؤں گی، مجھے تو خوشی ہوگی زارا کو بہو بنا کے لیکن ابھی میں نے زین سے پوچھا نہیں اور شکیل کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے بس وہ چاہتے ہیں کہ فیصلہ زین کی پسند اور مرضی سے ہو تو اچھا ہے۔'' رضوانہ، فہمیدہ بیگم کی بہن تھیں اور کئی بار زارا کے بارے میں بات کر چکی تھیں۔ فہمیدہ بیگم کو تسلی ہوئی۔ بس یہی ایک امید تھی انہیں ورنہ ان کی بھابیاں تو اپنے بچوں کی منگنی اور شادی میں بس مہمانوں کی طرح ہی بلاتی تھیں اور اہم وجہ شاید یہ بھی تھی کہ سب فہمیدہ بیگم کے مزاج سے واقف تھے تو زیادہ میل جول نہیں رکھتے تھے۔

''چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔'' شام میں انہوں نے ریاض صاحب سے بھی بات کر لی زارا اور زین کے رشتے کی۔

''زین اچھا لڑکا ہے آپ کا بھانجا ہے لیکن فہمیدہ بیگم مجھے تو اطہر زیادہ پسند ہے، بہت ذمے دار لڑکا ہے۔'' ریاض صاحب نے ہمت کر کے اپنی پسند بھی بیوی کو بتا ہی دی۔

''توبہ کریں ریاض، آپ سے کبھی کچھ کہا اطہر کے والدین نے؟ ہم کہاں اس کی امید میں بیٹی بٹھائے رکھیں گے اور سوچیں بھی مت کہ ان کی بیگم صاحبہ اپنے بیٹے کا رشتہ لینے ہمارے گھر آئیں گی۔ بھاگے گی اپنے میکے، وہیں سے کوئی اپنے جیسا ڈھونڈ کے عجوبہ لائے گی۔'' دل کی بھڑاس نکالنے کا وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔ ''اور سن لیں میری بات... جیسے پہلے مٹھائی کا ڈبا آیا تھا ناں اب بھی ویسے ہی اس کی بات پکی ہونے کی مٹھائی آئے گی عنقریب...... دیکھیے گا آپ۔''

ریاض صاحب کو سننے کی عادت تو تھی ہی لیکن چھوٹی سی بات پر اتنا سننے کو مل جائے گا اتنی امید نہ تھی گڑبڑا کر خاموش ہو رہے۔

''ایک تو یہ باپ اور بیٹی دونوں اطہر کو پتا نہیں کیا سمجھ بیٹھے ہیں، کون سمجھائے انہیں۔'' ان کی بڑبڑاہٹ بہت دیر تک جاری رہی۔

☆☆☆

''سنیے، منیب کا کچھ کریں... قابو نہیں تک رہا آج کل، بتائیے دے رہی ہوں آپ کو۔'' فہمیدہ بیگم نے آخر ہمت ہارتے ہوئے... شوہر کی توجہ بیٹے کی طرف مبذول کرائی۔ اب واقعی ان کو مدد کی ضرورت تھی۔

''فہمیدہ بیگم مجھے تو یہ لڑکا کبھی ٹھیک سے کسی بات کا جواب دیتا ہی نہیں...... آپ کا لاڈلا ہے آپ ہی پوچھیں۔''

اب جب منیب بالکل لاتعلق ہو گیا تھا۔ پڑھائی سے بھی اور گھر سے بھی اب وہ ان کو اس معاملے میں بولنے کا یا پڑنے کا حق دے رہی تھیں۔

''میں تو کہتی ہوں کوئی دکان ہی کرا دیں اس کو...... کوئی تو ذمے داری اٹھائے۔'' فہمیدہ بیگم کو بیٹے کی نالائقی نے بہت دکھی کیا تھا۔

''یہ آپ کہہ رہی ہیں اپنے شہزادے کے لیے یقین نہیں ہوتا مجھے۔'' ریاض صاحب کی آواز میں ناکامی کا دکھ واضح تھا۔

''طعنے بعد میں دے لیجیے گا، غور کریں ذرا دکان والی بات پر۔'' کیا، کیا خواب دیکھے تھے انہوں نے بیٹے کے بارے میں سب ہی ٹوٹ گئے۔ شکر ہے زارا، منیب کے جیسی نہیں تھی ایک طرف سے سکون تو تھا ہی۔

☆☆☆

اپنے تئیں تو فہمیدہ بیگم نے منگنی کی تیاریاں شروع کر ہی دی تھیں لیکن رضوانہ نے دوبارہ کوئی فون نہیں کیا تو فہمیدہ بیگم قدرے پریشان ہوئیں۔ وہ زارا کو بھی بتا چکی تھیں زین کے رشتے کا، زبان سے تو اس نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن خاموش سی ہو گئی تھی۔

''پاگل ہے بالکل...... کہاں زین اور کہاں اطہر رضوانہ خوش رکھے گی اسے اور زین کو دیکھ کر سب کچھ

بھول جائے گی۔'' اپنی سوچ پر وہ خود ہی ہنسنے لگیں۔ اور دل ہی دل میں سوچ کر خوش ہو رہی تھیں کہ اب زارا کی سوچوں کا رخ انہوں نے موڑ دیا تھا۔

''چلو ایک مسئلہ تو حل ہوا۔''

☆☆☆

''باجی میں نے زین سے بات کی تھی وہ نہیں مانتا۔ اس نے تو ایک اور لڑکی کا نام میرے آگے رکھ دیا، آفس میں کام کرتی ہے اس کے ساتھ، وہ شادی کرنا چاہتا ہے اس سے، اب تو شکیل بھی اس کے ساتھ ہیں، اب ہم لوگ ادھر ہی رشتہ لے جانے کا سوچ رہے ہیں۔'' رضوانہ کی بات پر وہ چکرا ہی تو گئی تھیں۔

''لیکن رضوانہ تم تو کافی عرصے سے کہہ رہی تھیں مجھے۔''

''کیا کروں باجی، جوان اولاد ہے زبردستی تو نہیں کر سکتی ناں۔'' رضوانہ اپنی مجبوریاں بتانے لگیں۔ وہ ہفتے انتظار کے بعد انہوں نے فون کیا تو اس بات سے ان کا دل ہی ٹوٹ گیا...... کا جاہ و جلال اور شخصیت کا رعب سب کچھ کھو گیا کہیں۔

☆☆☆

''ہو جائے گی شادی بھی، میں نے رشتہ کروانے والی خاتون کو بلوا کر بات کی ہے ہو جائے کا رشتہ اتنی جلدی کیوں ہو رہی ہے آپ کو۔'' ریاض صاحب اور زارا ہی ان کا بے تحاشا چڑ چڑا پن سہہ رہے تھے۔ اب بھی وہ غلطی سے اسی مسئلے کے بارے بات کر بیٹھے تھے۔

''نہیں، مجھے تو کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں تو رضوانہ کے انکار پر حیران ہو رہا تھا۔ عرصے سے کہہ رہی تھیں تو کیا زین سے بات نہیں کی تھی۔ چلو خیر جس میں ہماری بچی کی بھلائی ہو۔'' بیگم کے مزاج کے آگے وہ دیر تک نہ پاتے تھے۔

''ہر کسی کی اپنی مرضی ہوتی ہے ریاض...... ہر کوئی آزاد ہے اپنے فیصلوں میں، ہم زور زبردستی نہیں کر سکتے۔'' ان کے الفاظ پر وہ چونک گئے تھے۔

اب تک تو وہ زور زبردستی ہی کراتی آئی تھیں۔ اب کیسے ایسی بات کر رہی تھیں۔

خیر منیب نے بری طرح دکھی کیا تھا ماں کو وہ بھی اہم وجہ تھی، ان کے مزاج میں تبدیلی لانے کی۔

''منیب کو اچھی نوکری ملتی تو کیسے ہلا کے رکھ دیتیں فہمیدہ بیگم سب کو......'' ریاض صاحب صرف سوچ کر رہ گئے۔

☆☆☆

رشتے کرانے والی خاتون کی کوششوں سے ان کو اطمینان نہ ہوا۔ بیٹی کا فرض پورا کرنا اب ان کو دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا اپنے مزاج کے ہاتھوں وہ ویسے ہی بہت سوں سے بگاڑ چکی تھیں۔

زارا کے معاملے میں سوچنے لگتیں تو اطہر ہی ان کو سب سے بہتر لگتا...... سلجھا ہوا اور وضع دار لڑکا۔ ''تربیت تو نایاب کی ویسے ہے زبردست۔'' دل ہی دل میں اقرار بھی کیا۔ ''لیکن زارا کو اس کا رشتہ ملنا ناممکن ہے اور جو رشتے اس خاتون نے بتائے ان سے دل گھبرا جاتا ہے۔ اللہ جانے کیسے لوگ ہوں گے، کیسا سلوک کریں گے میری بچی کے ساتھ۔'' وہ ہولنے لگتیں۔

اہم ذمے داریاں تو اب ان کے سر پہ پڑی تھیں۔ ورنہ تو وہ اپنی بڑائی کے زعم میں خوش تھیں ''خیر جو نصیب میں ہوا وہ ہی ہوگا۔'' وہ سوچتیں۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا، منیب بھی اتفاق سے گھر پر ہی تھا کہ فیض اور نایاب مٹھائی کے ٹوکرے لیے خوشی، خوشی گھر میں داخل ہوئے اور فہمیدہ بیگم کو لگا کہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ شادی کا ہی بتانے آئے ہوں گے اطہر کی۔ فہمیدہ بیگم بجھے دل کے باوجود بہت خوش دلی سے ملیں۔ خیر، خیریت حال احوال کے بعد نایاب

بتانے لگیں۔

''بھابی بہت عرصے سے آپ کے پاس آنے کا سوچ رہے تھے، آپ بڑی ہیں مجھے آپ کو بڑا ماننا چاہیے تھا لیکن میں اپنی گھر گرہستی میں ایسی مصروف ہوئی کہ آنا جانا تو بالکل ہی ختم ہو کر رہ گیا۔'' نایاب آہستہ آہستہ فہمیدہ بیگم سے کہہ رہی تھی۔

''میری غلطی ہے، کوتاہی ہے، میں مانتی ہوں آپ بڑی ہیں، بڑا دل ہے آپ کا......آپ ہمیں معاف کر دیں۔''

فہمیدہ بیگم حیرت اور شرمندگی سے انہیں دیکھ رہی تھیں کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

''آپ یقین کریں بچوں کی پڑھائی اور غمِ روزگار میں ایسے پڑے کہ بس آج کل کے جو حالات ہیں اس میں رہ کر کم آمدنی میں سب کچھ کرنا۔ سو سکے تھے لیکن اپنی بساط سے بڑھ کر بچوں کو تعلیم دلائی...... میکے بھی سالانہ چکر لگتا ہے، یہاں کا بھی راستہ بھول گئی تھی۔ بس خیریت کی خبر مل جاتی تھی تسلی ہوتی رہی۔ اب اللہ کا شکر ہے فصل سمجھیں پک کر تیار ہو گئی۔ اطہر کی تعلیم پوری ہو گئی اسے نوکری مل گئی اب تو اظہر کا بھی آخری سمسٹر ہے۔ اب سمجھیں میں ہوش میں آئی ہوں اور سرخرو ہوئی ہوں اپنی نظروں میں۔''

ہوش میں تو ان کی باتوں سے فہمیدہ بیگم آئی تھیں۔ نایاب نے اپنا سارا وقت اولاد اور گھر گرہستی کو دیا تھا بھی تو فخر سے بیٹھی تھیں اور کتنی پرسکون بھی......اور فہمیدہ بیگم دوسروں کی زندگیوں میں مداخلت کرتے، کرتے سارا وقت برباد کر بیٹھی تھیں۔ تمام روپے پیسے کے باوجود ان کا بیٹا تعلیم مکمل نہ کر پایا تھا۔ وہ شرمندگی سے دیورانی کو دیکھے جا رہی تھیں۔ نایاب کی باتیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں وہ ایک سانس بھر کر پھر بولیں۔

''اب اطہر کی شادی کا ارادہ کیا تو یقین کریں پہلا خیال مجھے زارا کا آیا۔ یہ آئی تھی عید پر ریاض بھائی کے ساتھ تو مجھے بہت پسند آئی اور بس زارا کو دیکھنے کے بعد کوئی لڑکی جچتی نہیں تھی نظروں میں۔ ڈرتی تھی میں آپ سے کہ کس طرح بات کروں کہیں آپ ناراض ہی نہ ہو جائیں لیکن اب فیض نے کہا کہ آج تو بھابی کو راضی کر کے ہی آئیں گے۔'' وہ جیٹھانی کا ہاتھ تھامے حالِ دل بیان کر رہی تھی۔

''اور دیکھیں اب ہم آ گئے۔'' فہمیدہ بیگم حیران تھیں اور باقی سب بے حد خوش...... بھی بہت خوش لگ رہا تھا۔

''اطہر سے بات کی تو اس نے بھی یہی کہا کہ جہاں آپ کی مرضی ہو وہی میری پسند ہو گی۔''

نایاب کے چہرے کے سکون میں وقت کے ساتھ، ساتھ اضافہ ہی ہوا تھا آنکھیں خوشی سے روشن تھیں وہ تو خوب صورت ہو آئی تھی۔ فہمیدہ بیگم کو دل ہی دل میں اقرار کرنا پڑا۔

''بھابی آپ کا کیا خیال ہے، ہمیں ہماری بیٹی کے لیے ہاں کر دیں ناں......'' کتنا بڑا دل تھا نایاب کا اور بڑا پن بھی اسی نے ہی دکھایا تھا۔ تبھی تو چہرے پر سکون واطمینان تھا اس کے......وہ جھک کر بھی اونچی اور خوش قسمت رہی تھی۔ آج بھی اگرچہ سوالی بن کر آئی تھی نایاب لیکن ان کی پریشانی ختم کر دی تھی۔

''مجھے خوشی ہو گی اس رشتے سے اور نایاب تمہارا بھی شکریہ......تم نے ایک ماں کو مطمئن کر دیا۔''

سب خوش تھے نایاب اور فیض کے چہرے ان کی خوشی کا پتا دے رہے تھے۔ زارا کی آنکھیں اور چہرہ خوشی واطمینان کا آئینہ دار تھا۔ فہمیدہ بیگم نے شکر کیا آج ان کو اس حقیقت کا پتا چلا کہ نفرت کے راستے میں وہ اکیلی تھیں۔ نایاب نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا اس کا دل ہمیشہ کی طرح صاف تھا۔

☆☆......☆☆

"آپ دونوں ساتھی ہیں اور اب ایک دوسرے کو آپ دو اچھی اور دو بری باتیں لکھ کر دیں گے جو آپ کو ایک دوسرے میں نظر آتی ہیں مگر کبھی کھل کر اظہار نہیں کیا تھا...... ایک پرچے پر لکھ کر آپس میں شیئر کریں...... اور اس کے لیے آپ کے پاس دس منٹ ہیں......"

یہ وہ کام تھا جو میں بہت آسانی سے کر سکتی ہوں مگر اس کے لیے جس کو میرا ساتھی بنا کر کھڑا کر دیا گیا تھا میرے لیے ناممکن تھا...... یہ ہمارے آفس کا معمول تھا



کہ مہینے کے آخر میں ہمیں ایک ایسی میٹنگ کرائی جاتی جس میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کھل کر بات کرتے...... اور ہمیں ایک ساتھی دیا جاتا جو کہ اصل میں کسی دوسرے شعبے میں کام کر رہا ہوتا مگر اس سے ہمارا روز کا کوئی تعلق بھی ہوتا...... اس طرح ایک دوسرے کو لکھ کر دینے میں ہمیں اندازہ ہوتا کہ سامنے والا ہمیں کس نظریے سے دیکھ رہا ہے...... اور یہ ایک بہت ہی عمدہ میٹنگ ہوتی تھی جس سے ہمیں نہ صرف اپنے بارے میں پتا چلتا بلکہ دوسروں کے ہمارے اپنے بارے میں خیالات کا بھی اندازہ ہو جاتا...... میں نے ایسی ہی میٹنگ میں جا کر بہت سے اچھے دوست بنا لیے تھے...... اور کافی ساروں سے جو، جو مجھے شکایتیں تھیں وہ محض میرا وہم تھیں اس کا بھی اندازہ ہو گیا تھا...... مگر یہ ''...... اوہو...... اس کے بارے میں تو میرے پاس کوئی بھی اچھا خیال نہیں ہے...... یا اللہ کیا کروں؟''

اس کا نام بھی بڑا شاہانہ سا تھا وہ خود بھی بہت شاہانہ سی طبیعت رکھتی تھی...... اونچے برانڈ کے کپڑے سینڈلز...... پرس...... جیولری...... غرض وہ ہر طرح سے شاہانہ تھی...... اس کا شوہر ایک بہت ہی بڑی اور مشہور کمپنی میں جنرل منیجر تھا...... وہ اپنے شوہر کی پسند تھی...... خوش شکل، خوش اخلاق اور خوش لباس...... اپنا کام مکمل توجہ سے کرتی تھی...... ذہین اتنی تھی کہ ہر بات سیکنڈ میں سمجھ لیتی تھی...... دو پیارے، پیارے سے بچے تھے جو اسی کی طرح خوب صورت اور تندرست تھے...... وہ محفل لوٹ لینا جانتی تھی...... ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ کتابوں اور ادیب چاہے وہ ملکی ہوں یا غیر ملکی سب پر ماہرانہ انداز میں بے لاگ تبصرہ کر سکتی تھی...... وہ ایک مکمل شخصیت تھی اور مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ جب ہم کہتے ہیں کہ اس دنیا میں کوئی بھی مکمل نہیں تو بھلا یہ اس طرح مجھے مکمل سی کیوں دکھائی دیتی تھی۔

ایک دن میں یونہی کتاب لیے سیڑھیوں سے اپنے آفس جا رہی تھی کہ ہم دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی...... وہ اتر رہی تھی تو اس نے فوراً میرے ہاتھ میں دبی کتاب کو ہلکا سا چھوتے ہوئے کہا۔

''واہ...... یہ میں نے چند ہی دن پہلے ختم کی بہت عمدہ ہے...... تم پڑھ لو تو ہم اس پر ڈسکس کریں گے...... کیا خیال ہے؟'' اس کے سفید موتی جیسے دانت ہونٹوں میں سے جھانک رہے تھے، وہ ایسے کم ہی دکھائی دیتی تھی اس کا مطلب وہ اس وقت واقعی خوش تھی...... میں ہلکا سا کچھ منمنائی تھی، وہ خود پر اتنی نازاں تھی کہ اس نے میرے منمنانے کو اقرار تصور کر لیا اور تیزی سے یہ کہتی ہوئی گزر گئی کہ جلد ساتھ بیٹھ کر لنچ کریں گے......

میں اوپر پہنچی ہی تھی کہ میرا منیجر بھاگتا ہوا آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ وہ (شاہانہ) مجھ سے سیڑھیوں پر کیا بات کر رہی تھی میں نے اسے ابھی کوئی جواب دیا بھی نہیں تھا کہ وہ جھٹ سے کہنے لگا۔

''آپ خوش نصیب ہیں کہ اس کی توجہ حاصل کر پائی ہیں ورنہ میں تو کب سے کوشش میں مصروف ہوں مگر وہ ہے کہ مجھے دیکھتی تک نہیں......'' اور پھر میرے یہ بتانے پر کہ کبھی ہم لنچ ساتھ کریں گے وہ میری باقاعدہ التجا کرنے لگا کہ میں جب بھی لنچ پر اس کے ساتھ کہیں جاؤں تو ان صاحب کو بھی ساتھ لے لوں...... مجھے شدید غصہ بھی آیا اور عجیب احساسِ کمتری بھی محسوس ہوا کہ بھلا اس میں ایسی کیا بات ہے کہ یہ پاگل ہو رہا ہے۔

اس کے بعد میں شاہانہ سے چھپنا شروع ہو گئی جہاں دیکھتی وہ جا رہی ہے یا کہیں سے آ رہی ہے ادھر ادھر ہو جاتی...... ایک دن میں اپنے کام میں مصروف تھی کہ میرا انٹر کام بجا...... اس وقت زیادہ تر میں چائے کے لیے پاگل ہو رہی ہوتی تھی اور ہمیشہ میرا کینٹین والا انٹر کام کر کے پوچھتا ضرور تھا کہ چائے لائے یا نہیں لہٰذا مجھے اندازہ تھا کہ وہی ہوگا۔

''لے بھی آؤ چائے اب۔'' میں نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر کہا۔ دوسری طرف سے مترنم ہنسی کی آواز آئی۔

''ارے تم میرے آفس چلی آؤ...... دونوں ساتھ چائے پیتے ہیں۔'' اچھا تو یہ محترمہ شاہانہ ہیں، میں نے

دل میں ناگواری سے سوچا۔
"اصل میں...... مجھے یہ کام آج ہی مکمل کرنا ہے عبید صاحب (میرے منیجر) نے ڈیڈ لائن دے دی ہے۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا تو وہ بڑے گمبھیر سے لہجے میں بولی۔

"تم عبید کو کہو...... میں نے بلایا ہے......" اور اس کے بعد کھلکھلا کر ہنس دی...... اس کے فوراً بعد اس نے عبید کو بھی فون کر کے کہہ دیا کہ مجھے اس کے پاس بھیج دے...... میں ست روی سے اس کے پاس گئی مگر جتنی دیر میں اس کے ساتھ رہی مجھے اس کے ہنسنے، بات کرنے، معلومات کا خزانہ بکھیرنے اور اپنے بارے میں معلومات دینے سے لے کر ہر، ہر بات سے چڑ ہوتی رہی...... مجھے شدید نفرت سی محسوس ہو رہی تھی کہ آخر اس کو مجھ سے ایسی کیا انسیت ہو گئی ہے جبکہ ہمارے کام، ہمارے شعبے اور یہاں تک کہ شکل صورت...... طبقے میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا...... مگر وہ اتنی خوش، خوش بات کرتی رہی تھی کہ لگ رہا تھا جیسے ہم دونوں میں بچپن سے دوستی ہو اور آج ہم بڑے دنوں بعد ملے ہوں...... بہرحال میں اس سے جتنا بچنے کی کوشش کرتی وہ وہیں موجود ہوتی...... اب تو آفس میں ہماری دوستی مشہور ہونے لگی...... سب سے زیادہ غصہ مجھے اس وقت آتا جب تمام مرد حضرات مجھ سے ڈھکے چھپے انداز میں اس کے بارے میں معلومات لینے کی کوشش کرتے...... اور خواتین یہ معلوم کرنے پر بضد رہتیں کہ وہ کہاں سے کپڑے وغیرہ لیتی ہے۔ وہ مجھ سے کچھ ایسی محبت سے پیش آتی کہ میں چاہ کر بھی اس کے بارے میں برا نہیں سوچ پاتی تھی۔ سب سے زیادہ مجھے اس وقت حیرت ہوتی جب وہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے میرے خیالات کو پکڑ لیتی تھی...... یہی سوچ رہی ہو ناں تم...... اکثر ہم آفس کی طرف سے دی گئی... کسی محفل میں ہوتے تو وہ اپنے کام کس مہارت سے نمٹاتی تھی میں دیکھ کر دنگ رہ جاتی...... وہ اپنے ڈپارٹمنٹ کے لوگوں میں بہت عزت رکھتی تھی...... سب ہی اسے چاہتے تھے، احترام کرتے تھے جو جانتے تھے وہ اس کے اندر موجود اچھائی اور انسانیت سے متاثر تھے اور جو اس کو قریب سے نہیں جانتے تھے وہ اس کی ظاہری خوب صورتی سے متاثر ہو جاتے تھے...... وہ مجھے ایسی محفلوں میں اپنے ساتھ، ساتھ رکھتی اور ہر جگہ میرے لیے کوئی نہ کوئی ایسا کام نکال لیتی کہ میں اس کے آس پاس ہونے پر مجبور رہتی...... مگر میں اندر ہی اندر بہت ہی زیادہ چڑ چڑی ہوتی جا رہی تھی...... مجھے آفس جانے سے غصہ آنے لگا تھا...... میری اپنی شخصیت کہیں دب گئی...... اب میں ہر جگہ صرف اس کی دوست کے طور پر جانی جاتی اور مجھے اس بات سے خود سے گھن آنے لگی تھی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ہمارے آفس نے پکنک کا پروگرام بنایا...... سب بہت خوش تھے...... آفس میں ہر کوئی پلان کرتا رہا تھا کہ کس کے ساتھ بس میں بیٹھ کر جانا ہے۔ حسب معمول مجھے ابھی تک کوئی نہیں مل سکا تھا کہ میں کس کے ساتھ بیٹھ کر جاؤں گی اس نے انٹر کام کر کے بتایا کہ وہ آفس کی طرف سے گاڑی میں جائے گی کیونکہ وہ بڑے عہدے پر تھی اور اس کے پاس جگہ ہے تو میں اس کے ساتھ چلی چلوں...... لمبا سفر تھا اور یہ تین سے چار گھنٹے اس کے ساتھ گزارنے کے خیال سے ہی مجھے وحشت ہونے لگی...... آفس کے سب لوگ میری خوش قسمتی پر رشک کرتے جا رہے تھے اور میں چپ تھی۔

سب لوگ بس میں بیٹھ کر روانہ ہو چکے تھے جبکہ ہم دونوں گاڑی کا انتظار کر رہے تھے...... وہ ایک ضروری فون کال کا کہہ کر مجھے لان میں بینچ پر بٹھا کر آفس کے اندر چلی گئی۔ مجھے واش روم جانے کی سوجھی میں واش روم گئی تو دیکھا کہ وہ ابھی شاید وہیں سے ہو کر آفس گئی تھی کہ اس کا برانڈڈ پرس بیسن کے پاس جو تولیے کا ریک تھا اس پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اطمینان سے اس کا پرس کھولا...... اس کے اندر اس کی ایک عدد نوٹ بک تھی اور اس کا مہنگا والا موبائل چمکتا نظر آ رہا

تھا...... میں نے موبائل نکالا اس کا کور کھول کر سم باہر نکالی...... ایک ہی جھٹکے سے توڑی اور واپس اس کے موبائل میں ڈال کر کسی نہ کسی طرح موبائل کو آن کر دیا...... موبائل نو سم کا اشارہ دینے لگا...... میں نے موبائل واپس رکھ دیا...... پھر اس کی نوٹ بک باہر نکالی جس کا کور مہنگے چمڑے کا تھا...... اس پر اس کے ہی بیگ سے لپ اسٹک نکال کر خوب نشان لگائے اور ڈائری کھول کر اس کے پرچے پھاڑے اور اس میں واپس رکھ دیے...... ڈائری کا کام تمام کرنے کے بعد اس کے میک اپ کے سامان کو بھی اسی طرح گندا کیا...... جیسے لپ اسٹک کو ریک پر رگڑ کر آدھا کر دیا...... نیل پالش کھول کر اس کے بیگ کے اندر انڈیل دی...... اور فیس پاؤڈر کے کٹ میں پانی ڈال کر بند کر کے پرس میں رکھ دیا...... غرض میں جتنا نقصان کر سکتی تھی کیا اور واش روم سے آ کر باہر بیٹھ گئی...... جب ہماری گاڑی آئی تو میں نے اس کے آفس کے نمبر پر فون کر کے بتایا وہ اپنا پرس لے کر بھاگتی ہوئی آئی اور ہم دونوں بھی پکنک کے لیے روانہ ہوئے...... پورے راستے اس کو پرس کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی...... اور شاید اس نے پوری پکنک کے دوران بھی...... نہیں کھولا...... مگر پھر اس کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ کچھ دیر ہی پکنک پر گزارنے کے بعد واپس چلی گئی۔ مجھے کچھ شک نہیں ہو سکا کہ اس نے ایک دفعہ بھی...... بظاہر نہیں کیا تھا کہ اس کو پرس کا پتا چل چکا ہے...... بلکہ جب وہ جا رہی تھی تو بار بار مجھ سے معافی مانگتی رہی کہ وہ اس طرح مجھے اکیلا کر کے جا رہی ہے اس نے اپنی گاڑی منگوائی تھی لہٰذا پکنک سے واپسی پر ہمارا ڈیپارٹمنٹ گاڑی میں بھر کر واپس آیا اور ہم نے خوب مزے بھی کیے۔ کافی لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا کہ امیر اور نازک مزاج سے دھوپ برداشت نہیں ہو سکی اور بیمار ہوگئی۔ وہ دو تین دن کی چھٹی لے کر غائب ہوگئی...... مگر پورے آفس میں یہ بات پھیل گئی کہ کسی نے اس کے پرس کے ساتھ ایسا، ایسا کیا جب وہ اپنا پرس واش روم میں بھول گئی تھی...... زیادہ تر لوگوں کا دھیان آفس میں واش روم صاف کرنے والے اسٹاف پر تھا مگر کوئی بھی حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا سب خواتین کو ہدایات دے دی گئیں کہ اپنے پرس وغیرہ واش روم میں چھوڑ کر نہ جائیں اس کے بعد میں بڑے سکون سے ہوگئی تھی...... اور جب وہ چھٹیوں کے بعد واپس آئی تو کافی کمزور لگ رہی تھی اس نے اس واقعے کا کافی اثر لیا تھا اس کو دلاسا دینے میں جو لوگ آگے، آگے تھے میں ان سب میں بھی آگے تھی...... بلکہ ایسا ہوا کہ جس طرح اس نے اپنے اس واقعے پر صبر کیا اور دکھ منایا اور بیمار ہوئی تو مجھے پہلی دفعہ اس کا احساس ہوا اور میں اس کے بہت، بہت قریب ہوگئی...... مجھے احساس ہوا کہ وہ واقعی اچھی انسان ہے۔ اس میں ریاکاری جھوٹ، فریب نہیں تھا۔ وہ دل میں سب کے لیے نیک نیتی رکھتی تھی...... اب مجھے بھی اس کے ساتھ بیٹھنا، باتیں کرنا، ہنسنا اور مذاق کرنا اچھا لگنے لگا تھا...... دن گزرتے گئے اور میں یہ بات بھول ہی گئی۔

آج جب اس کے بارے میں مجھے اچھی اور بری بات لکھنے کے لیے کہا گیا تو میں نے پہلے تو خوب سوچا کہ کیا لکھوں مگر پھر...... میں نے قلم پکڑا اور لکھا...... دس منٹ پورے ہوئے اور ہم دونوں نے اپنے لکھے ہوئے پرچے ایک دوسرے کو تھما دیے۔

میں نے لکھا تھا......

"تمہارے پرس پر قیامت میں نے ڈھائی تھی اور اس کے بعد ہی شاید مجھے تم سے محبت ہوگئی......" میں اس کا دیا پرچا تھامے اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی...... اس نے پہلی دفعہ پڑھا...... مجھے دیکھا...... اور پھر دو چار منٹ تک وہ ہونٹ بھینچے مجھے دیکھتی رہی...... پھر مسکرائی...... میں بھی مسکرا دی...... میں نے اطمینان سے اس کا دیا ہوا پرچا کھولا...... اس نے اپنی خوب صورت لکھائی میں لکھا تھا۔

"مجھے یہ بات پہلے سے معلوم تھی۔"

ناقابلِ فراموش جنم دن اور اپنوں سے توقعات

شائستہ زریں

اس دن سے جُڑی ہیں کتنی یادیں
نہ بھول سکیں گی وہ بیتی باتیں

بلاشبہ ہماری زندگی میں آنے والے بعض دن، واقعات اور ساعتیں بھلائے نہیں بھولتیں اور اگر یاد اس دن سے منسوب ہو جو ہر انسان کی زندگی کا سب سے اہم دن ہوتا ہے یعنی اس کا یوم ولادت تب ہمیشہ گزشتہ "کل" ہمارا "آج" بن کر ہمارے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے اور ضروری نہیں کہ سالگرہ ہماری ہو، ہماری کسی عزیز ترین ہستی یا متعلقہ ادارے کی سالگرہ بھی ناقابلِ فراموش ہو سکتی ہے۔ اپنوں کی سالگرہ یاد رکھنے کی مسرت کا لطف ہی الگ ہوتا ہے۔ ہماری اپنی سالگرہ پر سماعت سے ٹکراتی اپنائیت بھری، بخلوص آواز......

آج تمہاری سالگرہ ہے، دیکھو ہم کو یاد ہے ناں

ہماری خوشیاں دو چند کر دیتی ہے اور اس بے لوث محبت کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ......

ہماری کب ہے یہ ہے آپ ہی کی سالگرہ

بے شک ان پُرمسرت ساعتوں کو دوام بخشنے میں اپنوں کا کردار بہت اہم ہوتا ہے جو ہماری خوشیوں میں ہم سے بڑھ کر شریک ہوتے ہیں۔ یہ محبت ہی ہے جو غیروں کو بھی اپنا بنا دیتی ہے۔

لاشعوری طور پر اپنی زندگی کے اس اہم دن اپنوں سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی جاتی ہیں جو پوری ہو جائیں تو دل چمن زار بن جاتا ہے ورنہ بصورت دیگر خوشی نامکمل رہ جاتی ہے۔

حسب روایت سالگرہ نمبر کے لیے سالگرہ کے حوالے سے ایک سروے رپورٹ جس میں ہم نے شرکا سے معلوم کیا کہ......

سوال ۱: آپ کی، آپ کی کسی عزیز ترین ہستی یا کسی بھی ادارے کی سالگرہ کی ناقابلِ فراموش یاد کون سی ہے؟

سوال ۲: اپنی سالگرہ پر آپ کی اپنوں سے کیا توقع ہوتی ہے؟

نیلوفر عباسی

(براڈکاسٹر۔ ٹی وی آرٹسٹ)

۱: دس سال تک اکلوتی ہونے کی وجہ سے والدین نے میرے بہت لاڈ اٹھائے۔ دس سال تک میری ہر سالگرہ بہت یادگار تھی۔ صدر کی مشہور بیکری آدم ڈی سوما سے ڈیڈی کیک اور کھانے پینے کی دوسری اشیا منگواتے تھے۔ فریسکو کے دہی بڑے ہوتے۔ خاندان والے میری سالگرہ میں خوش دلی سے شریک ہوتے۔ خوب انجوائے کرتے اور سال بھر میری سالگرہ کی دعوت کا انتظار کرتے۔ میرے تینوں بچوں کی سالگرہ جولائی میں آتی ہے۔ عمروں میں بھی بہت فرق نہیں۔ دوست بھی کامن، اس لیے ہم کسی ایک تاریخ پر تینوں کی سالگرہ مناتے ہیں۔ کیک کا خصوصی اہتمام کیا جاتا کبھی بڑا سا شپ، کبھی



نیلوفر عباسی

شاندار سا بنگلا جس میں تین بچے کھیل رہے ہیں۔ مہمان بچوں کو تحائف دیے جاتے۔ خوب ہلا گلا ہوتا۔ قمر علی عباسی کے دوست مجیب عالم خوب صورت نغمے سناتے۔ یوں ان کی ہر سالگرہ یادگار ہوتی۔ ۲۰۱۳ء میں قمر علی عباسی ۳۱ مئی کو چلے گئے۔ ٹھیک بارہ دن بعد ۱۳ جون کو ان کی سالگرہ آئی تو نیویارک میں اس کا اہتمام کیا گیا اور بہترین کالم نگار، بہترین سفرنامہ نگار اور بہترین ادیب کو کیش ایوارڈ دیے۔ یہ ناقابل فراموش اور یادگار مگر تکلیف دہ سالگرہ کی تقریب تھی۔

۲: مجھے سالگرہ کا دن یاد رکھنا اور منانا بہت اچھا لگتا ہے اسی لیے میں اپنوں سے بھی یہی توقع رکھتی ہوں کہ وہ مجھے ہیپی برتھ ڈے کہیں اور میں خود بھی اس کا خیال رکھتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ اپنوں کی سالگرہ یاد بھی رکھوں اور انہیں وش بھی کروں۔ اسی لیے دل چاہتا ہے کہ وہ بھی میری سالگرہ یاد رکھیں اور مجھے صحت مند زندگی کی دعا دیں۔

مومل شنید
(چیف ایگزیکٹو آفیسر
ایم انٹرٹینمنٹ)

۱: ہم ٹی وی کی سالگرہ ہر سال بہت ہی خوب صورتی سے منائی جاتی ہے۔ آن ائر سیلیبریشن بھی ہوتی ہے۔ پورے آفس کو روشنیوں سے سجایا جاتا ہے۔ بڑا زبردست معلوم ہوتا ہے۔ روشنیوں سے سجے اس ماحول میں سب کے موڈ بھی روشن اور خوشگوار نظر آتے ہیں۔ ہم بڑا سا کیک کاٹتے ہیں، ڈھول والے بلوائے جاتے ہیں۔ یہ دن میں بہت انجوائے کرتی ہوں۔ ہم ٹی وی کی سالگرہ ایک فیملی



مومل شنید

کی طرح منائی جاتی ہے۔ ہر آنے والی سالگرہ جانے والی سالگرہ سے زیادہ یادگار اور پرمسرت ہوتی ہے۔ اس لیے میرے لیے ہم ٹی وی کی تمام سالگراہیں ناقابل فراموش ہیں۔

۲: کوئی خاص توقع نہیں ہوتی بس اتنی خواہش ضرور ہوتی ہے کہ میرے اپنے، میری سالگرہ کا دن یاد ضرور رکھیں۔ کیونکہ آج کل زندگی اتنی مصروف ہو

گئی ہے کہ ہر موقع کو یاد رکھنے کے لیے وقت بھی چاہیے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنوں کی جانب سے سالگرہ پر جو ہو جاتا ہے وہ بونس ہی ہوتا ہے۔

شیف گلزار حسین

(Culinary Expert - Masala Tv)

ا: مصالحہ ٹی وی کی چوتھی سالگرہ پر بہت انجوائے کیا تھا۔ عام زندگی سے ہٹ کر مختلف تھا سب کچھ۔ میری بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی گئی... بلاشبہ میرے لیے وہ تمام لمحات یادگار تھے..... ہیں اور



شیف گلزار

ہمیشہ رہیں گے۔

۲: تحائف کی مجھے کوئی خاص طلب ہوتی نہیں۔ یہی چاہتا ہوں کہ میری سالگرہ پر میرے لیے میرے اپنے دعائیں دیں۔ لمبی، کامیاب اور صحت مند عمر کی۔

شاہینہ رفیع

(مصنفہ، براڈکاسٹر)

ا: میری شادی کے بعد جب میری پہلی سالگرہ آئی بہت اچھی طرح سے اس کا اہتمام کیا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا، افطار کے بعد سالگرہ کی تقریب کے اختتام پر میری نانی کے انتقال کی خبر آئی تھی، خوشی، غم مل گئے تھے، کیسے بھلا سکتی ہوں میں وہ سالگرہ؟

۲: اپنوں سے تو دلی دعاؤں کی توقع رکھتی ہوں جو تحائف سے بڑھ کر قیمتی ہوتی ہیں۔

اطہر رضا اجنبی

(پروگرام ہیڈ اپنا کراچی ۱۰۷)

ا: اب تک اپنی، اپنے عزیزوں اور مختلف اداروں کی سالگرہ میں ایک سالگرہ ایسی ہے جو بہت یادگار رہی۔ 2009ء میں دبئی میں اپنی چھوٹی بیٹی کی تیسری سالگرہ جس پر میں نے اچھل، اچھل کر غبارے پھاڑے تھے۔ اس سالگرہ کی ویڈیو آج بھی میں اپنی اہلیہ اور بیٹیوں کے ساتھ دیکھتا ہوں تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے اور وقت لگتا ہے کہ تھم سا گیا ہے۔

۲: سالگرہ پر بچپن میں ہمیشہ تحفے ملنے کی توقع رہتی (جو ہر بچے کی ہوتی ہے)، بچپن کی سرحدیں وقت نے پار کرا دیں تو ہمیشہ اپنوں خاص طور پر امی



اطہر رضا اجنبی

کی دعاؤں کا انتظار رہتا ہے۔ شادی کے بعد اہلیہ کی مبارک باد اور بیٹیوں کے ہاتھ سے بنائے گئے کارڈز ملنے کی توقع رہتی ہے۔

اسما عباس

(ٹی وی آرٹسٹ)

۱: میری سالگرہ تھی، کراچی سے شوٹ کروا کے لاہور واپس آئی تو ائرپورٹ پر بیٹا لینے آیا جبکہ ہمیشہ سارے گھر والے آتے ہیں۔ میں نے بیٹے سے پوتی کا پوچھا، نہیں آئی تو اس نے کہا کہ لیلیٰ (بہو) کے ساتھ نہیں گئی ہے۔ زارا (بیٹی) سو رہی تھی۔ پاپا کھانے پر گئے ہوئے ہیں۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ سب سے پہلے امی کے کمرے میں گئی وہ بھی نہیں تھیں، میں



اسما عباس

مزید پریشان اور پھر حیران رہ گئی۔ جب میں اپنے بیڈروم میں گئی اور روشنی کی تو بیک وقت میری آنکھیں جگمگانے اور جھلملانے لگیں، سالگرہ کا بھرپور اہتمام تھا۔ امی، میرے میاں، بیٹا، بہو، بیٹی، پوتی سب نے مل کر ہپی برتھ ڈے... کہا تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میری دونوں بیٹیوں، لیلیٰ اور زارا نے بہت عمدہ اہتمام کیا تھا۔ ایسی بے لوث محبت نے دل موہ لیا۔

۲: توقع یہی ہوتی ہے کہ جیسی میری سالگرہ کی خوشی منائی جاتی ہے ہمیشہ مناتے رہیں۔ میکے میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے میری سالگرہ کا ہمیشہ سے خاص اہتمام ہوتا تھا۔ اب میرے بچے میری سالگرہ کا بہت اہتمام کرتے ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے، میرے ابا کہتے تھے کہ محسوسات کا اظہار بہت ضروری ہے۔ میری بھی یہی خواہش ہے اور دل چاہتا ہے کہ یہ سلسلہ عمر بھر چلتا رہے۔

فصیح باری خان

(ڈراما نویس)

۱: سالگرہ کی ناقابل فراموش یاد تو اب میری والدہ سے ہی منسوب ہے۔ میں نے کبھی سالگرہ نہیں منائی بس بہن بھائیوں نے سرسری سا وِش کر دیا لیکن وہ جو امی کا ماتھے پہ بوسہ ہوتا تھا، وہ ان کی موت کے بعد بھی میری پیشانی پہ دھڑکتا ہے۔



فصیح باری خان

۲: ہاہاہاہا، کوئی توقع نہیں ہوتی لیکن پاکستان کی سالگرہ، جشنِ آزادی مناتے ہوئے اس قوم سے میری یہ توقع ہوتی ہے کہ خدارا انسان کے بچے بن جائیں، بہت کھیل چکے ہم اس ملک کے ساتھ، اب بس کردیں۔

ہمایوں اشرف
(ٹی وی آرٹسٹ)

۱: ایک مرتبہ میری ایک دوست نے میری سالگرہ پر بہت خوب صورت اور بھرپور اہتمام کیا تھا میرے تمام دوستوں اور شوبز کے کولیگز کو مدعو کیا تھا۔ کینڈلز اور پھولوں کی سجاوٹ سے ساری فضا منور اور معطر ہوگئی تھی۔ کھانے بھی خوش ذائقہ تھے۔ مجھے بہت اچھا تحفہ دیا تھا، سب نے مل کر بہت انجوائے کیا تھا۔ وہ سالگرہ میرے لیے بہت یادگار تھی۔

۲: ہمیشہ ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ بناوٹ سے پاک، پُرخلوص اور سچا پیار اور محبت ملے، نیچرل اور ایمانداری سے دی جانے والی مبارک باد پاکر سالگرہ کی خوشی بڑھ جاتی ہے۔



ہمایوں اشرف

میکال ذوالفقار
(ٹی وی آرٹسٹ)

۱: میری سولھویں سالگرہ بہت یادگار تھی، کالج فرینڈز اور کزنز کے ساتھ بہت انجوائے کیا تھا۔ ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا تھا۔ اچانک ہونے والی بارش نے سالگرہ کی خوشیوں کا لطف دوبالا کردیا تھا۔ ہم سب نے سڑکوں پر خوب ہلا گلا کیا۔ بڑی



میکال ذوالفقار

یادگار سالگرہ تھی وہ میری۔ سولھویں سالگرہ کے ساتھ، ساتھ اس زمانے کی پاکستان کی سالگرہ بھی بہت یادگار تھی پورے ملی جوش و جذبے کے ساتھ منائی تھی۔ پاکستانی جھنڈے ہاتھوں میں لیے دوستوں اور کزنز کے ساتھ سڑکوں پر ملی ترانے گاتے...... جنون کا ملی ترانہ بہت مشہور ہوا تھا وہ گاتے۔

۲: پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے اپنے میری سالگرہ یاد رکھیں اور دل سے اور بہت خوشی کے ساتھ میری سالگرہ کی خوشیوں میں شریک ہوں اور پھر جو سب سے پہلے برتھ ڈے وش کرتا ہے۔ اس کی اہمی

اہمیت ہوتی ہے۔

راحت گابا

(نعت خواں)

1: اپنی سالگرہ کا دن ہر انسان کی زندگی میں اہم ہوتا ہے۔ سال بھر اس دن کا انتظار کیا جاتا ہے اور جب وہ دن آئے اور کوئی ناگہانی آفت یا حادثہ پیش آجائے تب خوشی میں غم بھی شامل ہو جاتا ہے ایسا میرے ساتھ ۲۴ ستمبر ۲۰۱۳ء کو ہوا جب میری سالگرہ کے دن کراچی میں زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے گئے، جس کی وجہ سے لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنی سالگرہ کی خوشی بھلا کر میں ان کے لیے غمزدہ بھی۔ جو اس وقت مشکل میں تھے۔ اس حوالے سے یہ سالگرہ بہت یادگار ہے۔

2: میرا دل چاہتا ہے کہ میری سالگرہ پر میرے اپنے میری خوشی کا حصہ بنیں، میری خوشیوں میں شامل ہوں۔ چونکہ زندگی میں خوشیوں کے موقع کم، کم آتے ہیں، اس لیے میرا خیال ہے کہ اوروں کی خوشی کو اپنی خوشی بنانی چاہیے۔ گھر والوں اور



راحت گابا

دوستوں کے دم سے ہی خوشی ملتی ہے زندگی خوشگوار گزرتی ہے اس لیے اپنی سالگرہ ان کے ساتھ ہی گزارنا چاہتی ہوں۔

نور العین اشعر

(گھریلو خاتون)

1: مجھے اپنی بیٹی مریم کی سالگرہ 2 جولائی اور بیٹے محمد احمد کی 9 جولائی کو آتی ہے۔ دونوں بچوں کی



نورالعین اشعر

پہلی، پہلی سالگرہ میں جو خوشی ملی تھی وہ پھر کبھی نہیں ملی۔ اپنی سالگرہ کے تحفے لیتے ہوئے ان کے ننھے منے چہروں کی چمک اور خوشی جو میں نے محسوس کی وہ ناقابلِ بیان ہی نہیں ناقابلِ فراموش بھی ہے۔

2: یہی توقع ہوتی ہے کہ سالگرہ کا دن یاد رکھیں۔ بہت مصروفیت ہو تو فیس بک پر مبارک باد کے دو لفظ ہی لکھ دیں۔

زرنش خان

(ٹی وی آرٹسٹ)

1: میری اٹھارھویں سالگرہ پاکستان اور بیرون ملک سے آئے دوستوں کے ساتھ منائی گئی



زرش خان

تھی۔ میری دوست نے اپنے گھر پر سرپرائز پارٹی ارینج کی تھی۔ بہت زبردست اہتمام کیا تھا۔ سب دوستوں نے بہت انجوائے کیا تھا مجھے بہت اچھا لگا تھا سب کا اتنے پیار سے میری خوشیوں میں شریک ہونا۔ اتنا پیارا سرپرائز سالگرہ کی خوشیوں میں اضافہ کردیا تھا۔

۲: مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ سب کو میری سالگرہ یاد رہے اور میرے اپنے یاد بھی رکھتے ہیں۔

قارئینِ کرام:

برٹرینڈ رسل کا قول ہے کہ "خوش رہنے کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ دوسروں کو خوش دیکھنا پسند کرو۔"

اور آپ نے پڑھا سروے کے شرکا کی ناقابلِ فراموش سالگرہ میں خصوصی اہمیت اپنوں کی اپنائیت بھری محبت کی ہے۔ اسی طرح اپنوں سے کی جانے والی توقعات میں بھی صد فی صد تناسب اپنوں کا سالگرہ کی خوشی میں خوش دلی سے شریک ہوتا رہا خواہ وہ مبارک باد کے دو بول ہی کیوں نہ ہوں اور ہمارا کوئی اپنا یہ اہم دن فراموش کردے یا دانستہ نظر انداز کردے۔ تب یہی خیال آتا ہے ناں؟

کیا اسی کو کہتے ہیں محبت کا زوال
اب تجھے یاد نہیں سالگرہ بھی میری

اور محبت کو زوال نہیں آنا چاہیے خواہ رشتے اور تعلق کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ بالخصوص خونی رشتوں میں اپنائیت کا احساس کبھی نہیں مٹنا چاہیے۔

ہماری اور ادارۂ پاکیزہ کی جانب سے پاکیزہ کے تمام قارئین کو ان کی آنے والی سالگرہ کی پیشگی مبارک باد اس دعا کے ساتھ کہ

رفعتیں اور بلندی بھی تجھ پہ ناز کرے
تیری یہ عمر خدا اور بھی دراز کرے
حسین چہرے کی تابندگی مبارک ہو
تجھے یہ سالگرہ کی خوشی مبارک ہو

(آمین)

وہ آئے بزم میں...

نزہت اصغر



مایہ ناز مصنفہ اور پاکیزہ کی

پُرخلوص دیرینہ ساتھی محترمہ عنیزہ سید سے دلنشین گفتگو

معزز قارئین! السلام علیکم! دعائیں اور نیک خواہشات لیے ایک مرتبہ پھر ہم آپ کے لیے خوب صورت بزم سجائے بیٹھے ہیں۔ 2015ء کی یہ پہلی بزم ہے جو ماہنامہ پاکیزہ کے سالگرہ نمبر کے لیے خاص طور پر سجائی گئی ہے۔ آپ سب کی جانی پہچانی ،خوب صورت تحریروں کی ملکہ، دلکش خیالات کی مالک عنیزہ سید آج اس بزم میں رونق افروز ہیں۔ ان سے دیگر دلچسپ باتوں کے ساتھ حال ہی میں اختتام کو پہنچنے والے ان کے ناول شام شہر یاراں پر بھی بات ہوئی جو عنیزہ اپنی گفتگو میں تفصیلاً بتائیں گی مگر ہم اتنا ضرور بتادیں کہ ہماری یہ رائٹر ادارہ پاکیزہ کے لیے کسی بیش بہا خزانے سے کم نہیں۔ عنیزہ نے ہمیشہ

ایک سے بڑھ کر ایک افسانے' ناولٹ اور ناول تحریر کیے ہیں' ہماری دعا ہے کہ عنیزہ سید صحت و سلامتی کے ساتھ اپنے قلم کے ذریعے پاکیزہ کے پرستاروں کو اسی طرح مستفیض کرتی رہیں۔ الٰہی آمین۔ قارئین کے لیے ایک اور خبر کہ عنیزہ سید سے تصویری ملاقات نہیں ہو پائے گی آپ ان کے انٹرویو میں ان کی ہستی تلاش کریں۔

سو مزید انتظار کروائے بغیر اب ہم اپنی پیاری رائٹر سے مخاطب ہوتے ہیں۔

پاکیزہ ﴿ جی عنیزہ! ہماری اس بزم میں خوش آمدید۔ کیسا لگ رہا ہے قارئین کے روبرو آنا؟

عنیزہ سید ❖...... مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے، قارئینِ پاکیزہ کے ساتھ مختلف موضوعات پر اپنے خیالات شیئر کرتے ہوئے مجھے اچھا لگتا ہے قاری اور لکھاری کے درمیان ایسے روابط قائم رہنے چاہئیں کیونکہ ایسا ہونے سے قاری کے ذہن میں تحریروں کے حوالے سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات ملنے کا موقع بن سکتا ہے اور لکھاری کو بھی قاری کی ذہنی اپچ اور اس زاویے کو جانچنے کا موقع مل سکتا ہے جس سے وہ اس کی تحریر کو پڑھ اور دیکھ رہا ہوتا ہے۔ (یہ بات تو ہے)

پاکیزہ ﴿ اچھا آج کل کیا مصروفیات ہیں؟ سالِ نو کی کیا پلاننگ ہے؟

عنیزہ سید ❖...... آج کل میرا زیادہ تر وقت اسکرپٹ لکھنے میں گزر رہا ہے۔ مختلف ٹی وی چینلز کے لیے چند پروجیکٹ زیرِ تحریر ہیں۔ نیشنل کالج آف آرٹس سے فارغ التحصیل چند طلبا کے ایک گروپ کے ساتھ مل کر ایک آرٹ مووی اسکرپٹ پر بھی ساتھ ساتھ کام ہو رہا ہے۔

پاکیزہ ﴿ قارئین کے سوالات کے تو آپ بھرپور جوابات عنایت فرمائیں گی لیکن ہمارے اس مختصر سوال کا جواب دیں کہ ارضی و سماوی آفات تو پہلے بھی آتی رہی ہیں (اللہ آئندہ ہمیں محفوظ رکھے) لیکن 2005ء کے زلزلے کے متاثرین پر ہی آپ نے کیوں لکھا؟

عنیزہ سید ❖...... آپ کا یہ سوال بہت اہم ہے۔ ارضی و سماوی آفات اپنی جگہ بہت بڑی حقیقت ہیں اور یہ آفات چھوٹی ہوں یا بڑی ان کے متاثرین محدود ہوں یا لامحدود ان کے اثرات کئی نسلوں تک جاری رہتے ہیں۔ اکتوبر 2005ء کے زلزلے سے پھوٹنے والی آفت میری تحریر کا موضوع اس لیے بنی کہ اس کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں، بربادیوں، مسائل اس کے متاثرین کے ظاہری دکھوں اور پریشانیوں، ان کے بے گھر اور بے در ہو جانے پر رپورٹس لکھی گئیں۔ بلاگز لکھے گئے، کہانیاں، افسانے، ڈرامے تخلیق کیے گئے لیکن اس اتنے بڑے المیے کے باطن میں پوشیدہ رہ جانے والے بہت سے المیے بہت سوں کی نظروں سے پوشیدہ ہی رہ گئے۔ ایسے ہی ایک پوشیدہ المیے نے مجھے اس آفت کو کہانی کا موضوع بنانے پر مجبور کر دیا۔ میری کاوش (شامِ شہرِ یاراں) کہاں تک مکمل اور کامیاب رہی یہ تو میرے قاری ہی بتا سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ کمی رہ گئی ہو اگرچہ میں نے اس کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی۔

پاکیزہ ﴿ کیا مسلسل اس طرح کے واقعات ادیب یا شاعر کو حد درجہ متاثر کرتے ہیں؟

عنیزہ سید ❖...... یقیناً متاثر کرتے ہیں۔ دنیا بھر کی زبانوں میں آج تک جتنا بھی ادب تخلیق ہوا اس میں سے معرکتہ الآرا وہی کہلایا جو اسی طرح کے واقعات کے بطن سے ظہور میں آیا۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم، انقلابِ فرانس، انقلابِ روس، تقسیمِ ہندوستان، حالیہ زمانوں میں 9/11 جیسے واقعے کے بطن سے جنم لینے والے المیوں نے جس ادب کو تخلیق کیا اس کی حیثیت و مقبولیت کو کوئی آج تک چیلنج نہیں کر سکا۔ (بالکل درست)

پاکیزہ ﴿ آپ اردگرد کی تبدیلیوں کا اپنی

ذات پر اور پھر اپنے کام پر کیا اثر لیتی ہیں؟

عنیزہ سید ❖ ...... اردگرد کی مثبت تبدیلیاں یقیناً میرے ذہن و دل پر بھی مثبت انداز میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ انسان اپنی عمر کے بہترین دور کے ناسٹیلجیا میں ہمیشہ مبتلا رہتا ہے۔ میں اپنی مذہبی، روایتی اور معاشرتی اقدار و ثقافت کی شدت سے دلدادہ ہوں۔ میرے نزدیک اخلاقیات اور روایات کا جو زرخیز خزانہ ہمیں ہماری گزشتہ نسلوں نے منتقل کیا ہے وہ ہماری سب سے عظیم متاع ہے۔ آج کے دور میں جب میں اس عظیم خزانے کا جنازہ سرِعام نکلتے ہوئے دیکھتی ہوں تو میرا ذہن، دل، روح اور میرا کام سب ہی شدت سے متاثر ہوتے ہیں اور دل واپس اسی وقت میں لوٹ جانے کو چاہنے لگتا ہے جب اس عظیم خزانے کو قیمتی متاع سمجھ کر نہ صرف سینوں سے لگائے رکھا جاتا تھا بلکہ اس پر سر اٹھا کر فخر بھی کیا جاتا تھا۔

پاکیزہ ❖ آپ کی فیملی میں صرف آپ اس جانب آئیں یا اور بھی کوئی رہ نوردِ شوق نکلا؟

عنیزہ سید ❖ ...... میرے ننھیال میں علم و ادب سے لگاؤ رکھنے والی بہت سی ایسی شخصیات موجود ہیں جو باقاعدہ تخلیق کار نہ ہونے کے سبب اس طرح تو سامنے نہ آسکیں لیکن خاندان میں ان کی موجودگی مجھ ایسوں کے لیے بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوئی۔ باقاعدہ طور پر لکھنے والوں میں سرِفہرست نام تو مولوی سید میر حسن صاحب کا ہے۔ جو علامہ اقبال کے استاد رہ چکے ہیں اور رشتے میں میری والدہ کے نانا تھے۔ ان کے بعد انہی کے ایک بھتیجے سید نذیر نیازی ماہرِ اقبالیات اور عظیم دانشور اعلیٰ پائے کے تخلیق کار تھے۔ میری والدہ کی ایک ماموں زاد بہن مستورہ سید بھی ادبی پرچوں میں لکھتی رہی ہیں۔ انہوں نے ایک ناول بھی جاگے پاک پروردگار کے نام سے لکھا۔

پاکیزہ ❖ آپ کی تعلیمی قابلیت اور پروفیشن؟

عنیزہ سید ❖ ...... میں نے فلسفہ میں ماسٹرز کر رکھا ہے اور انٹرنیشنل ریلیشنز میں ڈپلوما بھی حاصل کر رکھا ہے۔ اگرچہ اب یہ تعلیمی قابلیت کچھ خاص قابلیت محسوس نہیں ہوتی۔ بہت عرصے تک میرا تعلق شعبۂ تعلیم سے رہا لیکن اب گھریلو مصروفیت کے سبب میں اس شعبے سے کنارہ کش ہوچکی ہوں۔ (اب تو آپ تحریر کے ذریعے بھی تعلیم دے اور لے رہی ہیں)

پاکیزہ ❖ کب آپ کو احساس ہوا کہ کہانی لکھ سکتی ہیں اور پہلی کہانی کیسے وجود میں آئی؟

عنیزہ سید ❖ ...... یہ 1985ء یا 1986ء کا زمانہ تھا۔ میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی اور ڈائجسٹ کی باقاعدہ قاری، ان دنوں ساجدہ حبیب صاحبہ جو اس زمانے کی اہم ترین ڈائجسٹ رائٹر گردانی جاتی تھیں کا ایک ناولٹ پڑھا جس کا عنوان تو مجھے یاد نہیں لیکن اس کا پہلا جملہ بہت اچھی طرح یاد ہے اور وہ کچھ یوں تھا۔ ’’دونوں باراتیں ایک ساتھ رنگ محل سے نکلی تھیں۔‘‘ اس ناولٹ نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے فیصلہ کرلیا میں بھی اس جیسا کوئی ناولٹ یا افسانہ ضرور لکھوں گی۔ خود کو یہ چیلنج میں نے خود ہی دے لیا اور اس چیلنج کو پورا کرنے کے لیے پہلا افسانہ لکھ کر بھجوادیا جو شومئی قسمت اگلے ہی ماہ ایک مقبول ڈائجسٹ میں لگ گیا بس پھر سلسلہ چل نکلا۔

پاکیزہ ❖ اردو ادب یا عالمی ادب کس کو زیادہ پڑھا اور متاثر کس سے ہوئیں؟

عنیزہ سید ❖ ...... میں نے دونوں ہی طرح کے ادب کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ اردو، انگریزی کے علاوہ فرانسیسی، روسی، اطالوی ادب کے انگریزی تراجم، بنگالی، مصری، ایرانی، ترکی، ہندی ادب کی کہانیاں نہ صرف پڑھیں بلکہ ان کے تقابلی جائزے لینے کی بھی حقیری سی کوشش کرتی رہی۔ وہ کتب بینی کا ایک انتہائی Profilic دور تھا جب جو پڑھنے کو ملا چاٹ ڈالا۔ اب کچھ عرصے سے کتب بینی کی رفتار

میں خاطر خواہ کمی آئی ہے۔ وقت کی کمی شاید اس کا ایک بڑا سبب ہے۔ رہا متاثر ہونے کا سوال تو میں ہر اچھی تحریر کے متاثرین میں سے ہوں۔

پاکیزہ ﴾ ڈائجسٹ میں چھپنے والی تحریریں، آپ کی نظر میں کس حد تک ادبی کاوشیں ہیں؟

عنیزہ سید ٭......میں ذاتی طور پر تخلیقِ ادب کے سلسلے میں کسی تقسیم کی قائل نہیں ہوں لیکن ہمارے ہاں اس بارے میں ایک شدید قسم کے تعصب نے اصنافِ ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج قائم کر رکھی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک خالص ادب عروج سے تنزلی کا شکار رہا ہے اور اب تو یہ عالم ہے کہ وہ ادب جسے خالص ادب کہا جاتا ہے اور جو ادبی پرچوں کی زینت بنتا ہے تخلیق ادب کی تکنیک سے شدید قسم کی بے توجہی کا ''شاہکار'' نظر آتا ہے۔ اچھے خاصے ادیب سستی جرنلزم کا شکار ہوتے رہے اور انہوں نے جو ادب تخلیق کیا ان کو پڑھتے، پڑھتے اگلی نسلوں میں ایسے ادیبوں نے جنم لیا جنہوں نے ادب کی نشوونما روک دی۔ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، غلام عباس، منٹو، قرۃ العین حیدر، بانو قدسیہ، اے حمید جیسے ادیب آسمان سے نہیں اترے تھے نہ ہی ان کے سروں کے گرد نور کے ہالے تھے مگر یہ سنجیدہ اور پُرخلوص قلم کار تھے۔ آج کل خالص ادب محض دفع الوقتی کے لیے لکھا جا رہا ہے۔ ادیب اور زندگی کے درمیان وہ رابطہ ختم ہو چکا ہے جو ادیب کو کائنات کا ترجمان بناتا ہے۔ اس کے برعکس ڈائجسٹ میں لکھنے والے چند قلم کار ایسے بھی ہیں جنہوں نے زندگی کی حقیقتوں کو ان کے مکمل معنوں کے ساتھ خود پر طاری کیا اور ایسے شاہکار افسانے اور ناولٹ تخلیق کیے جن کا بڑے ادیبوں کی تخلیقات کے ساتھ بلاجھجک موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اگر اس روایتی تعصب کی عینک کو نظر سے ہٹا کر دیکھا جائے تو ڈائجسٹ کا ادب سو کالڈ خالص ادب سے بہت سی تحریروں میں بہتر نظر آئے گا۔ ڈائجسٹ نے کئی ایسے مصنفین کو متعارف کروایا جنہوں نے پاپولر فکشن اور خالص ادب کے درمیان کی ایک ایسی نئی صنفِ تحریر ایجاد کی جسے پڑھنے والا طبقہ مخصوص نہیں بلکہ اسے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر قارئین کی ایک بڑی تعداد میں لامحدود توصیف وصول ہوئی اور اب تک ہو رہی ہے۔

پاکیزہ ﴾ اپنی اب تک کی تحریروں میں کس نکتے کو مرکزی حیثیت دی؟

عنیزہ سید ٭......میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ میں مذہبی، معاشرتی اور روایتی اخلاق و اقدار کی شدت سے قائل ہوں۔ میری تحریروں میں آپ کو میری اس سوچ کا عکس بارہا دیکھنے کو ملا ہوگا۔ میری تحریر کا ایک اور نکتہ خدا پر پختہ ایمان ہے۔ میرے نزدیک اس ایمان کے بغیر زندگی نامکمل اور بے سکون رہتی ہے۔ اس نظریے کی جھلک آپ کو میری تحریروں میں بھی ملے گی۔ (جی بہت زیادہ ...... یہی سب سے بڑی حقیقت ہے)

پاکیزہ ﴾ کیا ادیب یا لکھاری سیکھے ہوئے ہوتے ہیں یا تربیت پائے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں یا پھر پیدائشی صلاحیت ہوتی ہے کیونکہ آج کل تو نئی رائٹرز سیکھنے کو اور اصلاح قبول کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتیں ...... کیا انہیں سینئرز کا مطالعہ نہیں کرنا چاہیے؟

عنیزہ سید ٭......میرے نزدیک ادیب پیدائشی ادیب ہوتا ہے۔ سیکھنا اور تربیت حاصل کرنا اس پیدائشی وصف کو مزید پالش تو کر سکتا ہے لیکن محض سیکھنے اور تربیت حاصل کرنے سے کوئی ایسا شخص جس میں تخلیق کی پیدائشی صلاحیت موجود نہ ہو ادیب نہیں بن سکتا۔ آج کل اگر رائٹرز سیکھنے اور اصلاح لینے سے گریز کرتی ہیں تو ان کو یہ جان لینا چاہیے کہ پھر ان کی تحریروں کی عمر طویل نہیں ہوگی۔ سیکھنے اور ہنر میں مزید مہارت حاصل کرنے کا شوق اور لگن ہی دو ایسی کنجیاں ہیں جو تخلیق کار کے لیے

مہارت کی دنیا کے دروازے وا کر سکتی ہیں۔

پاکیزہ: آپ آج کس سے متاثر ہیں یا پسند کرتی ہیں اور اپنے شروع کے دور میں کون، کون پسند تھا؟ تحریروں کے حوالے سے؟

عنیزہ سید:......اگر آپ ڈائجسٹ کی مصنفات کے بارے میں پوچھ رہی ہیں تو میں نے مختلف مصنفات کی تحریروں سے سیکھا بھی ہے اور ان کی تحریروں نے مجھے انسپائر بھی کیا ہے۔ وحیدہ نسیم، ایم سلطانہ فخر، ذکاالرب رباب، خواتین کے پرچوں کے ایک یادگار دور کے یادگار نام ہیں۔ غزالہ نگار، رفعت ناہید سجاد، اقبال بانو، تنزیلہ ریاض، رفعت سراج، خالدہ اسد، ناہید سلطانہ اختر، عمیرہ احمد، فرحت اشتیاق، فائزہ افتخار وہ نام ہیں جنہوں نے ڈائجسٹ کے ادب کو مقبول عام بنانے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ آج کل بشریٰ سعید، سائرہ رضا، سمیرا حمید، شیریں حیدر جیسی مصنفات اپنے پیش روؤں کی روایات کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ اور بھی بہت سے نام ہیں ویسے میں سب کو پڑھتی ہوں کیونکہ مجھے پڑھنا اچھا لگتا ہے۔

پاکیزہ: کس قسم کا ماحول آپ کو لکھنے کے لیے چاہیے ہوتا ہے؟

عنیزہ سید:...... لکھنے کے لیے مجھے خاموشی، تنہائی اور مکمل فرصت درکار ہوتی ہے اس کے بغیر یکسوئی ناممکن ہے۔

پاکیزہ: آپ کے والدین اور پھر شوہر اور بچے کس حد تک معاونت کرتے ہیں؟

عنیزہ سید:......میرے والدین نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ میری والدہ میرے لیے سب سے بڑا سورس آف انسپائریشن رہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کے بغیر شاید میں کبھی نہ لکھ پاتی۔ میرے شوہر نے بھی ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی بلکہ کئی بار تو اصرار کر کے لکھوایا۔ میرا بیٹا میرے تمام اور کام پر خوش ہوتا ہے لیکن کبھی پڑھتا نہیں، بیٹی کو البتہ مطالعے کا شوق بہت زیادہ ہے اور وہ میری باقاعدہ قاری ہے۔

پاکیزہ: اپنی کسی تخلیق پر صرف ستائشی جملوں کی متمنی ہوتی ہیں یا تنقید بھی برداشت اور قبول کرتی ہیں؟

عنیزہ سید:......میں تعمیری تنقید کو ہمیشہ خوش آمدید کہتی ہوں لیکن تنقید بغیر منطق کے دل سے خلاف ہوں۔

پاکیزہ: کوئی ایسا موضوع جس پر لکھنا چاہیں مگر ہچکچاہٹ ہو رہی ہو یا متنازع موضوع ہو؟

عنیزہ سید:......میں پاک ہندوستان تعلقات پر ایک عرصے سے ایک ناولٹ لکھنا چاہ رہی ہوں۔ سرحد کے اُس پار اور سرحد کے اس پار ایک دوسرے کے بارے میں کیا سوچ، شعور اور جذبہ پروان چڑھتا رہا اور چڑھ رہا ہے۔ اس موضوع پر لکھنے کے لیے مواد اکٹھا کیے بیٹھی ہوں لیکن یہ سوچ کر کہ کہیں کوئی پوائنٹ متنازع نہ قرار دے دیا جائے رک جاتی ہوں۔

پاکیزہ: آپ نے نثر کو ہی اپنا ذریعۂ اظہار کیوں بنایا شاعری یا مصوری کیوں نہیں؟

عنیزہ سید:......کیونکہ میں نثر ہی لکھ سکتی ہوں۔

پاکیزہ: شاعری میں کس کس کو پڑھا کوئی پسندیدہ شعر سنا دیں؟

عنیزہ سید:......شاعری میں غالب، اقبالؔ اور فیض پسند ہیں۔ مصطفیٰ زیدی کی شاعری بھی اچھی لگتی ہے۔

پاکیزہ: کوئی یاد جو اکثر دل میں کھد بد مچاتی ہو؟

عنیزہ سید:......اب تو اکثر عمر رفتہ کو آواز دینے کو جی چاہتا ہے۔ ایک نہیں کئی یادیں ہیں۔

پاکیزہ: دوستی کے متعلق کیا خیالات ہیں۔

نوجوانی میں تو یہ رشتہ سب سے حسین لگتا ہے مگر گھر والے صحبت کو ترجیح دیتے ہیں۔ آپ کے خیال

میں دوستی کیا ہے اور کس حد تک ہونی چاہیے؟

عنیزہ سید ❖ ......دوستی بہت خوب صورت رشتہ ہے لیکن پھر وہی روایات اور اقدار کی بات آجاتی ہے تو ہمارے معاشرے میں ہمیشہ سے ہی دوستی کے بارے میں بڑے بزرگ احتیاط کی تلقین کرتے رہے ہیں اور احتیاط کی یہ تلقین اس معاملے میں وہ نسخہ کیمیا ہے جس سے اگر استفادہ حاصل کرلیا جائے تو دوستی کے معاملے میں تلخ تجربات سے بچا جاسکتا ہے لیکن اس نئے دور کا وہی مسئلہ کہ روایات اور اقدار کی جس حد تک ممکن ہو پاسداری نہ کی جائے اور دوستیوں کی ایسی، ایسی مثالیں قائم کی جارہی ہیں کہ کیا کہنے۔ حدود و قیود، مناسب نامناسب کی قید سے آزاد دوستیاں جب اپنے انجام کو پہنچتی ہیں تو زمانے اور وقت کو برا بھلا کہنا شروع کردیا جاتا ہے۔ انٹرنیٹ، موبائل وغیرہ پر دوستیوں کے وہ کمال شاہکار سننے اور دیکھنے کو ملتے ہیں کہ سمجھ نہیں آتا ان پر ہنسا جائے یا رویا جائے۔ میں ذاتی طور پر دوستی کے معاملے میں احتیاط اور حد میں رہنے کی قائل ہوں۔ کاش کہ ہمارے نوجوان اور بڑے اس بات کی تہ تک جائیں اور شخصیت سازی پر زور دیں)

پاکیزہ ﴾ آپ شوق سے یا زبردستی بازار جاتی ہیں؟

عنیزہ سید ❖ ......میں اکثر زبردستی اور کبھی کبھار شوق سے بازار جاتی ہوں۔

پاکیزہ ﴾ اپنے کاموں کا یا ہدف کا کوئی ٹائم پیریڈ متعین کرتی ہیں یا جب جس وقت جو ہوجائے؟

عنیزہ سید ❖ ...... ہدف مقرر کر بھی لوں تو شاید کبھی اس پر پوری نہیں اتر پاتی کیونکہ میری ذمے داریوں اور مصروفیت کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ میں باقاعدہ پلان بنا کر کوئی کام کرنے میں ناکام ہی رہتی ہوں۔

پاکیزہ ﴾ کس عمر کے لوگوں میں زیادہ خوش رہتی ہیں؟ بچوں، جوانوں یا بزرگوں میں؟

عنیزہ سید ❖ ......میری دوستی ہر عمر کے لوگوں سے ہے۔

پاکیزہ ﴾ کیا آج کل کے بزرگ اتنے ہی دلچسپ اور تحمل مزاج ہیں جیسے ہمارے والدین کے والدین ہوتے تھے؟

عنیزہ سید ❖ ......آج کل کے بزرگ وقت اور حالات کے ستائے ہوئے ہیں۔ ان کے مزاج میں وہ خوشگواری اور تحمل مفقود ہے جو ان سے پہلے کے بزرگوں میں دیکھنے کو ملتا تھا۔

پاکیزہ ﴾ آج کل کی شادی بیاہ یا دیگر تقریبات کے بارے میں کیا کہیں گی اچھا ہو رہا ہے یا کیا ہونا چاہیے؟ اپنے رسوم ورواج کس حد تک نبھاتے ہیں کوئی علاقائی ریت روایت جو آپ کو بے حد پسند ہو؟

عنیزہ سید ❖ ......آج کل کی شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے رنگ ڈھنگ بدل چکے ہیں اور شاید ہر زمانے اور دور میں لوگ اپنی آسانی اور سہولت کے حساب سے تقریبات کے انداز بدل لیتے ہیں لیکن آج کل اکثر شادیوں میں جس طرح انڈین سوپ جیسے ڈرامے اسٹیج کیے جارہے ہیں انہیں دیکھ کر ناگواری کا احساس ہوتا ہے۔ ہم اپنے روایتی طور طریقوں کو modify تو کرسکتے ہیں لیکن دوسروں کی تہذیب و ثقافت سے اس درجہ متاثر ہوجانا افسوس ناک عمل ہے۔ انسانوں، قوموں، تہذیبوں اور روایات کی اصل شکل اور مخصوص شناخت ہمیشہ برقرار رہنی چاہیے۔

پاکیزہ ﴾ انسان کی گفتگو اس کی شخصیت کی عکاس ہوتی ہے کیا اس پر بھی ملمع کاری کی جاسکتی ہے؟

عنیزہ سید ❖ ......ملمع کاری جتنی بھی کرلی جائے۔ تاڑنے والی نظر اس میں پوشیدہ اصلیت کو تاڑ ہی لیتی ہے۔

پاکیزہ: اگر ظاہرداری ہی سب کچھ ہے تو ہم باطن کی کھوج کیونکر کرتے ہیں؟ اصل میں ہماری تلاش کیا ہوتی ہے؟

عنیزہ سید: ......اس سوال کے جواب میں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا ہم باطن کی کھوج کرتے ہیں؟ کیا ہم اسی پر یقین نہیں کرلیتے جو نظر آرہا ہوتا ہے یقین جانیں کہ ہم میں سے اکثر ظاہر کو ہی حقیقت جان لیتے ہیں۔ آپ کے اس سوال کو اگر کائنات کے راز جاننے کی جستجو سے جڑا ہوا سمجھا جائے تو پھر میرے خیال میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا ہی اس جستجو کے لیے کیا تھا۔ اس کے لیے مشکل نہ تھا کہ کائنات کی ہر حقیقت کو اس حد تک ظاہر کردے کہ انسان اسے اپنی ننگی آنکھ سے دیکھ بھی لے اور اس کی عقل اسے سمجھ بھی لے۔ ان سربستہ رازوں کو سربستہ رکھنے کا مقصد ہی انسان کو جستجو اور تلاش میں مگن رکھنا تھا۔ (واہ کیا گہری بات کہی)

پاکیزہ: آج کی خاتون کو کس، کس محاذ پر لڑنا ہے شہری ہو یا دیہات سے تعلق رکھنے والی؟

عنیزہ سید: ......آج کی عورت کی زندگی مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے خود ہی اپنے لیے ایسے اہداف مقرر کرلیے ہیں جن کو پانے کے لیے اسے ایسی جدوجہد کرنا پڑتی ہے کہ زندگی کی خوب صورتیوں اور رنگینیوں کا بس نام ہی یاد رہ جاتا ہے۔ میری مراد ورکنگ ویمن سے ہے۔ جو کسی مجبوری کی وجہ سے عملی میدان میں آئی ہے تو اور بات ہے لیکن ضروریات اور خواہشات کا پیمانہ وسیع کرکے آئی ہو تو زندگی کو گراں بنالیتی ہے۔ دوسری طرف معاشرے میں عورت کے مقام کے حوالے سے پرانی سوچ تو بس ایک کلیشے بن کر رہ گئی ہے۔ وہ علاقے جہاں ناخواندگی کی شرح زیادہ ہے ان کو چھوڑ کر باقی ملک میں عورت معاشرے میں اپنی حیثیت مقرر کرنے میں خود بھی شراکت دار ہے۔ یہ اب اس پر منحصر ہے کہ وہ اپنے لیے کیا حیثیت منواتی ہے۔

پاکیزہ: اچھا اب پاکیزہ کی بات کرتے ہیں اس سے تعلق کی کہانی کب اور کیسے شروع ہوئی؟

عنیزہ سید: ......پاکیزہ سے تعلق بہت پرانا ہے۔ کب سے ہے یہ ٹھیک سے یاد نہیں۔ پاکیزہ سے تعلق جڑنے میں اور جڑے رہنے میں انجم انصار صاحبہ کا بہت ہاتھ ہے۔ وہ اتنے خلوص اور پیار سے یہاں بلاتی ہیں شوق اور خوشی کے ساتھ میری کاوشوں کو یہاں مناسب جگہ دیتی ہیں اور پھر ان پر اتنا محبت بھرا تبصرہ کرتی ہیں کہ ان کے اگلی کہانی کے لیے اصرار پر انکار کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

پاکیزہ: آپ پاکیزہ کی بہتری کے لیے اس میں کیا، کیا مزید دیکھنا چاہتی ہیں؟

عنیزہ سید: ......پاکیزہ نے اب تک ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں لیکن مزید آگے بڑھنے اور بہتری کی گنجائش تو ہمیشہ رہتی ہے۔ پاکیزہ سے دیرینہ تعلق کی وجہ سے میں اس پر اپنا حق سمجھتے ہوئے ادارہ پاکیزہ سے عرض کرنا چاہوں گی کہ معیاری تحریر کو اپنے ہاں خوش آمدید کہیں۔ معیاری تحریر کے لکھاری کی ہر لحاظ سے اتنی حوصلہ افزائی کریں کہ وہ پاکیزہ کے صفحات پکڑے رکھنے کی کوشش میں مصروف ہوجائے۔ سرورق پر توجہ بہت ضروری ہے۔ ایسے مستقل سلسلے شروع کیے جائیں جو سالوں سے چلے آرہے پرانے سلسلوں کی جگہ لیں۔ اور اس طرح سے لیں کہ انہی کو پڑھنے کی چاہ میں قاری پاکیزہ خریدنے پر مجبور ہوجائے۔ سلسلے وار ناولوں کے معیار پر بھی خصوصی توجہ ضروری ہے۔ معیاری تحریر کے مقابلے منعقد کیے جائیں اور پاکیزہ کی برسوں پرانی روایت پاکیزہ رائٹرز ایوارڈ کو دوبارہ سے شروع کیا جائے۔ اس ایوارڈ کی وجہ سے لکھنے والے زیادہ شوق ذوق اور محنت سے لکھنے پر تیار

آرمی پبلک اسکول
سانحہ پشاور

ہم اپنے بچوں کے لہو کا حساب لیں گے
کیا جرم تھا ان کا...... کیا قصور تھا؟
وہ تو علم کے راستے کے مسافر تھے
ان پیارے پھولوں سے مہکتا تھا چمن سارا
کوئی امی کی پیاری، کوئی ابو کا راج دلارا
ظالموں ان کی زندگی چھین کر تم کو کیا ملا؟
ماؤں کی گودیں اجاڑ کر کیا حاصل ہوا؟
سن لو دہشت گردوں بلند حوصلے ہیں ہمارے
ہم ہمت نہیں ہاریں گے...... اسکول آباد رہیں گے
ہم امن کے دشمنوں کو سبق سکھائیں گے
ہم روز اسکول آئیں گے...... زندگی رکتی نہیں......
ہم مستقبل کے معمار ہیں اور اس ملک کا وقار ہیں
تم طالبان نہیں ظالمان ہو...... انسان نہیں حیوان ہو
ہم طالب علم ہیں...... ہم علم کے چراغ ہیں
کتاب ہمارا ہتھیار ہے...... تعلیم ہمارا زیور ہے

شاعرہ: کشور سلطانہ، کراچی

رہیں گے۔ ایک کمی جو شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ وہ پڑھنے والوں کے خطوط میں گزشتہ ماہ شائع ہونے والے افسانوں پر تبصرہ ہے۔ پاکیزہ میں بہنوں کی محفل میں اس معاملے پر خصوصی توجہ دی جائے۔ (جی ضرور)

پاکیزہ ✤ آج کی رائٹرز کو کوئی گائیڈ لائن دینا چاہیں گی؟

عنیزہ سید ✤...... آج کی رائٹرز ہم لوگوں سے زیادہ privileged ہیں۔ ہم نے جب لکھنا شروع کیا ذرائع ابلاغ بہت محدود اور رسائی سے دور تھے۔ اس وقت کسی خاص موضوع پر لکھنے سے پہلے تحقیق اور جانچ کا ایک لمبا مرحلہ طے کرنے کے بعد حاصل شدہ معلومات کو تحریر کا حصہ بنایا جاتا تھا۔ یقین جانیں یہ جان جوکھوں کا کام اس لیے بھی تھا کہ اس وقت مجموعی کہانی یا افسانہ (ڈائجسٹ کا) ہلکی پھلکی رومانوی کہانیوں پر مبنی ہوتا تھا جن کے لیے مصنفین کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی لیکن خود میں نے اور میری کئی ہم عمر خواتین لکھاریوں نے خود کو تحقیق و موازنے کے کولہو میں سے تیل نکالنے کی مشقت پر لگایا اور کہانی، افسانے کا ٹرینڈ بدل دیا۔ اب حقائق پر مبنی، زندگی کے ایسے پہلوؤں پر کہانیاں لکھی جانے لگیں جنہیں پڑھ کر اکثر یہ بھی کہا گیا کہ دراصل یہ کوئی مرد ہیں جو خواتین کے نام سے لکھ رہے ہیں۔ یقین جانیں اس وقت یہ تحقیق یہ مطالعہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ریفرنس بکس، لائبریریوں کے چکر، اخبارات و رسائل کا باریک بینی سے مطالعہ، ہم نے اپنے دماغ چٹخ کیے اور ڈائجسٹ کی کہانیوں کو اس مقام تک پہنچایا جہاں سے اب کی رائٹرز کیو لے کر آگے چلی ہیں۔ آج کی رائٹر کے لیے آسانی یہ ہے کہ دنیا بھر کی تاریخ، جغرافیہ، ادب، آرٹ سب معلومات اس کی ایک انگلی کی جنبش تلے موجود ہیں، ایک کلک اور ایک موضوع پر ڈھیر ساری معلومات نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ ان کے لیے کام آسان ہوجاتا ہے پھر خود سے سینئر رائٹرز کی تخلیقات سامنے موجود ہیں جن سے لکھنے کی تکنیک سیکھنا آسان ہے لیکن کبھی کبھار مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ آج کی زیادہ تر رائٹرز اس سہولت سے اول تو فائدہ ہی نہیں اٹھاتیں، اٹھاتی ہیں تو تحقیق کے نچوڑ کو سمجھنے کی کوشش کیے بغیر

ادھوری معلومات سے بھرپور اضافہ سامنے لے آتی ہیں۔ اس کا مطلب اپنے قاری کو مس گائیڈ کرنا ہے۔ آج کی تحریر میں امیچورٹی کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے۔ میری آج کی رائٹرز سے التماس ہے کہ اپنی تحقیق اور معلومات کو آخری حد تک مکمل کرنے کے بعد ان کا ذکر اپنی تحریر میں کیا کریں۔ دوسری شکایت مجھے ان قلم کاروں سے یہ ہے کہ زبان کی صحت کا خیال رکھنا بھول جاتی ہیں، اس کی بنیادی وجہ تو اپنی زبان سے ناآشنائی ہی ہوسکتی ہے لیکن ایک اور بڑی وجہ غیر ملکی خصوصاً ہندوستانی ڈراما اور فلم بینی کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔ اس چیز کا اثر ہمارے سیٹلائٹ چینلز کے اینکرز کی زبانوں پر بھی ہے اور ان سے ہوتا ہوا ہماری عام بول چال اور لب و لہجے پر بھی آتا جارہا ہے۔ میں یہاں عرض کرنا چاہوں گی کہ ”میرا اپنا خود کا ٹی وی اور پاکستان کو لے کر کے میں بہت پریشان ہوں .....“ جیسے جملے اردو زبان کا حصہ نہیں کہلا سکتے۔ میرا ٹی وی یا میرا اپنا ٹی وی اور پاکستان کے حوالے سے میں بہت پریشان ہوں اردو زبان کے جملے ہیں، خدا کا واسطہ ہے روزمرہ میں اس ناقابلِ برداشت آمیزش کو لکھے ہوئے لفظ کا حصہ نہ بنائیں۔ زبان پر عبور حاصل کریں، مطالعے کی عادت ڈالیں، بامقصد تحریریں لکھیں۔ کمرشل کہانیاں بہت ہوچکیں اور شوق و لگن سے لکھیں..... لکھنا برائے لکھنا محض وقت کا [illegible] نے اکثر نئے مصنفین کو ایک دوسرے سے کہانی کے معاوضے پر بات کرتے اور معاوضے کو تجربے کار مصنفین کے مقام اور عوضانے پر بحث کرتے بھی سنا ہے جبکہ مجھے نہیں یاد کہ ہم نے تخلیق کے اولین زمانے میں کبھی معاوضے کی پروا بھی کی ہو۔ اگر آپ ابھی سے تحریر کو رقم کے ترازو میں تولنے لگیں گی تو یقین جانیے آپ کا آگے کا سفر مختصر سے مختصر ترین ہوتا جائے گا۔ کوالٹی کو ریوارڈ سے موازنہ کرنے کے بجائے اگر ابھی صرف کوالٹی پر توجہ دیں گی تو یقیناً ریوارڈ کا حجم بہت بڑھے گا لیکن وقت آنے پر۔

پاکیزہ: آج کل کی ڈائجسٹ رائٹرز کا ٹی وی کے لیے اسکرپٹ لکھنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے دونوں میں سے کون سا میڈیم تخلیق کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

عنیزہ سید: ..... یقیناً دونوں میڈیم تخلیق کا منبع ہیں لیکن ہم بھلے کتنے بھی اسکرپٹ کیوں نہ لکھ لیں چھپے ہوئے اور کتابی شکل میں سامنے آئی چیزوں کی اہمیت ہی کچھ اور ہے۔ یہ تاریخ کی گرد کے نیچے سے بھی اولین دن کی طرح ہی نکلتی ہیں۔ مصنف کے نام اور تعارف کے ساتھ جبکہ اسکرین پر چلنے والی چیز کی عمر صرف اتنی ہے جب تک وہ اسکرین پر چل رہی ہے۔ کلاسیکی فلموں اور ڈراموں کے علاوہ...... سو میرے نزدیک چھپا ہوا لفظ، اسکرین پر بولے جانے والے ڈائیلاگ سے زیادہ اہم ہے۔

پاکیزہ: اپنے قارئین سے کوئی دل کی بات تو ضرور نہیں کہ وہ پسندیدہ رائٹرز کی باتیں پلو سے باندھے رکھتے ہیں؟

عنیزہ سید: ..... قارئین سے دل کی باتیں تو پہلے ہی بہت کرلیں۔ ایک خصوصی بات یہ کہنی ہے کہ ذوقِ مطالعہ کو پہلے سے بہتر کرنے کی کوشش ضرور کریں۔ اچھی تحریروں کے متلاشی رہیے اور لکھے ہوئے لفظ سے سیکھنے کی کوشش بھی۔ (بہت اچھا)

پاکیزہ: ٹی وی دیکھنا کیسا لگتا ہے اب تو چینلز کا چناؤ ہی مشکل ہے، آپ کی دلچسپی کس میں ہے؟

عنیزہ سید: ..... موڈ پر منحصر ہے۔ موڈ ہو تو کئی گھنٹے ٹی وی دیکھ لیتی ہوں۔ نہ ہو تو کئی، کئی دن نہیں دیکھتی۔ چینلز صرف وہی دیکھتی ہوں جہاں میری پسند کا کوئی پروگرام نظر آجائے۔

پاکیزہ: لکھنے پڑھنے کے علاوہ اور کیا مشاغل ہیں؟

عنیزہ سید ❖...... میری گھریلو مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ لکھنے پڑھنے سے ہٹ کر وہی شروع ہو جاتی ہیں۔

پاکیزہ ◀ نوجوان بچیوں کو بھی کچھ نصیحت فرما دیں؟

عنیزہ سید ❖..... آج کل کی نوجوان بچیاں ماشاء اللہ اپنے سے پہلی نسلوں کی بچیوں سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ ان کے پاس سیکھنے اور سمجھنے کے ذرائع زیادہ ہیں۔ میری ان سے درخواست ہے کہ کسی بھی چیز کے منفی استعمال سے بچنے کی کوشش کریں کیونکہ مثبت ہمیشہ روشن اور پُرکشش ہوتا ہے۔

عنیزہ سید ❖...... چند سوالات لاہور سے میری ایک قاری عصمت بخاری نے بھیجے ہیں جن کا جواب دینا چاہوں گی۔ عصمت نے پوچھا ہے کہ شامِ شہرِ یاراں کے کردار میرال صلاح الدین اور مہرزاد خان اصلی ہیں یا محض تصوراتی۔ عصمت دونوں کردار دو اصلی کرداروں کے عکس ہیں۔ مکمل نہ سہی مگر خاکہ اصلی کرداروں سے ہی لیا گیا ہے۔

آپ نے دوسرا سوال ...... بڑے صاحب اور باڈی گارڈ کے ہاتھوں قتل ہونے والے وفاق کے نمائندے کے حوالے سے کیا ہے تو اگر آپ ان کو پہچان گئی ہیں تو یہ بھی جان لیجیے کہ پر ہوتا ہے تو کوا بنتا ہے۔ یہ پر سے کوے بننے والی بات ہی ہے۔ ہاں اوپر والوں کی اوپر کی باتوں سے فرصت ملے تو ہی نیچے والوں کو دھمکیاں دے سکتے ہیں۔

تیسرا سوال دانیال جہانگیر اور ایک اور ناول کے کردار سعد سلطان کے حادثات کی مماثلت کے حوالے سے ہے تو ان دونوں حادثات میں فرق یہ ہے کہ دانیال کی بچ جانے والی زندگی ایک معجزہ تھی اور سعد سلطان کی بچ جانے والی زندگی اس کے لیے ایک تنبیہ تھی۔ معجزہ دانیال کے لیے نئی دنیا کے در وا کر گیا اور تنبیہ سعد سلطان کو واپس اس زندگی کی طرف لے آئی جو اس کا اصل تھی اور یقین جانیں کہ دنیا بھر میں ایسے حادثات سے معجزاتی طور پر زندہ بچ جانے والوں کی تعداد قلیل تو ہرگز نہیں ہے۔

چوتھا سوال سائیں اختر اور صوفی صاحب کے متعلق ہے تو ایسے سوالات کے جواب میں، میں ہمیشہ یہی کہتی ہوں کہ اپنے اردگرد نظر ڈالیں آپ کو کہیں نہ کہیں لوگوں کے اس ہجوم میں سائیں اختر یا صوفی صاحب ضرور نظر آ جائیں گے۔ آپ کی تعریف و توصیف کے لیے میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔

☆☆☆

جی قارئین ہمیں سو فیصد یقین ہے کہ آپ کو یہ فصیح و بلیغ .... مفید معلومات اور خوب صورت خیالات سے پُر یہ گفتگو ضرور پسند آئی ہوگی۔ عنیزہ نے ہماری اور ہمارے قارئین کی دیرینہ خواہش کا احترام کیا اور ہمارے رسالے کو رونق بخشی۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری آج کی یہ بزم آپ کو ضرور محظوظ کرے گی اور سالگرہ نمبر کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔

انشاءاللہ اگلی بزم میں کسی اور کہنہ مشق رائٹر کے ساتھ دلچسپ گفتگو لے کر حاضر ہوں گے۔

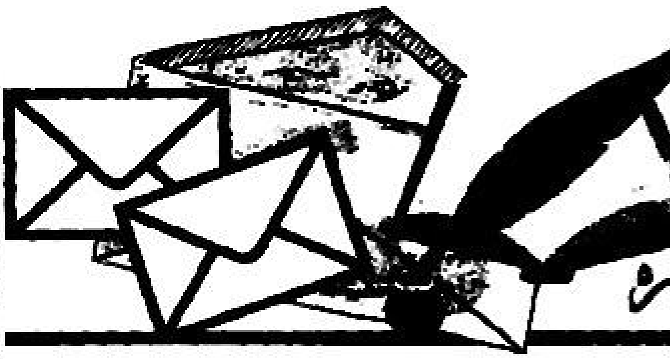
جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

بڑی مشکل ہے

مالک، ملازم سے۔ ''بلی تو میری مری ہے تم کیوں رو رہے ہو؟''

ملازم۔ ''جناب! اب میں دودھ پی کر کس کا نام لگاؤں گا۔''

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد



بہنوں کی محفل

مدیرہ

■ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

■ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

■ پیاری بہنو! آپ سب کو پاکیزہ کی [illegible] سالگرہ مبارک ہو۔ (ماشاء اللہ) ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ پاکیزہ میں ترقی و فروغ دیا جائے اسی لیے ہم نئے موضوعات کو زیادہ سے زیادہ شامل کیا کرتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ سچا ادب وہی ہے جو زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرے اور کسی طرح وقتی ادب نہ ہو جو [illegible] ہے جس کا ہاتھ معاشرے کی نبض پر ہو اور جو زندگی کے ہر گوشے کو محسوس کرتا ہو اسے پوری سچائی کے ساتھ قلم بند کرے۔ اسی حقیقت پسندی کے باعث ادب میں افادیت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور مقصدیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ الحمدللہ پاکیزہ کی مصنفات ہوں، شاعرات، تبصرہ نگار یا مراسلات تحریر کرنے والی بہنیں [illegible] ہم سب کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انتہائی محنت اور محبت کے ساتھ اپنی تحریریں ہمیں روانہ کرتی ہیں۔ پاکیزہ میں آپ سب کا مقام بے حد اہم ہے اور آج آپ سب کے لیے ہماری یہی دعا ہے کہ کامیابیوں اور کامرانیوں کے بلند مقام پر پہنچیں۔ آمین ثم آمین۔ پاکیزہ کے اس خصوصی شمارے میں میری جانب سے [illegible] کے لیے ناول اور کہانیاں تو ہیں ہی مگر میرا دل اپنی مصنفات، تبصرہ نگار بہنوں اور ان کی تحریروں کے حوالے سے دلچسپ اعزازات دینے کو چاہ رہا تھا۔ جیسے چنچل ایوارڈ، حق [illegible] ایوارڈ، [illegible] ایوارڈ، [illegible] ایوارڈ، کہانی ایوارڈ، چٹنی ایوارڈ، باچل ایوارڈ، فرمائشی ایوارڈ، ہنسی خوشی ایوارڈ، بصیرت افروز ایوارڈ وغیرہ وغیرہ۔ مگر آج میں اپنی تمام مصنفات جس میں سینئر اور جونیئر تمام مصنفات ہی شامل ہیں اور تبصرہ نگار بہنوں کو اس میں بھی تمام نئی اور پرانی ساری ہی بہنیں شامل ہیں۔ آپ کو آپ کی خوب صورت تحریروں کی وجہ سے جو حقیقت میں پاکیزہ کا سرمایہ ہیں [illegible] کے بہترین کارکردگی کا پاکیزہ ایوارڈ دے رہی ہوں کہ یہ حقیقت ہے کہ تحریروں کی پاکیزگی اور [illegible] نہ صرف صحیح راستے پر گامزن کرتی ہے بلکہ ایک سکون اور طمانیت بھی عطا کرتی ہے۔ ایک ایسی خوشی جو رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑا دے [illegible] وہ ہمیشہ پاکیزہ کی ہو کر رہتی ہے [illegible] کا ہی دوسرا نام ہے [illegible] شر سے بھی محفوظ اور اطمینان کی دولت کبھی نہیں چھوٹا کرتی۔

آپ سب کو بے حد مبارک باد ہو۔ (الحمدللہ اس سال کوئی بہن مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتی کہ میں کسی کا نام بھول گئی ہوں) اور اب پاکیزہ کی برسوں سے روایت ہے کہ اپنے قلم کاروں کو [illegible] جو اب اور نہ ہی انہیں بھلایا جاتا ہے [illegible] ان کے بچھڑ [illegible] چاہے اپنی جوا [illegible] مصنفات، شاعرات، تبصرہ نگار ہوں ان کے لیے صرف ایک بار سورہ فاتحہ اور صرف تین بار سورہ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کے لیے ضرور دعا کریں۔ یہ ان کا ہم





پڑتی ہے کہ وہ سب شک ہم میں نہیں ہیں مگر اپنی تحریروں میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

رضیہ بٹ، خالدہ اسد، نسیم اسحر قریشی، فاطمہ شہناز مرتضیٰ، عفت سحر طاہر، ایم سلطانہ فخر، شازیہ چوہدری، بلقیس ظفر، ایم اے صوفیہ، مسز صفیہ حسین، چاندنی عمران، ظفران عباسی، ناصرہ طالب، شگفتہ کنول، پروین شاکر، وحیدہ نسیم، تحسین فاطمہ زیدی، کوثر سلطانہ، ناظرہ بیگم، ناہید، عطیہ بانو، فرزانہ سلیم، ہما عروج، فرحت ناز، ملک۔

میں خلوص دل سے اپنے ادارے کا اور خصوصی اپنے معاونین کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ آمنہ عبداللہ اور نزہت اصغر بڑی مخلص خواتین ہیں اور بڑی مستعدی سے کام کرتی ہیں اور ہر کام پوچھ کر اور مشورہ کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتیں۔ حقیقتاً یہ دونوں خواتین میری ہمت اور توانائی ہیں۔ اسی طرح میں آفس میں میرے دیگر معاون، شہزاد صاحب اور مجید صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں گی۔

اب محفلوں پر نظر ڈالنے سے پہلے ایک بار دوبارہ انہیں پڑھتے ہیں جو ہم نے رمضان میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھنا ہے۔ اپنے حق کے لیے اور تمام مسلمانوں کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا کریں۔

⁂

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری اور معاون مسز طلعت اشفاق وہم نے کراچی کی ایک بھانجی اور ایک بھانجے کی شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی جس میں شکاگو سے بھی مہمان شرکت کے لیے آئے۔ (مبارک ہو)

☆ اس ماہ ہماری تبصرہ نگار شبنم کنول کے آنگن پوتی کی آمد ہوئی ہے۔ (مبارکاں)

☆ گزشتہ دنوں پاکیزہ کی بہت پیاری سی قاری مقدس کا نکاح حافظ شان کے ساتھ خوب دھوم دھام سے کراچی میں ہوا۔ (مبارکاں رابعہ، فوزیہ، ثمینہ، نسرین اور آمنہ کو بھی بے حد مبارک ہو)

☆ گزشتہ دنوں پیاری محترمہ عذرا جمالی کی ناول تریم ادب پاکستان کے تحت ایک تقریب ہوئی جس کی صدارت ناول نگار محترمہ آسیہ بنت عبداللہ صدیقی نے کی۔ محترمہ افشاں نوید مہمان خصوصی تھیں اور میزبانی کے فرائض عزالعزیز نے انجام دیے۔ شرکاء نے محترمہ عذرا جمالی سے تعارف اور تخلیق کے حوالے سے گفتگو کی۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ثروت مسعود کے بیٹے عمر مسعود کی شادی ڈاکٹر عروج سے ہوئی ہے۔ جس میں مہمانوں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔ (مبارک ہو)

☆ اس ماہ ڈاکٹر شمیم فاطمہ صدیقی کے پوتے اور ڈاکٹر عمران اور ڈاکٹر عظمیٰ عمران کے پیارے بیٹے ڈاکٹر فرجاد اور ان کی دلہن ڈاکٹر ردا کا ولیمہ پی اے ایف میوزیم کراچی میں ہوگا۔ جس میں ہماری بھی شرکت ہوگی۔ (انشاء اللہ پیشگی مبارک ہو)

☆ پاکستان میں کئی خواتین افسانوں کی صنف سے وابستہ ہیں اور سماجی معاملات اور ملکی حالات پر بھرپور تجزیے کرتی ہیں ان میں ایک نام افشاں نوید کا بھی ہے۔ ان کی مضامین کا مجموعہ نوید فکر کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ جس پر قیمت درج نہیں ہے۔ منگوانے کا پتہ D 35 بلاک 5 فیڈرل بی ایریا کراچی 75950 فون نمبر 021-36809201۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار راحیل شاہ ان دنوں ملائیشیا سے پاکستان آئی ہوئی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار سعدیہ ہما شیخ کے حوالے سے دو خبریں ہیں پہلی یہ کہ ان کی بہن ثنا شیخ کی منگنی حافظ راحیل کے ساتھ بخیر و خوبی انجام پائی اور دوسری پیاری خبر یہ ہے کہ اس ماہ ہماری سعدیہ ہما شیخ اپنی شادی کی سالگرہ منا رہی ہیں۔ (مبارک ہو)

☆ مصنفہ اور پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار گلشاد نذیر مری کی پیاری سہیلی کی بیٹی کائنات کی شادی راولپنڈی میں ہو رہی ہے۔ (مبارک ہو)

☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار یاسمین کنول، پسرور کا بیٹا عبداللہ چھت سے گر گیا تھا۔ الحمدللہ اب وہ ٹھیک ہے۔ (اللہ اس کو ہمیشہ اپنی امان میں رکھے، آمین)

☆ پاکیزہ کی مصنفہ، شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار ام ایمان قاضی، کوئٹہ ان دنوں عمرے کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب گئی ہوئی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ ہماری ماہنامہ مصنفہ نگہت اعظمی، کراچی ان دنوں حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہ پر کتاب لکھ رہی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری رجا فاطمہ، کراچی کا ڈاؤ میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو گیا ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز خان، کراچی ان دنوں پریشان ہیں، ان کی پریشانیاں دور ہو جائیں۔ اس کے لیے دعا ضرور کیجیے گا۔

☆ گزشتہ دنوں حنا سعید کی بہن ہما کی شادی عرفان کے ساتھ ہوئی۔ (مبارک ہو)

☆ عظمیٰ آفاق سعید کی پہلی کتاب ذرا سا چاند اجالوں میں جس میں تین ناولوں کے مجموعے ہیں۔ شائع ہونے کے مراحل میں ہے۔ کتاب کا انتساب عظمیٰ آفاق کی بیسٹ فرینڈ کے نام ہے۔ قیمت صرف 300 روپے ہے۔ آپ یہ کتاب اپنے گھر بیٹھے بھی حاصل کر سکتی ہیں کہ اس کے پیسے یا اپنا ایڈریس بھیج دیں۔ وہ بذریعہ ڈاک یا دستی طور پر آپ کو کتاب آپ کے گھر پہنچا دیں گے اور کتاب لانے والے کو آپ کتاب کی قیمت ادا کریں۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس نوٹ کریں۔ القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر 042-37652546 ــ 042-37668958

☆ معروف شاعرہ شگفتہ شفیق کا نیا شعری مجموعہ بہت جلد آنے والا ہے۔ (مبارک ہو)



دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عائشہ جبار خلیل، مظفرگڑھ کے بچوں کی ذہنی حالت کمزور ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راولپنڈی بیمار ہیں۔

☆ شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار امینہ عندلیب، ملتان آج کل بہتر حالت پر ہیں۔ وہ ان دنوں ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔

☆ مسز اے آر صدیقی، سندھ ان دنوں علیل ہیں، شوگر کی وجہ سے ان کی ٹانگوں میں سخت درد رہتا ہے۔

☆ واہ کینٹ سے مونہ غوری کی والدہ سخت علالت پر ہیں۔

☆ مسز راشد، کراچی کے بیٹے کی ذہنی حالت بے حد کمزور ہے۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار فرح ناز، بھوپال کے جوڑوں میں درد اور پٹھوں میں کھنچاؤ رہتا ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز تنویر اقبال بخاری، کراچی کے جوڑوں میں درد کی شکایت



ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ستارہ، کراچی کی شادی ہو جانے کے باوجود پڑھتی ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری صابرہ خورشید، فیصل آباد کی والدہ بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ نجمہ اصغر، کراچی علیل ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، راولاکوٹ کی بہن نصرت گل بیمار ہیں۔

☆☆☆

انتقال پر ملال

☆ پاکیزہ کی مصنفہ بلال احمد، کراچی کے والد انتقال کر گئے۔

☆ مصنفہ شمشاد اختر [illegible] انتقال کر گئیں۔

☆ پاکیزہ کی قاری صائمہ نایاب کی نانی شمس النساء کراچی میں چل بسیں۔

☆ 4 اپریل میں میرے والد جناب انصار حسین صدیقی کی برسی ہے۔

☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار نجمہ اصغر، کراچی کے شوہر کی اس ماہ برسی ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ناہید بنت نور، [illegible] کے بھائی کی [illegible] برسی ہے۔

☆ مصنفہ اور شاعرہ فصیحہ آصف خان، ملتان کے تایا انتقال کر گئے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فریدہ جاوید، کراچی کی بہن فہمیدہ وسیم انتقال کر گئیں۔

☆ شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار صائمہ جاوید [illegible]، لودھراں کی نانی چل بسیں۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کی دعا کریں۔

☆☆☆

سمعیہ کلثوم بلال [illegible]: میں [illegible] سے پاکیزہ کی مستقل قاری ہوں۔ مجھے اس کے سب سلسلے خاص طور پر بہنوں کی محفل بے حد پسند ہے۔ میں رسالہ پڑھنے کی تمام بہنوں کی محفل سے منسلک ہوں اور ان تمام بہنوں کی خوشی میں شریک ہوں۔ اور ان کے لیے دعاگو ہوں [illegible] تمام [illegible] آفات [illegible] سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ [illegible] بھی مجھے بے حد پسند ہے۔ [illegible] مشورے کا تو جواب ہی نہیں [illegible] بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور نجم انصار صاحب کی نصیحتوں پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں رسالے کی مزید ترقی کے لیے دعاگو ہوں۔ آپ مجھے ستمبر، اکتوبر اور نومبر 2014ء کے شمارے [illegible] تو میں آپ کی بہت مشکور ہوں گی۔

آخر میں تمام رائٹرز اور قارئین بہنوں سے التماس ہے کہ وہ میرے اور میری بچیوں کے لیے دعا کریں۔ اللہ آپ سب کو اجر عطا فرمائے۔ آمین۔ (پیاری بہن، [illegible] محفل میں خوش آمدید [illegible] آپ کی محبت [illegible] کا شکریہ [illegible] اب باقاعدگی سے اس محفل میں شریک ہوا کریں۔ [illegible] آپ کے لیے [illegible] دعا کریں گی)

سمیرا [illegible]: [illegible] پاکیزہ [illegible] خوب صورت [illegible] نگاہ [illegible] کرتے ہوئے بڑھے [illegible] خوب صورت [illegible] قارئین [illegible] خوب صورتی سے [illegible]

کی گئی ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام سے پردہ عورتوں کا انجام اور خاندانی محرم، نامحرم رشتوں کی خوب صورت
وضاحت نے اس موضوع کو شعور آگہی کا درس دیا۔ افسانے بھی اپنی مثال آپ تھے خوب۔ بنت حوا کی تحریر چھوٹی سی مگر
اپنے اندر برداشت اور وسعت نظر کا وسیع و عریض جہاں آباد کیے ہوئے تھی۔ شمع ہدایت، روحانی مشورے
اور بیوٹی پارلر کے پیارے سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح معلومات میں اضافہ کیے۔" (شکریہ)

سید ظل شاہین، رحیم یار خان سے۔ "بہار نمبر پورے سات ناول کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔
ہمیشہ کی طرح ناول سب سے پہلے پڑھا، یقیناً آنے والے دنوں میں بہت سے بندے کا بھی لیے ہے اور پھر اپنی خوب صورت
اعتبار وفا پڑھا اب یہ ناول نہایت ہی دلچسپ اور پرتجسس ہو گیا ہے۔ چھوٹا بھائی مرداروں کا تعلق بھی اس قسط
میں سمجھ آ رہا ہے۔ بہار نمبر اس بار مجھے تو افسانہ نمبر لگا۔ چھ افسانے پڑھے جن میں پہلے شیریں حیدر کا افسانہ
پڑھا واقعی یہ دنیا مکافات عمل ہے۔ احمق چڑیاں اور چار دیواری میں معصوم لڑکیاں موبائل گزیدہ
تھیں۔ موبائل اور انٹرنیٹ کے منفی اثرات بہت تیزی سے نوجوان نسل کو اپنی لپیٹ میں لے کر تباہی کے
دہانے پر پہنچا رہے ہیں۔ اسیری بھی پڑھا مگر اس پر کچھ نہیں کہوں گی کہ سزا اور جزا کا معاملہ تو میرا رب ہی
جانتا ہے۔ محبت بیداں ملیحہ غزل کی اچھی تحریر تھی، محبت، ریاضت اور قربانی حفصہ ان خوبیوں کا مجموعہ تھی۔
اینڈ اچھا تھا۔ مستقل سلسلے بہترین رہے جنت نمبر میں دونوں خاکے اچھے تھے۔ روحانی مشورے میں
انبیائے کرام کی دعا میں بہترین ہیں۔ گزشتہ ماہ شمع ہدایت، اختر شجاعت کے قلم سے بہت ہی فکر انگیز اور
پُرتاثیر تحریر تھی۔ اور موبائل پر پنپنے والی محبت پر سروے میں ناہید سلطانہ اختر اور صائمہ اکرم نے زبردست
جوابات دیے۔ ناہید آپا نے مختصر مگر جامع انداز میں منطقی جوابات دے کر گویا دریا کو کوزے میں بند
کر دیا۔ بہت خوب صائمہ اکرم نے محبت کے بارے میں بہت تجزیہ اور بے ساختہ رائے دی اور محبت
کے حوالے سے مختلف رائٹرز کے خوب صورت اور گراں قدر نظریات کو شامل کر کے اپنے جوابات کو مزید
خوب صورت تحریر میں ڈھال دیا۔ (ہماری صائمہ اور ناہید سلطانہ کے جوابات اچھے ہونے ہی تھے بلکہ دیگر
مصنفات نے بھی منفرد و مختصر سے اچھے جوابات دیے) اور اب بہنوں کی محفل کی کچھ بات
ہو جائے۔ آپ اپنے بیسٹ گئیں، آپ کی اسلام آباد کی سرگرمیاں، ملاقاتیں پڑھیں بہت اچھا
لگا۔" (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

سید ستارہ امین کومل، پتوکی سے۔ "آپ کی چار ماہ سے مستقل قاری ہوں، پاکیزہ بہت
بہترین رسالہ ہے۔ اعلیٰ معیار، زبردست سرورق، آپ کے انداز تحریر کی تو کوئی مثال نہیں
آپ اتنی محبت و خلوص سے گفتگو یوں لگا ہم سب آپ کے اپنے بہت خاص عزیز ہوں۔ پاکیزہ
پڑھ کر ہم اداس ہو جاتے ہیں۔ اب ہمیں آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ اللہ پاک آپ کو محبت و شفاء کی
بھی عمر سے نوازے، خوش و خرم رکھے آپ کی ہمارے شہر پتوکی میں پاکیزہ بہت لیٹ آتا
ہے 7.5 تاریخ کو ملتا ہے تو ہم سب سے میں لیٹ ہو جاتے ہیں۔" (ستارہ امین، اس محفل
میں خوش آمدید ہمیں آپ کا تبصرہ پڑھ کر یوں لگا جیسے یوں ادھار تو محبت کی پنچی ہے۔ آپ جس
دکان سے پاکیزہ خریدتی ہیں اس کا پورا نام، ایڈریس اور وہاں کا فون نمبر بھی ہمیں لکھ بھیجیں یہ
پاکیزہ کی مستقل خریدار بن جائیں۔ آپ نے فرحانہ ناز ملک کی تحریروں کے بارے
میں پوچھا تو اب شائع نہیں ہوتیں اور فرحانہ کی تحریر آئی تو ادارہ کوئی بھی
شائع کرے گا مگر رابطہ تو کیا جائے)

سید ناظمہ شاہین، اعوان ٹاؤن لاہور سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے ایک مختصر مگر جامع تحریر واہ





باجی مزہ آگیا۔ آپ پتا نہیں کہاں سے اتنے اچھے، اچھے موضوعات نکال لاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ برکت دے، آمین۔ اعتبار وفا، رنگ خلش، بادل تیری دہلیز پر محبتوں کے رنگ، جنگل کا پھول اور ترک وفا بہت زبردست اور سبق آموز تحاریر ہیں۔ ترک وفا مکمل ہونے کی خوشی میں نایاب جیلانی صاحبہ کو مبارک باد پیش کرتی ہوں باوجود اس کے کہ مومن پر بہت ترس آرہا ہے۔ باقی افسانے اور مضامین بھی بہت اچھے تھے لیکن شمع ہدایت اور ہم وطن کے ہوگئے کی کیا ہی بات ہیں اور جنتر منتر تو دل مردہ کے لیے ایک ٹانک ہے کہ میرے جیسے روتے منہ بسورتے لوگوں کے چہرے تھوڑی دیر کے لیے ہنسی ومسکراہٹ سے سج جاتے ہیں۔ موبائل اور انٹرنیٹ پر پنپنے والی محبت تو یہ محبت نہیں دھوکا ہے، ٹائم پاس کرنے کا ذریعہ ہے۔ ذلت و رسوائی ہے، پانی کا ببلہ ہے جو تھوڑی دیر کے لیے ابھرتا ہے ایک صاف ستھرے کردار پر دھبا ہے۔'' (ہمیں آپ سے سو فی صد اتفاق ہے)

سمیہ نگہت اعوان، سرگودھا سے۔ ''پیارے پاکیزہ کو سالگرہ مبارک ہو اگرچہ میں باقاعدگی سے پرچا پڑھتی ہوں۔ کبھی، کبھی اشعار وغیرہ بھی بھیجتی ہوں مگر تبصرے کم، کم لکھے ہیں۔ پاکیزہ میں کہانیوں کا انتخاب ہی اس کی الگ شناخت ہے اور آپ نے مستقل سلسلے بھی کافی سوچ سمجھ کر رکھے ہیں۔ بس ایک سلسلہ حسن کے متعلق یعنی بیوٹی کے مشورے ضرور شامل کریں آپ سب کو رسالے کی سالگرہ کی ڈھیروں مبارک باد ہو۔'' (شکریہ)

سمیہ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''بہار نمبر کا سرورق بھی بہار ہی دکھار ہا تھا کیونکہ ماڈل پیلے پھولوں سے مزین بہت بھلی دکھ رہی تھی۔ ناولز اور افسانوں میں اسیر وفا، اعتبار وفا، رنگ خلش، متاع دل، جنگل کا پھول، آئینہ، اب صبح ہونے کو ہے پسند آئے۔ رضوانہ پرنس نے سنبل اقبال سے خوب ملاقات کروائی۔ آپی عذرا کو بیٹے کی شادی کی مبارک باد دیتی ہوں۔ تصویروں کی منتظر ہوں۔ امینہ عندلیب، فریدہ جاوید فری کو اللہ تعالیٰ مکمل صحت وتندرستی عطا فرمائے اور ہمیشہ خوش وخرم رہیں، آمین۔ آپ سے گزارش ہے کہ بزم پاکیزہ کا سلسلہ دوبارہ شروع کردیں یہ سوال وجواب کا بہت ہی اچھا سلسلہ تھا۔'' (اب ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں)

سمیہ مصباح مقدم، کراچی سے۔ ''سب سے پہلے میں یہ بتاتی چلوں کہ کسی بھی رسالے میں یہ میرا پہلا خط ہے، یوں تو میں اک عرصے سے آپ کی خاموش قاری ہوں مگر جیسے، جیسے پاکیزہ ترقی کی منازل طے کررہا ہے اس کی واد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ ہمیشہ کی طرح اس ماہ کا پاکیزہ بھی شاندار تھا۔ سرورق پر موجود ماڈل واقعی بہار کی آمد کا پیغام دیتی نظر آئی۔ سلسلے وار ناول ہمیشہ کی طرح شاندار تھے۔ البتہ مٹی ناول میں ڈاکٹر خاور کا ریشم سے متعلق انکشاف واقعی سسپنس میں مبتلا کرگیا اور اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ نبیلہ راجا کا متاع دل بھی اپنی مثال آپ رہا۔ اگر صحیح وقت پر ذوالفقار مجید کی سیکلی کا خط نہ پڑھتا تو جانے کیا ہوتا سچ ہے کہ شک خلوص ومحبت بھی گہنا دیتا ہے اور نتیجہ صرف پچھتاوا رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آئینہ، احمق چڑیاں، نام تیرے نام، طوفان کے بعد، چادر اور چاردیواری اصلاحی نکتے سے بھرپور تھے۔ امرشامہ اور سنی غزل دل کو چھوگئیں۔ سیما سراج کی تحریر نہ پاکر مایوسی ہوئی۔ پچھلے ماہ میرے امتحان ہورہے تھے اور شانیہ کالج میں ہیپی دے رہی تھی تو معلوم ہوا کہ یہاں تو سیما سراج پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔ اب ہم اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے کہ جائیں یا نہ جائیں جانے





گا۔ ویسے آپ کو اتنا بتادوں کہ پاکیزہ کی سالگرہ کا کیک میں بھی کاٹتی ہوں۔ سال ابھی تو یوں ہی بج رہی ہوتی ہیں کہ آنکھ کھل جاتی ہے۔ لیکن بھی غرور نہیں کیا۔ بس اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے اتنی عزت دی۔" (گڑیا پاکیزہ کی سالگرہ پر تو کوئی تقریب ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کو کارڈ بھیجے گئے ہیں۔ ہم لوگ سادگی اور میانہ روی کے قائل ہیں۔ آپ کو اندازہ تو ہوجانا چاہیے)

سے **فرخندہ لطیف**، رحیم یار خان سے۔ "مجھے پتا نہیں کہ آپ نے جو بات کی وہ ہم سب کی ذات کا تاریک حصہ ہے۔ شکری معصوم نہیں کیوں ہوری عادت بن چکی ہے۔ سلسلے وار ناول اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ متاثر ناول نبیلہ ابر راجہ تو میری پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ عروہ آپی۔ امیہ وفا پسند آئیں۔ اچھا زمر نعیم بھی لکھنے والی ہیں کیا؟ (جی نہیں) افسانے چودہ افسانے ماشاءاللہ تمام مصنفات کی کاوشیں کامیاب ٹھہریں۔ افسانہ نہیں حقیقت ہے میں اف نوکی انداز کا انٹرویو سنبل اقبال سے ملاقات تو مجھ بہت زیادہ متاثر کر گئی۔ تمام مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح خوب تر رہے۔" (تبصرے کا شکریہ۔ آپ کا افسانہ قابل اشاعت ہے)

سے **عظمیٰ**، بلوچستان سے۔ "ناول بہت پیاری تھی۔ پھولوں کی طرح مہکتی ہوئی آپ نے جو کچھ لکھا ہے، میں بہت کچھ سمجھ گئی۔ آپی ہمیشہ کی طرح پڑھنا بہت اچھا ہے۔ پڑھنے کو اس بار ساری وفا نہیں ملی۔ اقبال وفا تو ہیں امیہ وفا۔ جنگل کا پھول اب شہری پھول بنتے جارہی ہے خرم اور ہشام کا تیکھے اختلاف رہا ہے۔ عمرانہ کا نقش بھی بہت خوب رہی۔ امید کرتے ہیں کہ وفا اور روحان کی سچائی اگلی قسط میں پڑھنے کو ملے گی۔ رفاقت جاوید باقی چیزیں جلدی سے بتا دیجئے گا کہ عادل اور ثمرانہ کی شادی کب ہوگی۔ نبیلہ ابر راجہ نے ناول متاثر کن نے واقعی اپنا سحر طاری کر دیا۔ وفا خوب لکھتی آپ نے اپنا مقام بنا لیا اسیہ وفا خوب پڑھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ شکری کا چھوٹا بھائی ادارہ بہت اچھا لگا۔ آپ حیدر کا سینے میں زمر کا کردار اچھا لگا۔ آخر تک پہنچنے سے پہلے اس نے اپنے ہاتھوں سے غداری نہیں کی۔ فرحت کی آپ کے ہونٹوں سے بعد میں نے یہ صاف صاف بتا دیا۔ محبت کا جو جذبہ ہے وہ بالکل سچ ہے۔ شامہ کی کہانی سر سے پاؤں اچھی لگی چھوٹو اور وقت۔ بحالی کی خود کی زندگی تماشا بن گئی۔ آج کل چیزوں میں تو یہ بہانہ ہے کہ آج کل کی لڑکیوں کی سوچ ایک ہی جیسی ہے۔ آج کل لڑکیوں کو صبر کرنا چاہیے۔ وشمہ کی کامیاب دعا سے آپ کی محبت ہی باقی سب باتیں اچھی نہیں اس بار ہماری طرح پتا نہیں اندر سے بھی جو اچھا لگا۔ سنبل اقبال سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ منظمی آفاق آپی اس بار کہاں رہ گئیں آپ کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ جتنا لکھ سکی اس بار چھوٹی سرخیاں بہادری روحانی شہرت میں ہوا... مجھے ساری دی ہیں۔ جو جیتے ہیں آپ کے پڑھنے میں اپنے بیٹے کو دیتے۔" (تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

سے **انیسہ آرا**، رحیم یار خان سے۔ "میں تو عرصہ سے پڑھتی ہوں مگر پہلا خط ہے۔ پاکیزہ دیر سے ملتا ہے جلدی ختم ہوجاتا ہے تو بیٹے سب میں سے پہلے وہ پڑھتے تو شاید آسانی ہو جانے کی اور وقت بھی بچے گا۔ پیشہ ورانہ لکھنے کا معاملہ ہے۔ اب یہ کیسی لگتی ہے۔ پاکیزہ میں آج کل نئی لکھاری بھی شامل ہو رہی ہیں اور سب اچھا لکھ رہی ہیں۔ تاہم سلسلہ بہت اچھا لکھتی ہیں اور

ایک نئی سوچ دے جاتی ہیں بس ذرا ڈائیلاگ لمبے ہو جاتے ہیں۔ عالیہ حرا اتنا اچھا کیوں لکھتی ہیں، ان کی تو اشعار بھی اچھی ہوتی ہیں۔ تابندہ جیلانی نے تو سب کو ہی بہت متاثر کیا اور نئے ناولوں کی ان سے بھی امید ہے۔ مارچ کا پیرا، نیمہ کا ناول بہت اچھا لگا، اداکارہ کشمالہ ملک کی اور بھی تصویریں لگاتے تو مزہ آتا۔ کچھ میں اچھے مراسلات تھے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ۔ ان شاء اللہ تابندہ جیلانی کا انٹرویو بعد میں شائع ہو گا۔ ہاں بھئی تابندہ تیار ہو جاؤ)

سمیع نیلوفر خان، پہاڑ پور سے لکھتی ہیں۔ ''مجھے مراسلات بہت اچھے لگتے ہیں اب تو اچھی شروع ہو گئی ہے جب سے میری بچیاں بھی ساتھ ساتھ پڑھنے لگی ہیں۔ وہ باقاعدہ اپنی رائے دیتی ہیں۔ رسالے میں شامل کہانیاں سب اچھی ہوتی ہیں۔ ہر مہینے آپ لوگ ایک سے ایک کہانیاں لگا رہی ہیں۔ ان میں ہر بار کسی نئی کہانی کا انتظار ہے۔ ان کا اور نمرہ احمد کا بھی ایک انٹرویو ضرور لگائیں۔ میری بیٹی نیلوفر خان بھی نہایت دلچسپی سے پڑھتی ہے۔ آج کی کہانیاں کافی سبق آموز ہوتی ہیں۔ ان سے بچیاں بہت کچھ سیکھتی ہیں اور ہاں کھانوں کی ترکیبیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور ایک بات آسانی سے بنائیں۔ میری اور میری بچیوں کی جانب سے پاکیزہ کو اپنی سالگرہ بے حد مبارک ہو۔ ہماری بہت ساری دعائیں آپ کے رسالے کے ساتھ ہیں۔'' (پیاری بہن نیلوفر مجھے خوشی ہوئی کہ آپ اپنی آرا سے ہمیں باقاعدگی سے آگاہ کریں۔ عمیرہ احمد اور نمرہ احمد کی تحریروں سے ہم بھی مختار ہیں دیکھتے ہیں کب اپنا وعدہ وفا کرتی ہیں)

سمیع عنیزہ وسید کراچی سے سالگرہ نمبر کے لیے۔ ''پاکیزہ تو مجھے ہمیشہ سے بہت پسند ہے۔ اس کی الگ پہچان ہے۔ اس کا الگ انداز ہے اور آپ لوگ نئی رائٹرز کو بھی شامل کرتے ہیں جن میں بہت ٹیلنٹ ہے اور ان کو اور بھی لکھنا چاہیے۔ پاکیزہ کا ایک معیار ہے اور اس کے پڑھنے والے بھی اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ میری ذاتی خواہش ہے کہ اس میں اچھی تحقیقی کالموں کو ضرور شامل رکھیں اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں۔ دیگر سلسلے بھی اچھے ہیں۔ پاکیزہ سے محبت رکھنے والوں کو بہت بہت مبارک ہو۔'' (آپ کو بھی سالگرہ مبارک)



سمیع وفیہ ایوب، کراچی سے۔ ''سورۃ کی اہمیت پسند آئی۔ اداریہ سے مستفید ہوتے ہوئے دونوں کی طرف بڑھے۔ محبت کے ساتھ ان میں دلچسپی بڑھتی ہے۔ وقت جو ہے نے بھی اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا۔ بہار نمبر میں اس افسانے نے دو شوق کے خوش کر دیے۔ سمیعہ غزل کا افسانہ، سمیہ بنت عاصم اور سیما رضا ردا اور نادیہ جہانگیر کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں۔ کشمالہ اقبال کا انٹرویو اچھا لگا۔ بہنوں کی محفل پڑھتی تو ہنستے ہوئے مگر بعد تو آخر میں چونکہ پڑھنے کے بعد سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اپنی محفل میں تبدیلی کر کے سکون ملتا ہے۔ ہم سے باتیں کرتے رشتے ہو جاتے ہیں۔ پردہ لگا، چند عجیب و غریب حقائق فراہم کر کے بہت اچھے تھے۔ سامعہ تبسم کا برتن بنانے کے بہت اچھا لگا، جلد تک میں ڈھونڈتی ہوئے بنائیں گی۔'' (نوازش، ہماری مصنفات شکریہ کہتی ہیں)

سمیع ثمیرا مجاہد، میرپور خاص سے۔ ''سب بہنوں کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو۔ میری شرکت باقاعدگی سے تو نہیں مگر پھر بھی ہوتی رہتی ہے۔ مجھے اس سال سب سے بہترین تحریر عظمی آفاق کی لگی۔ شمیم رشید نے افسانے بھی مجھے بے حد پسند آئے۔ جلتے ہم ان سے بہنوں کی محفل کی بات کی تعریف ہے۔ میرا اپنا صادق آباد سے ان دونوں شہروں میں پاکیزہ کا اور آپ کا





جتنا تذکرہ رہتا ہے میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ باجی عذرا رسول کو میری جانب سے سالگرہ کی مبارک باد ضرور پہنچا دیں۔'' (آپ کو بھی، آپ کی فیملی کو اور آپ کے شہروں میں پڑھنے والے پاکیزہ کے ہر قاری کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو۔ عذرا رسول صاحبہ بھی شکریہ کہہ رہی ہیں)

ﷺ شائستہ زریں، کراچی سے۔ ''اس ماہ سب سے خوب صورت تحریر نیمار ضا ردا کی رہی۔ اب صبح ہونے کو ہے، بے حد پُرتاثر افسانہ تھا جسے پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ شیریں حیدر، سلمیٰ غزل اور روشانے عبدالقیوم کے افسانے بھی بہت عمدہ تھے، اداریہ تو مجھے ہمیشہ ہی بہت اچھا لگتا ہے اور اپنی بہنوں کی محفل بھی۔'' (اور ہمیں اپنی شائستہ زریں بھی)

ﷺ شگفتہ ناز ملک، ہری پور سے۔ ''مجھے فالج ہوا تھا، دعا کے لیے میں نے پاکیزہ میں نیوز بھی لگوائی تھی اور اب میں پاکیزہ بہنوں کی دعاؤں کے طفیل بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں، فالج کے ذرا سے اثرات بھی نہیں رہے ہیں۔ میں آپ سب بہنوں کی بہت شکر گزار ہوں، اللہ آپ سب کو ہمیشہ خوشیوں کے ساتھ سلامت رکھے۔'' (اللہ تعالیٰ آپ کو بھی ہمیشہ صحت و زندگی عطا فرمائے، آمین)

ﷺ امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ ''آپ کو ادارے کے تمام ممبران، باجی عذرا رسول، شاعرات، رائٹرز، تبصرہ نگار سب کو دل سے پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو۔ عظمیٰ آفاق سعید، صغریٰ زیدی، آمنہ حماد، شائستہ زریں، رضوانہ پرنس، نزہت اصغر سب بہنوں کو بے حد مبارک جو ہر ماہ اپنی کاوشوں سے سجاتی ہیں۔ 24 اپریل کو پاکیزہ کی سالگرہ ہے تو اسی روز میری فیصل کی شاعرہ بہن نیلی نوشین ساجد کی سالگرہ ہے۔ باجی انجم انصاری ان تھک محنت ہے، تحریریں پڑھنا ہی مقصد نہیں۔ باجی انجم انصار نے جو محنت کی ہے آج یہ بام عروج پر ہے۔ باجی عذرا رسول، پہلی مرتبہ فون پر بات ہوئی بیٹے کی شادی کی مبارک باد دی۔ ایسے لگیں مدتوں سے میرا ان سے رشتہ ہے۔ بے حد محبت کرنے والی شخصیت ہیں، اتنی اپنائیت تھی۔ ان کے لہجے میں، اللہ تعالیٰ معراج رسول کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ انجم باجی اپنی بیماری کا خیال رکھتی ہیں نہ آرام کا۔ جب بھی فون کرتی ہوں۔ باجی کیا کر رہی ہیں؟ بیٹا کام کر رہی ہوں شمارے کا۔ اسی دوران صبح سے رات گئے تک ہم سب کی کالز جس محبت، خلوص سے اٹینڈ کرتی ہیں۔ سب کے دکھ سکھ سنتی ہیں، حوصلہ دیتی ہیں، دعائیں دیتی ہیں کسی وقت تو اشک بار بھی ہو جاتی ہیں۔ ایک مدیرہ بہت کم نظر آئیں گی۔ ان کی بے شمار محبتوں نے پاکیزہ کے قریب کیا ہے۔ ایک بار فون کیا، ساتھ ہی پی ٹی سی ایل پر فون آیا مجھے ہولڈ پر رکھا ایک منٹ بیٹا ابھی، اس بہن کی بات مکمل نہیں ہوئی ان کی بیٹی عظمیٰ آفاق سعید کا فون آیا۔ بڑے مان سے عظمیٰ کو کہا بیٹا تم بھی بعد میں فون کرنا امینہ کی کال آ رہی ہے پی ٹی سی ایل پر بھی فون سن رہی ہوں، عظمیٰ نے فراخدلی سے کہا امی میں پھر کر لوں گی۔ بیٹی انجم انصاری ہے ماں محبتوں سے بھرپور۔ سالگرہ کے اس موقع پر اپنی تمام بہنوں کو دل سے دعائیں کسی ایک بہن کا نام لکھنا ممکن نہیں۔ تمام بہنیں بہت اچھی اور بے حد پیار کرنے والی ہیں۔ ہر وقت رابطے میں رہتی ہیں۔ میری تکلیف پر تڑپ اٹھتی ہیں، حوصلہ دیتی ہیں، دعائیں دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ میری تمام بہنوں کو خوشیوں سے نوازے، محبت، تندرستی والی زندگی عطا فرمائے۔ خصوصی دعا بھائی جان معراج رسول کے لیے اللہ تعالیٰ شفائے کاملہ عطا فرمائے، آمین۔'' (بھرپور محبتوں کے لیے صرف جزاک اللہ کہہ سکتی ہوں)

ﷺ عظمیٰ آفاق سعید، کراچی سے۔ ''آپ سب کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو۔ دلی دعا ہے کہ اس میں لکھنے والے اسی طرح اچھے سے اچھا لکھتے رہیں اور شاد و آباد رہیں اور اس کے پڑھنے والے اسی طرح محبت اور توجہ سے پڑھتے رہیں۔ اچھی، اچھی باتیں سیکھتے رہیں اور ان کو آگے بتاتے رہیں۔ اور پاکیزہ کا ہر دن اور ہر

سال کامیابیوں اور کامرانیوں کا سال ہو اور ہماری عذرا آنٹی ہمیشہ اپنے رسالے کو پھلتا پھولتا دیکھتی رہیں، آمین۔ میں اپنے تمام قارئین بشمول مصنفات اور تبصرہ نگار بہنوں کا دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے میرے اوٹ پٹانگ سفرنامے کی تعریف کی۔ سچ میں بہت حیران ہوں کہ آپ کے لکھتے ہوئے ایک، ایک تبصرے نے میرا خون بڑھایا ہے، آپ کی بھرپور تعریف میرے لیے کیا چیز تھی یہ پھر کبھی فرصت سے بتاؤں گی کہ میں واقعی اپنے آپ کو رائٹر سمجھنے لگی ہوں۔ اور جب ایک دو پروڈکشن ہاؤس سے مجھے ٹی وی کے لیے لکھنے کو کہا گیا تو میں حیرت سے اچھل تک پڑی۔ بہرحال عذرا آنٹی آپ کا شکریہ کہ پاکیزہ کے اس پلیٹ فارم سے میں نے نام اور عزت کمائی ہے اور یہ اللہ کا ایسا کرم ہے جس کا شکر ادا کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ میری تمام مصنفات، تبصرہ نگار اور قارئین پاکیزہ ہمیشہ اسی طرح صحت و تندرستی کے ساتھ خوشیوں کے جھولوں میں جھولتے رہیں اور میری آنے والی کتاب ذرا سا گھوم لوں میں۔ ہر ایک کے گھر بلکہ ہر ایک کے سرہانے موجود ہو، آمین۔'' (رائے پہنچائی جارہی ہے)

زبیدہ پروین، سعودی عرب سے۔ ''ایک طویل عرصے بعد رابطہ کر رہی ہوں سالگرہ کی مبارکباد ہر ایک کو۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ مصنفات کی کہانیاں اور ناول شائع ہوتے ہیں اور بہنوں کی محفل میں بھی سب سے پہلے ان کے خطوط لگا کرتے ہیں اور بعد میں بچ جانے والے خطوط قاری بہنوں کے ہوتے ہیں اس کا سدباب ہونا چاہیے۔'' (ہم نے اسی ماہ سے آپ کی رائے پر عمل کیا ہے۔ اور شروع میں قاری بہنوں کے خطوط ہیں اور رائٹرز کے درمیان میں۔ اب تو خوش ہیں ناں آپ)

مسز عظمیٰ خورشید، لاہور سے۔ ''ساری مصنفات اور تبصرہ نگاروں کو سالگرہ مبارک۔ پاکیزہ میں جو بات ہے وہ واقعی کہیں نظر نہیں آتی۔ روحانی مشورے اتنے بہترین ہوتے ہیں کہ میں ہمیشہ نوٹ کرواتی رہتی ہوں، انجم اس کے لیے تو جزاک اللہ کی مستحق ہیں، دیگر بہنوں سے صرف ایک بات کہنا چاہوں گی کہ شادی شدہ زندگی کی کامیابی کا صرف ایک ہی اصول ہے اور وہ ہے برداشت اگر آپ اس اصول کو کبھی نہیں بھولتیں تو کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔'' (واقعی بڑے پتے کی بات بتائی ہے تم نے)

عائشہ جبار جمیل، برمنگھم سے۔ ''میں نے پاکیزہ میں سب سے پہلے جلتے گھر پڑھا اور وہ اتنا اچھا لگا کہ میں برسوں سے اس کی مستقل قاری ہوں۔ میرے حلقہ احباب میں پاکیزہ بے حد شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ چاہے اداریہ ہو، بہنوں کی محفل ہو یا آپ سے باتیں ہوں روحانی مشورے، میں سارے ٹپس اپنی ڈائری میں اتار لیتی ہوں۔ ناول پڑھنے مجھے مشکل لگتے ہیں، ہلکی پھلکی آسان سی تحریریں پڑھ کر میں بہت انجوائے کرتی ہوں۔ پاکیزہ میں مجھے عظمیٰ آپی کی تحریریں بہت اچھی لگتی ہیں، امی کو میرا اسلام کہیے گا اور عذرا آنٹی کو ان کے بیٹے کی شادی کی مبارکباد بھی دیجیے گا۔'' (پیاری عائشہ اس محفل میں خوش آمدید۔ ڈاک سے بھیجنا تمہارے لیے خط مشکل ہے تو بذریعہ فیکس بھیج دیا کرو۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کے لیے نوازش، عذرا بھی شکریہ کہہ رہی ہیں)



شہلا، لاہور سے۔ ''پاکیزہ بہت اچھا لگتا ہے۔ عظمیٰ آفاق کے سفرنامے بھی ہمیں اچھے تو لگے ہیں مگر کیا ادارہ پاکیزہ کے پاس یہی کام رہ گیا ہے کہ وہ عظمیٰ آفاق کو بھی گھمائیں اور ہمیں بھی سیر کروائیں، اگر ادارے کے پاس بہت پیسہ ہے تو وہ دوسرے کاموں پر بھی خرچ کرے۔'' (پیاری بہن اس محفل میں خوش آمدید، اسی نوعیت کے ایک دو فون بھی ہمارے پاس آئے ہیں۔ ہمارا ادارہ تحریروں کے حوالے سے کام کر رہا ہے۔ مصنفات کو ہم نے گھمانے کا واقعی نہ



اس نے نیچا کالے رکھا ہے اور نہ ہی یہ اس کے فرائض ہیں۔ عظمیٰ آفاق اللہ کے فضل و کرم سے ایک ویل آف فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے لیے دبئی یا امریکا جانا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ... رہی بات نیک کاموں پر خرچ کی... تو وہ ہر شخص اللہ کی رضا کے لیے کیا کرتا ہے اور اس کی تشہیر کرنا کسی طرح بھی اور کسی سے بھی مناسب نہیں ہے۔ پیاری بہن ایک بات اور ہمیں یہ آپ بتا دیجیے کہ یہ خط اور یہ فون کس کے کہنے پر کرائے گئے ہیں تاکہ ہماری معلومات میں بھی اضافہ ہو جائے)

سید فلاح علی، کراچی سے۔ ''انجم باجی آپ سے فون پر بات کر کے اچھا لگا۔ (مجھے بھی) پاکیزہ کی تحریریں بے حد عمدہ لگتی ہیں۔ آپ نئے رائٹرز کی مزید حوصلہ افزائی کریں۔ (بہت بہتر) مجھے ناہید سلطانہ اختر، شیریں حیدر، رفعت سراج اور اب عظمیٰ آفاق کی تحریریں بے حد پسند ہیں۔ آپ کا نام میں نے نہیں دیا۔ آپ نے جعد پاکیزہ کے لیے ناول بھی لکھنا ہے اور جب میں فون کروں تو مجھ سے باتیں بھی کرنی ہیں پلیز میں آپ سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔'' (گڑیا کسی بھی دن دوپہر میں ظہر کی نماز کے بعد فون کرو اور اپنی شاعری بھی جلد بھیجو)

سید ممتاز احمد، لاہور سے۔ ''میں پاکیزہ کی مستقل قاری ہوں اور پاکیزہ کی بہنوں کی محفل باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میری بہن شمشاد اختر حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث اچانک انتقال کر گئیں۔ ان کا ایک افسانہ آدھا چہرہ پاکیزہ میں شائع ہوا تھا اور وہ پاکیزہ سے بہت محبت کرتی تھیں۔'' (اللہ تعالیٰ آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور شمشاد کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین)

سید سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ''اپنا خط اور افسانہ دونوں ہی پڑھ کر دل خوش ... باغ باغ ہوا خاص طور پر ذکیہ ایوب کے خط نے مزہ دے دیا کیونکہ میں انہیں یقیناً یاد نہیں مگر آپ کے آسٹریلیا والے بیٹے کی شادی میں، میں اور میری بیٹی، ڈاکٹر کہکشاں ان کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ میز پر جہاں ان کے بیٹے اور بہو سے ملاقات بھی ہوئی تھی جیسے میرا خط پڑھ کر انہیں ہنسی تو آئی جائز کہ مجھے اعتراض نہیں بلکہ ... اگر تجسس ... ہے۔ اور اب آتے ہیں تبصرے کی طرف ... لگتا ہے عظمیٰ اپنے نئے گھر کو سجانے سنوارنے میں مصروف ہیں اس لیے سفر نامہ غائب ... ویسے شیریں حیدر سب پر بازی لے گئیں، با مقصد کہانی، ام ثمامہ کی سرکس والی نے مزہ نہیں دیا۔ فرحت احمد نے نوجوان لڑکیوں کی ماؤں کو صحیح نصیحت کی ہے۔ چراغ تلے اندھیرا میں ظہیر فاطمہ نے مردوں کی فطرت کی صحیح عکاسی کی ہے۔ ہیں وا کب کچھ نظر آتے ہیں کہ قول و فعل کا تضاد جانے ہمارے کو قوم کو کہاں پہنچائے گا، دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان پر کچھ ہے۔ اکثر دیکھا ہے کہ لوگ محفلوں میں اپنی انکساری، عاجزی، غریب پروری اور رحم دلی کے خوب چرچے کرتے ہیں لیکن گھر میں زبان سے آگ اور انگارے برستے رہتے ہیں۔'' (ہاں اس طرح تو ہوتا ہے ... اور ہو رہا ہے ... گڑیا ہم کہتے ہیں عادت تبدیل ہو سکتی ہے مگر فطرت نہیں)

سید مہوش سمرن، راجپوت، سیالکوٹ سے۔ ''ہم نے تو عظمیٰ جی کے مدینہ ٹرپ کی صرف تعریف کی تھی اور آپ نے اسے اتنی محبت سے شائع کر دیا۔ میرا لیٹر شائع ہونے سے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے ہمیں یاد رکھا ہمیں لکھنے کے قابل سمجھا ویلڈن آپ ایز روٹ ... صرف آپ میں یہ وصف ہے کہ ہر کسی کو یاد رکھتی ہیں آپ کی خوشبو میں مجھے اپنی ماں کی خوشبو آتی ہے جو کہ اس دنیا میں نہیں ہے اللہ انہیں اپنی جوارِ رحمت میں رکھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی زندگی دے، صحت و تندرستی دے۔ دبئی کے ٹرپ میں عظمیٰ جی جیسے آپ کی باتیں کرتی ہیں

ویسے ہی میری نانی جی کی عادتیں تھیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ اپنے بچوں پر تادیر سلامت رکھے، آمین۔ عظمیٰ جی keep it up آپ تو کمال ہی کرتی ہیں ... ماشاءاللہ آپ ... تو ہم آپ کے ساتھ ہیں، اب ایک ناول ہو جائے تو مزا ہی آ جائے۔ ترک وفا اپنی مثال آپ تھی۔ ویسے ہی ہم اینڈ چاہتے تھے زبردست۔ محبت یمنیٰ کا اعتبار وفا بھی بڑا زبردست جا رہا ہے، آہستہ آہستہ ماضی سے بھی پردہ اٹھ رہا ہے اور رشتے سمجھ میں آ رہے ہیں۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

٭ فریدہ فری یوسف زئی، لاہور سے۔" سب سے پہلے مجھے ... پڑھ کر سب سے اچھا لگا ان کی باتیں پڑھ کر دلی سکون ملتا ہے۔ الف اور نون ایک سے بڑھ کر ایک ... خاص کر شیریں حیدر کا آئینہ ناولٹ ... جہانگیر کی احمق چڑیا ... ام ثمامہ کی ... سب سے پسند آئی۔ مکمل ناول ... وفا ... نے کمال لکھا ہے خوش رہو۔ ... سب بہترین تحریریں تھیں۔ ... کو ذیشان بیٹے کی شادی مبارک ہو۔ شگفتہ شفیق کو تو کنزل کے نکاح کی بے حد مبارک باد۔ ... اللہ تعالیٰ سب کو صحت کاملہ سے نوازے۔" (تبصرے کا شکریہ، اللہ تعالیٰ آپ کو بھی کلی صحت عطا فرمائے، آمین)

٭ نورین شہزاد، کراچی سے۔" بے ساختہ قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ہے ہم وہاں کے ہو گئے، عظمیٰ آفاق سعید جی ہاں اتنا خوب صورت طرز بیان کہ لبوں پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ عظمیٰ آفاق سعید نے مزاح کے ساتھ جو سفر نامہ لکھا ہے، واقعی مزہ دے گیا ... اور مزہ بھی ایسا کہ بے ساختہ عظمیٰ جی سے دوستی کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔" (پاکیزہ کی اس محفل میں شرکت کر کے سب بہنیں ایک دوسرے کی دوست ہی تو ہیں)

٭ خولہ عرفان، مقام نامعلوم سے۔" ایک بار پھر آپ کی محفل میں بن بلائے مہمان کی طرح چلی آئی ہوں، اب کے بھی نظر کرم کے بجائے نظر انداز ہوئی تو ... (عزیزہ خوش آمدید ... ہم آپ کو نظر انداز کیوں کریں گے) ماشاءاللہ آپ کی ادارت میں اتنا خوب صورت انتخاب، تمام تعریفوں کا سہرا تمام مصنفین کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی جاتا ہے۔ خاص طور پر سیما سراج کی مختصر کہانی اور عالیہ حرا صاحبہ کا افسانہ اداسی تم تو شاید ہو، نے بہت متاثر کیا۔ ہمت کر کے ایک اور غزل ارسال کر رہی ہوں ... اس امید کے ساتھ کہ پچھلی غزل پر بھی نظر ثانی فرمائیں گی کہ اپنی تحریریں اولاد کی طرح ہوتی ہیں۔ کون ماں اپنی اولاد کو برا کہتی ہے۔ کالا ہو یا پیلا اس کے لیے سب سے حسین بچہ وہی ہوتا ہے۔" (آپ کی غزل ابھی پڑھی ہے اس کے چند شعر شائع ہو سکتے ہیں)



٭ تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد سے۔" شہلا نواز، لاہور کے خط میں میت والی بات اچھی نہیں لگی۔ سارے افسانے ... وہی دیکھتے بھاگ کھڑے ہوئے، مقصد جو لگا ہوا تھا یعنی مفت میں عظمیٰ صاحبہ ہمیں لیے لیے گھوم رہی تھیں۔ اختر شجاعت کا شمع ہدایت بہت بڑی نیکی ہے۔ اس سے ذکر الٰہی کی عادت دوبارہ زندہ ہو گی۔ انسان ہیں نا کہ دنیا داری کا ذکر یعنی غیبت کرتے نہیں تھکتے مگر اختر شجاعت صاحبہ نے سوئے دلوں کو جگایا اچھی کاوش ہے، اللہ اجر دے، آمین۔ ... قادری کی محبتوں کے رنگ میں شاہ کو بہن اور بھانجے کی محبت کا خاصا بھاری تاوان ادا کرنا پڑا اگرچہ ... سیما سراج کی مختصر کہانی جس موضوع پر تھی اس سلسلے میں ایسے ہی تو اللہ نے واضح نہیں کر دیا کہ کس کس سے پردہ جائز ہے۔ بابل تیری دہلیز پر، رضوانہ پرنس صاحبہ کا عروہ کے ساتھ سب اچھا کرنا بہت اچھا لگا گھر سے بھاگنے کی قیمت بظاہر تو لگا زیادہ ادا نہیں کرنا پڑی کہ ناظر نے بھی اختتام پر بھائی کا کردار ادا کیا سر پر ہاتھ رکھ کر اور سب گھر والوں تک، دادی سمیت اپنی محبتوں کی چھاؤں میں سمیٹ لیا بلکہ دادی کا جینا گزر



پہنانا بہت ہی دوراندیشی کا ثبوت لگا۔ اگر اپنا ہوتا میں جو ساس ہیں وہ تو روایتی ہیں مگر ایسی ساسیں بھی دستیاب ہیں جو بہوؤں کو بیٹیوں پر ترجیح دیتی ہیں۔ بلاعنوان واو زندگی کتنے روپ دھاتی ہے۔ ترک وفا کے اچھے اختتام نے گھر بھر میں خوشیاں دوڑا دیں۔ ورنہ طلاق کی تلوار تو پچھلی اقساط میں لٹکی ہی رہی۔ اچانک خوشی کی اختتام تا ایسی ہی تھی جیسے کہ اکثر خواتین ہمارے معاشرے کی ہوتی ہیں۔" (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

ہمہ سدرہ کلثوم مروت، صوبہ سرحد سے۔ "آپی آپ کی خدمت میں ایک چھوٹا سا ہدیہ بھیج رہی ہوں، زیادہ قیمتی تو نہیں اگر قبول فرمائیں تو بہت خوش ہوں گی۔ (عزیزہ آپ کی جانب سے ایک بال پین ملا ہے جس پر آپ نے دھاگے سے کڑھائی کی ہوئی ہے۔ جزاک اللہ مگر پلیز آئندہ صرف اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں میں نہیں چاہتی میری بہنوں کا وقت ضائع ہو) امینہ عندلیب آپی فریدہ جاوید کے لیے ڈھیر ساری دعا اللہ ان کو کامل صحت عطا فرمائے۔ آپی غزالہ جلیل راؤ کے لیے بہت، بہت شکریہ سونٹ آپی غزالہ آپ کا افسانہ بہت، بہت اچھا لگا۔ آپ نے مجھے برتھ ڈے پروش کیا تھینکس۔" (آپ کی آرا پہنچائی جا رہی ہے)

ہمہ فرخندہ لطیف، رحیم یار خان سے۔ "پاکیزہ ملا اور جھٹ سے بہنوں کی محفل میں حاضری دی اور اپنا عرض نامہ ڈھونڈ نکالا۔ آپ کے جواب نے جو مجھے خوشی دی وہ الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتی۔ آپ کی حوصلہ افزائی نے مجھے وہ ہمت دی جو آج سے پہلے میں کر نہ سکی۔ جی میں نے اپنا افسانہ آپ کی نذر کرنے کی جرأت کر ہی لی۔ بالآخر" (ہم تو یہی چاہتے ہیں، ہاں ابھی افسانہ پڑھا نہیں ہے)

ہمہ ساجدہ ظفر، کمالیہ سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے میں ہر ماہ حالات حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق کارآمد باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں تو دل خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے۔ افسانوں میں تو حال شیریں حیدر کا آئینہ، سیمار رضا ردا کا اب صبح ہونے کو ہے اور سلمیٰ غزل کا محبت جذبہ دل ہی پڑھ پائی ہوں سب قابل تعریف ہیں۔ پاکیزہ بہنوں کے خطوط میں نازنین آفریدی کا خط توجہ طلب ہے کیونکہ نازنین بہن نے گراں قدر تجاویز پیش کی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ نازنین صاحبہ نے ہمارے منہ کی بات چھین لی ہے۔ آپی! ہم نازنین بہن کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں بلکہ ایک مزید تجویز پیش کرنا چاہوں گی کہ دلچسپ سوال وجواب کا سلسلہ بزم پاکیزہ بھی دوبارہ شروع کریں۔ کیونکہ یہ سلسلہ بھی بارہ مسالوں والی چاٹ کا مزہ دیتا تھا۔ شائستہ زریں صاحبہ کا سروے۔ بے دو جہاں کی بہار تم سے نہایت محنت بلکہ عرق ریزی سے تیار کیا گیا ہے، انہیں مبارک باد پہنچا دیں۔ ہاں آپی ذیشان رسول کی شادی کا آنکھوں دیکھا حال اور دیدہ زیب تصاویر کا ہمیں شدت سے انتظار ہے۔ ہمارا تو خیال تھا کہ موجود شمارے میں شادی کی رنگ کمنٹری شائع ہو جائے گی مگر شاید آپ کو صبر کا مزید امتحان لینا مقصود ہے۔ پاکیزہ بہنوں کی محفل میں قارئین اور رائٹرز بہنوں کی تازہ سرگرمیاں پڑھ کر دل فرط مسرت سے دیوانہ وار جھوم اٹھتا ہے۔" (آپ کا انتظار ختم ہوا، آپ رائٹرز کی بھی پوز مارتی ہوئی ڈھیر ساری تصویریں دیکھیں گی)

ہمہ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ "مسلسل ناول، اعتبار وفا کافی اندھیروں میں ہے۔ فرزانہ نگہت نے گزر چکی ہے یہ فصل بہار میں مردوں کی مخصوص ذہنیت کی عکاسی کی۔ سرکس والی ام ثمامہ کی بے مثال تحریر تھی۔ شیریں حیدر کا آئینہ نے بہنوں کو اپنے اندر جھانکنے کا موقع دیا۔ طوفان کے بعد، فرحت احمد کا عبرت ناک المیہ تھا۔ جنگل کا پھول، زاہدہ پروین کا لازوال ناول ہے جو شب خرابی سے اپنی دلآویز خوشبوؤں سے ہمارے قلب وذہن کو مہکا رہا ہے اب تو خیر سے نئی کونپلیں بھی پھوٹنے والی ہیں۔ چراغ تلے اندھیرا پڑھ کر بے ساختہ منہ سے نکلا۔ ہیں

کو اب کچھ نظر آتے ہیں جو [illegible] احمق چڑیوں خاص متاثر نہ کر سکا۔ چار دو چار دیواری، سبق آموز تحریر رہی۔ سلسلے وار ناول رنگ خوشبو میں بجتی ہے عادل جیتتا ہے یا نمرہ۔ "محبت بند چڑیوں میں حفصہ کا ایثار اور صبر شاہزل کے لیے محبت کا رنگ لے کر آیا۔ حمل ناول، اسیر وفا میں سگے رشتوں کی سنگ دلی سے دل خون کے آنسو رو دیا دیکھے ان پر مرہم رکھ پائے گی یا... اب ختم ہونے کو ہے۔ میں ماہی کی ہمت و جرأت نے ان گھر کی عورتوں کے حوصلوں کو ابھارا۔ پگلی تتلی کی [illegible] ہر عورت کی کہانی تھی۔" (شکریہ)

سمیہ شیریں مظفر، ملتان سے۔ "جنگل کا پھول بہت لطف دے رہا ہے۔ اس کے کردار ان کا بات کرنے کا انداز 60 کی دہائی کا ہے۔ اب کہاں اتنی سادگی رہ گئی ہے اور معصومیت [illegible] نبیلہ ابر راجا کا مکافاتِ دل پڑھا آج کے دور کی خود غرضی، چالاکی اور اپنے رشتوں کی دھوکا دہی سے بھرپور ایک حساس موضوع پر مشتمل ناول [illegible] باقی آئندہ دیکھ کر دھچکا تو لگا مگر ہم سہہ گئے۔ نمرہ نعیم کا اسیر وفا پڑھا، تمام تر حالات وہی رشتے داروں کی خود غرضی، دھوکا دہی [illegible] حسد کچھ بھی نیا نہیں [illegible] پاکیزہ کا سرورق کا شمارہ بہار نمبر تھا۔ افسانوں کی بہار لسٹ دیکھ کر اچھل ہی تو پڑی۔ یہ اتنا مزہ آنے والا ہے۔ اور سچ میں مزہ تو آیا۔ فرحت احمد کا طوفان کے بعد، حریش فاطمہ [illegible] تیسرے نمبر [illegible] نظیر فاطمہ کا چراغ تلے اندھیرا، سمیرا جہانگیر کا احمق چڑیا، شری پاجوہ کا چادر اور چار دیواری پڑھنے کے لیے چشم کشا افسانے تھے۔ آج کل کے ماؤں کی سختی اور درست تصویر کشی [illegible] اتنا بھیانک انجام ہوتا ہے۔ فون اور انٹرنیٹ کے غلط استعمال کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایک ہی بچے کے غلط قدم سے خاندان تباہ ہو جاتا ہے۔ سیما بنت عاصم کا افسانہ نیلی رضا کا افسانہ بہت اچھے ہونے کے باوجود اچھے افسانے تھے مگر دونوں لکھاری بہنیں جو سبق دینا چاہتی تھیں وہ کوشش کرتے ہوئے مختصر کر کے بھی دیا جا سکتا تھا۔" (شکریہ)

سمیہ انیسہ زینب، فاروق آباد سے۔ "پاکیزہ تین ماہ سے پڑھ رہی ہوں، مجھے بہت تنگ، ہم وہی سے ہو گئے شیریں سعید، زاہدہ منظور اختر کی تحریریں پسند آئیں۔ وہ اچھے تھے، ان میں کرفوری کا سرورق زیادہ پسند آیا۔ بندوں کی محفل میں اپنا نام دیکھ کر بہت اچھا لگا شکریہ [illegible] آپ نے مجھے جگہ دی۔ آپ میری امی کو بھی بہت پسند ہیں۔ میری اماں جان اٹھارہ سال سے پاکیزہ پڑھ رہی ہیں۔" (محفل میں بھرپور انداز سے تبصرہ کیجیے اور اپنی امی کو ہمارا سلام کہنا)

سمیہ فریحہ شبیر، شہداد کوٹ سے۔ "پاکیزہ کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں اس امید پر کہ دل سے خوش آمدید کہا جائے گا اور جگہ بھی ملے گی۔ محفل کے ساتھ ساتھ دل میں بھی کہ دلوں میں اتر نے کا فن بھی آتا ہے اور بڑی بات ہے کہ اتر نے میں تو سب ہی ماہر ہوتے ہیں اس لیے ہم دلوں میں ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ بہت دور کی بات ہے پاکیزہ سے تعلق کی تو پاکیزہ بھی بعد نظروں سے گزرتا ضرور تھا مگر بھی اس میں شرکت کا نہیں سوچا تھا۔ پھر دسمبر 2014 میں فیصلہ کیا باقاعدگی سے پاکیزہ ماہ [illegible] کی نشست میں پڑھا [illegible] بہت پسند آیا۔ ہر مہینہ بہت زیادہ سب سے زیادہ اور آنے پزیر میں پڑھ کر بہت کچھ جاننے کو ملتا ہے ان [illegible] سے جو سب میں ہیں جو پڑھنا اور ان سے جو سب میں جو نا چاہتے ہیں۔ میں فیس بک پر فریحہ چوہدری کے نام سے جانی جاتی ہوں مگر پاکیزہ میں شرکت ہمیشہ اپنے نام سے فریحہ شبیر سے کروں گی اس لیے آپ نے بھولنا نہیں [illegible] یاد رکھیے گا مجھے (دلوں میں رہنے والوں کو بھولتے نہیں) آپ کو ناامید بھی کرتے نہیں ہوں گی۔" (آپ کی محفل میں دل سے خوش آمدید [illegible] ہو جاتا ہے [illegible] اب تبصرہ کیجیے یہ عادت ہے آپ کی اپنی مرضی ہے مگر حوصلہ افزائی





ضرور ہوں (ان شاء اللہ)

سیدہ علیشاہ، بہاولپور سے۔ "اب میں آپ کو مل جاتی ہی ہوں ... کی
مجھے یقین ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گی ... میں بھی ہمیشہ جیسی موٹی شوٹی ہوں خود اپنی
تعریف کرتے ہوئے تھوڑا تھوڑا ہچکی بھی رہی ہوں ... ٹی وی ... ف ... بولی یہ
بتاؤں کہ 20 تاریخ کے بعد ہی مجھے پاکیزہ سے شعاع کے لیے اچھا وقت ... بے چینی
شروع ہو جاتی ہے۔ مگر انتظار کی وہ گھڑیاں ... یہ توکل نہ ہوں ... تب ... کا ... ب
صبری سے ہی تھیں سب سے شروع سے بھی انتظار تھا ... کی خیر ... کا اینڈ بہت اچھا تھا۔ پڑھ
کے خوشی ہوئی ... رقص ... کیا مصیبت ہے۔ اب ناول ... پن ... ہوئی ... سے
یہ قسط قدرے بہتر تھی ... قادری کا مکمل ناول محبتوں کے رقص کا ... پڑھ ... خون
ہوئی ہم آپ سے ... کا ... ہوا مگر درمیانی حصہ ... طور پر پسند بہت ... نیب
تھا۔ مختصر کہانی میں ... سراج ... سے ... انداز میں بہت ... بہت ، بہت
خوب ... کی قسم ... وہ ... یہ تو ... کی قسم ... شدید ہو ... یہ ... سے یہ
ثابت کرنے کی کوشش کی کہ محبت پانے سے زیادہ محبت کا اظہار ضروری ... حقیقت ہے
... رفعت شبانہ کی کوشش اچھی ہی ہے ... چھوٹی ... ہو سکے ... سے
پڑھنوں میں ہی مجھے رہتے ہیں ... بالکل تیری ... رضوانہ پرنس نے خوب لکھا
یہ آج کل کا دور ہے ... بچوں کی پسند کو تھوڑی سی اہمیت دے دی جائے تو والدین کی
نافرمانی کے اقدام میں کمی واقع ہو۔ جنگل کا پھول ... پروین کی اچھی کوشش ہے۔ اب ... بہت خوب ہے
محبت ... اعتبار، وفا، محبتوں سے مزین ... کی ... ہے ... مجھے اس سے
پسند ہے۔ واہ بہت خوب ... ہو گئے ... نے بہت مزے سے ... لکھا ... یہ پڑھ
کر بہت مزہ آتا ہے ... اس کا سارا کریڈٹ عظمیٰ آپی کو جاتا ہے ... بہت ... بہت مزے کا
تھا ... مزے ... پڑھ کر بہت ... اس ... مزے ... چٹ پٹی چاٹ جیسا
لگا ... اس مرتبہ جنتر منتر بھی بہت مزے کا تھا ... طور پر چھوٹی ... بہت مزے کا تھا۔" (بہت بہت
شکریہ)

یاسمین کنول، پسرور سے۔ "ایک شمارے کا مضمون بہت ... پسند آیا۔ ہم ... ہو گئے،
عظمیٰ آفاق کا دلچسپ ... بہت ... یہ ... افسانہ ... کی مختصر کہانی اچھی
تھی ... دلچسپ تھا ... زندگی میں ... خوشیاں ... بھی نظر
آ رہے ہیں۔ جنتر منتر قابل تعریف رہا۔ سرورق ... سے ... تھی ... کو
ٹھنڈک کا احساس ... رہی تھی۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

نصرت جبیں ملک، ضلع خوشاب سے۔ "شمارہ ... ہوا ... ہو گا ... سے
ماڈل گرل کی ڈریسنگ ... باتیں ... ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بہنوں کی محفل میں سب سے پہلے شامل
ہوئے جہاں پیاری بہنوں کا حال احوال ... اور خواہشات کے بارے میں جانا۔ یہ محفل ہمیشہ
مجھے اپنے گھر میں ... وقت ... ہوئے ... گھر ... کی محفل ... میں صلاح،
مشورے ... معصوم ... اور ... کی ... یہ ... ہے۔ ... اس
محفل ... بہنوں کی طرف ... نہ ... ۔ ... ہے ... اچھے ... میں ...

رائے پڑھی جو مزہ دے گئی۔ ارے صائمہ اکرم تو آج بھی ویسی ہی دبلی پتلی ہیں جیسی سالوں پہلے پھول کھلے ملتان کی تقریبات میں ہوا کرتی تھیں۔ ہم دبئی کے ہو گئے، میں عظمیٰ جس دلچسپ انداز سے ہمیں دبئی کی سیر کروا رہی ہیں وہ مزہ تو شاید دبئی جا کر بھی نہ آئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ہلکے پھلکے واقعات کا جو مسالا لگاتی ہیں وہ قاری کو آخر تک تحریر میں جکڑے رکھتا ہے۔ افسانوں میں عالیہ حرا اور ریما مرزا کے افسانے ابھی تک پڑھے ہیں جو بہترین تھے۔'' (مصنفات شکریہ کہتی ہیں)

ﷺ منور شہزادی، گوجرانوالہ سے۔ ''پاکیزہ کی بہنوں کی محفل میں عرصہ دراز سے شامل ہوں مگر بعض مرتبہ ایک دو ماہ کا وقفہ آ جاتا ہے۔ یہ سال تحریروں کے حوالے سے بڑا بھرپور رہا بہت اچھے موضوعات پر ہم نے تحریریں پڑھیں مگر جو تحریر سب سے زیادہ اچھی لگی یا یہ سمجھیں جس نے ہمارے دلوں کو چھو لیا... وہ عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ تھا ... بہترین انداز تحریر ہے جو قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ دوسری ہماری پسندیدہ رائٹر نایاب جیلانی رہیں جن کا سلسلے وار ناولٹ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ مجھے شیریں حیدر کی کہانیاں بھی بہت اچھی لگیں ....اور اس سال آپ کا لکھا ہوا ناولٹ کچی ڈوری رشتوں کی بھی بازی لے گیا سالگرہ کے موقع پر تمام مصنفات اور تمام بہنوں کو سالگرہ مبارک'' (آپ کو بھی)

ﷺ طاہرہ خورشید، فیصل آباد سے۔ ''باجی پاکیزہ مجھے بہت ہی بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر صرف ایک کمی ہے جو آپ ہی پوری کر سکتی ہیں پلیز باجی آپ اپنا ناول جلد شروع کریں'' (انشاء اللہ ضرور لکھوں گی مگر ابھی میرے پاس اپنی بہنوں کے جو ناول آئے رکھے ہیں وہ تو شائع ہو جائیں)

ﷺ نرگس نسیم، صابہ، موہڑہ سے۔ ''بہت عرصے بعد اس محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ آپ کو سالگرہ کی مبارک باد دینے کے لیے باجی آپ ہمارے علاقے میں آئیں تا کہ آپ کو پتا چلے آپ سے لوگ کتنی محبت کرتے ہیں... مجھے شیریں حیدر، ناہید سلطانہ اختر، نایاب جیلانی اور عظمیٰ آفاق کی تحریر حد سے زیادہ پسند ہیں۔ غلام رسول صاحب کو ان کے بیٹے کی شادی کی مبارک باد پہنچا دیں۔'' (آپ کی آواز پہنچائی جا رہی ہے)

ﷺ صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ سے۔ ''رفعت شبانہ کا افسانہ تا پڑھ رہی تھی بہت اچھا لگا دل پر لگا زندگی کی تلخ حقیقتیں ہیں جو ہر بار ہمارے سامنے آتی ہیں، میت پڑی ہوتی ہے لیکن ہم اس کو دیکھ کر عبرت نہیں پکڑتے موت برحق ہے سب نے ایک دن جانا ہے۔ شادی بیاہ تو چھوڑ ہمارے ہاں تو میت کی رسومات میں بھی منافقت شامل ہوئی۔ کتنا غم ہے ناں ہمارے اندر اب ہمیں میت دیکھ کر رونا نہیں آتا بین کرنے والی عورت مخصوص آواز میں رونا ڈالتی ہے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے۔ میت پڑی ہو انتظار ہوتا ہے کب لے کر جائیں گے فلاں کو چائے چاہیے، بغیر چینی والی فلاں کو چائے پتی ہے زیادہ دودھ والی۔ (ہر ہر جگہ یہی سب ہو رہا ہے) عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ ایسٹ میں بازی باندی ..... نے بہت محظوظ کیا۔ ناہید سلطانہ اختر کا بلا عنوان بہت اچھی تحریر تھی۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا عمر کے بعض ادوار بڑے حسین ہوتے ہیں لیکن بڑھاپا آزمائش ہوتا ہے جو ہر ایک کے حصے میں آتی ہے۔ بہترین میں ایسٹ والا مسز محبوب مرزا بہت مزہ آیا پڑھ کر۔'' (تبصرے کا شکریہ)

ﷺ شبنم کنول، گاؤں پپھڑی سے۔ ''سب سے پہلے آپ کو بیٹے کی شادی کی بہت مبارک باد ہو۔ انجم آنٹی کو بھی چاندنی پوتی کی مبارک ہو۔ آنٹی یہ جو آپ نے نئی لکھنے والی بہنوں کے لیے الگ صفحات کے بارے میں سوچا ہے وہ میرے خیال سے تو زبردست ہے۔ نئی لکھنے والی بہنوں کو بھی آگے آنے کا موقع دیا جائے۔ آنٹی ایک درخواست ہے کہ روحانی مشورے پاکیزہ





کے شروع میں شائع کریں۔ دین کی باتیں بہت اچھی تھیں۔ اب آتے ہیں پاکیزہ کے افسانوں اور ناولوں کی طرف افسانے سب ہی اچھے تھے۔ رضوانہ پرنس، بلقیس تیری دہلیز پر کمال کی تحریر تھی۔ مکمل ناول بھی زبردست تھا۔ ثناء کو اس کی خدمات کا صلہ مل گیا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ رنگ خلش میں اب ایک موڑ آیا ہے عادل اور ثمرا کی شادی کیا رنگ لاتی ہے، خصوصی مضامین بھی اچھے تھے، عظمیٰ آفاق آپی نے تو کمال ہی کر دیا۔ دبئی کا پورا کا پورا نقشہ ہی کھینچ کر ہمیں دکھا دیا۔ کہیں کہیں تو ایسا بھی لگا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔''

(پیاری شبنم تبصرے کا شکریہ۔ ہم تحریروں کے طفیل ایک دوسرے کے ساتھ ہی تو ہوتے ہیں)

☆ نگہت عظمیٰ، کراچی سے۔'' یہ خط میں آفس میں بیٹھ کر لکھ رہی ہوں۔ پاکیزہ پورا پڑھ لیا ہے۔ اس دفعہ جو سب سے بہترین تحریر ہے وہ ناہید سلطانہ اختر کی تھی۔ زبردست، کیا خوب لکھا ہے۔ اس قدر روانی اور تسلسل کے ساتھ گزرتے ہوئے وقت کا بیان انسان کی بے ثباتی، زمانے کا تغیر...... حقیقت تو یہ ہے کہ وقت بڑا ظالم ہے، انسان ہوتا کیا ہے اور وقت اسے کیا بنا دیتا ہے۔ ناہید کو یہ تحریر لکھنے پر بہت، بہت مبارک باد۔ دوسری تحریر جو یاد رہ گئی وہ عظمیٰ کا سفر نامہ ہے۔ بہت سہل اور شگفتہ انداز ہے۔ بہت چھوٹے، چھوٹے جملوں میں بہت گہری باتیں پوشیدہ ہیں اور پھر آپ کا جشنِ تمگ۔ کیا تعریف کروں...... تعریف اس خدا کی جس نے آپ کو اس صلاحیت سے نوازا۔ رضوانہ پرنس کی والدہ کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور ان کے لواحقین کو اس دکھ کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرے کہ ماں جیسی ہستی کا نعم البدل اس دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے خاندان میں اضافہ کیا اور آپ کے گھر میں اپنی رحمت نازل کی۔ پوتی کی بہت، بہت مبارک باد، خدا اسے زندگی، صحت، ہدایت کے ساتھ والدین کے زیرِ سایہ پروان چڑھائے، آمین۔ عذرا رسول، ذیشان کی شادی کی بہت، بہت مبارک، باد دیجیے گا۔ خدا اس جوڑی کو بے شمار خوشیوں اور مسرتوں سے نوازے۔'' (پُرمحبت اور دعاؤں سے لبریز خط لکھنے کے لیے جزاک اللہ)

☆ ارم خان، ڈیرہ غازی خان سے۔'' ڈیئر مدیرہ پاکیزہ میں یہ میرا فرسٹ لیٹر ہے۔ امید ہے کہ آپ ہمیں دوسری بہنوں کی طرح شامل کر کے شکریہ کا موقع دیں گی۔ کچھ دن پہلے گی اور رسالوں کے ساتھ پاکیزہ بھی لائی تو پڑھنے کے بعد اچھا لگا تو پھر سوچا کیا بیٹھوں خط لکھنے۔ اب دیکھتے ہیں جگہ ملتی ہے یا نہیں۔ امید اور یقین تو ہے کہ جگہ ضرور ملے گی۔'' (پیاری ارم اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ ہر ماہ اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ شرکت کیا کریں اور اپنے ہر مرا سلے پر اپنا نام بھی ضرور تحریر کریں اور اسے الگ صفحے پر لکھیں)

☆ فرح ناز، ملکوال سے۔'' مجھے جب بھی موقع ملتا ہے صرف پاکیزہ ہی اچھا لگتا ہے اس کے علاوہ کوئی رسالہ دل میں جگہ نہیں بنا سکا۔ پچھلے دنوں فرحانہ ناز ملک کی افسوس ناک موت اور ان کے گھر والوں کا اس طرح دنیا سے چلے جانا بہت بڑا خلا ہے گھر اور پروا لے کے ہاتھ میں ہے خاص طور پر ان کی بہن، والد اور شریک سفر کے ساتھ ان کے بچوں کے ساتھ، ساتھ افسوس اور دل کی تہہ گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ میں بھی ایک ماں ہوں فرحانہ کی تصویروں کا شدت سے انتظار ہے۔ شاید ہی کوئی رسالہ ہو جو میں نے نہ پڑھا ہو مگر سب سے اچھی کتاب پاکیزہ ہی ہے اور دل کو سکون ملتا ہے۔ ذیشان کی شادی کے بارے میں لکھا نہیں آیا بجھ۔'' (رنگین تصاویر چھپنے کی وجہ سے تاخیر ہوئی ہے اور انشاء اللہ آپ آئندہ ماہ پڑھیں گی)

☆ عظمیٰ زہری، اوستہ محمد سے۔'' رفاقت آپی یہ کیا حسنات کو احساس دلایا جا رہا ہے کہ وہ اچھے شوہر

نہیں، وہ باتیں بھی کرنے لگے ہیں اپنی بیوی سے۔ عاس کی آنٹی اچھی تربیت کا نمونہ ثابت ہوا۔ میں وہ تو بالکل اپنے پاپا جیسا بنتا جا رہا ہے۔ یہ قسط خاص رہی۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ راشدہ کے خیالات پڑھ کر دل خوش ہوا کیونکہ انہوں نے بہت زبردست باتیں کیں موبائل اور انٹرنیٹ والی محبت کے بارے میں۔ یہ موبائل اور انٹرنیٹ نے نوجوان کو راہ راست سے بھٹکا دیا ہے پھر آج کل والدین بھی توجہ نہیں دیتے بچوں پر سب سے بڑی بات بڑوں کو ان چیزوں کو ہی استعمال کرنے کا بتانا چاہیے۔ پیاری بہنوں ہمارے ہاں رم جھم بارش برس رہی ہے۔ میں نے کافی اور پکوڑے بنائے ہیں آئیں مل کر کھائیں الحمد للہ بچیں '' (بارش کا اور پکوڑوں کا لطف اب آپ پاکیزہ کا سالگرہ نمبر پڑھتے ہوئے مزید اٹھائیں ہمیں تو اپنے شہر کراچی کی گرمی بھی پیاری ہے)

سعدیہ سنبل ملک اعوان، لاہور سے۔ '' میں آپ کو آپ کے پورے اسٹاف کو اور آنٹی عذرا رسول صاحبہ کو بہت بہت مبارک دیتی ہوں ان کے بیٹے کی شادی کی اور پاکیزہ کی سالگرہ کی (خیر مبارک) مجھے کچھ کہنا ہے میں آنٹی آپ سے گفتگو کرنے میں سادگی کے طریقے کو اپنانے پر زور دیا ہے۔ مگر آنٹی کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ آپ اپنا ندا، محبت، خلوص والے سچے اور ہمدرد ہونے کے باوجود کسی ایک انسان کا خلوص بھی جیتنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ (وہ اس لیے کہ دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہیں مگر ہمیں اللہ کی رضا کے لیے اپنا رویہ مثبت رکھنا چاہیے۔ جزاک اللہ والی بات ہے) ناولٹ بہت ہی خوب صورت امروزی کے حوالے سے گرہیپ کا فیشن پرانا تھا۔ اعتبار وفا میں ساتھ ساتھ پڑھ رہی ہوں۔ امل کی اپنے والد سے محبت نے آنسو بہانے پر مجبور کردیا۔ اور دل میں آتی خواہش ہے کہ بابا بھی میرے اتنے قریب ہوتے اور مجھ سے پوچھتے یہی سفر بیمار رہا۔ ترک وفا، نایاب جیلانی صاحبہ کی لاجواب تحریر ہے۔ نایاب جیلانی کو میں نے ابھی پہلی مرتبہ پڑھا، مرد سے میں پڑھا۔ ترک وفا کی صورت ایک خوب صورت ناول دیا ہمیں پڑھنے کے لیے۔ ذرا کی سمجھائی اور ہمیں نئی باتوں کی سیر کروائی۔ یہ ایک تاریخی ناول تو نہیں تھا مگر ہم جیسے ملک، مصر کی خواہش رکھنے والوں کے لیے معلوماتی تھا۔ سوٹ نایاب جیلانی آنٹی آپ نے بہت ہی ریسرچ کے بعد یہ ناول تحریر کیا اور یقیناً اس میں آپ نے محنت بھی کی ہے جو کہ لائق تحسین اور لاجواب ہے۔ جنگل کا پھول، زاہدہ پروین کی تحریر بھی اچھی لگی۔ بجلی تیری دہلیز پر آنٹی رضوانہ پرنس ہمیشہ ہی خوب صورت لفظوں کے ذریعے معاشرے کی بدصورتی کو پیش کرتی ہیں کہ زندگی کتنی تلخ ہوتی ہے مگر رشتوں کو مضبوط ڈوری سے باندھنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔ رنگ نقش، سوٹ سوٹ رفاقت جاوید کی تھوڑی تھوڑی میٹھی محبت اور نفرت کو اجاگر کرتی نظر آئیں۔ چھوٹے چھوٹے محسوسات کو لفظوں کا جامہ پہنانا کسی عام لکھاری کے بس کی بات نہیں۔ سیما رضا، شیریں حیدر کی تحریریں اچھی تھیں اور عظمی آفاق کی بھی میں آخر میں شکر گزار ہوں میں عرشیہ ہاشمی، عزیز وتسلیم.... یہ نایاب پسند آئیں۔ گھر میں بڑی ٹینشن تھی مگر جب جلترنگ، مامو پڑھ کر شاید.... مسکرانے نہیں (... تبصرے کا شکریہ)



سعدیہ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ '' مجھے کچھ کہنا ہے، ہمیں سب سے پہلے اعتبار وفا، وفا ڈھونڈتے رہیں گے۔ رنگ خوشبو میرا پسندیدہ ترین شعر مرکزی خیال بنایا گیا خوشی ہوئی۔ ترک وفا سب گرہیں کھل گئیں۔ زندگی بدلتی ہے، ناہید سلطانہ اختر میں بچپن سے ان سے آشنا ہوں۔ ان کی تحریر بے حد پسند آئی۔ باب محمد مصطفی کے لیے اردو پوک کے ہمراہ مفتی منعم واحد پڑھیں۔'' (جزاک اللہ)

سعدیہ ناہید فاطمہ حسنین، کراچی سے۔ '' قیصر وحیات کی کتاب سے اقتباس پیش کر کے ہمیں قیصروں کی وسعت ہی کا بھی ادراک ہوتا ہے۔ فرحانہ کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ رضوانہ پرنس کی والدہ کے انتقال کی خبر نے رنجیدہ کردیا۔ فریدہ جاوید کو سالگرہ والا ادارہ مبارک ہو۔ اس سالگرہ ادارہ تک پہنچتے پہنچتے فریدہ نے یاد دلایا، شفقت نمایاں ہوئی۔ آنٹی آپ کو آپ کی فیملی کو پیاری،



پیاری عائشہ کی ڈھیروں مبارک باد عذرا رسول کو ذیشان کا ولیمہ مبارک ہو۔ وہ ذیشان اور ڈاکٹر فاطمہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی کسی طرح ان کی ساس نہیں لگ رہی تھیں بلکہ ذیشان کی بڑی بہن لگ رہی تھیں۔ (ماشاءاللہ) نایاب جیلانی اور رضوانہ پرنس کے ناولٹ زبردست رہے۔ شوبز پر ناولٹ لکھ کر رضوانہ نے یوں بھی جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ پچھلی بار میں عظمیٰ آفاق کے سفرنامے پر لکھ نہ سکی تھی سو اب... ماشاءاللہ عظمیٰ نے سفرنامہ لکھ کر بھی خود کو منوالیا پاکیزہ ڈائری تو وہ زبردست سجاتی ہیں۔ شائستہ زریں نے بہت حساس موضوع اٹھایا اور جواب دینے والوں نے بھی کھل کر سچے اور حقیقی جوابات دیے۔ ویل ڈن افسانوں کی طرف آتی ہوں نہ تو اور اگر اچھا ہوتا اتنا زیادہ متاثر نہ کر سکے۔ ناہید سلطانہ اختر ایک منجھی ہوئی لکھاری ہیں۔ بلاعنوان پڑھا احساس ہی نہیں ہوا کب شروع کب ختم ہوا انہوں نے ایک ایک لوازمہ نبھایا۔ غزالہ جلیل نے جو موضوع چنا وہ بے حد حساس تھا اور اسے انہوں نے نبھایا بھی۔ اداس تم تو شاید ہو عالیہ کا لکھنے کا اپنا انداز ہے اور وہ اس میں کامیاب ہیں۔ انہوں نے محبت کے فلسفے کو بہت عمدگی سے پیش کیا۔ سیما سراج کی مختصر کہانی بہت اچھی تھی۔ نئی لکھاری بہنوں کو سینئرز سے کم از کم یہ ضرور سیکھنا چاہیے کہ سینئرز کس طرح مختصر بات کو مختلف اور مختصر انداز میں لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور کامیاب ہو کر سیما سراج جیسی بنتے ہیں۔ جب ذکر ہو مزاح کا تو جلترنگ کا ذکر نہ آئے یہ ممکن نہیں میں نے جلترنگ ہی سے پاکیزہ پڑھنے کا آغاز کیا تھا آنٹی آپ کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ آج سے دس سال پرانا جلترنگ بھی پڑھو تو آج کا لکھا لگتا ہے، ویری ویل ڈن اکثر متفق ہوں میں شاعری کا اعلیٰ نمونہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام اشعار وزن میں ہوتے ہیں۔'' (تفصیلی تبصرے کا شکریہ، مصنفات، آمنہ اور نزہت اصغر بھی شکریہ کہتی ہیں)

☆☆☆☆

■ پیاری بہنوں اس ماہ تاخیر سے آنے والے خطوط، مراسلات اور انٹرویو انشاءاللہ آئندہ ماہ لگ جائیں گے۔ پاکیزہ میں خط لکھ کر آپ یہ تو کبھی سوچیے گا بھی نہیں کہ یہ شائع نہیں ہوگا میرے پاس ہر آنے والا خط انتہائی اہم ہوتا ہے۔ آپ اپنی تحریروں کے بارے میں یا کوئی بھی اچھی سی بات بتانے کے لیے مجھے فون بھی کر سکتی ہیں مگر پلیز رات کو فون نہ کیا کریں۔ دن میں گیارہ سے شام چار بجے تک آپ مختصر فون اس نمبر پر کر سکتی ہیں۔ (021-36964779)

■ اب آپ سے درود پاک پڑھ کر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم میرے جسم کو شفا، دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نور بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتی رہے۔ یا رب العالمین مجھ سے میری اولاد سے اور میرے تمام عزیز و اقارب سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا اور ہر چھوٹی، بڑی غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا۔ اپنی نظر میں چھوٹا اور دوسروں کی نظر میں بڑا بنا دینا اور دونوں جہاں میں مجھے خیر عطا کرنا کہ بے شک تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور تیری ثنا سب سے بڑی ہے اور تیری پناہ عزت والی ہے اس لیے صرف اپنا محتاج رکھنا اور اپنی شان کے حساب سے اپنا رحم و کرم اور فضل کرنا... بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

دعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمدِ باری تعالیٰ

مجھے بخشا ہے تو نے شعورِ زندگی یارب
ترے ہی نور کی ہے ہر طرف تابندگی یارب
اجالوں میں اجالا ہے تصور تیری ہستی کا
مٹا دیتی ہے ظلمت کو بھی تیری روشنی یارب
تیری مدحت سرائی میں بسر ہوتے تو ہیں لمحے
مگر محسوس ہوتی ہے ابھی کچھ تشنگی یارب
مجھے کر دے عطا وہ علم جس سے خود کو پہچانوں
میں خود کو جان کر پا جاؤں آخر آگہی یارب
تفکر سے تصور تک تیری رحمت کا سایہ ہو
میرے دل کو بھی ہو جائے عطا بالیدگی یارب
جو مجھ پر راز کر دے منکشف اس بحرِ ہستی کے
مجھے بھی بخش دے اب تو وہ رمزِ آگہی یارب
ادا ہو جائے حقِ بندگی زہرا تو میں سمجھوں
ملے گی ایک دن مجھ کو بھی در پہ حاضری یارب

شاعرہ: منیبہ زہرا نقوی
مرسلہ: مسز شمع حسین، کینیڈا

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

صبا چپکے سے کہتی ہے چلو آقا بلاتے ہیں
صبا اِک بار پھر کہہ دو مجھے آقا بلاتے ہیں
گناہوں سے بھرا دامن طلن سے دور رکھتا ہے
جدائی نے بڑی لمبے مجھے پل پل رُلاتے ہیں
کہوں کیسے میں دل کی بات لب خاموش ہیں میرے
چھلکتے نیر آنکھوں میں عجب سپنے دکھاتے ہیں
صبا اِک بار پھر کہہ دو مجھے آقا بلاتے ہیں
بہت سے پھول لے کر جب چلوں آقا کی چوکھٹ پر
کدھر دیکھوں کہاں جاؤں قدم بھی لڑکھڑاتے ہیں
صبا اِک بار پھر کہہ دو مجھے آقا بلاتے ہیں
صبا اب کچھ نہیں کہتا، صبا خاموش اب رہتا
میں واپس آنہ پاؤں گی اگر سچ مچ بلاتے ہیں
نبی سے عشق ہے مجھ کو یہی تو کہہ نہیں پاتی
صبا چپکے سے کہہ آؤ میرے ساگر چھلکتے ہیں

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

ذکرِ الٰہی

ام درداؓ زوجہ ابو درداؓ فرماتی ہیں۔ ذکرِ الٰہی سب سے بڑا عمل ہے۔ اگر تو نماز پڑھے تو یہ بھی ذکرِ الٰہی ہے۔ اگر تو روزہ رکھے تو یہ بھی ذکرِ الٰہی ہے۔ ہر نیک عمل جو سرانجام دے یہ ذکرِ الٰہی ہوگا۔ ہر برائی جس سے تو اجتناب کرے یہ عمل بھی ذکرِ الٰہی کے زمرے میں آئے گا۔ سبحان اللہ کا ورد کرنا سب سے بڑا ذکر افضل ہے۔

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

وجہ

ایک دفعہ حضرت بابا فریدؒ اپنے سیلانی دور میں ایک بستی سے گزرے دیکھا کہ ایک خوب صورت عورت ایک غریب عورت کو مار رہی ہے۔ بابا جی نے وجہ دریافت فرمائی۔ اطلاع ملی کہ یہ امیر عورت ایک عشوے گاہ کی مالک ہے اور غریب اس کی ملازمہ بلکہ مشاطہ اس دن نوکرانی نے مالکن کو کاجل ڈالا اور اس کے ساتھ کوئی ریت کا ذرہ بھی تھا جو اس کی خوب صورت آنکھوں میں بڑا تکلیف دہ لگا۔ اس لیے اس نے خادمہ کو مارا۔ بابا فریدؒ اپنے سفر پر گامزن

ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا اور اس بستی کے قبرستان میں قیام کے دوران انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا، ایک چڑیا نے اپنے بچے دیے ہوئے تھے۔ چڑیا آ کر اپنے بچوں کو خوراک کھلاتی۔ بچے کھوپڑی کی آنکھوں سے باہر منہ نکالتے اور خوراک لے کر اندر چلے جاتے۔ بابا جی نے دیکھنے کے لیے مراقبہ کیا کہ یہ کھوپڑی کس کی ہے۔ انہیں معلوم ہو کہ یہ تو اس خوب صورت عورت کی ہے جو آنکھوں میں ریت کا ذرہ برداشت نہ کرتی تھی آج اس کی آنکھوں میں چڑیا کے بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔

انتخاب: مہر و میر، کشمیر

مقدر کا رزق

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حضرت ابوبکر شبلیؒ شدید بیمار ہو گئے ایک حکیم آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ "یا حضرت! پرہیز فرمائیں۔" آپ نے فرمایا۔ "میں کس چیز کا پرہیز کروں اس سے جو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے روزی میں مقدر فرما دیا ہے یا اس سے جو میرے مقدر میں ہی نہیں ہے؟ اگر تم اس سے پرہیز کرانا چاہتے ہو جو میری قسمت میں لکھا جا چکا ہے تو اس سے پرہیز کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں اور اگر اس سے پرہیز کروانا چاہتے ہو جو میرے لیے روزی میں مقسوم ہی نہیں تو وہ مجھے پہلے ہی نہیں مل سکتی۔" حکیم صاحب نے حضرت ابوبکر شبلیؒ کا یہ جواب سنا تو خاموش ہو کر چلا گیا۔

اقتباس: تذکرۃ الاولیا

مرسلہ: فرح ناز، ملکوال

سالگرہ مبارک

محبت کے قرینوں میں
کہ لفظوں کے نگینوں میں
گلابوں کی بہاروں میں
چمکتے ان ستاروں میں

سحر کی سب دعاؤں میں
کہ لافانی وفاؤں میں
یہی تکرار ہے دل کی
یہی گفتار ہے دل کی
مبارک یہ جنم دن ہو
ہمیشہ تم پھلو پھولو

مرسلہ: نیر رانی شفق، ڈی جی خان

بہترین دوا

حکیم لقمان نے کہا۔ "میں نے دنیا میں تیس سال مختلف دواؤں سے لوگوں کا علاج کیا مگر اس طویل تجربے کے بعد میں نے سیکھا کہ انسان کے لیے سب سے بہترین دوا محبت اور عزت ہے۔" کسی نے پوچھا کہ "اگر یہ اثر نہ کرے تو؟" وہ مسکرائے اور بولے۔ "دوا کی مقدار بڑھا دو۔"

مرسلہ: گل شاہین، رحیم یار خان

سالگرہ

سالگرہ کی شام مبارک
شام کے لب پر
میری یاد
مچلتی رہنے دینا
اپنے حصے کی سب شمعیں
گل کر دینا..... لیکن
میرے نام کی آدھی شمعیں
جلتی رہنے دینا

شاعر: محسن نقوی

مرسلہ: مسز فرح امجد، لاہور

انمول باتیں

☆ بعض لوگ شاکی ہیں کہ گلوں میں خار پنہاں ہیں لیکن میں شاکر ہوں کہ کانٹوں کے ساتھ پھول بھی ہیں۔

☆ زبان کی لغزش پاؤں کی لغزش سے زیادہ

خطرناک ہے۔
☆اس خوشی سے دور رہو جو کل کو غم کا کاشانہ کردکھوے۔
☆وہ علم دیرپا اور مستقل ہوتا ہے کہ جو اپنی کوشش اور تجربوں سے حاصل ہو۔
☆خاموشی دل کا سکون ہے اور روح کے لیے وہی درجہ رکھتی ہے جو جسم کے لیے نیند۔
☆جو لوگ ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتے ہیں انہیں بہت کم کبیدہ خاطر پایا جاتا ہے۔
مرسلہ: سیما گل، ملتان

دعا

تمہاری سالگرہ پر دعا ہے میری
کہ ایسا روز مبارک ہزار بار آئے
تمہاری جنتی ہوئی زندگی کی راہوں میں
ہزاروں پھول لٹاتی ہوئی بہار آئے
مرسلہ: نجمہ اصغر، کراچی

عورت کے لیے شوہر

☆شوہر کی خدمت اور محبت کرنے والی عورت کو اللہ محبوب رکھتا ہیں۔
☆شوہر کی خدمت صدقہ ہے۔
☆شوہر کے ہر حکم کی اطاعت کرو خواہ بیکار ہی معلوم ہو۔
☆غیر اللہ کو سجدہ جائز ہوتا تو شوہر کو سجدے کا حکم ہوتا۔
☆شوہر سے بلا وجہ طلاق مانگنے پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔
☆شوہر کی شکر گزاری نہیں تو اللہ کی نگاہ کرم بھی نہیں۔
☆شوہر کو ناراض چھوڑے رکھنا اور پروانہ کرنا لعنت کا باعث ہے۔
☆شوہر کی خدمت افضل ترین اعمال سے بڑھ کر ہے۔
مرسلہ: صائمہ یاسر شاہ، اٹک

بھول نہ جانا

کوشش کی تھی جان و دل سے وفا کا عہد نبھانے کی
لیکن کر کے ہیں پچھتائے دھیرے، دھیرے ہولے، ہولے
حاصلِ زیست تھا عمروں کا جو وقت وہ ہم سے روٹھ گیا
کیسے کوئی واپس لائے دھیرے، دھیرے ہولے، ہولے
جادو حسن خوباں کا ہم تم کو کیا بتلائیں دوست
آنکھوں سے ہیں جام لنڈھائے دھیرے دھیرے ہولے ہولے
بھول نہ جانا شہر یاراں ہم نے اپنی جانیں دے کر
خوشیوں کے ہیں دیپ جلائے دھیرے دھیرے ہولے ہولے
شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

بکھرے موتی

☆خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو اس کی عظمت کا علم رکھتے ہیں۔
☆رشتوں کا نہ ہونا اتنا تکلیف کا باعث نہیں بنتا جتنا رشتوں کے ہوتے ہوئے احساس کا مرجانا تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔
☆لالچ ختم کردو دنیا کا کوئی شخص آپ کو دھوکا نہیں دے سکے گا۔
☆آپ والد صاحب کو تیل کا کنواں اور دوستوں کو لاٹری کے ٹکٹ کی حیثیت دے دیتے ہیں تو ہماری توقعات کے جسم پر کانٹے نکل آتے ہیں اور یہ کانٹے ہمارے تن من کو زخمی کر دیتے ہیں۔
☆قبرستان میں کتنے لوگ دفن ہیں لیکن ان کو کوئی دکھ نہیں کوئی رکاوٹ اور کوئی مشکل نہیں۔ مسائل، رکاوٹیں اور پریشانیاں تو صرف زندہ لوگوں کو درپیش ہوتی ہیں اور یہی زندگی کی اصل قیمت ہے۔

سالگرہ

ایک کالی کلوٹی بدصورت دلہن کی دوسرے دن سالگرہ تھی اس نے اپنے خوب صورت دولھا سے

شرماتے ہوئے پوچھا۔ ''کل میری سالگرہ کی تقریب ہے آپ بتائیں میں آپ کے کس، کس رشتے دار سے پردہ کروں؟''

دولہا نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''بس اک مجھے چھوڑ کر باقی جسے مرضی چہرہ دکھا دو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔''

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

تصحیح

دل کے بڑے آپریشن کے بعد ایک خاتون نازک حالت میں تھیں۔ ان کے شوہر بیڈ کے قریب پریشان کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ فکرمند نہ ہوں یہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی کیونکہ ان کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے۔''

''کچھ ایسی کم بھی نہیں ہے۔ یہ پینتالیس سال کی تو ہو چکی ہیں۔'' شوہر نے ڈاکٹر کو بتایا۔ مریضہ آہستہ سے کسمسائی ہونٹ ذرا سے ہلے اور سرگوشی سنائی دی۔

''چوالیس سال کی ہوں میں۔''

مرسلہ: شبانہ حیات، لاہور

وفادار عورت

چارلی چپلن سے کسی نے پوچھا۔ ''کون سی عورتیں سب سے زیادہ وفادار ہوتی ہیں۔ سنہرے بالوں والی یا بھورے بالوں والی؟'' چارلی نے جواب دیا۔ ''جن کے بال سفید ہو چکے ہوں۔''

میری جنت

وقتِ رخصتی دل کا
عجب عالم تھا مت پوچھو
بہت سے خوف دل میں تھے
قدم مشکل سے اٹھتے تھے
نہ آنسو میرے رکتے تھے
تڑپ کر میں یہ کہتی تھی
یہ ہیں اجنبی انجان
نہیں جانا، مجھے روکو
میرے بھائی میرے پاپا
خدا کے واسطے روکو
زمانہ یوں بھی بدلا ہے
یا میرا دل ہی پگلا ہے
جواب ہر دم یہ کہتا ہے
میرے بچے، میرا ساجن
ان پہ وار دوں تن من
یہ ہی بس میری دنیا ہیں
یہ کہنا ہے اب دل کا
میری جنت میرا گھر ہے

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

خطرناک غلطیاں

☆ اپنے والدین کی خدمت نہ کرنا اور اپنی اولاد سے توقع رکھنا۔
☆ اس نیت سے عیب کرنا کہ دو چار مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔
☆ اپنا راز کسی کو بتا کر اس کے پوشیدہ رکھنے کی درخواست کرنا۔
☆ ہر اک انسان کے متعلق ظاہری شکل صورت دیکھ کر رائے قائم کر لینا۔
☆ اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرنا اور کسی خدائی عطیے کی امید رکھنا۔

مرسلہ: نور افشاں...... شکارپور

چاند تارے اور میں

دور نیلے آسمان پہ
چمکتے ہیں تارے
کتنے لگتے ہیں پیارے
آسماں پہ اڑ کے میں جاؤں
ان تاروں کو چھو کے آؤں

مرسلہ: نورین شہزاد، کراچی

کلنک کا ٹیکا

ہمارے یہاں اچھے بھلے بڑی کلاسوں کے طلبا بھی محاورے کی وہ ٹانگ توڑتے ہیں کہ رہے نام اللہ کا۔ الیف اے کے ایک پرچے میں ایک طالبہ نے کلنک کا ٹیکا لگنا کو بھی انجکشن کی کوئی قسم سمجھا تھا اور اسے کچھ یوں جملے میں استعمال کیا۔

''ہمارے محلے میں سب نے کلنک کے ٹیکے لگوائے، میں گھر پر نہ تھی اس لیے نہ لگوا سکی۔''

امجد اسلام امجد کے سفرنامے ،ریشم ریشم سے اقتباس

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور

جدید اردو

فخر سے ایک راز ہم فاش کرتے ہیں
کبھی ہم منہ کو دھوتے تھے اب واش کرتے ہیں
تھا بچوں کے لیے بھی بوسہ مگر اب کس ہی کرتے ہیں
ستاتی تھیں کبھی یادیں مگر اب مس ہی کرتے ہیں
چہل قدمی بھی کرتے تھے مگر اب واک کرتے ہیں
کبھی کرتے تھے ہم باتیں مگر اب ٹاک کرتے ہیں
کبھی جو امی ابو تھے وہ اب ممی ڈیڈی ہیں
خاتونِ محترم تھیں جو کہلاتیں اب وہ لیڈی ہیں
کبھی ہم بھی تھے کرتے غسل شاور اب تو لیتے ہیں
کبھی ہم پھول چنتے تھے فلاور اب تو لیتے ہیں
کبھی جو تھا غسل خانہ بنا پھر باتھ روم
درجہ اور بڑھا اس کا بنا اب وہ واش روم
مہمان گھر میں ہمارے اب بھی آتے ہیں
مگر اب وہ ہمارے گیسٹ کہلاتے ہیں
ایسی اردو سن کر دل بڑا بے چین ہوتا ہے
پہلے ہوتا تھا درد ہم کو مگر اب پین ہوتا ہے

انتخاب: یاسمین اقبال، لاہور

تاج محل

بیوی: کتنا پیار کرتے ہو؟ ٹی وی کے پروگرام سے متاثر ہو کر پوچھا گیا۔

شوہر: شاجہان جتنا۔ (چائے پیتے ہوئے مسکرا کر)

بیوی: میرے مرنے کے بعد تاج محل بناؤ گے؟ (اپنی بچی ہوئی چائے اس کے کپ میں ڈالتے ہوئے)

شوہر: میں تو پلاٹ بھی لے چکا ہوں پگلی، دیر تو، تُو کر رہی ہے..... (ذو معنی مسکراہٹ کے ساتھ)

از: مہرین ضیا بنگش، کراچی

موسم

کوئی آہٹ، کوئی جنبش، کوئی دستک نہیں ملتی
ہمارے دشتِ ویراں میں بڑی فرصت کا موسم ہے

از: فرحت احمد، کراچی

جان لو

☆انسان آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان لٹکا ہوا ایک پینڈولم ہے۔

از: بشریٰ ملک، ٹیکسلا

نصیحت

اے شوخ و شریر لڑکی
مت حائل ہو میری راہوں میں
میں تو بہتے ہوئے سمندر کا پانی ہوں
اور تو ایک ٹھہری ہوئی جھیل کا پانی
میری منزل لاپتا ہے
تیری منزل جھیل
مت تلاش کر مجھے
کہیں تیرا وجود کھو نہ جائے
موسم اب بدلنا چاہتا ہے
سنا تھا خاموشی ہر بلا کو ٹالتی ہے
اس لیے چپ ہوں
مجھے چپ .... سادھ لینے دو
مگر سن لو
کہ موسم اب بدلنا چاہتا ہے

از: ارم کمال، فیصل آباد



تبدیلی

"یہ سلمٰی بھابی، کیا کہہ رہی ہیں؟" کچھ دیر تو ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ یوں بھی ان کا ذہن ان دنوں شل سا ہو رہا تھا۔ دو کماؤ پوت بیٹوں کی شادیوں کا جب سے فیصلہ ہوا تھا۔ ان کا دل ہمہ وقت بے کل سا رہا کرتا تھا۔

شان اور جان دو ہی تو ان کے بیٹے تھے۔ وجیہہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماں کے فرمانبردار، گھر سے جب نکلتے تو دونوں بیٹے ماں کے گالوں کو بوسہ دیتے پھر گھر سے قدم باہر نکالتے، ماں بھی جب تک اپنے بچوں کی پیشانی چوم کر پڑھ کر پھونک نہ دیتیں، انہیں گھر سے باہر نہ نکلنے دیا کرتیں۔

پہلے تو شادی میں دیر اس وجہ سے ہو رہی تھی کہ ان کی جاب معمولی تھی۔ اللہ کے فضل سے اس میں ترقی ہوئی تو یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ گھر میں صرف ایک کار ہے، دونوں کے پاس علیحدہ، علیحدہ کاریں ہونی چاہئیں تاکہ آنے والیوں کو بھی کسی قسم کی کوئی دقت نہیں ہو۔

دونوں بیٹوں نے جھٹ لیزنگ پر زیرو میٹر گاڑیاں لے لیں۔

"اللہ نے مجھے صرف دو بیٹے دیے ہیں، آنے والیاں لڑے بغیر نہیں رہیں گی، یوں بھی دیورانی، جیٹھانی میں کہاں دوستیاں ہوتی ہیں، میں تو ایسی جگہ شادی کرنا چاہتی ہوں جو سگی بہنیں ہوں یا جڑواں بہنیں ہوں۔"

خاندان میں لڑکیوں کا ویسے ہی کال تھا، شادی کا مسئلہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔

جو لوگ باہر کی دکھاتے، وہ انہیں پسند نہیں آتیں۔ گھر والوں کا مکان بہت برا ہے، گاڑی پرانے ماڈل کی ہے، اماں کے دانتوں کا چوکا اونچا ہے، ابا موٹے بہت ہیں، بھائی گنجے ہیں، لڑکی ہنس بہت رہی تھی، یہ وہ خامیاں تھیں جن کی وجہ سے انہوں نے ایک درجن کے قریب لڑکیاں رد کر دیں۔

اور پھر سلمٰی بھابی ہی کام آئیں۔ انہوں نے ان کو ایسی پیاری، پیاری لڑکیاں دکھائیں کہ ان کا دل چاہنے لگا کہ کاش ان کے بہت سے بیٹے ہوتے اور ایسی پریاں ان کے آنگن میں گھوما کرتیں۔

بیٹوں نے جب لڑکیاں دیکھیں تو بضد ہو گئے کہ منگنی کی رسم تو فوراً کر دی جائے۔ سلمٰی بھابی سے رابطہ قائم کیا گیا۔ دو بہنوں کے حق میں قرعہ فال نکلا۔ مونا اور ارونا کے ساتھ شان اور جان کی منگنیاں کر دی گئیں اور ایک سال تیاری کے لیے لے لیا گیا۔

اور وہ بھی چٹکیوں میں بیت گیا۔

اب نہ صرف لڑکی والے جلد شادی کے لیے اصرار کر رہے تھے بلکہ دونوں بیٹے بھی اپنی شادی کے لیے بلکنا شروع ہو گئے تھے۔ سلمٰی بھابی سے مشورہ کیا تو انہوں نے سمجھایا۔

"منگنی کا دورانیہ طویل نہیں کرنا چاہیے۔"

"تو کیا ہو جائے گا؟" وہ تمام ممکنہ خطرات سے آگاہی چاہتی تھیں۔

"لڑکے خود کر لیتے ہیں شادی... منگنی کے بعد یوں بھی وہ ایک دوسرے کو فون کے ذریعے پل، پل کی خبریں دینے اور لینے کے عادی ہو جاتے ہیں۔" انہوں نے ڈرایا۔

''تو پھر کیا کروں میں؟''

''وہی کرو، جو سب مائیں کرتی ہیں، بیٹے جب جوان ہو جاتے ہیں تو ان کی شادیاں کر دینی چاہئیں۔''

''مگر میرے دونوں بیٹے مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' شائستہ کے آنسو بھل بھل بہنے لگے۔

''یہ کوئی نئی اور انہونی بات تو نہیں ہے، سب بیٹے اپنی ماؤں سے ایسی محبت کرتے ہیں۔''

''میرے بیٹے جب گھر سے باہر جاتے ہیں تو شان اور جان میرے گال چومتے ہیں اور جب آتے ہیں تو میرے ہاتھ چومتے ہیں۔'' وہ زارو قطار روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''آپ کا کیا خیال ہے، شادی کے بعد ان کی پرانی عادتیں تبدیل ہو جائیں گی؟'' سلمٰی بھابی نے زچ ہو کر پوچھا۔

''ہاں! شادی کے بعد سب کے بیٹے بدل جاتے ہیں، سب کی پرانی عادتیں ختم ہو جاتی ہیں۔'' انہوں نے سسکی بھر کر کہا۔

''شائستہ تم بھی حد ہی کرتی ہو، میں جو کہہ رہی ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ انسانی عادات اتنی جلدی تبدیل نہیں ہوتیں، ہاں، ماحول کا فرق ضرور پڑ جاتا ہے۔'' انہوں نے سمجھایا۔

''تو پھر کیا ہوگا؟ شادی کے بعد بھی میرے بچوں کی یہی عادت رہے گی ناں۔''

''ہاں! وہ گھر میں آتے جاتے، یونہی چومتے رہیں گے۔ بس گال تبدیل ہو جائیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ چلتی بنیں۔

اب شائستہ بیگم، کافی دیر سے بیٹھی سوچ رہی تھیں کہ یہ سلمٰی بھابی آخر کہہ کیا گئیں۔

پاگل کون نہیں

پرانی فلموں میں ایک خوبی یہ ہوتی تھی کہ آخری سین میں لائن سے کھڑے فنکاروں کی شادیاں ہوا کرتی تھیں، کوئی فلمی نانا، نانی یا دادا، دادی اپنے دبنگ لہجے میں ہیرو کی ہیروئن سے، ہیرو کے دوست کی ہیروئن کی سہیلی سے اور نوکر کی، نوکرانی سے شادی کا فیصلہ کر دیتے تھے۔ (پرانی بلیک اینڈ وائٹ فلموں میں دوست اور سہیلی کا کردار لازمی ہوا کرتا تھا جیسے ہیرو، ہیروئن کے دل کی ہر بات کی خبر پہلے سے ہی کرانی تھی) ان شادیوں کی ایک وجہ یہ ہوتی تھی کہ فلم بین دل میں بوجھ لے کر نہ اٹھیں اور جس طرح ہنستے ہوئے آئے تھے اسی طرح اپنے گھر جائیں۔ (آج کل تو فلم بینوں کا کوئی خیال ہی نہیں رکھتا آہ)

اسی طرح ان فلموں میں پاگل خانے کا ایک سین ضرور ہوتا تھا۔ آج کی نئی فلموں میں یہ سین نہیں ہوتا تو شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اب لوگ اپنے، اپنے پاگلوں کو اپنے گھر میں رکھنا زیادہ پسند کرتے ہوں یا اب پاگل خانے اتنے ایڈوانس ہونے لگے ہوں کہ انہوں نے اپنے مریضوں کو آزاد چھوڑ رکھا ہو۔

ہاں، بات ہو رہی تھی پاگلوں کے فلمی سین کی یہ لوگ اپنے، اپنے بال نوچتے ہوئے ہی ہی، ہاہا کرتے نظر آ رہے ہوتے۔ ذرا سی بات بھی ان کی مرضی کے خلاف ہو جاتی تو مرنے مارنے پر تل جایا کرتے خیر آج بھی کسی کے مزاج کے خلاف بات ہو جائے تو اس کا اقدام بھی اسی نوعیت کا ہوتا ہے پاگل باس کو پاگل کہنا بے حد مشکل ہوتا ہے اگر وہ کسی گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس یا گرلز کالج کی پرنسپل ہوں تو اس سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایسے اداروں میں اسٹاف ممبرز دو دھڑوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں ایک چمچی گروپ، دوسرا ناہنجار گروپ دوئم اللہ کر کا نام پرنسپل اور ان کی چمچیاں رکھتی ہیں۔

یہ خیر قطعی دوسری بات ہے کہ پاگل کسی بھی محاذ پر ہو انہیں پاگل کہنا انتہائی مشکل اور ناممکن ہوتا ہے۔

آج بھی کتنی دکھیاری عورتیں اپنے غم اپنے سینوں میں پال کر جوان کرتی ہیں مگر ان کے لبوں پر ان کے شوہر یا ان کے سسرال والوں کا نام نہیں آتا۔ (ہمارا خیال ہے کہ پچھتر فیصد خواتین کا نام صابرہ ہونا چاہیے)

وقت جوں جوں بیتا لفظ پاگل خانے نے خاطر خواہ ترقی کی فلموں میں جب ہیروئن اپنے ہیرو کی محبت پر ایمان لے آتی تھی سرشاری سے اس طرح اعتراف کرتی۔ ''تم بھی بس پاگل ہو۔'' وہ لفظ پاگل کو جس طرح محبت اور حیا آمیز لہجے میں ادا کرتی دیکھنے والے اپنے پاگل نہ ہونے پر تاسف محسوس کرتے۔

جوں، جوں وقت کی نزاکتیں اور قدریں بدلیں تو زیادہ محنت کرنے والوں کو پاگل کا خطاب دیا جانے لگا۔

''نہیں بھئی اس دفتر میں کسی صورت نہ جانا وہاں کا باس تو پاگلوں کی طرح کام کرتا ہے اور کرواتا ہے۔''

بے وقوف عورتیں ہر دور میں اِن رہی ہیں ذہین عورتوں کو مکار اور سفاک اور ان کی باتوں پر یقین کرنے والوں کو بھوندو (باؤلے) کا خطاب تو خیر عرصہ دراز سے دیا جا رہا ہے جن میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی نظر آتی ہے اس گھرانے کے شوہر کو دبو، بے وقوف، زن مرید اور آخر میں پاگل بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ (دل کے پھپھولے اسی طرح پھوڑے جاتے ہیں ایسی باتیں کرنے سے اکثر لوگوں کے مزاج میں شگفتگی آجاتی ہے) شگفتگی تو خیر انڈیا کی ان بڑی عمر کی اداکاراؤں کے چہرے پر بالکل بھی نظر نہیں آتی جو بچے گود لے کر اپنی مامتا کو تسکین بھی دے رہی ہیں اور بعض اپنے کرتوتوں پر ڈھکن رکھنے کی بھی کوشش کر رہی ہیں پاکستانی فلم انڈسٹری میں شادی کو ظاہر کرنا بدنامی کے پلڑے میں بیٹھنے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ آج بھی کئی اداکارائیں ایسی ہیں جو بچوں والیاں ہیں مگر وہ اپنے آپ کو لڑکی سمجھ کر ایسی خوش ہیں جیسے انہیں کوئی جھوٹا سمجھے گا ہی نہیں۔ (صائمہ اور سید نور نے اپنی شادی چھپانے کے لیے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں جھوٹ تو ضرور بولے ہوں گے) بچوں والی اداکارائیں یہ بھی سمجھتی ہیں کہ انہیں دیکھنے والے نہ صرف اندھے ہیں بلکہ وہ پاگل بھی ہیں اور ایسے پاگل جب پرانی فلموں میں شبنم مراد نہ بھیس بدل کر ہیرو اور اس کے گھر والوں کو بے وقوف بناتی ہیں تو تماش بین بچہ، بچہ اسے باجی پکار اٹھتا تھا مگر ہیرو قرأت بھرے لہجے میں انہیں خان صاحب کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔

ایک اخباری رپورٹ کے مطابق انڈیا میں اسکول کے کورس میں فلمی مکالمے شامل کیے جائیں گے اور رفتہ، رفتہ فلمی گیت بھی نصاب کا حصہ بنیں گے اگر یہ پاگل پن نقالی کی صورت میں پاکستان میں بھی آگیا تو کیا یہ گیت کسی نصاب میں شامل ہو سکتے ہیں۔

کنڈی نہ کھڑکا سوہنیاں سیدھا اندر آ
مینوں نوٹ وکھا میرا موڈ بنے (لاحول ولاقوۃ)

ہماری یہ تحقیق قطعی ذاتی ہے۔ (جس سے آپ کا متفق ہونا ضروری ہے) جون، جولائی کے مہینے میں پاگلوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو پہلے پاگل نہیں ہوتے۔ یعنی اپریل اور مئی میں) وہ آنے والے مہینے میں وہ بھی کوچہ پاگلاں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس کی پہلی وجہ تو بجٹ کی آمد ہوتی ہے جو کبھی عوام دوست نہیں ہوتا بلکہ عوام دشمن ہوتا ہے کسی شاعر نے یہ بالکل غلط کہا تھا۔

کیسی یہ جوانی آئی ہے
آگ لگے گی کہیں نہ کہیں

حالانکہ شاعر کو یہ کہنا چاہیے تھا۔

کیسا یہ بجٹ آیا ہے
آگ لگے گی کہیں نہ کہیں

مہنگائی کی آگ نے لوگوں کا کیا حال کر دیا ہے۔ اس کا احساس ڈرائنگ رومز کے اے سی زدہ ماحول میں بیٹھنے والے سیاست دان نہیں کر سکتے۔ کراچی میں اگر وہی ایک سو دس روپے کلو ل رہا ہے تو ان کے ٹھینگے سے ان کے لیے تو اب بھی یہ بہت سستا ہے۔ ایک ڈالر کا ہی ہوا۔ اس سے زیادہ وہ عوام کو کیا ریلیف دیں گے یوں بھی موبائل کو غذا، پانی اور بجلی سے سستا کر کے عوام کو بے وقوف تو بنا ہی دیا گیا ہے۔ اگر وہ پاگل بھی ہو رہے ہیں تو ہوتے رہیں ویسے بھی پاگلوں کی کمی تو کہیں نہیں ہوتی، ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔

گھریلو ماحول میں لفظ ''پاگل'' بڑی شان اور آب و تاب کے ساتھ ماضی میں بھی موجود تھا، حال میں بھی ہے اور مستقبل میں رہے گا مختصر یہ کہ اس طرح کی باتیں کانوں میں ہمیشہ کسی کے لیے رس اور کسی کے لیے زہر گھولتی رہیں گی۔

''ارے بھئی یہ سلمیٰ بیگم میں بڑا گُر ہے پتا نہیں اپنے میاں کو کیا گھول کر پلایا ہے، وہ ان کے پیچھے پاگل بنے پھرتے ہیں۔ وہ جو بات بھی کہہ دیں اچھا جی، بالکل! ارے واقعی یا تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی ہے'' اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اکثر بیویاں اپنے پاگل شوہروں پر خاصی مغرور بھی نظر آیا کرتی ہیں کہ میں کچھ بھی کہہ دوں ماشاء اللہ بولتے ہی نہیں۔

ذھنی ھم آھنگی

وہ پہلی مرتبہ میاں کے ساتھ لندن جارہی تھیں۔ ان کے میاں جانی بسلسلۂ ملازمت وہیں رہتے تھے اور بے حد نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ انہوں نے دیکھا بیگم صاحبہ جھاڑن، برتن مانجھنے کا جونا، اپنی اٹیچی میں رکھ رہی ہیں۔

''یہ کیا الا بلا لے جارہی ہو؟'' وہ برہم سے بولے۔

''یہ بے حد کام کی چیزیں ہیں، جاتے ہی مجھے ضرورت پڑے گی۔'' انہوں نے دونوں چیزیں نکال کر دور اچھال دیں۔

''اب مجھے یہ بے تکی چیزیں نظر نہ آئیں۔'' تھوڑی دیر بعد وہ اپنے سوٹ ان کی اٹیچی میں رکھنے لگے تو وہی گلابی جھاڑن اور برتن مانجھنے کے تار ان کے ہاتھ میں آ گئے۔

''بڑی بدتمیز اور ضدی ہو، جب میں نے منع کر دیا کہ یہ چیزیں نہیں جائیں گی تو نہیں جائیں گی۔'' انہوں نے وہ چیزیں صحن میں نکال کر پھینک دیں۔

ائیر پورٹ جانے سے پہلے کسی بہانے سے ان کی اٹیچی چیک کی تو انہیں یہ اطمینان ہوا کہ وہ بکواسیات موجود نہیں تھیں۔ اور جب تھکا دینے والے سفر سے نمٹ کر وہ اپنے گھر پہنچے تو اگلی صبح ان کے باورچی خانے میں وہی گلابی جھاڑن اور برتن مانجھنے کے تار کے پیکٹ کاؤنٹر پر رکھے تھے۔

''یہ تم کس طرح لے آئیں؟'' اب وہ متبسم لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

''میں نے آپ کے سوٹ کیس میں رکھ دی تھیں۔ مجھے پتا تھا کہ اب میری اٹیچی تو بار، بار چیک ہوسکتی ہے۔ مگر آپ اپنے سوٹ کیس کو چیک نہیں کریں گے۔''

''بڑی ضدی ہو یار.....'' وہ ہنسے۔

''وہ دراصل ہم دونوں کا اسٹار ایک ہے ناں...... اس لیے ذہنی ہم آہنگی بہت ہے۔'' وہ شرما کر بولیں۔

اور ان کی مسکراہٹ نے قہقہے کی شکل اختیار کرلی۔

☆☆☆



☆ جبیں نیاز..... ملتان

سایہ ہوں تو پھر ساتھ نہ چلنے کا سبب کیا
پتھر ہوں تو رستے سے ہٹا کیوں نہیں دیتے

☆ کوثر خالد..... جڑانوالہ

ہمدردیوں کی بھیک سی دینے لگے ہیں لوگ
یوں اپنے جی کا حال نہ سب سے کہا کرو

☆ صائمہ قیصر..... راول پنڈی

آنکھوں پہ اعتبار کیا دل گنوالیا
ناداں سے دوستی ہوئی صدمہ اٹھالیا

☆ کائنات عبدالحلیم..... میر پور خاص

پاتے ہیں کچھ گلاب چٹانوں میں پرورش
آتی ہے پتھروں سے بھی خوشبو کبھی کبھی

☆ نگہت اعوان..... سرگودھا

ویسے تو زندہ دل ہیں مگر پھر بھی اے شکیل
ہوتا ہے ایک درد بھی اس ہنسی کے ساتھ

☆ نیلوفر خان..... بہارہ کہو

شدتِ غم کو تبسم میں چھپانے والے
دل کا ہر درد تو آنکھوں سے عیاں ہوتا ہے

☆ شہلا محمود..... واہ کینٹ

قلق انہیں نہیں گر دوستوں کے چھٹنے کا
طبیعت اپنی بھی کچھ، کچھ سنبھلتی جاتی ہے

☆ عرشیہ جنید..... کراچی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
تیرے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

☆ ممتاز خانم..... کراچی

تو کہیں بھی ہو ترے پھول سے عارض کی قسم
تری پلکیں میری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں

☆ نگہت زیدی..... بہارہ کہو

اسی میں، میں سکونِ دل کا ساماں دیکھ لیتا ہوں
سجا کر میز پر تصویرِ جاناں دیکھ لیتا ہوں

☆ ماہ نور قیصر..... راول پنڈی

تمہارے غم سے جب اپنوں کی آنکھیں نم نہیں اکبر
تو پھر یہ پوچھتے کیوں ہو کہ بیگانوں پہ کیا گزری

☆ صبا سجاد..... دبئی

مانا کہ بزمِ حسن کے آداب ہیں بہت
جب دل پہ اختیار نہ ہو کیا کرے کوئی

☆ یاسمین رشید..... کراچی

پھر کیوں ہے غریبوں کے مکانوں میں اندھیرا
یہ چاند اگر سارے زمانے کے لیے ہے

☆ نرگس نسیم..... صوابہ موہڑہ

تمام لوگوں میں عہدِ وفا نہ ڈھونڈا کر
ہر ایک برگ تو رنگِ حنا نہیں دیتا

☆ حنا عروج..... کراچی

یہ اور بات کہ دشمن ہوا ہے آج مگر
وہ میرا دوست تھا کل تک، اسے برا نہ کہو

☆ ثوبیہ ظہور..... ضلع اٹک

ہم اوس کے قطرے ہیں کہ بکھرے ہوئے موتی
دھوکا نظر آئے تو ہمیں رول کے دیکھو

☆ سمیرا مجاہد..... صادق آباد

میں تجھ کو بھول جاؤں گا لیکن یہ شرط ہے
گلشن میں چل کے پھول سے خوشبو جدا کرو

☆ امینہ مشیر..... نئی دہلی

اپنی تو وہ مثال ہے جیسے کوئی شجر
دنیا کو چھاؤں بخش کے خود دھوپ میں جلے

☆نفیسہ آرا......راس الخیمہ

خود بہا جاتا ہوں، پر تیری خوشی کو میں نے
غم کے دریا کی روانی سے الگ رکھا ہے
یہ جو اِک رنگ ہے میرا، ہاں ہمیشہ اس کو
سرمئی، دودھیا پانی سے الگ رکھا ہے

☆انیقہ انا...... چکوال

کسی کام میں کوئی کوزہ گر مجھے رکھ کے بھولا تھا چاک پر
سو یہ گردشوں میں رہا سفر، میں تلاش نان جویں میں بھی

☆شہلا فواد......لاہور

کنویں سے جیسے کوئی اپنا آپ کھینچتا ہے
ہمیں تو سانس بھی اتنی گھٹن سے آتی ہے

☆حمیرا طارق......کراچی

عادت جو پڑی، صبر و تحمل کی تو نجمہ
آنسو مری پلکوں پہ مچلتا ہی نہیں ہے

☆نگہت غفار......کراچی

یہ غم نہیں ہے کہ ہر جذبہ پامال ہوا
بس اِک جدائی کا اس کی بہت ملال ہوا

☆نزہت جبیں ضیا...... گلشن جمال

جن میں خلوص و جذبہ ایثار بھی نہیں
ہم ایسے دوستوں کے طلبگار بھی نہیں

☆پروین افضل شاہین...... بہاول نگر

آتی ہے خوشی آ کے چلی جاتی ہے
اب رنج کا احساں اٹھانے دیا جائے
حصہ ہے مرا اس شہر کی تاریکی میں
اب اِک دیا مجھ کو بھی جلانے دیا جائے

☆ناظمہ شاہین......واہ کینٹ

ہاتھوں میں چھپائے ہوئے پھرتا ہے کئی زخم
شیشے کے کھلونوں سے بہلتا تھا جو اِک شخص
ہر ذہن میں کچھ نقشِ وفا چھوڑ گیا ہے
کہنے کو بھرے شہر میں تنہا تھا جو اِک شخص

☆شہلا محمود شاہین......واہ کینٹ

گزرے ہیں تیرے بعد بھی کچھ لوگ ادھر سے
لیکن تیری خوشبو نہ گئی راہ گزر سے
امجد نہ قدم روک کہ وہ دور کی منزل
نکلے گی کسی روز اسی گردِ سفر سے

☆فریحہ شبیر......شاہ نکڈر

بہت کم نظر آیا مجھے اخلاص لوگوں میں
یہ دولت بٹ گئی شاید بہت ہی خاص لوگوں میں

☆سامعہ ملک پرویز، بھیرہ خان پور

میں نے بار ہا چاہا اس کی یاد سے غفلت برتنا
مگر اِک خیال ہے کہ لہو میں گردش کرتا ہو جیسے

☆عروبہ ناز......کوٹلی

ہمیشہ ہی نہیں رہتے کبھی چہرے نقابوں میں
سبھی کردار کھلتے ہیں کہانی ختم ہونے پر

☆انعم وقار حیدر......لاہور

پلکوں کی بندش کو توڑ کر دامن پر آگرا
اِک آنسو میرے صبر کی توہین کر گیا

☆امینہ ... حیدر آباد

شرم گر ان کو آتی ہے تو شرمانے دو
خود فریبی میں انہیں آج، بہک جانے دو
بس ایک میں ہوں اور شہرِ ستمگر
خوب مل بیٹھے ہیں بچھڑے ہوئے دیوانے دو

☆فریدہ ریحان......کراچی

ظلم کیوں بار بار کرتی ہے
زندگی کیوں تجھے قرار نہیں
گر محبت کو گناہ کہتے ہو
یہ گناہ گار شرمسار نہیں

☆نزہت رضوی ......کراچی

کچھ تو اس کو بھی نظر آتا ہے
کوئی یونہی دغا نہیں دیتا
تیری الفت بھی کوئی چیز ہے کیا
دینے والا وہ کیا نہیں دیتا

☆☆☆

خوش ذائقہ
پاکیزہ بہنیں

پنج طبق بریانی

اشیاء: چاول، ایک کلو۔ نمک، حسب ذائقہ۔ ادرک، لہسن پسا ہوا، دو کھانے کے چمچ۔ پیاز، دو عدد درمیانی۔ گاجر، ایک عدد۔ آلو، ایک عدد۔ بند گوبھی، ایک عدد چھوٹی۔ چقندر، ایک عدد۔ بون لیس چکن، ابلی ہوئی ایک پیالی۔ شملہ مرچ، ایک عدد۔ کالی مرچ پسی ہوئی، حسب ذائقہ۔ سفید زیرہ، ایک کھانے کا چمچ۔ زردے کا رنگ، ایک چٹکی۔ کوکنگ آئل، حسب ضرورت۔

ترکیب: چاولوں کو بھگو کر بیس سے پچیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پیاز کو باریک کاٹ لیں۔ آلو باریک فرنچ فرائز کی طرح کاٹیں، شملہ مرچ اور بند گوبھی کو بھی باریک کاٹ کر رکھ لیں۔ پین میں دو کھانے کے چمچ کوکنگ آئل ڈال کر اس میں پیاز کو سنہری فرائی کریں اور اس میں زیرا ڈال کر کڑکڑائیں پھر اس میں پہلے چکن کو پھر چاول ڈال کر بھونیں اور چار پیالی پانی اور نمک ڈال کر پکنے رکھ دیں۔ اس دوران کڑاہی میں کوکنگ آئل کو گرم کر کے کٹے ہوئے آلوؤں کو زردے کا رنگ لگا کر فرائی کر لیں۔ چقندر کو ابال کر چھیل لیں اور کش کر کے رکھ لیں۔ جب چاولوں کا پانی خشک ہو جائے اور ایک کنی رہ جائے تو اسے الٹ پلٹ کر پانچ حصوں میں نکال لیں اور ہر حصے کو علیحدہ علیحدہ ایک کھانے کا چمچ کوکنگ آئل آدھا چائے کا چمچ ادرک لہسن اور ایک قسم کی سبزی کے ساتھ ہلکا سا فرائی کر لیں۔ بڑی سی ڈش میں تہہ لگا کر گرم اوون میں 150.C پر پانچ سے سات منٹ رکھ کر نکال لیں۔

نوٹ: اوون نہ ہو تو بڑے پتیلے کو گرم کر کے یہ ڈش اس میں رکھ دیں اور پندرہ منٹ بعد نکال لیں۔

از: ماہ نور خان، بہارہ کہو

توا فش

اشیاء: مچھلی، ایک عدد۔ نمک، حسب ذائقہ۔ لہسن کے جوے، تین سے چار عدد۔ ادرک، دو انچ کا ٹکڑا۔ کٹی ہوئی لال مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ چاول کا آٹا، ڈیڑھ پیالی۔ کارن فلور، آدھی پیالی۔ انڈے، تین عدد۔ چلی گارلک ساس، چار کھانے کے چمچ۔ لیموں کا رس، آدھی پیالی۔ آئل، حسب ضرورت۔

ترکیب: بغیر کانٹے کی مچھلی کے موٹے قتلے کر لیں اور اچھی طرح دھو کر چھلنی میں خشک کرنے کے لیے رکھ دیں۔ بڑے پیالے میں ادرک، لہسن کو چھل کر ڈالیں اور اس میں ساتھ ہی نمک، لال مرچ، چلی گارلک ساس، کارن فلار، چاول کا آٹا، انڈے اور لیموں کا رس ڈال کر پھینٹ لیں۔ مچھلی کے قتلوں کو اس مکسچر میں ڈال کر اچھی طرح ملا لیں اور پندرہ سے بیس منٹ کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ توے پر چار سے چھ کھانے کے چمچ کوکنگ آئل ڈال کر درمیانی آنچ پر گرم کریں اور اس میں ایک وقت میں تین سے چار قتلے ڈال کر سنہری فرائی کر لیں۔ تمام قتلے اسی طرح سے آئل میں سنہری فرائی کر لیں۔ گرم گرم مزیدار مچھلی کو حسب پسند چٹنی اور تازہ بنی ہوئی چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

از: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

عربین رائس

اشیاء: باسمتی چاول، (دھو کر بھگو دیں) دو کپ۔ سویاں۔ (باریک توڑ لیں) نمک، حسب

ضرورت۔ تیل، چار کھانے کے چمچ۔ بادام (چوپ کرلیں) چار سے پانچ عدد۔

ترکیب: سوس پین میں تیل گرم کر کے اس میں سویاں ڈال کر فرائی کرلیں۔ گولڈن براؤن ہوجائیں تو اس میں چاول، پانی اور نمک ڈال کر چاول کے گل جانے تک پکائیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر بادام سے گارنش کر کے سرو کریں۔

از: حنا کاشف، ملیر

عربک ثوبت

اشیا: مٹن یا چکن، آدھا کلو۔ چپاتی، تین سے چار عدد۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ ادرک، لہسن پسا ہوا، ایک کھانے کا چمچ۔ پیاز باریک کٹی ہوئی، ایک عدد۔ لال مرچ پسی ہوئی، ایک کھانے کا چمچ۔ ہلدی پسی ہوئی، آدھا چائے کا چمچ۔ دھنیا پسا ہوا، ایک چائے کا چمچ۔ پسا ہوا گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ دہی، آدھی پیالی۔ ٹماٹر باریک کٹے ہوئے، دو عدد۔ آئل، آدھی پیالی۔

ترکیب: عرب کی اس خاص ڈش کو بنانے کے لیے سب سے پہلے چپاتیاں تیار کرلیں، جس کے لیے تازہ گندم کے آٹے کو نرم گوندھ لیں اور اس کی پتلی چپاتیاں بنا کر رکھ لیں۔ پین میں آئل ڈال کر درمیانی آنچ پر گرم کریں اور اس میں باریک کٹی ہوئی پیاز کو سنہری فرائی کرلیں پھر اس میں صاف دھو کر رکھی ہوئی چکن ڈال کر تیز آنچ پر فرائی کریں، ادرک لہسن اور باریک کٹے ہوئے ٹماٹر ڈال کر درمیانی آنچ پر ڈھک دیں۔ دہی میں نمک، لال مرچ، دھنیا، ہلدی ڈال کر ملائیں اور چکن کو بھونتے ہوئے اس میں شامل کردیں۔ تیز آنچ پر اتنی دیر بھونیں کہ تیل علیحدہ ہوجائے۔ اس میں آٹھ سے دس پیالی پانی ڈال کر درمیانی آنچ پر پکنے رکھیں اور جب پانچ سے سات منٹ کے بعد چکن گل جائے تو چولھے سے اتار لیں۔

پھیلی ہوئی ڈش میں روٹی کے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈالیں اور اس پر چکن کا شوربہ ڈال دیں، دس سے بارہ منٹ کے بعد جب شوربہ جذب ہوجائے چکن کی بوٹیاں اوپر رکھ دیں۔ گرم مسالا اور باریک کٹا ہوا ہرا مسالا چھڑک دیں۔ چاہیں تو ذائقہ دوبالا کرنے کے لیے آدھا چائے کا چمچ پسا ہوا انار دانہ چھڑک دیں۔

از: انیقہ انا، چکوال

اورنج گرل سزلنگ چکن

اشیا: چکن بریسٹ، دو عدد۔ سیاہ مرچ، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ پیپریکا پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ لال مرچ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ لہسن، آدھا چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ضرورت۔ تیل، دو کھانے کے چمچ۔

سوس کے لیے:

کارن فلاور، ایک کھانے کا چمچ۔ چینی، ایک کھانے کا چمچ۔ سیاہ مرچ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ لہسن پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ ادرک پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ شلجم، ایک عدد۔ (ابال کر سلائس کرلیں) شملہ مرچ، ایک عدد (چوپ کرلیں) ہری مرچیں، تین عدد۔ اورنج جوس، آدھا کپ۔ اورنج کا پیسٹ، ایک چائے کا چمچ۔ اورنج سلائس، حسب پسند۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ تیل، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب: چکن بریسٹ کو کوکنگ ہیمر سے کچل کر پھیلا لیں اور نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، پیپریکا پاؤڈر، لال مرچ پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر اور لہسن پاؤڈر لگا کر ایک گھنٹا میرینیٹ کردیں اور گرل پین میں تیل گرم کر کے چکن بریسٹ کو دونوں طرف سے گرل کر کے ایک طرف رکھیں۔

سوس کے لیے: سوس پین میں کارن فلاور، چینی، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، لہسن پاؤڈر، ادرک پاؤڈر، اورنج جوس، شلجم، ہری مرچیں، شملہ مرچیں، اورنج سلائس، تیل اور اورنج کا پیسٹ ڈال کر مکس کرلیں۔

درمیانی آنچ پر پکائیں، چمچ چلاتی رہیں، گاڑھا ہونے لگے تو گرلڈ چکن بھی شامل کردیں۔ ہلکا سا پکا کر

سرونگ پلیٹ میں نکال کر رائس کے ساتھ سرو کریں۔

از: ہما انصار، کراچی

زعفران کاجو برفی

اب منہ میٹھا کیجیے:

اشیا: کاجو پانچ سو گرام۔ چینی، تین سو گرام۔ زعفران، آدھا چائے کا چمچ یا زردے کا رنگ، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ چاندی کے ورق، دو عدد۔ گھی، ایک پاؤ۔ پستہ اور بادام حسب ضرورت......

ترکیب: کاجو تین گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ اس کے بعد پانی نتھار کر کاجو کو اچھی طرح پیس لیں۔ اس پیسٹ میں چینی شامل کر دیں۔ گھی گرم کر کے اس میں کاجو اور چینی کا پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ جب مکسچر میں سے خوشبو آنے لگے اور گھی علیحدہ ہو جائے تو پانی میں گھلا ہوا زردے کا رنگ ملا دیں۔ پانی خشک ہو جائے تو ایک گہری پلیٹ کو ہلکا سا چکنا کر کے اس میں تیار کردہ آمیزہ پھیلا دیں۔ چاندی کے ورق اور باریک کٹے ہوئے بادام، پستے سے گارنش کریں اور ٹھنڈا کر کے جما لیں۔ جب جم جائے تو حسب پسند سائز اور شکل کے ٹکڑے کاٹ لیں۔ مزیدار کاجو برفی تیار ہے۔

از: رضوانہ سمیع..... کراچی

فروٹ جوسی کیک

اشیا: میدہ، دو کپ۔ دودھ، ایک کپ۔ اوولٹین، تین کھانے کے چمچ۔ ڈرائی فروٹ، ایک پاؤ۔ چینی، ایک کپ۔ گولڈن سیرپ، تین چمچ۔

ترکیب: میدہ کو چھان کر اس میں اوولٹین، ڈرائی فروٹ، دودھ اور چینی شامل کریں اور گولڈن سیرپ کو گرم کریں جب پگھل جائے تو اچھی طرح مکس کریں۔ اب اس آمیزے کو گھی لگے سانچے میں ڈال کر ایک گھنٹے تک اوون میں بیک کریں جب ٹھنڈا ہو جائے تو پیش کریں۔

نوٹ: اگر اوون نہ ہو تو پتیلے میں پتھر ڈال کر اوون کی طرح گرم کریں اور سانچہ اس میں رکھ دیں۔

از: روبینہ حنیف..... کراچی

مفید باتیں

☆انجیر خشک یا تر ہر موسم کے لیے مفید ہے۔ خیال اس کی مقدار کا رکھنا چاہیے۔ دو خشک انجیر رات کو سادہ پانی میں بھگو دیں اور نہار منہ اس کو کھائیں۔ اجابت صاف ہوگی۔

☆انجیر منہ کی بدبو دور کرتی ہے، ہڈیوں کو مضبوط کرتی ہے اور بال بڑھانے میں مددگار ہے اور بواسیر کی تکلیف میں مفید ہے۔ اپنی غذا میں انجیر کو شامل رکھو۔ بیماریوں سے دور رہو گے۔ صرف دو انجیر روز کی خوراک ہے۔

☆اگر شہد کو غذا کا مستقل جزو بنا لیں تو جگر کی کسی تکلیف کی نوبت نہیں آئے گی مگر شہد اصلی ہونا شرط ہے۔ ناشتے میں شہد کو بھی جزو دستر خوان بنائیں۔

☆ستو، ستر قسم کی بیماریوں کو دور کرتا ہے۔ ستو معدہ کو قوت دیتا ہے، صفرا کو گھٹاتا ہے، پیاس کی زیادتی کو دور کرتا ہے، معدے کو صاف کرتا ہے۔ مزید خوش ذائقہ بنانے کے لیے لال شربت میں برف کا چورا ڈال کر ستو کے ساتھ مشروب بنائیں، گرمیوں کا مزیدار شربت تیار ہے۔

☆آنکھوں کے سیاہ حلقے اس طرح دور کریں کہ ایک آلو چھیل کر کدوکش کر کے خوب یخ پانی میں پانچ منٹ بھگو دیں۔ پھر نکال کر اس میں ایک چمچ شہد ملائیں اور اس مرکب کو آنکھوں کے گرد اور پپوٹوں پر لگا دیں۔ دس منٹ کو لیٹ جائیں اور پھر ٹھنڈے پانی میں روئی بھگو کر آہستگی سے صاف کر لیں۔

☆آج کل بازار میں اچھی مولی آئی ہوئی ہے۔ اس کو کھانوں میں تو شامل کریں ساتھ ہی اس کے رس سے بھی فائدہ اٹھائیں۔ مولی کا رس چہرے کا بہترین کلینزر ہے۔ مولی کے رس کے چند قطرے روغن زیتون ملا کر ہاتھ، پیر، کہنیوں اور گھٹنوں پر ملیں۔ جلد کو شادابی بخشنے میں مددگار ہے۔

عندلیب پاکیزہ بہنیں

سچ

ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم اللہ کو ایک مانتے ہیں لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اللہ کی ایک نہیں مانتے......

از...... امینہ عندلیب، سلانوالی

اے پاکیزہ

تیرا خاور درخشاں رہے تا ابد سلامت
تیری صبح نور افشاں کبھی شام کو نہ پہنچے

از...... ارم کمال، فیصل آباد

نیا سال

گزرے ہوئے لمحات کو بھول کر
نیک تمناؤں کے ساتھ
امن کی ایک مثال قائم کریں
آؤ مل جل کر
ایک اچھے سال کا آغاز کریں

از...... سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ

بیوی کی سالگرہ

سنو! اگر تم
کان کی بالی اور
ہونٹ کی لالی
تک افورڈ نہیں کر سکتے
تو تم بیوی کی سالگرہ پر
اس کو خوش نہیں رکھ سکتے
اور دنیا میں بھی کچھ نہیں کر سکتے

شاعرہ...... عظمیٰ آفاق

مرسلہ...... صبا نور، لیہ

سالگرہ

میری ماں ہمیشہ کی بھلکڑ ہیں
کل تم گھر پر تحفہ لے کر آ جانا
میں ان سے کہہ دوں گی
کہ آج میری سالگرہ ہے

مرسلہ: نور افشاں، شکار پور

سالگرہ کا حساب کتاب

بڑی بھابی نے دیے پانچ سو
دیورانی نے دیے ڈھائی سو
ساس، سسر نے کچھ نہیں دیا
نندیں بھی خالی ہاتھ آئیں
ہو گیا میرا نقصان
بچی کی سالگرہ پر دو ہزار خرچ ہوئے
آئے صرف ساڑھے سات سو

جلترنگ سے اقتباس......

مرسلہ...... ممتاز خانم، کراچی

اپنی پیاری دوست کے نام

محبت سے بڑھ کر تم سے عقیدت آج بھی ہے،
مجھے اے دوست
یوں مقام تیرا بلند سب دوستوں میں آج
بھی ہے
ہر لمحہ زندگی میں محبتیں نصیب ہوں تجھے
شامل تو میری زندگی کی دعاؤں میں آج بھی ہے
کبھی الوداع نہ کہنا اے دوست
ہمیں آپ کی ضرورت آج بھی ہے

تحریر: نرگس نسیم صابہ موہڑہ، چکوال

ہمارے پاس

دل میں رہنے والے رستے
کوئی ایسے بھی ہوتے ہیں
وہ کہیں بھی نہیں جاتے
ہمارے پاس رہتے ہیں

از: صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ

کوئی اپنا

ساری زندگی رکھا ہے بے فیض رشتوں کا بھرم
سچ پوچھو تو کوئی بھی اپنے سوا اپنا نہیں ہوتا

از.....نگینہ ضیا بخش، کراچی

محل

جو الجھن تھی درپیش وہ حل ہوگئی
تجھے دیکھتے ہی غزل ہوگئی
میرے دل میں جب سے مکیں تم ہوئے
یہی کوٹھری اک محل ہوگئی

شاعرہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

میں بھی!

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کرلیا اور ملال بھی نہیں

مینا آفریدی، کلفٹن، کراچی

ذرا سوچیں ذرا

لوگ کیا کہیں گے
صرف ایک جملہ
روزانہ
لاکھوں خواب
توڑ دیتا ہے

شاعرہ: ماہا بلوچ، میرپور خاص

کاش

چاند تاروں کی حکومت ہوگی
پھول کلیوں کی زیارت ہوگی
سبز پرچم کی حفاظت ہوگی
پاک کھلاڑیوں کی سطوت ہوگی
پاک بزرگوں کی حرمت ہوگی
پاک بچوں سے محبت ہوگی

شاعرہ: کوثر خالد، جڑانوالہ

مرمت

بھول نہ جانا چپل کی مار کبھی
ایسا چرچا نہ ہوا تھا سرِ بازار کبھی
لاکھ حجاموں سے بال بنوائے مگر
ہوا نہ سر ایسا ہموار کبھی

فردوس شاہی، لاڑکانہ

سن لو ذرا

پیاری بہنو! ہمیشہ چھوٹی، چھوٹی خوشیوں کا استقبال کیا کرو۔
کیونکہ ان کے پیچھے ہمیشہ محبت کا سیلاب ہوتا ہے۔

از: زرین زبیر کوٹھاری، کراچی

دیکھا جائے گا

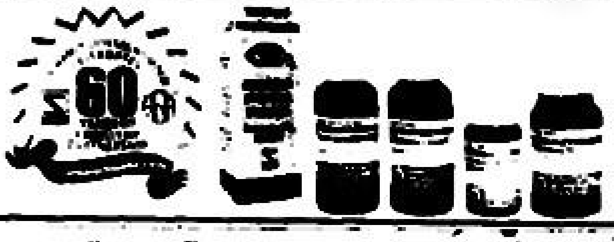
کوئی ہنسائے گا کوئی رلائے گا
کوئی محسن کوئی ظالم کہلائے گا
ہاتھوں کی لکیریں آنکھوں کی تصویریں
وقت آنے پہ کون کس کو ہرائے گا
آج پھر عجیب انداز میں دھڑک رہا ہے دل
کیا پھر ایک بار وہ مجھ کو ٹھکرائے گا
ہر ظلم سے ظالم ہے جدائی اس کی
اس بار یہ ظلم دل سہہ نہ پائے گا
تھک ہار کے دل مجھ کو میں دل کو دلاسے دیتی ہوں
وقت تو آئے دیکھا جائے گا

مرسلہ: ارم خان، ڈی۔جی خان

☆☆☆

شوابے ہومیو کلینک

SCHWABE



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں۔ ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

جسمانی کمزوری اور نسوانی مسائل

نسرین.........وزیر آباد

ڈاکٹر صاحب میں نے آپ کو پہلے بھی خط لکھا تھا اور اپنا مسئلہ بیان کیا تھا۔ لیکوریا، جسمانی کمزوری اور بریسٹ کا برائے مہربانی مجھے کوئی اچھا سا نسخہ لکھ دیں۔ آپ نے میری پہلے بھی مدد فرمائی تھی اسی طرح اب بھی میری رہنمائی فرمائیں۔

جواب: مریض کا صحیح معنوں میں علاج ڈاکٹر کے معائنے کے بعد ہوا کرتا ہے۔ بہت ساری باتیں مریض کو دیکھنے، سننے کے بعد اور بہت ساری باتیں مریض سے پوچھنے کے بعد اور کچھ رپورٹوں کے ذریعے سمجھی جاتی ہیں جن کے بعد ایک صحیح نسخہ تجویز کیا جاتا ہے۔ پھر دوبارہ معائنہ کچھ عرصے بعد ہوتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ مریض دوا ہدایت کے مطابق لے رہا ہے یا نہیں، دوم مریض کو کن ادویات سے کتنا فائدہ ہو رہا ہے، سوم مریض کی کیفیت میں جو تبدیلی ہو رہی ہے اس کے مطابق نسخہ میں کوئی تبدیلی یعنی کوئی اور دوا شامل کرنی یا نکالنی ہے اس لیے یہ اتنا آسان کام نہیں ہوتا جس طرح عموماً لوگ خیال کرتے ہیں اور خصوصاً جب بہت سارے مرض اکٹھے ہوں ان کی تشخیص کرنا اور ان کا

ٹوکن
برائے شوابے ہومیو کلینک

مئی 2015

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________________

پتا: ____________________

____

علاج کرنا یقیناً وقت مانگتا ہے۔ ان خطوط میں بہت ساری تفصیلات معلوم نہیں ہو پاتیں۔ ورزش کو معمول میں شامل کریں۔ متوازن، سادہ غذا خصوصاً گندم کی روٹی کا استعمال کریں۔ دودھ دہی، بکرے/گائے کا گوشت، ٹماٹر، سیب، گاجر، چقندر، ہرے پتوں والی سبزیوں کا استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کے بعد Hb% کی رپورٹ کے ساتھ حال بتائیں۔

Calc Iodium-30، Natr.mur-30، Ferr.Phos-30، Phos-30، 5،5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔

بچی کی بیماریاں

ماہا مقصود.........چکلالہ، راولپنڈی

میری بیٹی کی عمر ابھی چار سال ہے۔ اسے نہ تو کھانے کا شوق ہے اور نہ ہی وہ کھانے کو مانگتی ہے۔ ہم اکیلے رہتے ہیں اور مجھے کوئی طریقہ بھی نہیں پتا تھا کہ بچوں کو کس طرح رکھتے ہیں۔ چار سال کی ہے مگر جو بھی دیکھتا ہے یہی کہتا ہے کہ 2 سال کی ہے۔ پہلے اس کا رنگ لال اور سفید تھا مگر اب سارے بدن کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔ اس عمر میں اس کے بال تیزی کے ساتھ گر رہے ہیں اور ماتھے کے اوپر والے بال سارے گر گئے ہیں اور اب جسم اور ہونٹوں کے اوپر بال بھی آ گئے ہیں۔ سارا جسم خشک ہو گیا ہے اور جسم کی ہڈیاں باہر آنا شروع ہو گئی ہیں۔ خون کی بھی کافی کمی ہو گئی ہے۔ پڑھائی میں پہلے ٹھیک تھی مگر اب اسے پڑھنے کا دل نہیں کرتا۔ اس عمر میں اس کو لیکوریا بھی ہو گیا ہے۔ پیشاب والی جگہ پر خارش بھی کرتی ہے۔ اس کی نیند کافی کم ہو گئی ہے۔ مرچ تو کسی صورت نہیں کھا سکتی۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے بن گئے ہیں۔ پیٹ درد کی شکایت کرتی ہے۔ موشن جب کرتی ہے تو وہ سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ اس کے منہ سے بدبو بھی آتی ہے۔ کانوں کے پیچھے، بازوؤں کے نیچے، ٹانگوں کے درمیان اور پیشاب کی جگہ دونوں طرف کبھی کبھی زخم ہو جاتے ہیں۔

SCHWABE

جواب: بچی کو اچھا خوشگوار ماحول دیں۔ بعض اوقات بچوں کا حد سے زیادہ خیال رکھا جائے تو اس سے بھی بچے چڑ جاتے ہیں۔ وہ آزادی چاہتے ہیں۔ بچی کے پیٹ میں کیڑے بھی ہو سکتے ہیں۔ کھانے کے ساتھ صفائی کا بھی خیال رکھیں۔ کم از کم ایک دن بعد نہلایا کریں۔ صفائی ستھرائی کا خیال رکھیں۔ استنجا کرنے کا صحیح طریقہ بتائیں۔ تمام موسم کے پھل سبزیاں، متوازن خوراک دودھ، دہی، مکھن، پنیر، گوشت گائے و بکرا، دیسی مرغی، مچھلی، دالیں، اناج، جو، گندم، مکئی کھلائیں۔ خود بھی کھائیں تاکہ دیکھنے سے رغبت ہو اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔

Cina-30، Calc.Carb-30، Ferr.Phos-3x، Chelidonium-30، کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں ....ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

مرگی

نوشین.........کوہاٹ

ڈاکٹر صاحب میرا بیٹا مرگی جیسے موذی مرض کا مریض ہے۔ ایلوپیتھی علاج چل رہا ہے۔ اگر درمیان میں دوا چھوڑ دے تو دورہ پڑ جاتا ہے۔ ویسے ماشاء اللہ بہت قابل ہے۔ میرا بیٹا انجینئر ہے۔ صحت بھی ٹھیک ہے بس سر میں بہت زیادہ خشکی ہے۔ میں آپ سے جاننا چاہتی ہوں کہ کیا ہومیوپیتھی میں اس کا مکمل علاج ممکن ہے۔ اگر ہے تو میری رہنمائی فرمائیں بلکہ کسی شمارے میں اس کے بارے میں تفصیل سے لکھیں تاکہ بہت سے اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

میں اپنے بیٹے کو Apival 500gm صبح شام دیتی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اس کا علاج شادی بھی ہے۔ بچے کے والد کو شادی سے پہلے یہ مرض تھا مگر اب وہ اللہ کے کرم سے بالکل ٹھیک ہیں۔ میرے اس سوال کا جواب نزدیکی شمارے میں دیں، بہت نوازش ہوگی۔

جواب: مرگی ایک اعصابی بیماری ہے جس میں مریض کا اعصابی نظام متاثر ہوتا ہے۔ اس کو اس طرح سے سمجھ لیجیے کہ جب بجلی کے تاروں میں وولٹیج زیادہ ہو جائے تو بلب/سیور وغیرہ تیز جلنے لگتے ہیں بالکل اسی طرح جب اعصاب میں حرکی قوت بڑھتی ہے تو وہ مریض پر جھٹکوں کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ مریض اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ یہ خاندانی پیدائشی یا کسی چوٹ کے لگنے، یا کسی صدمے وغیرہ سے ہوسکتی ہے۔ ہومیوپیتھی میں اس کا بہترین علاج موجود ہے اور جب سبب جاننے کے بعد علاج کیا جائے تو پھر یہ مکمل علاج ثابت ہوتا ہے۔ امید ہے کہ آپ کو تسلی ہوگئی ہوگی۔ علاج کے لیے مکمل تفصیل ضرور بھیجئے گا۔ کسی بھی قسم کے مفروضوں پر عمل نہ کیجیے گا۔

ہاضمہ کی خرابی

دانی ایل.........کھاریاں

ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ اور علامات درج ذیل ہیں۔ پیاس زیادہ لگتی ہے، نظام ہضم ٹھیک نہیں، تھوڑا سا کھانا کھاتے ہی بھوک ختم ہوجاتی ہے۔ ڈکار زیادہ آتے ہیں۔ ناف کے قریب بھی کبھار درد محسوس ہوتا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں کے ناخنوں کی رنگت سفید ہے اور یہ کمزور ہیں۔ منہ سے ناگوار بدبو آتی ہے۔ کچی بلغم ہلکی سفید رنگ مشکل سے خارج ہوتی ہے۔ ناک بھی رات کے وقت بند ہوجاتی ہے۔ گزارش ہے کہ آپ میرے لیے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ادویات تجویز کریں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی اور دعا ہے کہ ادارہ اور ڈاکٹر ولمار شوابے مزید ترقی کرے۔

جواب: دانی، تم کرتے کیا ہو، یہ تم نے نہیں لکھا۔ چہل قدمی صبح سویرے اور رات کھانے کے بعد ضرور کیا کرو۔ کھانے میں مرغن غذاؤں کا استعمال بھی نہ کرو۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرو۔

Lycopodium-30 nux vomica-30 Merc sol-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

وزن، سفید بال اور لیکوریا

ثمن ناز.........کراچی

مجھے لیکوریا کا پرابلم پانچ سال سے ہے۔ میں نے ہومیوپیتھک علاج کروایا۔ وقتی فائدہ ہوتا ہے جب تک دوا کھاؤ۔ دوا چھوڑنے کے بعد دوبارہ سے شکایت ہوجاتی ہے۔ ایک مسئلہ اور ہے کہ میرے بال سفید ہو رہے ہیں اور چہرے پر بھورے تل بھی ہو رہے ہیں اور ویٹ بھی کافی ہوگیا۔ مجھے وزن کم کرنے کی دوا بھی تجویز کردیں۔

جواب: صبح سویرے کھلی ہوا میں پہلے چہل قدمی پھر جاگنگ شروع کریں۔ سادہ متوازن غذا لیں جس میں میٹھا اور چکنائی نہ ہو۔ تمام بازاری شیمپو استعمال نہ کریں ہمارا شیمپو استعمال کریں۔ پانی میں کلورین کی زیادتی بھی بالوں کا رنگ خراب کردیتی ہے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ ہفتہ میں ایک دفعہ صبح ایک خوراک Calc carb-200 کے 5 قطرے آدھے کپ پانی لیں۔ اس کے بعد Kreosotum-30، Natr.mur-30 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں جبکہ اسی کمپنی کی Phytolaca- e-

becsis-Ø کے 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ آکر مل لیں تو بہتر ہوگا۔

+++ سے کیا مراد ہے؟

نظام نظامی.........لاہور

مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ پیشاب کی رپورٹ میں ایک پلس +، دو پلس ++، یا تین پلس +++ سے کیا مراد ہوتی ہے؟ شکریہ، والسلام!

جواب: +، ++، +++ شدت کو ظاہر کرتا ہے۔

پیچیدہ مسئلہ

نمرہ امین.........ساہیوال

محترم ڈاکٹر صاحب! میں پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور خاص کر شوابے ہومیو کلینک بہت شوق سے پڑھتی ہوں جس میں آپ ہر قسم کی بیماری کی تشخیص کرکے لوگوں کی رہنمائی اور مدد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کاوش میں کامیاب کرے، آمین! محترم ڈاکٹر صاحب! میرا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ کبھی تو دل کرتا ہے کہ خودکشی کرلوں مگر پھر اس خیال سے رک جاتی ہوں کہ خودکشی حرام ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ خدا کے لیے مجھے اس مشکل سے نجات دلائیں۔ میرے بریسٹ بہت چھوٹے ہیں اس کے علاوہ مجھے ماہواری بھی نہیں آتی۔

جواب: والدین کو اپنے بچوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ان پر گہری نظر رکھنی چاہیے تا کہ وہ غلط کاریوں سے بچیں۔ ساتھ بچوں کو چاہیے کہ وہ بھی ہر بات بغیر کسی شرم کے اپنے بزرگوں کو بتائیں تا کہ صحت، عزت، دین اور دنیا خراب نہ ہو۔ نادانی میں جو کچھ ہوا اس کو بھول جائیں۔ اللہ سے استغفار کریں اور اس سے مدد مانگیں۔

سادہ لیکن متوازن غذا کا استعمال کریں۔ صبح و شام چہل قدمی کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Calc. ،Iodium-30 Pulsatilla-30، carb-30 کے 5-5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

بواسیر

عاصم وقار.........چکوال

میری والدہ صاحبہ کو عرصہ 5 ماہ سے بواسیر (خونی) کی تکلیف ہے جو کہ اس وقت شدید صورت اختیار کرچکی ہے۔ انہوں نے مختلف دیسی دوائیاں استعمال کی ہیں لیکن افاقہ نہیں ہورہا۔ دائمی قبض، تین سے چار سے اور خون کے آنے سے مرض شدت اختیار کرچکا ہے اور درد بھی بہت شدید ہے جس کی وجہ سے چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا حتیٰ کہ چارپائی پر لیٹنا بھی دشوار ہو چکا ہے۔ آپ سے بہت عاجزی کے ساتھ درخواست ہے کہ مندرجہ بالا موذی مرض کا مناسب علاج تحریر فرمائیں۔ BP کنٹرول کرنے والی گولیاں، خون پتلا کرنے والی دوائی اور سانس کے لیے انہیلر (Inhalor) استعمال کررہی ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ ایسی دوا تجویز کریں جو دل پر گھبراہٹ و تنگی نہ لائے۔

جواب: پانی کا استعمال بڑھائیں۔ لہسن، بادام، اخروٹ کھائیں۔ چہل قدمی کیا کریں۔ قبض نہ ہونے دیں۔ خون پتلا کرنے والی دوائی فوراً بند کریں اس کی جگہ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Arnica-200 ایک خوراک 5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 1 مرتبہ لیا کریں۔ Aesculus-30، Nux vomica-30، Hamamelis-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

سفید بال

مسز طاہر.........لیہ

میرے سر کے بال شادی سے پہلے 20 سال کی عمر سے سفید ہونا شروع ہو گئے تھے اور اب بھوؤں کے بال بھی سفید ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ میں جاب کرتی ہوں اس لیے بڑی ٹینشن میں ہوں۔ پلیز میری رہنمائی کریں۔ میری بھنوؤں کے بال سفید ہونے سے رک جائیں۔ خوراک بھی اچھی ہے۔

دوسرا مسئلہ میری بیٹی کا ہے۔ اس کے سر کے بال دس سال کی عمر میں سفید ہونا شروع ہو گئے تھے اور اب آدھا سر سفید ہو چکا ہے جس کی وجہ سے میری بیٹی احساسِ کمتری میں مبتلا رہتی ہے۔ بڑی ٹینشن رہتی ہے۔ خوراک بھی اچھی لیتی ہے۔ دودھ بھی پیتی ہے۔ برائے مہربانی ہمارے مسئلے پر توجہ دیں کوئی اچھا نسخہ تجویز کریں جو سفید بال ہیں وہ کالے ہو جائیں اور مزید سفید ہونے سے رک جائیں۔ ہمیشہ آپ کو دعائیں دوں گی۔

جواب: سر کے بال سفید ہونے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ غم، فکر، غذا کی کمی، پانی میں کلورین کی زیادتی، شیمپو، سر کی جلد کی بیماری، سر کے بالوں میں میلانین کی کمی۔ کچھ ادویات بھی بلاواسطہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ صحیح تشخیص ہونے کے بعد علاج کرائیں۔ فی الحال ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ آپ دونوں Acid Phos-3x، Jaborandi-Ø، Lycopodium-30 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ ہفتے میں دو مرتبہ ہمارے شیمپو سے بال دھوئیں اور تیل استعمال کریں۔ بالوں کی جڑوں میں مساج کریں۔ 2ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

ہارمونز کی خرابی

سعدیہ بی بی..........کوٹ ادو

میں اپنی بیٹی کی طرف سے پریشان ہوں۔ مسئلہ پیریڈ ہارمونز کا ہے۔ 13 سال کی عمر میں پیریڈ شروع ہوئے۔ کچھ عرصہ ٹھیک رہے۔ اب پچھلے 3 سال سے کبھی تین ماہ بعد آتے ہیں اور کبھی چار ماہ بعد۔ میں بہت پریشان ہوں۔ وزن 80 کلو تک ہو گیا ہے۔ احتیاط کرنے کے باوجود وزن کنٹرول نہیں ہوتا۔ چہرے پر بے تحاشا موٹے، موٹے بال ہیں جس کی وجہ سے بچی احساسِ کمتری کا شکار ہو گئی ہے اور تعلیم بھی درمیان میں روک دی ہے۔ ایک اچھی MBBS ڈاکٹر سے 18 ماہ تک علاج کروایا۔ جب تک علاج جاری رہا بچی ٹھیک رہی۔ دوا چھوڑ دی تو بچی پہلی والی کیفیت پر آ گئی۔ اس کی طبیعت میں چڑچڑا پن اور غصے میں اضافہ ہو گیا ہے۔ مہربانی فرما کر آپ ہمارے خط کا جلدی جواب دیں اور کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

جواب: یقیناً آپ کی بیٹی کا مسئلہ ہارمونز کا ہے جس کے لیے اسے باقاعدہ علاج کی ضرورت پڑے گی۔ اللہ سے دعا کریں۔ صابر اور شاکر رہیں۔ اس طرح ذہنی طور پر مطمئن رہیں گی۔ کسی بھی بیماری کے علاج کے لیے ذہنی سکون از بس ضروری ہے۔ جو صرف اور صرف اللہ کے ذکر سے ملتا ہے۔ مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔ ورزش ضرور کیا کریں۔ چہل قدمی کریں، پانی کا استعمال بڑھائیں اور قدرتی چیزوں کا استعمال کریں۔ مصنوعی چیزوں سے پرہیز کریں۔ پہلے ایک خوراک Calc carb-200 کی یعنی 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں لیں پھر ایک دن کے وقفے کے بعد Pulsatilla-30، Thyroidinum-30 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ اور Fucus-ves-Q کے 10 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 3 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔